Terhi Lakeer

BY : ASMAT CHUGHTAI

ناول

ٹیڑھی لکیر

عصمت چغتائی

ٹیڑھی لکیر (ناول)

عصمت چغتائی

BOOK TIME KARACHI

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

نام کتاب : نیزھی لکیر
مصنف : عصمت چغتائی
تعداد : 500
ایڈیشن : 2009ء
کمپوزنگ : عبداللہ کمپوزنگ سینٹر
قیمت : -/350روپے

Stockist:

Welcome Book Port
Karachi: Main Urdu Bazaar, M.A jinnah Road.
Email: welbooks@hotmail.com
Dubai: P.O. Box 27869, Karama Dubai.
Email: welbooks@emirates.net.ae

CITY BOOK POINT
Naveed Square, Urdu Bazar, Karachi
Ph # 021-2762483, Cell # 0322-2820883
Email: citybookurdubazaar@gmail.com

''پہلے پہل جب میں نے عصمت چغتائی کے افسانے پڑھے تو مجھے یوں معلوم ہوا گویا میرے ذہن کی چار دیواری میں ایک نیا دریچہ کھل گیا ہے یہ دریچہ جو میرے ذہن، شعور اور ادراک کی دنیا میں ایک نئے منظر کا اضافہ کرتا ہے۔''

(کرشن چندر)

''عصمت نے بے باکی اور جرأت کے ساتھ پردوں کو فاش کرنا شروع کیا ہے ہمارے ادب میں اس کی کمی تھی اور اس کی ایک حد تک ضرورت بھی تھی۔''

(مجنوں گورکھپوری)

''عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں بلکہ اشخاص سے شغف ہے، ان کے جوش و ہوش، ان کی تھرتھراہٹ اور پیچیدگی سے، ان کی کشمکش سے، عداوت اور فریب کاری سے، جو انسان پر طاری ہوتی ہے تو جسم بھڑکنے لگتا ہے۔ اس کے فن میں خاموشی آسودگی یا مسرت عالیہ کہیں نہیں ملے گی۔ بلکہ انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا۔ جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے، لبالب اور ابلتا ہوا، ٹکراتا ہوا اور راستہ چیرتا ہوا۔

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے، انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کئی راستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اردو ادب میں جو امتیاز عصمت کو حاصل ہے اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔''

(پطرس)

''عصمت پر بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا رہے گا کوئی اسے پسند کرے گا کوئی ناپسند لیکن لوگوں کی پسندیدگی سے زیادہ اہم چیز عصمت کی تخلیقی قوت ہے۔''

(منٹو)

پیش لفظ

جب ناول ٹیڑھی لکیر شائع ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا میں نے ایک جنسی مزاج اور بیمار ذہنیت والی لڑکی کی سر گذشت لکھی ہے۔ علم نفسیات کو پڑھیے تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون بیمار ہے اور کون تندرست۔ ایک پارسا ہستی جنسی بیمار ہو سکتی ہے اور ایک آوارہ اور بدچلن انسان صحت مند ہو سکتا ہے۔ جنسی بیمار اور تندرست میں اتنا باریک فاصلہ ہوتا ہے کہ فیصلہ دشوار ہے۔ مگر جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن نہ ذہنی بیمار ہے اور نہ جنسی۔ جیسے ہر زندہ انسان کو گندے ماحول اور آس پاس کی غلاظت سے ہیضہ، طاعون ہو سکتا ہے اسی طرح ایک بالکل تندرست ذہنیت کا مالک بچہ بھی اگر غلط ماحول میں پھنس جائے تو بیمار ہو جاتا ہے اور موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

مگر 'شمن' زندہ ہی نہیں ہے جان دار بھی ہے۔ اس پر مختلف حملے ہوتے ہیں لیکن ہر حملے کے بعد وہ پھر ہمت باندھ کر سلامت اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ ہر امتحان سے گزر کر پرسکون انداز میں اپنا سر تکیے پر ٹکا دیتی ہے اور ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے کے بعد دوسرا قدم اٹھاتی ہے۔ یہ اس کا قصور نہیں ہے کہ وہ بے حد حساس ہے اور ہر چوٹ پر منہ کے بل گرتی ہے مگر پھر سنبھل جاتی ہے۔ نفسیاتی اصولوں سے ٹکرلے کر وہ انہیں جھٹلا دیتی ہے۔ ہر طوفان سر سے گزر جاتا ہے۔

'شمن' کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ کوئی اسے سمجھ نہیں پاتا وہ پیار محبت اور دوستی کی بھوکی ہے اور انہی نعمتوں کی تلاش میں بھیانک جنگلوں کی خاک چھانتی ہے۔ اس کا دوسرا عیب ہے ضد یا شاید یہی اس کی خوبی ہے۔ ہتھیار ڈال دینا اس کی طبیعت نہیں۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ٹیڑھی لکیر میری آپ بیتی ہے۔ مجھے خود یہ آپ بیتی لگتی ہے۔ میں نے اس ناول کو لکھتے وقت بہت کچھ محسوس کیا ہے۔ میں نے شمن کے دل میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ آنسو بہائے ہیں اور قہقہے لگائے ہیں۔ اس کی کمزوریوں سے جل بھی اٹھی ہوں، اس کی ہمت کی داد بھی دی ہے۔ اس کی نادانیوں پر رحم بھی آیا ہے اور شرارتوں پر پیار بھی آیا ہے۔ اس کے عشق و محبت کے کارناموں پر چٹخارے بھی لئے ہیں اور حسرتوں پر دکھ بھی ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ یہ میری آپ بیتی ہے تو کچھ زیادہ مبالغہ تو نہیں۔

اور جگ بیتی اور آپ بیتی میں بھی تو بال برابر کا فرق ہے۔ جگ بیتی اگر اپنے آپ پر بیتی محسوس نہ کی ہو تو وہ انسان ہی کیا؟ اور بغیر پرانی زندگی کو اپنائے ہوئے کوئی کیسے لکھ سکتا ہے۔

شمن کی کہانی کسی ایک لڑکی کی کہانی نہیں ہے یہ ہزاروں لڑکیوں کی کہانی ہے۔ اس دور کی لڑکیوں کی کہانی ہے جب وہ پابندیوں اور آزادی کے بیچ ایک خلا میں لٹک رہی تھیں اور میں نے ایمانداری سے ان کی تصویر ان صفحات میں کھینچ دی ہے، تاکہ آنے والی لڑکیاں اس سے ملاقات کر سکیں اور سمجھ سکیں کہ ایک لکیر کیوں ٹیڑھی ہوتی ہے اور کیوں سیدھی ہو جاتی ہے۔ اور اپنی بچیوں کے راستے کو الجھانے کے بجائے سلجھا سکیں اور بجائے تنبیہ الغافلین کے اپنی بیٹیوں کی دوست اور رہنما بن سکیں۔

عصمت چغتائی
بمبئی

اُن یتیم بچوں کے نام!

جن کے

والدین بقید حیات ہیں

(1)

وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی۔ بڑی آپا کی چہیتی سہیلی سلمہ کی شادی تھی اور وہ بیٹھی جھپا جھپ سروئی کریپ کے دوپٹہ پر لچکا ٹانک رہی تھی۔ اماں اتنے بچے جننے کے بعد بھی ننھی ہی بنی ہوئی تھیں۔ بیٹھی جھانوے سے ایڑیوں کی مردہ کھال گھس گھس کر اتار رہی تھیں کہ ایکا ایکی گھٹا جھوم کر گھر آئی اور وہ دہائی ڈالی کہ میم کو بلانے کا سارا ارمان دل کا دل ہی میں رہا اور وہ آن دھمکی۔ دنیا میں آتے ہی بغیر گلے میں گھانٹی کیے ایسا دھاڑی کہ توبہ بھلی۔

نو بچوں کے بعد ایک کا اضافہ، جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم آگے بڑھ گئی۔ اور دس بج گئے۔ کیسی شادی اور کس کا بیاہ، حکم ملا، ننھی سی بہن کو نہلانے کے لئے گرم پانی تیار کرو۔ پانی سے زیادہ کھولتے آنسو بہاتی آپا نے کوستے ہوئے چولہے پر پتیلی چڑھا دی پانی بھی مذاق میں ذرا سا چھلک گیا۔ اور سارا ہاتھ ابل کر رہ گیا۔

''خدا غارت کرے اس منی سی بہن کو۔ اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی''۔ حد ہو گئی تھی! بہن بھائی اور پھر بہن بھائی۔ بس معلوم ہوتا تھا، بھک منگوں نے گھر دیکھ لیا ہے، اڈے چلے آتے ہیں۔ ویسے ہی کیا کم موجود تھے جو اور در پے در آ رہے تھے، کتے بلیوں کی طرح، ازل کے مربھکے، اناج کے گھن ٹوٹے پڑتے ہیں۔ دو بھینسوں کا دودھ تبرک ہو جاتا پھر بھی ان کے تندور ٹھنڈے ہی پڑے رہتے۔

اور یہ سب ابا کا تصور تھا، کیا مجال جو اماں دودھ پلا جائیں، ادھر بچہ پیدا ہوا، ادھر آگرے سے گوالن بلوالی۔ وہ دودھ پلائے اور بیگم کی پٹی سے پٹی جڑی رہے پھر بھلا بچے کیوں سانس لیتے؟ گھر کیا تھا، جیسے گائے بیلوں کا باڑہ، کھانا ہے تو پتیلوں، پینا ہے تو گھڑوں، سونا ہے تو گھر کا کونا کونا، زندگی سے لبریز، چھلکنے کو تیار!

اور یہ پیٹ کی کھرچن کالی پیلی، دھنیا سی ناک، چیاں سی آنکھیں پر چیل سے زیادہ تیز، بڑی آپا اور منجھو دونوں نے کئی دفعہ اس کے چوہے کے بچے جیسے منہ مسکراتے ہوئے دیکھا، گویا وہ انھیں چھیڑنے کو مسکرا رہی ہے۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ اس کی زر خرید لونڈیوں کی طرح خدمت کریں گی اماں کو کیا فکر ہو رہی ہوگی۔ آخر اتنی ڈھیر سی لڑکیوں کا نصیبہ کہاں کھلے گا۔ مانا کہ روپیہ بھی ہے اور لڑکی کو دکھانے کا فیشن نہیں پھر بھی کہاں تک

تالے ڈالے جائیں گے، کیا ہوگا؟

نہ اس کا پیٹ پھولا نہ بیمار ہوئی اور روز بروز پھول کر کپا ہوتی گئی۔ دو ایک بھائی بہنوں تک تو ذرا چاؤ چونچلے کئے، پر اب بڑی آپا کا بھی جی بھر چکا تھا اور وہ بیزار تھی۔ خیر انا موجود تھی اور وہ پل رہی تھی۔

انا بالکل جوان تھی، سولہ سترہ برس کی۔ تبھی تو راتوں کو وہ گھنٹوں غلاظت میں لتھڑی پڑی رہتی اور اس کی آنکھ بھی نہ کھلتی۔ انا کو جگانا گو آسان کام نہ تھا، مگر دودھ خوب ہوتا تھا۔ دوسرے انا کا عاشق جب اسے کندھے پر بٹھا کر گھوڑے کی طرح دوڑتا تو وہ سب دکھ درد بھول کر کلکاریاں مارنے لگتی۔ وہ تینوں، گھر والوں کی آنکھ بچا کر بھینسوں کے بھوسے والی کوٹھڑی میں دبک رہتے، انا بھوسے پر لوٹیں لگاتی اور اس کا عاشق اس کے پیچھے پیچھے لڑھکتا، تب وہ تالیاں بجا بجا کر گھٹنیوں دوڑتی، مگر جب وہ انا سے لڑنا شروع کرتا تو وہ منہ بسور کر اپنا نچلا ہونٹ آگے پھسلا دیتی۔ اسے لڑائی سے سخت پریشانی ہوتی تھی۔ جب دو کتے آپس میں بھاؤں بھاؤں کر کے لپٹ جاتے تو اس کا سارا جسم خوف سے لرزنے لگتا اور وہ بے طرح بلبلانے لگتی، یہاں تک کہ کتے بھی پریشان ہو کر علیحدہ ہو جاتے۔ جب تک وہ جاگتی رہتی انا کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ یونہی اگر اسے چھیڑنے کو انا کا عاشق اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا 'انا ہماری ہے' تو وہ فوراً صدائے احتجاج بلند کرتی اور اسے چھوڑنا پڑتا۔

مگر اسے اپنی اس سینہ زوری کا جلد ہی خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایک دن جب وہ تینوں حسب معمول خشک پیال پر لوٹیں لگا رہے تھے تو نہ جانے کب اسکی آنکھ لگ گئی اور وہ اپنی ننھی سی دنیا کے معصوم خوابوں میں کھو گئی، آگے پیچھے، دائیں بائیں انائیں ہی انائیں بکھری ہوئی تھیں، خوشی سے دیوانی ہو کر ایک گود سے دوسری گود میں ہمک ہمک کر لپکنے لگی۔ مگر پھر اس نے دیکھا یکا یک ساری انائیں کہیں غائب ہو گئیں۔ اس کا جی کمہلا گیا۔ ندیدی کتیا کی طرح سونگھ سونگھ کر وہ ڈھونڈنے لگی۔ اس نے پالیا، پیال کے ایک کونے میں اس کی نرم گرم انا پکے آم کی طرح گول مٹول سی ہو رہی تھیں۔ کوں کوں کر کے وہ اس میں گھسنے لگی۔ اس کے ہونٹ ہلنے لگے اور حلق کی رگیں پھڑک اٹھیں، گویا دودھ کے گھونٹ کے گھونٹ حلق سے ہوتے ہوئے پیٹ میں جا رہے ہوں، اسے اچھو سا لگ گیا۔ کچھ پکڑنے کے لئے اس نے اپنے موٹے موٹے ہاتھ بڑھائے مگر ایک بھیانک بلا نے اسے دور جھٹک کر انا کو دبوچ لیا اور بھنبھوڑنا شروع کیا۔ حلق پھاڑ کر وہ دھاڑی، جیسے اسے سانپوں نے ڈس لیا ہو۔ اس کی معصوم آنکھیں اس کی کریہہ منظر کو دیکھ کر پتھرا گئیں۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔ چیخیں سن کر باہر سے بہشتی، بھنگی اور باورچی دوڑ پڑے اور ملزم گرفتار ہو گئے۔

بسور بسور کر وہ انا کے پیارے مکھڑے کو تکتی گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہی ہو۔ ''چوٹ تو نہیں لگی؟ میں نے تمہیں بچا لیا نا؟'' مگر انا کچھ بے مزا سی تھی اور اس کی شرارتوں پر بجائے پیار سے ہنسنے کے رکھائی سے جھٹک رہی تھی۔ اپنے تمام معصوم اور کمزور حربے اس نے انا کو منانے کے لئے استعمال کر ڈالے۔ مگر وہ اسے ہنسا نہ سکی۔ کاش وہ پوچھ سکتی کہ وہ کیوں روٹھی ہوئی تھی۔ مگر آج تو انا نے اس کی آنکھوں کی زبان سمجھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

اسی دن شام کی گاڑی سے اس کی انا کو آگرے واپس بھیج دیا گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ یتیم ہو گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ کئی دن اور کئی رات روتی رہی۔ سارا گھر اس کے چاروں طرف جمع ہو گیا مگر اسے چین نہ پڑا۔ وہ گرم گرم انا جس کے سینے سے چمٹ کر بالکل ماں کے پیٹ میں سونے کا مزہ آتا تھا۔ بھلا وہ اب کہاں مل سکتی تھی۔ اسے وہ بوتل دیکھ کر ہی صدمہ کا دورہ پڑ جاتا تھا جس سے اسے دودھ پلانے کی کوشش کی گئی۔ بھلا کہاں وہ سانولی سلونی گدگدی انا اور کہاں شیشے کی ذلیل بوتل۔ مگر پیٹ کی آگ نے اسے سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ منجھو بی نے جب سے گود میں لے کر بوتل پلائی اور چند قطرے بھولے سے اس کے حلق میں اتر گئے تو وہ خاموش ہو گئی۔ پھر بھی ایک دم سے وہ بوتل چھوڑ کر جلدی سے منجھو سے چمٹ جاتی اور بلے کی طرح اس کے کپڑوں میں اپنی انا کو ڈھونڈنے لگتی۔ منجھو گھبرا کر اسے دور لٹا دیتی اور بڑی آپا سے شکایت کرتی کہ وہ اس کے بے طرح گدگدیاں کرتی ہے۔

تجربہ نے اسے بہت کچھ سکھا دیا اور بالکل جیسے گائے بیل چارہ کھاتے ہیں۔ دودھ زہر مار کر لیتی مگر اس کے ہاتھ بھٹکتے ہی رہتے۔ بوتل کی چکنی چکنی سطح پر وہ پیار سے اپنی ہتھیلیاں چپکا کر اسے کلیجے سے بھینچ لیتی شروع شروع میں تو دودھ پیتے پیتے ایک دم اسے انا کی آنکھیں، اسکی ناک کی ننھی سی بالی، اور کان کی لونگیں یاد آ جاتیں۔ اس کا دل بھر آتا اور وہ تھوڑی دیر کو چسنی چھوڑ کر دردناک آواز میں رونے لگتی۔ مگر پیٹ کی پکار اسے چوکنا کرتی اور وہ خاموش ہو جاتی۔

جب سے انا چھن گئی تھی۔ منجھو نے اسے لے لیا تھا۔ پتہ نہیں منجھو کو اس پر کیوں پیار آ گیا۔ شاید جس دن اس نے اس کے کپڑوں میں انا کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اسی دن سے منجھو کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ بوتل سے دودھ پلا کر منجھو بی اسے سینے سے چپکا لیتی۔ اور پلنگڑی پر لیٹ جاتی۔ ورنہ اسے نیند ہی نہ آتی۔ منجھو کے پہلو میں اسے کچھ کچھانا کی گرمی مل جاتی۔ اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے منجھو کی گردن اور گال سہلایا کرتی جس کا منجھو بالکل برا نہ مانتی۔

پھر ایک دن جب منجھو نہا رہی تھی تو وہ اندر گھسی چلی گئی۔ ''ارے آپا اسے پکڑو'' منجھو لرز کر چلائی۔

''اوئی وہ کیا سمجھے اتنی ذرا سی تو ہے۔'' مگر اس نے منجھو کو ایسی بری طرح سے گھورا کہ وہ شرما گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں اسے گھورتی رہی۔ ''چل یہاں سے'' منجھو نے لوٹے کی آڑ لے کر اسے ڈانٹا، مگر وہ تو جیسے مقناطیسی طاقت سے اس کی طرف کھنچنے لگی۔ منجھو نے خوفزدہ ہو کر اسے پھر دھتکارا اور جب وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے مسکرا مسکرا کر اسے معنی خیز نظروں سے تاکتی بڑھتے ہی چلی گئی تو اس نے چلو بھر پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹا مارا۔

پانی کی مار سے ٹھٹک کر زور سے رو پڑی اور سسکیاں بھرتی ہوئی باہر رینگ آئی۔ اس دن اس نے نہ ہی جی بھر کے دودھ پیا اور نہ ہی ہنسی بولی۔ وہ منجھو کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتی گویا اس نے اس کے ساتھ کوئی زبردست بے ایمانی کی ہے، اور پھوٹ کر رو پڑتی۔

جب منجھو نے اسے پہلو میں لٹا کر رضائی اوڑھ لی تو وہ خلاف معمول خاموش اسے گھورنے لگی۔

''کیا ہے؟'' منجھو نے پیار سے پوچھا اور وہ حسرت سے مسکرا پڑی۔ آہستہ سے اس نے اس کی گردن پر اپنی انگلیوں سے کھجانا شروع کیا اور آنکھیں گڑوئے اس کے تل کو دیکھتی رہی جو بائیں گال پر چمک رہا تھا۔

''نہیں، بری بات'' منجھو نے اس کا بھٹکتا ہوا ہاتھ اٹھا کر پہلو میں رکھ دیا وہ بسورنے لگی اور ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ منجھو پسیج گئی، اس کا ہاتھ اٹھا کر گردن میں ڈال لیا اور کلیجے سے لگا کر سو گئی۔

منجھو نے اس کے لئے پھول جیسی فراکیں اور ٹوپیاں سیں۔ گھڑی گھڑی نہلایا جا رہا ہے سرمہ، کاجل اور مسی سے لیس۔ وہ اپنی ساری گنتیں خاموش بیٹھی بنوایا کرتی۔ مگر کیا مجال کہ جو کوئی اسے ہاتھ بھی لگا جائے۔ منجھو سے تو آنکھوں میں صابن بھی لگ جاتا تب بھی وہ کچھ یونہی سا بسور کر چپ ہو جاتی۔ منجھو آخر کو منجھو ہی تھی۔ مگر جوں جوں بڑھتی گئی وہ منجھو کی صفائی سے عاجز آ گئی وہ اسے سجا بنا کر نادر شاہی حکم صادر کر دیتی کہ ایک بال بھی ادھر سے ادھر ہوا اور موت آئی۔ پر یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ چلتی ہوئی ٹانگوں اور ہاتھوں کو روکنا اس کے قابو میں نہ تھا۔ تھوڑی دیر تو وہ کلیجے پر صبر کی سل رکھے بیٹھی رہتی۔ مگر جونہی منجھو کی آنکھ بچتی وہ باہر کھسک جاتی اور پھر شام کو جو وہ قدم رکھتی تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی دیوانی کتیا کیچڑ کی کونڈی میں لوٹ کر آئی ہے۔ غبارہ جیسی فراک جانو سڑے ہوئے چوہے کی کھال اور اس پر باریک باریک دھول کی افشاں چھڑکی ہوئی۔ سر، بال اور آنکھیں دھول میں اٹی ہوئی۔ دونوں نتھنے غلاظت سے ایسے ٹھسا ٹھس جیسے سیمنٹ سے دروازے چنے ہوئے ہوں۔ جامنوں، امرودوں، بیروں اور آموں کا یا حسب موسم جو پھل موجود ہوتے ان کا پلستر کیا ہوا اور اوپر سے طاعونی چوہے جیسی بو!

سب سے پہلا کام منجھو بی یہ کرتیں کہ گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں سے جتنی دھول جھڑ سکتی جھاڑ دیتیں۔ وہ زور سے بھینس کے پڈے کی طرح ڈکراتی، پلکوں کی ریت آنسوؤں سے دھل جاتی اور کھار کی وجہ سے دونوں نتھنے سٹ سے کھل جاتے، جیسے اٹی ہوئی نالی میں تیزاب ڈال دیا۔ پھر گھونسوں اور گرجدار دھموکوں کے شادیانوں کے ساتھ غسل میت شروع ہوتا۔ پھر صاف ستھرا فراک پہن کر وہ اپنی غلطی کو بڑی تیزی سے محسوس کرتی اور پچھلے گناہوں سے تائب ہو کر آئندہ نیک چلنی کا ارادہ باندھتی۔ وہ پختہ فیصلہ کر لیتی کہ اب کیچڑ اور مٹی سے تو کوئی واسطہ نہ رکھے گی۔ دھول میں لوٹنا تو قطعی بند۔ اس وقت اس کے چہرے پر تارک الدنیا سادھو کا سا استقلال چھا جاتا جو اپنے جسم کے کسی عضو کو معطل کر لینے کا قصد کر چکا ہو۔ چیل جیسی چوکنا آنکھیں کبوتر کی طرح معصوم ہو کر اونگھنے لگتیں۔

مگر زمانہ ساز گار نہ تھا۔ دوسرے دن جب عین اسی وقت، اسی عبرت ناک حالت میں ایک بدمست شرابی کی طرح جھومتی، دھول کی افشاں میں جگمگاتی نظر آتی تو دیکھنے والوں کو سخت عبرت ہوتی اور جب دھول جھڑتی تو زمین و آسمان کانپ اٹھتے۔

وہ پھر توبہ کرتی۔ حلف اٹھاتی۔۔ مگر سب بھول جانے کے لئے۔ شیطان اسے پھر ورغلاتا۔ جونہی وہ سچ

دھج کر باہر نکلتی۔ جملہ عناصر کو اس کے صاف کپڑوں سے بیر ہو جاتا کھیتوں کی سانولی سانولی کیچڑ، تال کے کنارے کی سرگوشیاں کرتی ہوئی ریت اسے پھسلاتیں۔ اصطبل کی بھیگی بھیگی مہکتی ہوئی گھاس آغوش پھیلا کر اس کے پیچھے دوڑتی۔ مرغیوں کا متعفن اور غلیظ ڈربہ اسے پھولوں سے لدی سیج کی طرح اپنی طرف کھینچتا۔۔۔ وہ سب کچھ بھول جاتی، اپنے ضمیر سے وہ قسم جو بارہا کھائی تھی۔ منجھو سے وعدہ اور خود اس کی اپنی خودداری جسے روز روز کی دھول جھڑائی چکنا چور کئے دیتی تھی۔۔۔ وہ ان بے پناہ شیطانی رعنائیوں سے بچنے کے لئے بہت مضمحل ہو جاتی۔ مگر پھر وہ پکار پکار کر بلاتیں تو وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح، اس ابدی گناہ کے غار میں جا گرتی۔ جس کے پاداش میں وہ روز دکھ جھیلا کرتی تھی۔

تھوڑی سی دیر میں وہ لہو ولعب میں غرق نظر آتی کیچڑ کے ریشمی لندو، بھوری بھوری بھنی ہوئی سوجی جیسی ریت کی ننھی ننھی ڈھیریاں۔۔۔ گھوڑے کی گھاس سے بنائی ہوئی چھوٹی سی جھاڑو، مرغی کی دم کے جھڑے ہوئے پر، اور پنیا اس کی عزیز ترین سہیلی، بھنگن کی لڑکی، منجھو کے بعد دنیا میں یہی پنیا تھی۔ وہ دونوں بھینسوں کے تھان کے پیچھے جا کر ایک دوسرے کے گلوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلا کرتیں۔ پھر ریت میں بیلنوں کی طرح گول گول لوٹیں لگاتیں مٹھیاں بھر بھر کے ریت پانی کے چلوؤں کی طرح اچھالتیں۔ یہاں تک کہ وہ بالکل مٹی کی بدہیئت مورتیاں معلوم ہونے لگتیں۔ ان کی رگ رگ میں ریت رینگنے لگتی، پھر بھی ان کے جی مٹی سے نہ بھرتے اور وہ سوکھے ہوئے پتوں کے چمچے بنا کر ریت پھانکنا شروع کرتیں۔ خستہ بھربھری ریت وہ مزے دار پنجیری کی طرح کھا جاتیں، پیٹ والیوں کی طرح انھیں سوندھی سوندھی مٹی بہت ہی بھاتی تھی۔ نہ جانے ان کے پھولے ہوئے کپریوں جیسے پیٹوں میں کون سے سپوت پروان چڑھ رہے تھے۔

ان کی حالت تھی ہی کچھ حاملہ عورتوں جیسی، چکنی سرمئی رنگتیں پیلی پڑ گئی تھیں اور زبانوں پر سفید پھپھوندی لگ گئی تھی۔ آنکھوں میں بھورے بھورے ڈورے پڑ گئے تھے۔ پنیا کا ازار بند اتنا چھوٹا پڑ گیا تھا کہ اس کی گھگریا میں آگے طاقچہ کھلا رہتا تھا روز بروز سستی بڑھتی جا رہی تھی منہ کا مزا خراب رہتا تھا۔ لڑائی میں انہوں نے دانتوں اور ناخنوں کا استعمال ضرورت سے زیادہ کر دیا تھا۔ چنن منن وہ ہر وقت منمناتی ہی رہتیں جیسے کسی نے بھتنی کو ڈبہ میں قید کر دیا ہو۔ اس لئے سب نے اس کا نام 'بھتنی' رکھ دیا۔

جب سب اسے چھیڑنے کے لئے ''بھتنی بھتنی'' کہتے تو وہ واقعی چڑیلوں کی طرح آنکھیں نکال کر غراتی۔ بلی کی طرح وہ دشمن پر جھپٹا مارتی اور جہاں جہاں اس کا ناخن لگتا کھال ہی اتری چلی آتی۔ جب وہ دانتوں کے کسی بوٹی چباتی تو اوپر نیچے کے دانت گوشت میں آر پار ہو کر آپس میں بج اٹھتے۔

وہ سپوت جو اس کے پیٹ میں پل رہا تھا۔ اسکے سوندھی مٹی کے شوق کو بڑھاتا ہی گیا۔ اس کی زبان پر نمک چھڑکا گیا۔ پھر کونین لگائی گئی مگر کسی سزا سے بھی مٹی کی چاٹ نہ گئی۔ کسی نے رائے دی۔ ''چڑیل کی زبان جلا دو۔'' کسی نے ترکیب بتائی۔ ''سوئیاں چبھو دو کم بخت کے۔'' مگر کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ جب وہ مٹی کھاتی پکڑی جاتی تو منجھو اس کے منہ ہی منہ پر طمانچے مارتی کہ ہونٹ کٹ کر خون نکل آتا مگر وہ کچھ نہیں تو کوئلہ ہی چبا

جاتی دیوار پر سے چونا ہی ناخنوں سے کھرچ کر کھا لیتی۔

ایک دن جب وہ اور پنیا رفع حاجت کی غرض سے پاس پاس بیٹھی گپیں ہانک رہی تھی کہ وہ سپوت وارد ہو گیا۔۔۔ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ وہ منجھو کے پاس پہنچی۔

''سانپ!'' اس نے منجھو کی ٹانگوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ منجھو نے اسے پرے دھکیل دیا۔ تحقیقات کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کے پیٹ میں کیچوے پڑ گئے ہیں۔ لیکن اسے یقین نہ آیا اور رات بھر وہ ''سانپ سانپ'' چلاتی رہی۔ پورے وقت اسے پیٹ میں سانپ لہراتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، سانپوں کے گچھے کے گچھے جیسے سپیرے کی ٹوکری میں کلبلاتے ہیں۔ اس کے پیٹ میں اودھم مچا رہے تھے۔ ایک کے پیچھے دوسرا اور دوسرے کے پیچھے تیسرا، ہزاروں سانپ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

اس دن سے اس نے پنیا کے ساتھ سوکھے ہوئے پتوں کے چمچوں میں بھر بھر کر مٹی کھانی چھوڑ دی۔ للچائی ہوئی نظروں سے وہ ریت کے ذروں کو گھورتی اور ایک دم وہ بڑھ بڑھ کر سانپوں کے پھن بن جاتے جو لپ لپ اپنی زبانیں نکال کر آنکھیں مٹکانے لگتے۔ مٹھی میں لے کر وہ ریت کو پیار سے سہلاتی۔ جی چاہتا بھر بھر کر مٹھیاں کھانا شروع کر دے اور ساری دنیا کی مٹی کو اپنی زبان کے نیچے تھوک میں رول ڈالے اور پھر یہ لیس دار کھویا سا اس کے حلق کے نیچے پھسلتا چلا جائے مگر فوراً ہی اس کے پیٹ میں سانپ انگڑائیاں لینے لگتے۔ ایک دم دیوانوں کی طرح وہ ریت اچھالنا شروع کر دیتی، زمین پر لوٹ جاتی اور ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی پر اپنے گال رگڑتی۔ اس کے جسم کی رگیں ایک ہنیسے کی طرح جاتیں اور وہ چاہتی کہ زمین کے کلیجے میں گھس جائے۔ جب ذرا جوش ٹھنڈا ہو جاتا تو آہستہ آہستہ وہ اپنا ماتھا زمین سے کھٹ کھٹ ٹکراتی۔

''دروازہ کھولو۔'' اس کا ماتھا التجا کرتا مگر زمین اسی طرح ڈھیٹ بنی پڑی رہتی۔ اسے زمین سے کیوں اتنا پیار تھا؟ وہ اسی میں سما جانا چاہتی۔ پھر اگر کوئی دیکھ لیتا تو وہ ساری ریت جھاڑ دیتی۔ مگر جہاں موقع ملتا وہ مٹی میں جذب ہونے کی کوشش کرتی۔ ''خاک میں ملے کم بخت، جتنی دفعہ نہلاؤ اتنی دفعہ گندی!'' منجھو کہتی اور وہ سوچتی کاش کوئی جانتا کہ خاک میں ملنا اس کے لئے کوسنا نہیں بلکہ دعا تھی یہی تو اس کی آرزو تھی۔

(2)

لوگوں کو شادی بیاہ کا ارمان ہوتا ہے مگر شمن کو کچھ دن سے کسی کو مارنے کا ارمان ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کا جی پھڑ پھڑانے لگتا کہ وہ کسی کو مارے۔ اپنے موٹے سے گھونسے سے کسی کو کچل کر رکھ دے۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے ویسے اس کی آنکھیں دانہ کھاتی ہوئی مرغی کی دم پر جمی ہوئی ہیں۔ جہاں سوکھی ہوئی بیٹ کا ننھا سا قتمہ اس کی ہر جنبش پر لرزنے لگتا ہے یا اس ننھی سی چوہیا کی طرف جو صبح سے تین بار سہمی ہوئی نظروں سے صندوق کے پیچھے سے جھانک چکی ہے۔ یا وہ کسی اور چیز کو گھور رہی ہے کہ ایک دم سے اسے مارنے کا شوق چراتا۔ گھر میں ایسا دیا لو کون تھا جو اس سے پٹ لیتا۔ منجھو کیا مزے سے جب چاہتی دھم سے اس کی کمر پر گھونسا جما دیتی۔ اس کا بھی دل چاہتا کہ ایک دن وہ بھی منجھو بی کی ٹھوس کمر پر ایک تگڑا سا گھونسا جمائے۔۔۔ پھر تخیل میں ہی وہ منجھو بی کو پیٹنے لگتی۔ دو تھپڑ گال پر مار کر اس کے کپڑے اتار ڈالتی اور نہلانے لگتی۔ اس وقت اسے کہیں سے اپنی بھولی بسری انا کا دھندلا سا خاکہ یاد آ جاتا اور اس کا جی بھر آتا اور غصہ چڑھنے لگتا اور وہ منجھو کے سر پر بیسن ڈال کر خوب گھسے لگاتی۔ زور زور سے جھانوے سے اس کی کہنیاں اور گٹے چھیلنے لگتی۔ پھر کھردرا سا تولیہ لے کر اتنا رگڑتی کہ منجھو کی کھال اتر جاتی اور ناک لال چقندر ہو جاتی۔ ایک کان کی لو ٹوٹ کر تولیہ ہی میں الجھ آتی۔ پھر وہ اسے ایک عمدہ سی فراک پہنا کر کہتی:۔ ''خبردار جو بلی، ٹانگیں توڑ ڈالوں گی۔''

مگر جب وہ تخیل کی دنیا سے جاگ کر واپس آتی تو دیکھتی کہ کچھ بھی نہیں، اس کے دونوں ہاتھ پتھر کی مورتی کی طرح گود میں اکڑے ہوئے ہیں، گردن کی رگیں تنے تنے دکھ گئی ہیں۔۔۔ وہ ایک انتقام بھرا لمبا سانس کھینچ کر جسم کو اور تان لیتی اور ایک دم پاگلوں کی طرح زور زور سے بستر پر گھونسوں کی بارش کر دیتی۔ جب وہ جی بھر کے کوٹ چکتی تو تھک جاتی جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی اور بڑا ہی سکون ملتا۔

ایک دن اسے بیٹھے بیٹھے اپنی گڑیا کو مارنے کا دورہ پڑا۔ پہلے تو اس نے اس کو ہولے ہولے دو تنبیہی طمانچے مارے پھر ایک دم اس پر بھوت سوار ہو گیا۔ دھڑا دھڑ اس نے گھونسوں اور لاتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دانتوں اور ناخنوں سے اس کے پرزے کر دیئے۔ گویا وہ اپنے کسی خوفناک دشمن سے لڑ رہی ہو۔

گڑیا کا چورا چورا ہو گیا۔ اس کے جسم میں بھرا ہوا برادہ بکھر گیا اور کچھ شمن کی زبان پر چپک گیا۔ اس کے بعد اس کا پیٹ بھر گیا اور وہ اطمینان کا سانس لے کر ہانپتی ہوئی چت پڑ گئی۔ برادے کا مزہ بڑی دیر تک اس کی زبان پر باسی خون کی طرح جما رہا۔

پھر ایک دم اس پر خوف طاری ہو گیا، جیسے اس نے سچ مچ کسی کو قتل کر ڈالا ہو۔ ڈر کر وہ گھگھیانے لگی اور جلدی جلدی گڑیا کے پرزے صندوق کے نیچے چھپا دیئے۔ وہ منجھو بی کی طرف پناہ لینے کیلئے بھاگی۔ منجھو بے خبر بیٹھی اپنا کرتہ سی رہی تھی، اس کی ران سے لگ کر لیٹ گئی اور اس کی گردن پر اپنی سہمی ہوئی انگلیاں پھیرنے لگی۔

منجھو بی فراکیں سینا ہی نہیں جانتی تھی بلکہ ایک دن اس نے ایک الف بے کا قاعدہ منگا کر مشین سے سی ڈالا۔ شمن پاس بیٹھی مشین کے دانتوں کو کت کت کاغذ چباتے دیکھتی رہی۔ دانتوں میں ہلکی سی لطیف کھجلی ہونے لگی، ان دانتوں پر انگلی پھیر کر عجیب سی لہر اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ قاعدہ سی کر منجھو نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ ''آج سے تم پڑھنا شروع کرو گی، اچھا۔''

''اچھا''۔ شمن نے مان لیا اور قاعدہ دیکھنے کے لئے اچکنے لگی۔ یہ پہلی یا دوسری کتاب اس کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ جسے پڑھنے میں پریشان کرنے پر منجھو بی اسے مار دیا کرتی تھی۔ ویسے گھر میں پڑھنے لکھنے کا سارا دلچسپ سامان اس کی پہنچ سے دور رکھا جاتا تھا۔ مارنے کے کام کا تو تھا نہیں یہ قاعدہ۔ اس سے بہتر تو وہ اخبار ہوتا تھا جس سے ابالفافہ سا بنا کر پیار میں اس کے سر پر مارا کرتے تھے۔

''دیکھیں۔ دیکھیں منجھو بی۔'' اس نے کتاب لے کر دیکھنا شروع کی پھر فراک میں اس کی پھنکی سی بنا کر منجھو کے سینے پر ماری۔

''اے گدھی، تمام موڑ کر رکھ دی۔'' منجھو نے اس سے قاعدہ لے لیا۔

''دیکھو یہ الف ہے، الف۔''

''کاں۔'' اسے بالکل یقین نہ آیا۔

''یہ۔۔۔ یہ الف سے انار۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''ایں ہاں، الف سے انار کہاں ہوتا ہے۔ انار تو آتش بازی میں چھوٹتا ہے فرفر۔ ہیں نا؟''

''ہٹ، یہ دیکھ۔ یہ الف سے انار۔۔۔ کہو، الف سے انار۔''

''کہو الف۔''

''یوں کہو۔ الف!''

''نہیں ہم نہیں کہتے، پہلے یہ تو بتاؤ یہ کیا ہے۔۔۔۔ یہ، یہ۔''

''یہ جیم ہے۔''

''اور یہ؟''

''یہ ص، ض''

''اونہوں، ص ض نہیں ہیں یہ تو چائے دانیاں ہیں۔''

''چل پگلی، یہ دیکھو الف سے انار۔۔۔ کہو۔''

''کہو۔'' وہ بے وقوفوں کی طرح منجھو کا منہ تکنے لگی۔

''ارے میں کہتی ہوں الف کہو۔'' صبر کا پیمانہ چھلکا۔

''الف کہو۔''

''اونہہ چڑیل۔'' منجھو نے دھکا دے کر اسے اپنی گود سے انڈیل دیا اور اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی۔ شمن نے قاعدہ اٹھالیا۔ بالکل سور کم بخت، سور تھا قاعدہ، کالی کالی ٹیڑھی تصویریں، سوائے لونے کی شکل کے 'ص ض' کے اسے کچھ نہ بھایا اور جیم کو تو وہ دیکھ کر جل ہی گئی۔ کسی قدر اترائی ہوئی مہترانی کی شکل کی تھی! توبہ! ۔۔۔ الف سے انار!۔۔۔ ہنہہ، بھلا کیسے؟ یہ منکے کی شکل کا انار نہ لال لال چنگاریاں نہ کچھ۔۔۔ بالکل ردی۔ خیر الف تو وہ پڑھ لے گی مگر 'جیم' تو وہ مر جائے جب بھی نہیں پڑھے گی۔ بہت ہوگا منجھو گھونسے مارے گی مگر ہرج ہی کیا ہے مارنے دو، اپنا کیا جاتا ہے۔ گھم سے جیسے محرم میں ڈھول بجا! اس پر پھر کسی کو محرم کے ڈھول کی طرح پیٹ ڈالنے کا جنون سوار ہوا مگر وہ ضبط کر گئی۔ اس نے دھیان بٹانے کے لئے قاعدہ اٹھالیا۔ کت کت مشین کے دانتوں کے نشان دیکھ کر اس کے اپنے مسوڑھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ یونہی جو سرے پر لٹکتا ہوا ڈورا پکڑ کر کھینچا تو کچے زخم کی طرح ٹانکے ٹوٹتے چلے آئے! بڑا مزہ آیا، جیسے وہ جلدی جلدی چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں سے اتر رہی ہو۔ قاعدے ورق بکھر گئے۔

ارے! منجھو شرطیہ برا مانے گی، اور کیا عجب جو مار بھی بیٹھے! اس نے جلدی سے قاعدے کے ورق سمیٹ کر مشین کے دانتوں کے نیچے رکھ دیئے اور ہینڈل گھماتی رہی۔ کت کت، کت کت وہ ادھر سے ادھر بڑی مشاقی سے چلایا کی، یہاں تک کہ قاعدہ سوزنی کی طرح ٹانکوں سے بھر گیا۔ خیر اچھا ہوا۔ 'ص۔ض' کم بخت چائے دانی کی شکل کے غارت ہو گئے اور جیم بھی مٹ گیا۔

مگر جب منجھو نے قاعدے کی صورت دیکھی تو تمام گذشتہ گھونسوں سے زیادہ وزنی گھونسا جمایا، اس کے

بعد تھپڑ اور چانٹے۔ وہ دیر تک بیٹھی بے آنسوؤں کی سوکھی سوکھی ہچکیاں بھرتی رہی۔ اگر ہر بار مار پڑنے پر آنسو گرانا لازمی ہوتا تو یقیناً مصیبت ہو جاتی اور اس کی آنکھوں کے ڈیلے کبھی کے بہہ گئے ہوتے، ادھر منجھو کے تھپڑوں کا خزانہ کم ہوتا نہ نظر آتا اور جو وہ ہر تھپڑ پر ایک آنسو بھی بہاتی تو سات سمندر کا پانی ہوتا سو بھی خشک ہو جاتا۔ اس لئے وہ اب بس گلے سے رویا کرتی تھی۔ دماغ بالکل پرسکون اور غیر متاثر رہتا۔

یہ دوسری کتاب تھی جس سے اسے لنبی بغض ہو گیا۔ ایک تو وہ ناول ہی کیا کم تھی۔ جسے پڑھتے وقت منجھو بی اس کی کسی آہ وزاری پر کان نہیں دھرتی تھی۔ اب دوسری یہ جس کی آمد ہی منحوس ثابت ہوئی۔

مگر یہ کتاب تو اس کی جان کو چمٹ گئی۔ ایسی کہ چھٹنا دشوار ہو گیا۔ ''الف'' تو خیر دل پر پتھر رکھ کر پڑھ لیا گیا مگر ''جیم''، حتی کہ ''ص ض'' کم بخت بھی پڑھنا پڑے۔ حیرت تو اسے جب ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ۔۔۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

بات یوں ہوئی۔ اس نے ایک دن منجھو سے پوچھا:

''منجھو بی جب قاعدہ ختم ہو جائے گا تو مٹھائی بٹے گی نا؟''

''ہاں'' اور پھر دوسری کتاب شروع ہوگی۔

''دوسری؟۔۔۔ پھر؟''

''پھر بڑے بھائی جیسی موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرنا۔۔۔'' منجھو نے نہایت معصومیت سے بتایا کس سادگی سے وہ اسے آنے والی بلاؤں سے دوچار کر رہی تھی۔

خاموش، اپنی گود میں ہاتھ سمیٹے وہ بیٹھی رہی اور ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک موٹی سی بھیانک کتاب اس کے سر پر پتھر کی سل کی طرح گرتی ہے۔ جس میں ''ص ض'' اور ''جیم'' سے بھی زیادہ کمینے اور غیر دلچسپ الفاظ موجود ہیں۔

بہت سے بہن بھائیوں اور بھرے پرے خاندان میں زندگی کے دن ماضی کی تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے جیسے کوئی بہت سے کنکروں کو سوپ میں ڈال کر پھٹک رہا ہے اور ہر کنکر سوپ کے دندانوں میں پنجے گاڑے جما ہوا ہو۔ سائیں سائیں لمبے لمبے پینگوں کی طرح زندگی گزرنے لگی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

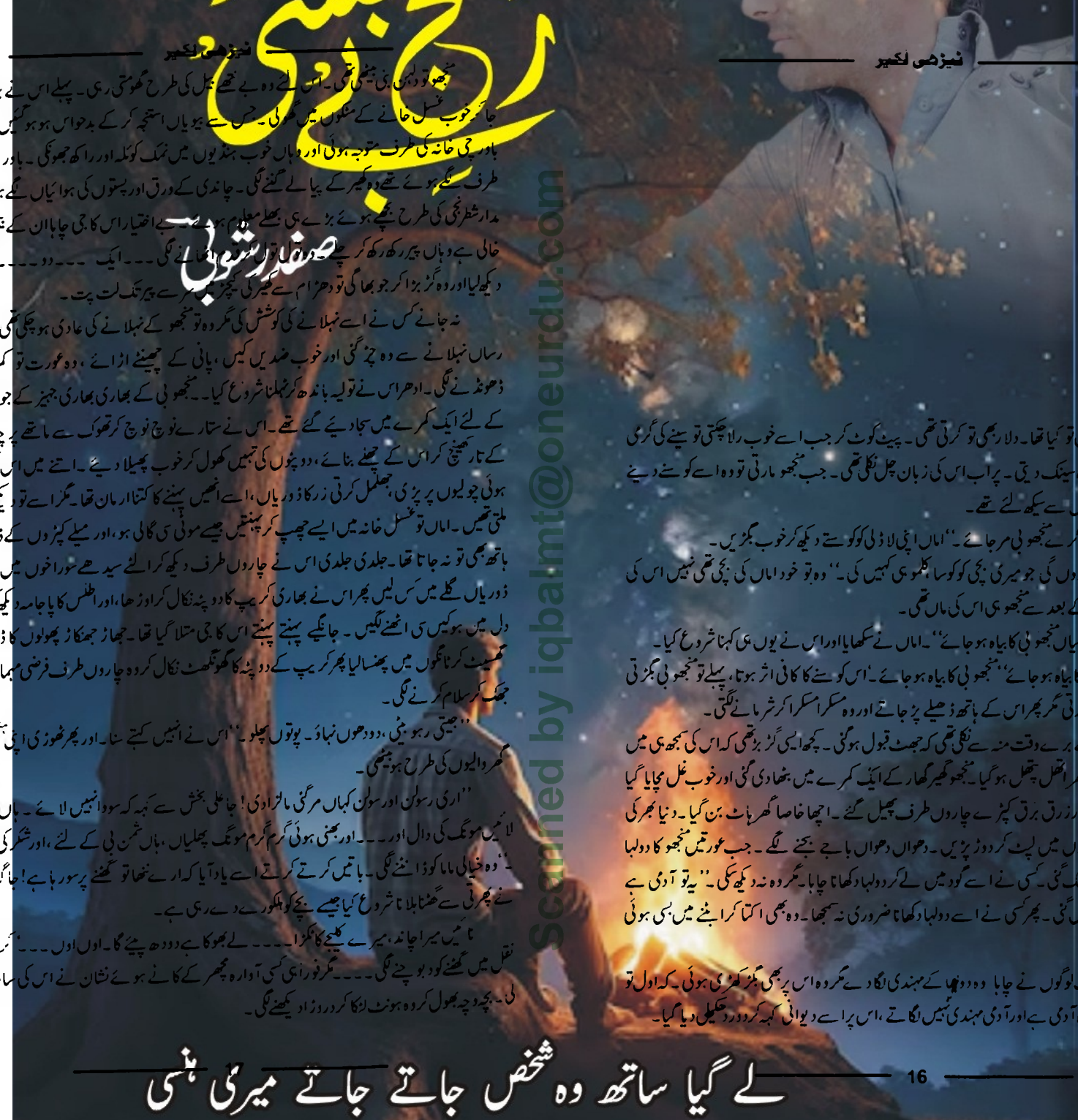

(3)

منجھو بی مارتی تھی تو کیا تھا۔ دلار بھی تو کرتی تھی۔ پیٹ کوٹ کر جب اسے خوب رلا چکتی تو سینے کی گرمی سے اس کے سارے زخم سینک دیتی۔ پر اب اس کی زبان چل نکلی تھی۔ جب منجھو مارتی تو وہ اسے کوسنے دینے لگتی جو اس نے نوکرانیوں سے سیکھ لئے تھے۔

''مر جائے، اللہ کرے منجھو بی مر جائے۔'' اماں اپنی لاڈلی کو کوستے دیکھ کر خوب بگڑیں۔

''کھود کے گاڑ دوں گی جو میری بچی کو کوسا کلموہی کہیں کی۔'' وہ تو خود اماں کی بچی تھی نہیں اس کی بدمعاش انا کے جانے کے بعد سے منجھو ہی اس کی ماں تھی۔

''یوں کہو کہ اللہ میاں منجھو بی کا بیاہ ہو جائے''۔ اماں نے سکھایا اور اس نے یوں ہی کہنا شروع کیا۔

''اللہ میاں منجھو کا بیاہ ہو جائے'' منجھو بی کا بیاہ ہو جائے۔' اس کوسنے کا کافی اثر ہوتا، پہلے تو منجھو بی بگڑتی زور زور سے دھمو کے مارتی مگر پھر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ مسکرا مسکرا کر شرمانے لگتی۔

دعا نہ جانے کیسے برے وقت منہ سے نکلی تھی کہ جھٹ قبول ہو گئی۔ کچھ ایسی گڑ بڑ تھی کہ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر اتھل پتھل ہو گیا۔ منجھو گھیر گھار کے ایک کمرے میں بٹھا دی گئی اور خوب غل مچایا گیا۔ الٹی سیدھی مٹھائیاں اور زرق برق کپڑے چاروں طرف پھیل گئے۔ اچھا خاصا گھر ہاٹ بن گیا۔ دنیا بھر کی عورتیں لال ہرے کپڑوں میں لپٹ کر دوڑ پڑیں۔ دھواں دھواں باجے بجنے لگے۔ جب عورتیں منجھو کا دولہا دیکھنے دوڑیں تو وہ بھی بلک گئی۔ کسی نے اسے گود میں لے کر دولہا دکھانا چاہا۔ مگر وہ نہ دیکھ سکی۔ ''یہ تو آدمی ہے، دولہا۔'' وہ چلائی اور مچل گئی۔ پھر کسی نے اسے دولہا دکھانا ضروری نہ سمجھا۔ وہ بھی اکتا کر اپنے میں بسی ہوئی منجھو سے لپٹ کر سو گئی۔

رسموں کے وقت لوگوں نے چاہا وہ دولہا کے مہندی لگا دے مگر وہ اس پر بھی بگڑ کھڑی ہوئی۔ کہ اول تو وہ دولہا نہیں سیدھا سادہ آدمی ہے اور آدمی مہندی نہیں لگاتے، اس پر اسے دیوانی کہہ کر دور دھکیل دیا گیا۔

منجھو تو دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس لئے وہ بے نتھے بیل کی طرح گھومتی رہی۔ پہلے اس نے بری کی شکر لے جا کر خوب غسل خانے کے مٹکوں میں گھولی۔ جس سے بیویاں استنجہ کر کے بدحواس ہو ہو گئیں۔ اس کے بعد باورچی خانہ کی طرف متوجہ ہوئی اور وہاں خوب ہنڈیوں میں نمک کوئلہ اور راکھ جھونکی۔ باورچی کسی دوسری طرف لگے ہوئے تھے وہ کھیر کے پیالے گننے لگی۔ چاندی کے ورق اور پستوں کی ہوائیاں لگے ہوئے پیالے کا مدار شطرنجی کی طرح بچھے ہوئے بڑے ہی بھلے معلوم ہوئے۔ بے اختیار اس کا جی چاہا ان کے بیچوں بیچ جو جگہ خالی ہے وہاں پیر رکھ رکھ کر چلے۔ وہ تول تول کر قدم اٹھانے لگی۔۔۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین، کسی نے دیکھ لیا اور وہ گڑ بڑا کر جو بھاگی تو دھڑام سے کھیر کی کیچڑ میں سر سے پیر تک لت پت۔

نہ جانے کس نے اسے نہلانے کی کوشش کی مگر وہ تو منجھو کے نہلانے کی عادی ہو چکی تھی۔ یوں رساں رساں نہلانے سے وہ چڑ گئی اور خوب ضدیں کیں، پانی کے چھینٹے اڑائے، وہ عورت تو کمر بند کی لکڑی ڈھونڈنے لگی۔ ادھر اس نے تولیہ باندھ کر ٹہلنا شروع کیا۔ منجھو بی کے بھاری بھاری جہیز کے جوڑے دکھانے کے لئے ایک کمرے میں سجا دیئے گئے تھے۔ اس نے ستارے نوچ نوچ کر تھوک سے ماتھے پر چپکائے۔ سلمہ کے تار کھینچ کر اس کے چھلے بنائے، دوپٹوں کی تہیں کھول کر خوب پھیلا دیئے۔ اتنے میں اس کی نظر گوٹہ لگی ہوئی چولیوں پر پڑی، جھلمل کرتی زر کا ڈوریاں، اسے انھیں پہننے کا کتنا ارمان تھا۔ مگر اسے تو دیکھنے کو بھی نہیں ملتی تھیں۔ اماں تو غسل خانہ میں ایسے چھپ کر پہنتیں جیسے موٹی سی گالی ہو، اور میلے کپڑوں کے ڈبہ میں اس کا ہاتھ بھی تو نہ جاتا تھا۔ جلدی جلدی اس نے چاروں طرف دیکھ کر الٹے سیدھے سوراخوں میں ہاتھ ڈال کر ڈوریاں گلے میں کس لیں پھر اس نے بھاری کریپ کا دوپٹہ نکال کر اوڑھا، اور اطلس کا پاجامہ دیکھ کر تو اس کے دل میں ہوکیں سی اٹھنے لگیں۔ جانگیے پہنتے پہنتے اس کا جی متلا گیا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ پھولوں کا ڈھیر اس نے گھسیٹ کر ٹانگوں میں پھنسا لیا پھر کریپ کے دوپٹہ کا گھونگھٹ نکال کر وہ چاروں طرف فرضی مہمانوں کو جھک جھک کر سلام کرنے لگی۔

''جیتی رہو بیٹی، دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو۔'' اس نے انہیں کہتے سنا۔ اور پھر ٹھوڑی اپنی ہتھیلی پر ٹکا کر گھر والیوں کی طرح ہو بیٹھی۔

''اری رسولن اور سولن کہاں مر گئی مالزادی! جا علی بخش سے کہہ کہ سودا نہیں لائے۔ ہاں جلدی سے لائیں مونگ کی دال اور۔۔۔ اور بھنی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں، ہاں شمن بی کے لئے، اور شکر کی گولیاں بھی۔'' وہ خیالی ماما کو ڈانٹنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے اسے یاد آیا کہ ارے ننھا تو گھٹنے پر سو رہا ہے! جاگ گیا۔ اس نے پھرتی سے گھٹنا ہلانا شروع کیا جیسے بچے کو ہلکورے دے رہی ہے۔

نا میں میرا چاند، میرے کلیجے کا ٹکڑا۔۔۔ لے بھوکا ہے دودھ پیئے گا۔ اوں اوں۔۔۔' کرتا سرکا کر وہ نقل میں گھٹنے کو دبوچنے لگی۔۔۔ مگر فوراً ہی کسی آوارہ مچھر کے کاٹے ہوئے نشان نے اس کی ساری توجہ کھینچ لی۔ بچہ وچہ بھول کر وہ ہونٹ لٹکا کر دوڑ دوڑ ادیکھنے لگی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''کاٹ کھایا مری پینے نے!'' وہ اپنے گھٹنے پر چپتیں لگانے لگی۔۔۔اور پھر اسے کسی کو مارنے کا دورہ پڑ گیا۔ دھما دھم اس نے جہیز کی چیزوں کو دونوں ہاتھوں سے کوٹنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں کھیت کا کھلیان کر کے رکھ دیا۔ لوگ آ گئے اور اسے یونہی گھسیٹ کر باہر نکال دیا گیا۔ اتنی فرصت کسے تھی جو اس کا پاجامہ ڈھونڈ کر پہناتا، لہٰذا شام تک وہ تولیہ لپیٹے ادھر اُدھر گھومتی رہی۔

مگر اسے ایک تجربہ ضرور ہوا کہ تولیہ پاجامے سے کہیں زیادہ آرام دہ اور مفید ہوتا ہے۔ ایک تو گھڑی گھڑی ڈھیلا کمر بند تنگ کرانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوسرے اس عجیب و غریب ہیئت میں دیکھ کر بہت سے بچے تو آتشِ رشک سے بھنے جا رہے تھے۔ دو چار اس تاک میں لگے تھے کہ تولیہ ہٹ جائے تو اسے ننگا دیکھ لیں۔ مگر وہ انھیں جوتیوں سے مار مار کر بھگا رہی تھی۔ اسے اس کھیل میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔

''ہم سو رہے ہیں، ہمیں جگانا مت!'' وہ بن کے سو جاتی اور بدذات بچے اس کا تولیہ چھیننے لگتے۔ پھر وہ جاگ جاتی اور خوب ناخنوں اور دانتوں سے ان کی تواضع کرتی۔

جدھر وہ نکل جاتی سب اسے ڈانٹتے۔ بہنیں چپتیں لگا کر دھتکار دیتیں۔ مگر کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ تالا کھول کر اس کا پاجامہ نکالے۔ خدا خدا کر کے جب شام کو دولہا کے آنچل یا کسی دوسری ضروری رسم کا وقت آیا تو اس کی تلاش ہوئی اور وہ پچھلے دالان میں عجیب و غریب کھیل کھیلتی ہوئی پکڑ کر ماری گئی۔

دولہا آیا، غل مچا، کسی نے اسے جوتا چھپانے کو دیا۔ بڑی دیر تک تو وہ اس جوتے سے کھیلتی رہی۔ پھر سو گئی۔ رات کو جب دولہا جانے لگا تو جوتے کی ڈھنڈیا پڑی۔ لوگوں نے اسے جگایا تو وہ بوکھلا کر ان سے لپٹ گئی کوئی خواب دیکھ رہی تھی بے تحاشا چلائی۔

''دونی۔۔۔ارے میرے دونی!''

کہتے ہیں دولہا ٹھوڑا ننگے پیر گیا۔ صبح کو جوتا پینے کے پانی میں لاش کی طرح پھولا ہوا ملا۔ خوب سمدھنوں نے اس کا شربت پیا۔ لاکھ لوگوں نے چاہا کہ وہ بتا دے کہ اس نے جوتا منگنے میں کس غرض سے ڈالا تھا مگر وہ کچھ بھی نہ بتا سکی۔

''جوتا؟۔۔۔منکا؟'' وہ یہی پوچھتی رہی مگر پھولا ہوا جوتا دیکھ کر اس کے دل میں گدگدی ہونے لگی اور وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

(4)

جب منجھو بیاہ کر جانے لگی تو ثمن ذرا بھی نہ روئی بلکہ چپکے سے پالکی میں جا کر بیٹھ گئی۔ منجھو جانے سے پہلے اسے یاد کرتی رہی مگر وہ نہ ملی۔ جب دلہن اور اس کے ساتھ والیاں پالکی میں بیٹھیں تو ان میں سے سب سے موٹی عورت ثمن کی گود میں چڑھ بیٹھی۔ وہ زور سے چلاتی مگر موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ضبط کر گئی اور موٹی عورت کے کولہوں میں کچکچا کر دانت گاڑ دیئے۔ ایک غدر مچ گیا، پالکی لوٹتے لوٹتے بچی، مگر ثمن پکڑی گئی لوگوں نے اسے گھسیٹ کر اتارنیا ہزار لاتیں چلائیں، کوسا، گالیاں بکیں، مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

منجھو بی چلی گئی، گھر میں جیسے موت ہو گئی! سارا گھر سو گیا مگر ثمن کے حصے کی نیند غائب تھی۔ کئی دفعہ وہ منجھو کو پکار پکار کر روئی، ہچکیاں لیتے لیتے حلق دکھ گیا۔ آواز پڑ گئی مگر کون سنتا؟

''منجھو بی۔۔۔۔منجھو بی ہائے منجھو بی!'' وہ رات بھر سسکیوں سے پکارتی رہی۔ شادی کے تھکے ہارے مہمان اور میزبان دنیا سے بے خبر سو رہے تھے اور وہ اکیلی ادھر سے اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔

منجھو کے جاتے ہی اس کی گت بن گئی۔ کئی دن تک تو کسی کو یاد ہی نہیں آیا کہ وہ بھی گھر میں ہے یا نہیں، نہلانے یا کنگھی کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ جب بہت ہی اس میں سے بساند پھوٹنے لگی تو سڑتی ہوئی نالی کی طرح لوگ اس سے دور دور رہنے لگے۔ میل اور کھجلی سے بے قرار ہو کر وہ راتوں کو چلاتی اور دن بھر کونوں کھدروں میں بھٹکتی پھرتی۔ تب اماں کو نہلانے کا خیال آیا۔

سر کے بال چپک کر چٹائی بن گئے تھے۔ اور بدن پر میل کی پپڑیاں بندھ بندھ کر اکھڑ رہی تھیں۔ تائین کے بس کی کہاں تھی۔ جب اس نے نہلانا چاہا تو اسے مارنے لگی، بال نچے تو اسے پچھاڑ کر ننگی بوچی بھاگی۔ دونوں میں بڑی دیر تک برآمدے میں ریس ہوتی رہی۔ ثمن آگے آگے اور تائین پیچھے پیچھے۔ آخر کو موری کے پاس پھسل کر گر پڑی۔ تائین نے پکڑ دھکڑ کر نہلا تو دیا مگر کیسا یہ وہ خود ہی جانتی تھی الجھے بال ویسے ہی میل اور چیکٹ کا جوتا بنے رہے، میل ذرا پانی ڈالنے سے پھول گیا اور میلے کپڑے کی رگڑ سے نمی دور ہو گئی۔ پلستر ویسا ہی جما رہا اور اس نے کپڑے پہن لئے پھر تو یہ حال ہو گیا کہ جس دن وہ نہاتی اماں موٹی سی قینچی لے کر بیٹھ جاتیں اور بچ مچ کی لاش نہلائی جاتی۔ کیونکہ ایسی ویسی مار کو وہ خاطر ہی میں کب لاتی تھی۔

دن بھر وہ منجھو کو بھولے رہتی مگر رات کو وہی منجھو بی کی رٹ لگاتی۔ تنگ آ کر اماں نے بوزھی دودا سے کہا ''بوا تم ہی سلاؤ اللہ ماری کو۔'' مگر ثمن نے سوتے میں انھیں اپنے پاس لیٹا دیکھ کر ان کے بال کھسوٹ ڈالے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اور دھکیل دیا۔ اکیلی پڑی اپنی ہتھیلیوں کو چبایا۔ جب سب سو جاتے، وہ جاگا کرتی، اس کے ہاتھ منجھو کی گردن کی تلاش میں کھری پٹیوں پر رینگا کرتے۔ اس کا جی چاہتا بس ایک دفعہ وہ نرم گرم گردن اس کی گرفت میں آجائے۔ پھر تو وہ مر جائے گی پر نہیں چھوڑے گی۔ پڑی پڑی وہ منجھو کے کمینے دولہا کو کوسا کرتی جو اسے چیل کی طرح جھپٹا مار کر چھین کر لے گیا۔ اور منجھو کے اس نابکار دولہا کو کوسنا بھی شاید خدا نے سن لیا اور ایک دن تار آیا اور گھر میں ماتم ہونے لگا۔ ''تمھارے دولہا بھائی مر گئے تم روتی نہیں؟'' تحصیلدارنی کے لڑکے نے اس سے کہا۔

''کون منجھو بی کا دولہا؟'' وہ خوشی سے چونکی۔

''نہیں بڑی آپا کے دولہا۔'' خاک پڑے بڑی آپا کے دولہا کے مرنے کا کسے ارمان تھا۔ بدمزاج کہیں کے پچھلی دفعہ گئے لائے تو سارے اماں کو بھجوا دیئے ایک پوری بھی نہ چھونے دی۔ اسے سخت ناامیدی ہوئی اور وہ رو پڑی سب سمجھے وہ غم میں شریک ہو رہی ہے اس لئے اور بچوں کے ساتھ بہلانے کو اسے تحصیلدارنی کے یہاں بھجوا دیا گیا، جہاں اسے بھنے ہوئے میٹھے انڈے کھلائے گئے۔

''جب منجھو بی کا دولہا مرے گا تو اس سے بھی مزیدار انڈے ملیں گے!'' وہ انڈوں کا مزہ دیر تک منہ میں قائم کرنے کی کوشش کر کے سوچتی رہی۔

بڑی آپا بیوہ ہو کر میکے میں آن رہی۔ اس کے دونوں بچے بھی آ گئے۔ جنھیں چھونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ کبوتری کے گھونسلے میں ہاتھ ڈالو تو کس زور کی ٹھونگ مارتی ہے ایسے ہی جب بڑی آپا کے بچوں کو کوئی چھوتا تو چنگھاڑتی ہوئی لپکتی۔

جب خدا خدا کر کے منجھو سسرال سے آئی تو ثمن کا مارے غصہ کے برا حال ہو گیا۔ وہ تو سمجھتی تھی جیسے وہ اس کے بغیر دیوانی کتیا بن گئی ہے۔ منجھو بھی میلی کچیلی چوہیا روتی بسورتی اترے گی۔ مگر اسے پہلے سے بھی موٹا اور زیادہ لال دیکھ کر اسے اپنی سخت ہتک محسوس ہوئی۔ جھوٹی کہیں کی! اماں کو لکھا کرتی تھی۔ ''مجھے اپنی ثمن بہت یاد آتی ہے۔'' خاک! یاد آتی ہوتی تو یوں طباق سا چہرہ نہ ہوتا۔ سر سے پیر تک ریشمی کپڑوں میں غرق، بجتے زیور، کانوں میں لمبے لمبے جھمکے، جنھیں بات کرتے میں وہ قصداً جھلاتی، اور ناک میں چمکتی ہوئی کیل، شرما کر بات کرتے میں وہ ہمیشہ اس کیل کو نزاکت سے آنکھ نیچی کر کے دیکھنے کا انداز، اور باریک ریشم کی جالی کا کرتا جس کے اندر سے گونے کی چولی بادلوں میں چھپے چاند کی طرح جھلملا اٹھتی۔

آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح سب کے گلے سے لٹکنے لگی۔ مگر اس نے ثمن کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ بدل بھی تو بہت گئی تھی۔ ساری پھول جیسی فراکیں مرجھا گئی تھیں اور جانگیوں کے بجائے اونگے بدوضع پاجامے پہننے لگی تھی۔ بڑی دیر بعد نہ جانے کیسے وہ اسے یاد آ ہی گئی۔

''ثمن کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا اور اس کے دل کو بڑی طرح ٹھیس لگی۔ اوہو تو اب بی منجھو اسے پہچاننے لگی بھی نہیں، یہ گھنٹہ بھر سے دروازے سے لگا کون ٹنگی باندھے اسے دیکھے جا رہا ہے؟ کس نے کئی بار

اس کا ریشمی دوپٹہ چھو کر متوجہ کرنے کی ناکام کوششیں کیں؟ اور یہ کون صبر کئے دیوار سے خاموش لگا کھڑا ہے ثمن نہیں تو پھر اور کون ہو سکتا ہے؟ مگر اسے ماں، بہنوں کے گلے لگنے سے فرصت ملے تو کسی اور کا بھی دھڑکتا ہوا دل ذرا سکون پائے۔ آپا کی لڑکی نوری کو تو آتے ہی کلیجے سے لگا لیا اور ثمن جیسے پچھل پیری کی چڑیل تھی کہ لوگوں کو نظر بھی نہ آئی۔

مگر پھر بھی جب منجھو نے اسے اپنے مہکتے ہوئے سینے سے لگایا تو اس کے دل کی ہزاروں سوتے پھوٹ نکلے اور سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی وہ اس کے شانے سے ٹک گئی۔

''جوئیں، جوئیں، اے ہے منجھو، موئی کے ہزاروں جوئیں بھری پڑی ہیں۔'' آپا اور اماں چلائیں اور منجھو نے ڈر کر اسے دور دھکیل دیا۔

''گندی ہے یہ بھنگن کی لونڈیا۔'' نوری اترائی اور منجھو کی گود میں چڑھ بیٹھی۔ منجھو پھر باتوں کے ریلے میں بہہ گئی اور کسی نے نہ دیکھا کہ ثمن دھکا کھا کر باہر چل دی اور چپکے سے سرک کر میلے کپڑوں کے گٹھر میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج وہ دل اور دماغ دونوں سے رو رہی تھی، کھارے کھارے آنسو میلے بدبودار کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ نہ جانے کب تک وہ پڑی روتی رہی، کسی کو یاد بھی نہ آئی۔ بچے دوڑ دوڑ کر منجھو کی لائی ہوئی مٹھائی کھا رہے تھے۔ نوری اب بھی اس کی گود میں ڈٹی اس کی چمپا کلی سے کھیل رہی تھی۔ منجھو نے گڑیا نکال کر اسے دی اور دوسری نکال کر ثمن کو پکارا۔

''نہیں ہم دونوں لیں گے۔'' نوری مچل گئی، ویسے ثمن اتنی ذلیل نہ تھی کہ منجھو کی گڑیا پر اس کی نیت بھٹکتی مگر جب دونوں گڑیاں نوری داب بیٹھی تو وہ ضبط نہ کر سکی۔ اس نے منہ پھیر لیا اور چھت میں لٹکے ہوئے جالوں کو دیکھتی رہی جس میں نیم مردہ مکھیاں جھول رہی تھیں۔ اس پر پھر دورہ سا پڑ گیا وہ دانتوں سے میلے کپڑوں کھسوٹنے لگی۔ بدبودار پاجامے، سڑی ہوئی بنیانیں اور بساندے کرتے، وہ غصہ میں ان سب کو نگل جانا چاہتی تھی۔

تھک کر وہ باہر برآمدے میں آ کر کونے میں بیٹھ گئی۔ آج اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نظروں سے غائب ہو جانے والی ٹوپی پہنے ہے، آزمانے کے لئے وہ کئی بار سامنے سے گزری مگر نہ منجھو نے اسے دیکھا اور نہ نوری نے، جو دونوں گڑیاں سمیٹے منجھو کے پلنگ پر بیٹھی تھی۔

منجھو کے پلنگ میں ابھی تک دلہنا کے دھندلے سے نشانات موجود تھے۔ تکیے وہی سرخ ساٹن کے جن پر جھاگ جیسے کڑھے ہوئے غلاف چڑھے تھے اور وہی کارچوبی گوٹ کی رضائی۔ نوری اس کے تکیوں پر سر اوندھائے قلابازیاں کھا رہی تھی۔ ثمن کا کتنا جی چاہا کہ جا کر نوری کو اتنے زور سے دھکیلے کہ وہ اندھے کنوئیں میں جا گرے اور پھر دونوں گڑیاں چھین لے۔

دیر تک بیٹھی منجھو کے مہندی لگے پیروں کو پلنگ کے نیچے سے جھانک کے دیکھتی رہی۔ لال لال پیر جس میں گھنگرو اور پازیب! اس کا گلا رقت سے بھنچ گیا، کاش وہ سب کی آنکھ بچا کر کسی طرح پلنگ کے نیچے رینگ کر

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

پہنچ جاتی اور ان دو گھنگروؤں کو آہستہ سے انگلی سے بجا کر دیکھتی جو اس کی حنا آلود ایڑی پر ہلکی ہلکی جنبشوں سے ناچ اٹھتے تھے۔ اتنے میں اسے نوری نے دیکھ لیا۔

'خالہ جان شمن مہترانی کی لڑکی ہیں یہ، انھیں نانی نے بھنگن سے دو پیسے کو لیا تھا' وہ تتلا کر بولی اور بڑی آپا نے پیار سے اس کے تھپڑ لگایا۔ منجھو نے مڑ کر اسے دیکھ لیا مگر وہ وہاں سے بھاگ آئی۔ پھر منجھو کا دولہا بھی گھر میں آ گیا۔ منجھو کچھ شرمائی کچھ اترائی باتیں کرتی رہی۔ دولہا کی آنکھیں شاید تیز تھیں اس نے شمن کا بھوت دیکھ لیا۔

''ارے بھئی یہ تمھاری بہن شمن کیوں الگ کھڑی ہے۔''

''ان کے جوئیں ہیں۔'' نوری نے جلدی سے اطلاع دی۔

''اے ہی، جوئیں ہیں۔ یہ تو بری بات ہے، چہ چہ۔'' شمن اور جل گئی یہ کم بخت کون ہوتا ہے چہ چہ کرنے والا۔

''بھئی یہاں آؤ۔'' اس نے پھر بلایا۔

''انھیں مت بلایئے، یہ بری ہیں ان سے کوئی بھی نہیں بولتا۔'' نوری دولہا کی گود میں بھی چڑھ گئی اور پھر دولہا نے منجھو سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اس نے چونک کر شمن کی طرف دیکھا۔ شمن سمجھ گئی اور پھر گرتی پڑتی بھاگی کہ اب اس کے ساتھ ہمدردی جتانے کی سازش ہو رہی ہے۔

پھر اندھیری کوٹھڑی میں جا کر اس نے منجھو بی منجھو بی پکارنا شروع کیا مگر بیکار، جیسے وہ کسی مردے کو قبر سے کھینچ بلانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو، منہ اوندھیائے وہ پڑی تھی کہ کسی نے زور سے ہاتھ جھٹک کر اسے چونکا دیا۔

''خبردار جو یوں میلی کچیلی منجھو کے کمرے میں گئی، مردار کہیں کی۔'' بڑی آپا نے بے رحمی سے اسے جھنجھوڑیاں دیں۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ کچکچا کر لپٹ ہی جاتی اور ان کی بوٹیاں ہی اڑا دیتی۔ مگر اس وقت تو کسی نے اس کے سارے احساسات پر چوٹیں مار مار کر سن کر دیا تھا۔ وہ سہم کر دوسری طرف جانے لگی۔ اتنے میں منجھو باہر نکل آئی۔

''شمن۔'' اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شمن کو بڑی بہادری سے کام لینا پڑا۔ ورنہ اس کے جسم کا رواں رواں کھنچ کر منجھو میں جذب ہو جانے کو تڑپ اٹھتا۔

''چل ادھر کم بخت کیا گت بنالی ہے، ذرا سے دنوں میں۔'' منجھو نے کس کس کے دو گھونسے جمائے۔ شمن پھوٹ پڑی۔ دکھ سے نہیں، ان توجہ بھرے گھونسوں کی لذت سے۔ اس کا جی دکھ اٹھا۔ گھسیٹتی ہوئی اسے غسل خانے میں لے گئی۔ شمن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، آنسو بے تاب ہو کر بہہ نکلے، گھٹے ہوئے بخار امڈ پڑے۔ منجھو کے گھونسے کی شیرینی جس کے لئے وہ ترس گئی تھی اس کی رگ رگ میں تیر گئی اور پھر گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں نے نہ صرف اس کے جسم پر سے بلکہ روح پر سے بھی میل کا غلاف اتار دیا اور اس لاش کو

دوبارہ جگا دیا جو بالکل اس کے اندر سڑ گل چلی تھی۔ خون سرعت سے دوڑنے لگا مچھلیاں پھڑکنے لگیں اور ذرا سی دیر میں وہ پرانی شمن کی طرح واویلا مچانے لگی۔

منجھو کو بھی جیسے بہت دن کی چھوٹی شراب ہاتھ آئی بس ٹوٹ ہی تو پڑی۔ پھر بال نوچ نوچ کر کنگھی کی اور سارا دن کھانا پینا چھوڑ کر اس کی جوئیں نکالیں، سب نے بہتیرا منع کیا مگر اس نے تو جیسے گرتے ہوئے مکان کی مرمت کرنا تھی۔ وہ بھی برسات سے پہلے پہلے۔ شام کو شمن کے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے بدن تو ہلکا ہوا ہی تھا جی ایسا ہلکا ہو گیا کہ وہ دھما دھم منجھو کے پلنگ پر قلابازیاں کھانے لگی۔ دھواں دھواں تکیوں کو پیٹ ڈالا اور رضائی کا تمبو تان کر لاتیں چلانے لگی۔

''ہیں، ہیں، پھٹ جائے گی رضائی! آپا چلائیں۔'' بس ذرا ڈھیل دی اور اترانے لگیں کم بخت بات کرنے کے لائق نہیں، نوری بھی تو ہے مگر یہ دیوانی حرکتیں نہیں کرتی۔'

شمن نے دیکھا نوری منجھو کے دولہا کی گود میں بیٹھی مینا کی طرح چہک رہی تھی۔ اس کا جی سلگ اٹھا بس چلتا تو وہ نوری کی بوٹی بوٹی کر کے پھینک دیتی۔ کمینی کہیں کی۔ ہر بات میں اماں بیٹیاں ذلیل کرنے آن مرتی ہیں۔ نوری گوری ہے وہ کالی، نوری نازک وہ بھدی۔ نوری ہنس مکھ شرمیلی، باتمیز اور پڑھنے میں تیز، وہ بدمزاج بدتمیز اور پھوہڑ، پڑھنے سے دم چراتی، نوری روز کا سبق قرآن شریف کا، جھٹ پٹ یاد کر سنا دیتی۔ شمن پر اس بات پر ہزاروں پھٹکاریں پڑتیں۔ وہ اپنا پچھلا سبق بھی بھول جاتی۔ نوری ننھی سی بدھنی سے چوکی پر بیٹھ کر وضو کرتی اور جائے نماز پر ماں کے برابر کھڑی ہو کر نماز پڑھتی لوگ واہ واہ کرتے۔ مگر شمن خوب جانتی تھی کہ اسے نماز خاک بھی نہیں آتی، کھڑی بدبد ہونٹ ہلایا کرتی ہے۔ اسے نماز کچھ زیادہ اچھی نہ لگتی تھی۔ ویسے گھر میں پڑھتا بھی کوئی نہیں تھا۔ بڑی آپا نے تو بیوہ ہونے کے بعد زوروں شوروں سے نماز پکڑی۔ دوسرے وہ عموماً نجس رہا کرتی تھی۔ اس لئے کوئی نماز سکھاتا بھی تو نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا، اس واپس پائی ہوئی منجھو کا کیا کرے۔ اس سے لپٹتے لپٹتے تو وہ تھک گئی تھی چھوتے چھوتے دل اکتا گیا تھا مگر پھر بھی بھوک باقی تھی۔

رات کو کھانے پر وہ ٹھنک ٹھنک کر منجھو ہی سے سب کچھ مانگتی رہی۔

''ہنک بوٹی۔۔۔ سالن گردہ۔۔۔ سینگ کی ہڈی لیں گے، نہیں مٹھائی۔ ہمارے مرچیں لگ رہی ہیں۔۔۔ تیچے سے کھائیں گے۔'' منجھو باتوں میں مشغول اس کی فرمائش ٹھیک طرح پوری نہیں کر رہی تھی اور جب شمن نے سالن کا ڈونگا جلے دسترخوان پر اوندھا دیا تو اس اور آپا میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔

''چلو اٹھو۔'' منجھو روتی رہی مگر بڑی آپا اسے گھسیٹ کر برآمدے میں پٹخ آئیں۔'' آواز نکالی تو دم گھونٹ دوں گی۔'' اگر کوئی اور ہوتا تو شمن اس سے لپٹ کر گھسونے لگتی۔ مگر آپا سے وہ ڈرتی تھی کیونکہ انھوں نے ایک دن ایسی بے دردی سے مارا تھا کہ اماں تک کے آنسو نکل آئے تھے۔ اس بے رحمی میں شمن کو ایسی کریہہ نفرت پوشیدہ نظر آئی تھی کہ وہ سہم گئی تھی۔ اس دن سے بڑی آپا کو بڑا فخر تھا کہ گھر بھر میں کسی کی نہیں سنتی مگر ان کی گھرکی سے شمن کانپ اٹھتی ہے اور فوراً کہنا مان لیتی ہے، مگر انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یوں کہنا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

مانتے وقت ثمن کی آنکھیں کسی خوفناک نفرت سے دہک اٹھتی ہیں، ایسے ہی جیسے پنجرے میں بند شیر سدھانے والے کے چابک سے ڈرتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جو خونی نفرت نظر آتی ہے اسے کچھ سدھانے والے کا جی ہی جانتا ہے۔ ایک ذرا دیر کو جو یہ ہنٹر ہاتھ سے چھوٹ پڑے تو کیا ہو۔ جب وہ اسے ڈانٹتی تو ثمن خاموشی سے انھیں ایسے دیکھتی کہ ان کا غصہ چوگنا ہو جاتا اور وہ اسے چباڈالنا چاہتیں۔

ثمن کھانے پر سے تو ہٹادی گئی تھی مگر منجھو کے پلنگ پر لیٹنے کا تو پورا پورا حق رکھتی تھی۔ وہ خاموش ضبط کیے لیٹی رہی کہ کہیں آپا بہانہ بنا کر اس کی جگہ نوری کو منجھو کے پلنگ پر نہ سلادے، اس کی یہ عادت تھی کہ ہر جگہ اپنی بیٹی کو ٹھونسے جاتی تھی لیکن جب اس سے کہا گیا کہ جا کر اپنے پلنگ پر سوئے تو وہ بگڑ گئی۔ ''نہیں، ہم تو منجھو کے پاس سوئیں گے۔''

''رہنے دو آپا یہیں سو رہنے دو، کیا ہے۔'' منجھو شرما شرما کر اپنی کیل دیکھنے لگی۔ ثمن نے سوچا کوئی اٹھا نہ دے۔ وہ جلدہ سے سوتی بن گئی مگر اسے واقعی نیند آ گئی وہ منجھو کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے سوتی رہی۔

رات کو جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے جلدی جلدی منجھو کی گردن ٹٹولنے کے لئے ہاتھ پھیلائے مگر ایک دم وہ رنج و ہیبت سے رو پڑی کیونکہ اس کا ہاتھ بجائے منجھو کی گرم گرم گردن کے پٹی پر بے کسی سے پڑا ہوا تھا۔ یہ تو اس کا اپنا پلنگ تھا جس سے اسے قبر سے زیادہ نفرت تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اور گھٹی گھٹی آواز میں منجھو کو پکارنے لگی۔

''چپ چڑیل، خبردار جو آواز نکالی۔'' پاس کے پلنگ سے بڑی آپا غرائی۔۔۔۔ اور اب وہ سمجھ گئی سوتے میں ظالموں نے اسے منجھو کے پاس سے اٹھا کر یہاں پھینک دیا۔ وہ جلدی سے منجھو کے کمرے کے پاس گئی، دروازے بند تھے اور اندھیرا گھپ تھا مگر منجھو کے ہنسنے اور دولہا کے کھسر پھسر کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''منجھو منجھو بی یہ میں ہوں، تمہاری ثمن۔۔۔ دروازہ کھولو۔'' منجھو بی کی ہنسی ایک دم رک گئی مگر دروازہ نہ کھلا۔

منجھو بی ثمن ہوں۔۔۔ دروازہ کھولو۔' وہ التجائیں کرنے لگی۔

''اے ہے چڑیل جان کو آ گئی ہے اس کی، ادھر چل۔ اگر اب پلنگ سے اٹھی تو بس کال کوٹھری میں بند کر دوں گی۔'' بڑی آپا نے اس کی بانہہ پکڑی اور بھگاتی ہوئی لا کر پلنگ پر پٹخ گئی۔

ثمن کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ خوف کی وجہ سے وہ دم گھونٹے سسکیوں سے روتی رہی۔ سب سو رہے تھے مگر اسے نیند نہ آئی۔ بڑی دیر تک رونے کے بعد چپ ہو گئی مگر سسکیاں نہ رکیں۔ اسے پلنگ پر لیٹنا دوبھر ہو گیا اور اٹھ کر صحن میں چلی آئی۔ جاڑے اچھے خاصے تھے مگر اسے بالکل سردی نہ لگی۔ آنگن میں نیم کا درخت بھوت کی طرح پر پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ تھوڑی دیر اس کے کھردرے تنے سے لگی اپنی ہتھیلیاں رگڑتی رہی پھر بغیر کسی ارادے کے مرغیوں کے ڈربے پر بیٹھ گئی۔ یہاں پھر آنسوؤں نے حملہ کر دیا اور گہری گہری سانسوں سے نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی۔ سنسان رات میں جب ہر چیز سوئی پڑی تھی اور سوائے مرغیوں کی کڑ کڑ کے بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ نہ آیا کہ اب کیا کرے۔ اتنے میں ایک بلی دیوار سے کودی، ڈربے میں

مرغیاں چونکی ہو کر کڑ کڑائیں، وہ اٹھ کر برآمدے میں واپس بھاگی، راستے میں ایک دم اس کی نظر کیاریوں پر پڑی جہاں دھنیا اور ساگ بویا ہوا تھا۔ اندھیرے میں بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالا کالا اون الجھا ہوا پڑا ہے۔ بڑی آپا کی کیاریاں!

آناً فاناً میں وہ بھوکی شیرنی کی طرح ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے کھسوٹنا شروع کیا۔ جیسے وہ اپنی کسی دشمن کی آنتیں نکال رہی ہو۔ اور پھر مٹھیوں میں لے کر اس نے زمین پر رگڑ ڈالا۔ مرچوں کے پیڑ، لوکی کی بیل، چنبیلی اور موگرے کے پودے، جس میں سے روز پھول توڑ کر آپا جوڑے میں لگایا کرتی تھیں، توڑ موڑ کر پیروں سے مسل ڈالے۔ اب اسے ہنسی آنے لگ جیسے کسی نے پچکاریوں سے تازہ تازہ خون اس کے جسم میں بھر دیا۔ آنسو بھری پھٹی پھٹی آنکھیں وحشت سے بھینگی ہو گئیں۔ گھنے بال ہوا میں سنپولیوں کی طرح لہرا رہے تھے اور وہ بالکل ایک چھوٹی سی مرگھٹ کی ڈائن معلوم ہوتی تھی، جو قبر کھود کر مردے کے کلیجے میں نا خون گڑو کرا سے دانتوں سے چبانا شروع کر دیتی ہے۔ وہ تھک کر شل ہو گئی اور اس کا جی بھی بھر گیا۔ اسے اب بھی بری طرح ہنسی آ رہی تھی۔ سوکھے سوکھے پاگل کتیا کے سے بھیانک قہقہے لگا رہی تھی۔

''بس، بس، اب ٹھیک ہوئیں۔'' اس نے تخیل میں کسی پر دانت پیسے اور پھر وہ وہیں زمین پر لوٹ گئی۔ منجھو نے آج اسے نہلایا تھا، بال سنوارے تھے تو بس اب اس کی یہی سزا ہے! اس نے بھر بھر مٹھیاں ریت کی اپنے بالوں میں ڈالیں، خوب کیاری کی کیچڑ میں قلابازیاں لگائیں، زمین پر تھوک کر ہتھیلیوں سے رگڑا اور پھر وہی ہتھیلیاں اپنے منہ اور گردن پر پھیر لیں۔ اس کا بس نہ تھا جو اپنے جسم کو آگ لگا کر بھسم کر دیتی تب تو منجھو کو پتہ چلتا۔ تھوڑی دیر میں اس کا جی ٹھہر گیا تو تھکن اور غصے کا آیا ہوا پسینہ خشک ہو رہا تھا، اور ہوا اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔

صبح جب نوکروں نے اسے کیچڑ میں لتھڑا ہوا کیاریوں کے پاس بے ہوش پایا تو خوف سے ان کی چیخ نکل گئی۔ ماما سمجھی اسے کسی نے قتل کر دیا کیونکہ اس کے سارے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ناک سے نکسیر پھوٹ کر ساری ٹھوڑی اور گردن پر خون جما ہوا تھا۔

چار پانچ روز تک اسے بخار کی وجہ سے ہوش نہ آیا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے سینے پر پلاسٹر جکڑا ہوا تھا اور منجھو بڑی پریشان بیٹھی تھی۔ اس کا جی خوش ہو گیا۔ بڑی آپا تک فکر مند نظر آ رہی تھیں اور رات رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی رہتی تھیں۔

پھر تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے دوبارہ کسی کے یہاں اکلوتی پیدا ہو گئی۔ خوب خوب ضدیں کرتی اور منجھو تو اسے اچھا ہونے پر اپنے ساتھ سلانے کا پکا قول دے چکی تھی۔ اس کا دولہا چلا گیا تھا اور وہ اس کے قریب ہی سوتی تھی۔ بیماری میں خوب لاڈ ہوئے، مگر وائے قسمت وہ بڑی تیزی سے اچھی ہونے لگی۔ بخار بالکل غائب اور کمزوری نام کو نہیں۔ بڑی آپا نے پھر نظر ٹیڑھی کر لی۔ انار اور انگور ملنے بند اور ساگودانہ بھی ختم۔ مگر اسے تندرست ہو کر سخت غصہ آیا۔ پڑوس میں چلا کی ماں رہتی تھی کیا مزے سے ہمیشہ بیمار رہتی تھی۔ کیا اللہ میاں کو اسے مرض دیتے بھی کنجوسی سوجھتی تھی! اسے اچھا ہونا پڑا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(5)

جب منجھو سسرال جانے لگی تو ثمن کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت نوری کی خوب کرکری ہوئی، بری طرح بلکی اور پچھاڑیں کھائیں۔ سب نے اسے مزید ادھوکہ دے دیا۔ پہلے تو سب نے کہا کہ ہاں بھئی نوری بھی جائے گی، مگر منجھو نے چپکے سے اسے بتایا کہ نوری کو پھسلا رہے ہیں۔ ثمن کو بڑا ہی مزا آیا۔ منجھو جانے لگی تو نوری پہلے ہی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ ڈری کہ بہلانے کے بجائے سچ مچ لئے جا رہے ہیں مگر گاڑی چلنے سے ذرا پہلے بڑے چچا نے نوری سے کہا:

''آؤ بیٹی نوری تمھیں مٹھائی دلائیں۔''

''نہیں نہیں، ہم مٹھائی نہیں لیتے۔'' نوری ایسے بہت چکھے سہہ چکی تھی۔

''بیٹی ہمارے لئے لے آؤ۔ سنگ لے چلیں گے۔'' منجھو بی بولی۔

''نوکری میں لے چلوگی خالہ جان؟'' نوری چہکی اور ثمن مسکرائی کہ آئی اب کمبخت بیچاری کی۔ جونہی نوری چچا کی گود میں گئی۔ گاڑی نے سیٹی دے دی۔ نوری دھاڑیں مارتی رہ گئی۔ ثمن کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد اسے بے اختیار نوری یاد آنے لگی۔ بیچاری نوری، دونوں چھتیں تو مزہ آتا۔

منجھو کا گھر اسے بالکل پسند نہ آیا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے اور چھوٹا سا صحن۔ منجھو کا دولہا اور منجھو کی ساس نے دیکھتے ہی ثمن نے بھانپ لیا کہ یہ دشمن کا مورچہ ہے۔ بڑھیا اسے شروع ہی سے بری لگی اس کے علاوہ منجھو کی ساس کا پوتا کندن بھی اسے قطعی پسند نہ آیا۔ لال چقندر رنگ اور نیلی نیلی بلے جیسی آنکھیں، کپا گال! ایک کمرے میں منجھو اور اس کا دولہا، دوسرے میں منجھو کی ساس اور کندن سوتے تھے، وہیں ثمن کا پلنگ بچھا دیا گیا۔ وہ اب کچھ کچھ سمجھ چلی تھی کہ منجھو سے دولہا کی موجودگی میں تو وہ کمرے میں سو نہیں سکتی۔ کبھی کبھی اسے تشویش ہوتی کہ آخر کیوں؟ مگر کبھی کسی نے اسے اطمینان بخش جواب نہ دیا۔

''نہیں، منجھو کے پاس نہیں سوتے!''

''کیوں؟'' وہ پوچھتی

''بس بک بک نہ کرو۔'' جواب ملتا اور وہ بک بک نہ کرتی۔

منجھو سے پوچھنے کی کبھی ہمت نہ پڑی، وہ کچھ بدل سی گئی تھی۔ اگر پاس بھی لٹاتی تو پہلے ہی سے کہہ دیتی۔

''دیکھ ثمن ہٹ کے لیٹیو، ہاں بھئی مجھے گرمی لگتی ہے۔'' وہ ویسے یونہی کبھی دکھاوے کو چمٹا بھی لیتی۔ مگر وہاں اب اسے گرمی نہ ملتی تھی جس کی کبھی وہ عادی تھی۔ اس لئے منجھو سے کبھی لاڈ نہ کرتی کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی مگر منجھو نے کبھی دھیان نہ دیا۔

ثمن کو قادر عرف کدن سے بھی اس لئے نفرت تھی کہ اس سے بڑا ہو کر پٹ لیتا تھا کیونکہ اسے لڑائی جھگڑے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ کبھی مذاق ہی میں ثمن اس سے کشتی لڑنے کو کہتی تو دبک جاتا۔ بس ہر وقت دادی بی کے پاس بیٹھا پان چبایا کرتا۔ کبھی سر دتے سے کھیل لیتا اور دوڑ دوڑ کر کام کرتا۔ بڑھیا کو تو ثمن نے شروع ہی سے ذلیل نہ دی۔ باوجود منجھو کی دھمکیوں کے اس نے انھیں دادی بی نہ کہا بلکہ ہمیشہ ''منجھو کی ساس'' ہی کہتی رہی جس پر بڑھیا جل اٹھتی اور منجھو سے اس پر ڈانٹ پڑواتی، پھر تو وہ اور ضد باندھنے لگی اور سوائے ''اے'' یا ''وہ'' کے کچھ نہ کہہ کر خطاب کرتی۔

کدن دادی کے ساتھ ساتھ چولہے کے پاس بھی گھستا۔ یہاں تک کہ وہ رفع حاجت کو جاتی تو باہر کھڑا جلدی نکلنے کے تقاضے کرتا رہتا۔ ثمن سے تو وہ پہلے ہی دن ڈر گیا تھا جب اس نے اس کی چھوٹی سی صراحی چھوئی تو وہ خونخوار بلی کی طرح جھپٹی اور گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ ایک دم جھجک کر بھاگ گیا تھا اور دادی بی کے کندھے سے لگ کر خوب رویا تھا۔

کدن کی بھی ایک کیاری تھی جس میں اس نے پودینہ اور کپاس بو رکھی تھی اور ثمن کی کیاری میں سیمیں بوئی ہوئی تھیں۔ کدن کی کیاری پر بڑھیا دولت کا سانپ بن کر پہرہ دیتی۔ کیا مجال جو کوئی چھو بھی جائے۔ ایک دن بڑھیا نے جان بوجھ کر ثمن کی کیاری سے دھنیا توڑ لینا چاہا۔

''کدن کی کیاری میں سے توڑو ہماری کیاری میں سے نہیں۔'' وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر کیاری کے آگے کھڑی ہو گئی۔

''اے بیٹی ذرا سا لوں گی، کدن تو روئے گا۔''

''نہیں۔'' اس نے کچھ ایسے زور سے بڑھیا کو ڈانٹا کہ وہ ذرا کر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

کچھ ہی دن میں وہ منجھو کے گھر سے تھک گئی۔ اسے رہ رہ کر اپنا گھر یاد آتا۔۔۔ نوری، بڑے بھائی اور منجھلے بھائی۔۔ وہ تو اسے اتنا مارتے بھی نہ تھے پر اس کے موٹے موٹے گال خوب نوچتے تھے۔۔۔ بڑی آپا البتہ ٹیڑھی کھیر تھیں۔ لیکن ان سے ناطہ رکھنے کی ایسی ضرورت ہی کیا تھی مگر یہاں تو بڑھیا اور کدن دو جنیں،

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

جن سے اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔

منجھو تو دوپہر کو کمرہ بند کر کے سو جاتی اور اس کی ساس دالان میں بیٹھی دالیں وغیرہ چنا کرتی۔ شمن پاگلوں کی طرح کیاریوں کے پاس ٹہلتی یا مرغیوں کو آنگن میں دوڑاتی، کبھی باورچی خانہ میں جا کر آلو بھوننے لگتی، پھر ان سب باتوں سے بھی دل گھبرا جاتا تو وہ خاموش منڈیر پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتی اور سنسان سڑک پر سوکھے ہوئے پتوں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے دیکھا کرتی۔ پاس ہی درختوں پر بندر اچھل کود میں مشغول ہوتے۔ اس ڈال سے پینگ لے کر اس ڈال پر، جیسے سرکس میں نٹ جھولتے ہیں۔ ایک دم سے کسی بندر کا ہاتھ چوک جاتا اور وہ پھد سے دیوار پر آن گرتا تو شمن ہنستے ہنستے دہری ہو جاتی۔ کاش وہ بھی بندر ہوتی۔ ان میں منجھو کی ساس اور کدن سے تو زیادہ انسانیت ہوگی، یہ نہیں کہ ہر وقت بس دال بین رہے ہیں یا گیہوں پھٹک رہے ہیں۔ اور وقت ملا تو لال پیلے چیتھڑوں کو جوڑ کر جھاڑ جھنکار بلائیں سی جا رہی ہیں۔

ایک دن کدن نے اپنی رنگین شیشے کی گولیوں کا ڈبہ نکالا اور بولا۔

''آؤ شمن کھیلیں۔''

شمن اسے منہ تو نہ لگاتی مگر لال ہری گولیوں کو دیکھ کر اتر آئی۔ بڑی دیر تک وہ ایک ایک گولی آنکھ سے لگا کر اس میں دوڑتے ہوئے رنگ دیکھتی رہی جیسے قوس وقزح کی جھاڑو سے ان کے اندر کسی نے دائرے کھینچ دیئے ہوں۔ ایک تو بالکل ایسی تھی جیسے ریشم کا پھندنا شیشے میں بند کر دیا ہو اور دیکھتے دیکھتے وہ پھندنا زندہ کیڑے کی طرح رینگنے لگتا۔

''کدن آؤ ان گولیوں کو کیاری میں بوئیں۔''

''کیاری میں؟''

''ہاں پھر پیڑ اگیں گے تو ہزاروں گولیاں بیروں کی طرح لگیں گی، اور جناب بس پھر اپن توڑ توڑ کر جمع کر لیں گے، ہاں۔''

''پردادی بی ماریں گی جو!''

''ہونہہ، دادی بی کو کیا پتہ چلے گا۔ ہاں مگر جب پیڑ اگیں گے تو بس خوشی کے مارے وہ مر جائیں گی۔ دیکھ لینا ہاں۔''

''تو چلو''۔۔۔ کدن آج بنا دادی بی کے ہی کچھ کرنے کو تیار ہو گیا۔ شمن کو اس پر کچھ یونہی سا پیار آنے لگا۔ گولیاں بو کر انھوں نے خوب سا پانی ڈالا اور گھٹنوں پر کہنیاں رکھ کر انتظار میں بیٹھ گئے۔ شمن کو گولیاں اگتے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب اس نے دھنیا بویا تھا تو صبح ہی صبح کیاریوں کو دیکھنے گئی تھی مگر کلّہ بھی نہ پھوٹا تھا۔ اسے ڈر لاگا کہ کہیں دھنیہ خراب تو نہیں تھا۔ لیکن تیسرے چوتھے دن اس نے دیکھا باریک باریک کپاسی رنگ کے ٹانکے زمین پر اٹھے ہوئے تھے۔ ننھے ننھے کنڈے زمین کا سینہ چیر کر باہر نکل آئے تھے، ان میں سے دو چار تو بالکل ہی جھکے ہوئے تھے۔ جیسے کوئی ان کی گردنیں پھنسائے ہوئے کھینچ رہا ہو۔ ان کی کمروں پر بڑا زور پڑ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

رہا تھا۔ شمن نے چاہا تنکے سے انھیں سہارا دے کر ان کے سر چھڑا دے مگر وہ کٹ سے بیچ میں سے ٹوٹ گئے۔

اس کا دل اس روز کسی کام میں نہ لگا اور وہ کیاریوں کے پاس بیٹھی ان کلّوں کے زمین سے ابھرنے کی کشمکش دیکھتی رہی۔ کچھ تو جب وہ ناشتہ کرنے گئی نکل آئے اور کچھ ابھی کشتی لڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو بالکل زندہ کیڑے کی طرح باہر کو اپنا نازک جسم کھینچ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بل میں سے سنپولئے کی طرح نکل آیا۔ شمن نے ٹھنڈی سانس لی، جیسے کلے کا سارا زور وہی لگا رہی تھی۔ کلے کی ناک میں دھنیے کے چھلکے کا بلاق لٹک رہا تھا جو تھوڑی دیر میں اس نے جھٹک کر پھینک دیا اور دوپہر تک تن کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ فتح مند سپاہی کی طرح پھیلا دیئے۔

آج وہ گولیوں کے کلے کا پھوٹنا دیکھے گی۔ چکنے چکنے کانچ کے پچرنگے حلقے جیسے چوڑی موڑ کر کنڈا بنا دیا ہو۔ وہ ان کنڈوں کو پرو کر ہار بنائے گی۔ نہیں نہیں پھر پیڑ کیسے بڑھیں گے اور پھر جامنوں کی طرح رنگ برنگی گولیوں کے گچھے اس کی آنکھوں کے سامنے جھومنے لگے۔

تیسرے پہر تک تو کلے پھوٹے نہیں، پھر اسے نیند آ گئی جب شام کو وہ اٹھی تو اس کا کلیجہ پھٹ گیا منجھو کی ساس مصالحہ پینے کے پیالے میں بیٹھی گولیاں دھو رہی تھی۔ ہیں! شاید چڑیل انھیں گوشت میں بگھارنے جا رہی ہے۔ شمن اس پر پل پڑی۔

اس کے بعد نہایت ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ اس نے منجھو کی ساس کی کلائی چبا ڈالی اور منجھو نے اس کا منہ چانٹوں سے توڑ کر رکھ دیا۔

آج اس کا دل و دماغ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ہونہہ گولیاں میری نہیں بوئی جاتیں۔۔؟ اس کا بس چلے تو منجھو کی ساس اٹھا کر بو دے، اور پھر وہ یہ سوچنے لگی۔۔۔ اس نے گڑھا کھود کر منجھو کی ساس کو بو دیا ہے۔۔۔ دوسرے دن کلا پھوٹ رہا ہے۔۔ بھورا بھورا چیتوں دار۔۔۔ سپیرے ٹوکریوں میں اژدہا لیے پھرتے ہیں نا۔۔ بالکل ویسا۔۔۔ شمن خوشی سے دیوانی دیکھ دیکھ کر مری جا رہی ہے۔ پھر وہ بڑھتا بڑھتا نیم کے پیڑ سے اونچا ہو گیا اور نمکولیوں کی طرح گچھے کے گچھے مرگھلی سڑی ہوئی سبزی بڑھیوں کے لٹکنے لگے۔ ایک لمبا بانس لے کر وہ انھیں جھاڑنے لگی۔ جیسے پکی پکی املیاں۔ سارا آنگن بڑھیوں سے پٹ گیا۔ ہزاروں، لاکھوں، کھانستی، چھینکتی بڑھیاں کوئی پاندان کھولے جلدی جلدی پان لگا رہی ہے، کوئی چوکی پہ بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہے، آٹھ دس باورچی خانہ میں گھسی ہنڈیوں کا ناس مار رہی ہیں۔ دو چار اچار کی منکیوں کے پاس پھدک رہی ہیں۔ منی منی ککڑیوں کے برابر بڑھیاں سارے گھر میں اودھم جوت رہی ہیں اور وہ ایک دم ان بڑھیوں سے گھبرا اٹھی اور دونوں ہاتھ سے انھیں دور دور کرنے لگی۔

شکر ہے جو اس نے بڑھیا کو بونے کا خیال جلدی پرے کر دیا۔ ورنہ غضب ہو گیا تھا، ایک ہی بڑھیا نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اسے کدن پر بھی بہت غصہ آیا کہ اس نے اپنی چہیتی کو بتا کیوں دیا۔ جی چاہا ناخنوں سے اس کی گنجی بلو سے جیسی آنکھیں نکال کر گولیوں کی جگہ بو دے۔

(6)

اسے آہستہ آہستہ منجھو سے اور نفرت ہونی شروع ہوئی، یہاں تک کہ اس کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب اسے قابل اعتراض لگنے لگا۔ وہ روز بروز موٹی اور کاہل ہوتی جاتی۔ بڑھیا ساس ماما کی طرح اس کے آگے پیچھے لگی رہتی۔ مگر اس کا منہ کسی وقت سیدھا نہ ہوتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ منجھو پیلی پیلی مٹی کا ٹکڑا چبا رہی ہے۔ شمن کا دل دہل گیا، اسے یاد تھا کہ جب وہ خود مٹی کھایا کرتی تھی تو سانپ پیدا ہو گیا تھا اور اب منجھو مٹی کھا رہی ہے۔

''منجھو بی مٹی کھاتی ہے۔'' اس نے چپکے سے کدن سے کہا۔

''کون، میری چچی؟''

''ہاں، اور جبھی تو اس کا پیٹ پھول گیا ہے، دیکھ لینا اس کے پیٹ میں سے ایک دن یہ بڑا سانپ نکلے گا۔'' کدن نے دادی سے جڑ دیا۔

''دادی بی، شمن کہتی ہے چچی کے پیٹ میں سے سانپ نکلے گا۔''

''خاک پڑے شمن کے منہ پر، کیوں رے، منع کیا کہ اس دیوانی سے مت بولا کر مگر سنا نہیں تو نے ۔۔۔ لو بھلا بہن کے لئے مراثن ایسی باتیں منہ سے نکالتی ہے۔'' بڑھیا گھنٹوں بیٹھی بڑبڑاتی رہتی۔ مگر شمن کی فکر نہ گئی۔ وہ چھپ چھپ کر منجھو کا پیلا اترا ہوا چہرہ اور مریل جسم دیکھا کرتی۔ اسے اس کے پیٹ میں موٹے موٹے پھنکاریں مارتے ہوئے سانپ بل کھاتے نظر آتے۔ پھر اسے منجھو سے اور نفرت ہو گئی۔ مگر کسی کو اس کے متعلق فکر نہ تھی بلکہ بڑھیا تو اور خوش نظر آتی تھی کہ مزے سے سارے گھر میں اسی کا راج ہے، وہ جان بوجھ کر اس کے لئے سڑی سڑی مرچوں دار نقصان دہ چیزیں پکاتی اور خود گھی شکر چرا کر کھاتی۔

اس کی اماں آئیں اور منجھو ایک دن بہت زور سے بیمار پڑی۔

''کدن آج دیکھ لینا۔ تمہاری دادی بی سچ کہتی تھی یا ہم ۔۔۔ اتنا بڑا سانپ ہے کہ کیا بتائیں۔ جبھی تو منجھو بی رو رہی ہے بے چاری۔''

''چچا تو دورے پر گئے ہیں۔ کون مارے گا سانپ کا۔''

''تھانے میں سپاہی جو موجود ہیں جناب۔'' اس نے نہایت اطمینان سے کہا اور سپاہیوں سے نہایت رازدارانہ انداز میں بولی۔

''تم اپنی بندوقیں لے چلنا، اچھا''

''کیوں؟'' داروغہ جی نے اس سے پوچھا۔

''سانپ مارنے کے لئے، ہماری بہن جو ہیں نا منجھو بی، ان کے پیٹ میں سانپ ہے، اب نکلنے ہی والا ہے۔''

داروغہ جی نے سور کی طرح تھوتھنی اٹھا کر کھوں کھوں ہنسنا شروع کر دیا۔ دو چار سپاہی بھی ہنسنے لگے۔

رات کو ایک دم جو شمن کی آنکھ کھلی تو گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آ رہی تھی اور منجھو کے کمرے میں غدر مچا ہوا تھا۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف بھاگی، دو چار عورتوں نے اسے پکڑ کر دبوچ لیا۔ مگر وہ منجھو بی ہائے منجھو بی کی رٹ لگائے رہی۔ معلوم ہوتا تھا باہر بھی سارے سپاہی ایک دم جاگ اٹھے اور ٹھائیں ٹھائیں بندوق چلنے لگیں۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔

''کیا مر گیا؟'' اس نے ایک عورت سے پوچھا

''کیا؟ کون؟''

''سانپ۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''اری بیٹی، اس سے کیا سر مار رہی ہے، یہ دلہن کی بہن ہے، موئی دیوانی۔'' منجھو کی ساس نے کہا اور بھاگی کسی کام کو۔ آج وہ بڑی اترائی ہوئی پھر رہی تھی۔ اتنے میں اس کی اماں باہر نکلیں، وہ بھی سٹپٹائی ہوئی تھیں۔ ''اماں، منجھو بی'' اس نے سسکی روک کر پوچھا۔

''اچھی ہے منجھو بی، چل منا سا بھانجا تو دیکھ۔'' آج اماں خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں۔ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔

''اف!'' حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ننھا منا سا چینی جیسا بوا ایک عورت کی گود میں رکھا تھا۔ منجھو بی چپکی پڑی تھی۔

''اور سانپ'' اس نے ڈرتے ڈرتے اماں سے پوچھا۔

''چل پگلی۔''

''یہ منا کہاں سے آیا'' اس نے دوسرے دن پوچھا۔

''یہ جو میم صاحب تھیں نا وہ منجھو بی کے لئے لائی تھیں ۔۔۔''

''اچھا ۔۔۔ تو اماں ایک ہمیں بھی منگا دو ۔۔۔ منجھو کی ساس تو اسے چھونے نہیں دیتی۔''

''اچھا منگا دوں گی۔'' اماں نے کہا اور دو چار عورتیں ہنس پڑیں۔

''تو پھر سانپ یقیناً سپاہیوں نے مار ڈالا جبھی ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں چلی تھیں، اچھا۔''

مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی کلوٹی میم صاحب اتنا سفید بچہ کہاں سے اڑا لائیں۔

دوسرے منجھو بی تو بالکل پچک کر رہ گئی تھی۔

''دو اور دو چار!'' اس نے حساب لگا لیا مگر ہے ضرور کچھ گڑبڑ!

اب منجھو بی کے یہاں اس کا قطعی دل نہ لگا اور وہ اماں کے ساتھ گھر چلی آئی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(7)

منجھو بی کے یہاں سے واپس لوٹی تو ایسا محسوس ہوا گویا اسے ہمیشہ کے لئے دفن کر آئی مگر تعجب ہے اسے ذرا بھی افسوس نہ تھا۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اتنا چھینکا کہ بالکل ہی کنگال کر دیا۔ اچھا ہی ہوا ایک روگ سے دور ہو گیا۔ یہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب منجھو اسے نہیں مل سکتی۔ اسکے حصول کے لئے جان تجی اتنی ہی فضول ہے جتنی پتھر میں جونک لگانے کی کوشش۔

بیوہ ہو کر بڑی آپا مستقل طور پر میکے آن رہی تھیں۔ وہ ثمن کی نگراں بن گئیں۔ اماں کو تو دنیا کا بس ایک کام آتا تھا اور وہ بچے پیدا کرنا۔ اس کے آگے نہ انھیں کچھ معلوم اور نہ ہی کسی نے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ ابا جان کو بچوں سے زیادہ بیوی کی ضرورت لاحق۔

ثمن کو بڑی آپا پر کبھی بھروسہ نہ ہوا، ویسے تو برابر یہی جتاتیں کہ انھیں ثمن کی بہتری مقصود ہے اور اس کی عاقبت سدھارنا چاہتی ہیں۔ لیکن اصل میں اسے نوری کے لئے درس عبرت دینے کا بہترین آلہ بنا رکھا تھا۔

''کہنا نہیں مانو گی تو ثمن کی طرح پھٹکاریں گے سب۔''

''نہاؤ گی نہیں تو ثمن کی طرح جوئیں پڑ جائیں گی۔''

''پڑھو لو نہیں تو ثمن کی طرح جاہل رہ جاؤ گی۔''

''پھر تم نے ثمن کی طرح ضد کی۔''

''ثمن کی طرح جھوٹ بولنا خوب آتا ہے''۔۔۔اور

''یہ ثمن ہی تمھیں بگاڑتی ہے، خبردار جو اس کے ساتھ کھیلیں۔''

یہی نہیں وہ آگے بھی نہ چوکتی، اماں جان پر طعنے کسے جاتے۔

''بھئی میں اماں تو ہوں نہیں جو تمھیں بھی۔۔۔''

''مجھے اماں جیسے چونچلے تو آتے نہیں۔'' وہ کہتیں حالانکہ دونوں بچوں کو تجی آم کی طرح ہر وقت چوما چاٹا کرتیں۔

اس پر ثمن کی اماں شرمندہ اور کھسیانی ہو کر اس کی موت کی دعائیں مانگتیں۔ خیر ان کی زندگی کو سہارا یہ فخر تو تھا کہ اتنی الابلا کے ساتھ انھوں نے بڑی آپا جیسی ہیرا سی بیٹی بھی تو جنی۔

مگر یہ ہیرا سی بیٹی اٹھتی جوانی میں رانڈ ہو گئی۔ دو بچے مرحوم نے اپنی نشانی چھوڑے جنہیں وہ چیل کی طرح نگہبانی کر کے پال رہی تھی۔ بچے کیا تھے تہذیب اور فرمانبرداری کے دو چرخے تھے، سوت پر سوت کات لو کیا مجال جو تکلا ٹیڑھا ہو جائے۔ روز صبح اٹھ کر کھٹا کھٹ سب کو سلام کرنا، کوئی مہمان آئے تو فوراً سے خالہ، ممانی، چچی، دادی، حسب حیثیت و عمر خطاب دینا۔ جھٹ پٹ۔۔۔''آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ'' اور۔۔۔ ''لب پہ آتی ہے دعا'' سنانا اور پھر

''نوری ناک کو کیا کہتے ہیں''

''نوز''

''کان کو؟''

''ائیر''

''دانت کو؟''

''چیک''

''نہیں بھئی چیک تو گال کو کہتے ہیں، دانت کو۔۔۔؟''

''ٹیتھ'' منو جلدی سے بولتا۔

''شاباش، بھئی واہ، بھئی واہ''۔۔۔مہمان مست ہو کر جھوم اٹھتے۔

''اچھا چلو اب ٹونکل ٹونکل سناؤ۔۔۔کرسی پر کھڑی ہو کر اور بھئی اشارے کرتی جانا۔''

پھر نوری کرسی پر بندریا کی طرح پھدک پھدک کر انگریزی گانے سناتی اور منو جسم کے مختلف حصوں کی انگریزی بتاتا۔ حالانکہ اس وقت اس کی تمام تر توجہ ان لڈوؤں پر ہوتی جو مہمان کے سامنے رکھے ہوتے اور اس کا ہاتھ کمر بند سے کھیلتا ہوتا۔

''بس جاؤ اب کھیلو۔'' اور وہ کھیلنے چلی جاتی۔

بڑی آپا غریب کی زندگی کا سہارا یہ دو ننھی ننھی جانیں ہی تو تھیں اور اس کی زندگی میں رہ ہی کیا گیا تھا سوائے آہوں اور سسکیوں کے۔ یہ عمر اور رانڈ پا؟ مگر وہ اب پہلے سے بھی زیادہ بدمزاج ہو گئی تھی گویا بیوہ ہو کر وہ بڑا تیر مار آئی تھی۔ چوڑیاں اور رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تو یہ سب لوگوں پر احسان نہیں تھا تو کیا تھا۔ رنڈاپے میں زندگی کے دن گزار کر وہ مرے ہوئے میاں کے ساتھ ساتھ جیتے جاگتے۔ ساس سسر اور ماں باپ کا بھی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

سوگ کر رہی تھی۔ جب کوئی خوشی کا تہوار آتا وہ اپنا ناٹک شروع کر دیتی، ایک کونے میں منہ لپیٹ کر پڑ جاتی اور بین شروع کر دیتی۔ جلدی سے گھلی ہوئی مہندی پھنکوا دی جاتی، چوڑی والی کو ہش ہش کر کے ٹال دیا جاتا، سویوں کا زردہ پکنا ملتوی ہو جاتا، عید کی چونی ایسے مل جاتی گویا اماں پہ قرض آتا تھا یا وہ اپنی جان کا صدقہ دینے پر مجبور ہیں۔

مگر بن باپ کی معصوم بچی نوری کے خوب لاڈ ہوتے۔ اس کے بہانے خوب مہندی گھلتی اور اس کے ہاتھوں پر بیل بوٹے بنائے جاتے مگر شمن کے مہندی لگانے کے خیال کو اس قدر فضول اور حقیر سمجھا جاتا کہ وہ خود لگوانے سے انکار کر دیتی۔

''بری لگتی ہے ہمیں کیچڑ جیسی مہندی'' وہ نفرت سے کہتی۔

''واہ بھئی جب ہاتھ دھوڈالو تو کیسے پیارے لگتے ہیں۔'' نوری اپنے لال ہاتھوں کو دیکھ کر کہتی۔

''ہونہہ، گنواریوں جیسے لال ہاتھ، جیسے پان کی پیک لتھیڑ دی ہو، ہمارے تو میموں جیسے صفا ہاتھ۔'' گو وہ خوب جانتی تھی کہ میموں کے ہاتھ قطعی اتنے گندے اور کالے نہیں ہوتے۔ لیکن جب وہ ایسی باتیں کرتی تو بچاری نوری کی مہندی کا مزہ بھی کرکرا ہو جاتا اور یوں اس کا جی کچھ ٹھنڈا ہو جاتا۔

کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ بڑی آپا رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تھی تو اس نے بالکل سنیاس ہی لے لیا تھا۔ اس کے سفید کپڑوں میں بھی وہ رنگینیاں ہوتیں کہ وہ کھل اٹھتی اور ایک دفعہ تو نئی دلہن کا سہاگ کا جوڑا بھی ماند پڑ جاتا۔ سفید کریپ یا شفان کا دوپٹہ جس پر بے چاری بیوہ نازک سی بمبئی کی بیل چپکا لیتی، سفید چکن کار گے کا کرتا، سارا گلا مہین مہین بیلوں اور ریشمی ڈوریوں سے آراستہ، قدم قدم پر ستاروں کے جال اور موتیوں کے۔۔ پھندنے۔۔ ہاں پجامے پر رنڈاپا اتارنے کی ضرورت نہیں، سبز کاہی یا آسمانی پوت کا جھولدار پجامہ ہاتھوں میں وہی رنڈاپا اتارتے وقت جو ماموں نے دو دو نازک سی بانکیں ڈال دی تھیں، پڑی ہوئی تھیں اور مرنے والے کی نشانی زمرد کی انگشتری اور بس۔ ہاں منجلی بوا اگر کبھی زبردستی آویزے پہنا دیتی تو خیر ورنہ سوتی ہی سہی۔ مانگ کی تو بے چاری کو اجازت نہ تھی، ویسے کون روکتا تھا، مگر اس کا اپنا ہی دل مردہ ہو گیا تھا اس لئے بال اوپر چڑھا کر پھولے پھولے گچھے کانوں پر چھوڑ دیتی۔ بس اتنے نیچے کہ کانوں کی لوئیں جھانکتی رہیں۔ روتے روتے آنکھیں خراب ہو گئیں تھیں۔ اس لئے کہیں آتے جاتے وقت سنہری زنجیر والی عینک لگا لیتی تھی۔

پر جب بڑی آپا رنڈاپے میں یوں بج دھج کر نکلتی تو لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے۔۔۔ ''ارے وہ تو سادے کپڑوں میں پھوٹی نکلی ہے۔'' ایک دفعہ بوا منجلی کا پیغام لائیں تو بیویاں بڑی آپا کو دیکھ کر اس پر پھیل پڑیں۔

اماں نے کہا ''لو اور سنو، وہ نگوڑی تو بیوہ ہے۔'' بڑی آپا فخر یہ اس غلط فہمی کا ذکر کیا کرتی کہ لوگ اس دو بچوں کی ماں کو کنواری سمجھ لیتے تھے۔ اس کا منہ تھا بھی تو کچا کچا کنواریوں جیسا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

جونہی کوئی آپا کے دولہا کا ذکر کرتا اماں ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتیں اور الٹی سیدھی مرنے والے کی تعریفیں شروع کر دیتیں۔

''زبان تو نگوڑے کی تھی ہی نہیں، اور سینہ یہ چوڑا، منہ، لمباق سا۔''

اماں سدا کی کپن تھیں اور ہمیشہ بات میں کلی پھندنے لگا دیتیں۔ دو انگل کی چیز کو گز بھر کی بنا دینا تو ان کے لئے کوئی بات نہ تھی۔

''فلانی۔۔۔ جیسے الٹا توا۔۔۔ امکی جیسے میدہ شہاب۔'' حالانکہ نہ فلانی بے چاری الٹے توے جیسی اور نہ امکی میدہ شہاب، مگر پھر بھی لوگ ان کی باتوں کا یقین کر لیتے تھے اور وہ شریف بزرگوں میں گنی جاتی تھیں۔

کپڑوں کے معاملے میں تو اماں نے کبھی سچ بول کر ہی نہیں دیا۔

''یہ تین روپے گز ہے، دلی سے منگایا ہے۔'' حالانکہ سب جانتے تھے کہ کٹ پیس بیچنے والی چندی بڑھیا چار روپے سیر کے حساب سے دے گئی ہوگی۔ اماں کا ایک جھوٹ ہوتا تو بتا دیا جاتا۔

بڑی آپا تو خیر میاں کے فراق میں گھل گھل کر بد مزاج ہو گئی تھی۔ مگر یہ نوری اور منو پر کونسا رنڈاپا ٹوٹا تھا جو وہ چنگیز دوراں بن کے سینوں پر کھڑے مونگ دلتے تھے۔ جس کی چیز جب جی چاہتا مچل کر مانگ لیتے اور وہ مل جاتی۔ بات یہ تھی ان کا باپ جو مر گیا تھا۔ پر یہ مردہ باپ سو باپوں پر بھاری تھا۔ سارا گھر بلکہ سارا کنبہ مرنے والے کے بھوت سے لرزتا تھا، اور کبھی تو شمن بلبلا کر دعا مانگتی کہ کاش وہ بھی بیوہ ہو جائے یا کم از کم ماں باپ ہی مر جائیں، پھر ذرا وہ خبر لے لوگوں کی۔

بڑی آپا ماں باپ کی عزت سمیٹے بیٹھی جیسے سارے گھر کی جان پر احسان کر رہی تھی۔ نفس کو مار کر اس میں حکومت کرنے کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں وہ باپ کی عزت کی خاطر اپنی نسوانیت کا خون کر رہی تھی مگر شمن اس کی ذرا بھی احسان مند نہ تھی، شوق سے وہ کوٹھے پر جا بیٹھتی تو شمن کو پرواہ نہ ہوتی۔ اس کی بلا سے اور پھر بڑی آپا کے بچوں سے زیادہ خوش نصیب شاید ہی کوئی ہوگا۔۔۔ آہ۔۔ بیوہ اور یتیم!

(8)

اس کی قسمت سے جو چیز زندگی میں آتی تھی طوفان کی طرح آتی، یکا یک لوگوں کو اس کی تعلیم کا خیال آیا اور بس طاعون کی طرح سب کے دماغوں کو جکڑ لیا۔ سبھی تو اس کے پیچھے ''پڑھو'' کا ڈنڈا لے کر پل پڑے۔ بڑی آپا تو پڑھاتی کم نوری سے مقابلہ کر کے ذلیل وحقیر زیادہ کرتیں۔ مولوی اور ماسٹر بھی آ کر اپنے دانت اس پر تیز کرتے۔

''پل پر جا۔''

''کیوں؟'' وہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔

''یہ اس کا دیور ہے۔'' ہوا کرے، دشمن کو کیا۔ اس کا دیور تو نہیں۔ وہ جل جاتی اسے کسی کے دیور سے کیا ناطہ جوڑنا تھا جو وہ یاد کرتی۔

''دس تک گن۔'' بس اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا، ایک ہتھوڑی لے کر کھٹا کھٹ ماسٹر صاحب کی کھوپڑی پر سو تک گن دے۔ اور پھر پانچ چھکے تیس یہ لیجئے یہ کیوں؟ پانچ چھکے سولہ کیوں نہیں؟ ۔۔۔ پھر جوڑنا، گھٹانا، ضرب، تقسیم، کاش اسے معلوم ہوتا کہ وہ کس کی بوٹیاں بانٹ رہی ہے اور کس کا خون گھٹا رہی ہے تو شاید اس کو رحم آ جاتا اور وہ کچھ دلچسپی لینے لگتی۔ مگر دلچسپی نہ لینا ماسٹر صاحب کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ عموماً تو کسی کا سوال آنکھ ٹیڑھی کر کے نقل کر لیتی اور سب کے بعد میں جا کر اپنی سلیٹ دکھاتی مگر بعض وقت ماسٹر کچھ تاڑ جاتے اور اس کی ہی سلیٹ کے پیچھے پڑ جاتے، اس وقت بڑی مصیبت آتی اور وہ گھبرا گھبرا کر ہتھیلیوں میں تھوک لے کر سلیٹ پر تھوپنے لگتی، ایسے موقعوں پر عموماً اس کا حلق سوکھ جاتا جس پر وہ جھلا کر پیٹ میں درد یا کوئی حاجت محسوس کرنے لگتی۔ لیکن ماسٹر صاحب کے چانٹوں کا جادو مسیحائی کا کام کرتا اور دم بھر میں تکلیف چھومنتر ہو جاتی۔ ایک نوکر کے لڑکے کا نام رٹوا تھا جو دق کی طرح ہر وقت اپنی ماں کے کلیجے پر ماتم کیا کرتا

تھا۔ بس عبارتی سوال تو اس کی جان کو لوا بن کر چپک گئے تھے اور بے طرح اس کی روح کو جھنجھوڑیاں دیتے۔

''کم کا ضرب، زیادہ کی تقسیم۔''

مگر یہ اس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ کم اور زیادہ میں فرق کتنا ہے۔

''ایک پیسے کی دو نارنگیاں تو ڈیڑھ روپے کی کتنی؟''

اول تو سرے سے یہ پھر رے ہی اس کی قسمت میں نہیں لکھے تھے کہ وہ ایک پیسے کی دو نارنگیاں خرید سکے۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ دو پیسے کی نارنگیاں کافی ہوتیں بھلا ڈیڑھ روپے کی کون گاڑی بھر نارنگیاں خریدے گا۔ سڑ نہیں جائیں گی ساری کی ساری ۔۔۔ پچھلی گرمیوں میں آگرہ والی خالہ نے دو ٹوکرے خربوزے بھیجے سارے سڑ سڑ کر ہی تو پھکے مگر فوراً ہی اسے آگرہ والی خالہ کا چھدری داڑھی والا میاں یاد آ جاتا جس کی تیمم کی مٹی کی اس نے اور نوری نے کلیاں بنا ڈالی تھیں اور شاید اسی دن سے اس نے خربوزے بھیجنے بند کر دیئے ۔۔۔ اچھے ہوتے تھے بے چارے خربوزے، بیج زمین پر لیس لیس کر چھلنیوں میں دھوئے جاتے تھے اور پھر ۔۔۔،

تڑ سے ایک چانٹا پڑتا اور وہ خربوزے کے بیجوں پر سے پھسلتی ہوئی جاگ پڑتی اور اس موقع پر سلیٹ کی نوک جو ناک میں نشانہ باندھے بیٹھی ہوتی اس کی ناک میں آ لگتی۔

''سن ۔۔ اگر تجھے ایک پیسہ دیا جائے تو تو کتنی نارنگیاں خریدے گی؟'' اگر خدا کی قدرت جوش مارتی اور واقعی اسے پیسہ دیا جاتا تو وہ بھلا پاگل ہوئی تھی جو کھٹی چونا نارنگیاں لیتی۔ اور کیا سچ تو ہے، بھلا پیسہ کی دو والی نارنگیاں کھٹی نہ ہوں گی تو اور کیسی ہوں گی۔ ماسٹر صاحب تو سدا کے سڑی تھے۔ خواہ مخواہ کھٹی نارنگیاں خرید وائے دیتے تھے۔ پیسے ملتے تو کبھی کا فیصلہ کئے بیٹھی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے کٹی ہوئی پستے لگی گزک خریدے گی اور چکھنے کے بہانے ایک ریوڑی بھی مانگ لے گی۔

''ارے بول ۔۔۔ کتنی نارنگیاں آئیں گی؟''

''نارنگیاں؟ ۔۔۔ آں ۔۔ وہ'' ابھی وہ فیصلہ بھی نہ کر چکتی کہ نارنگیاں لے ہی ڈالے یا گزک کے لئے پیسہ اٹھا رکھے کہ ماسٹر صاحب بے صبر ہو جاتے۔

''کوڑ مغز کہیں کی ۔۔۔ ارے ہاں نارنگیاں ۔۔ ایک پیسے کی دو تو ڈیڑھ روپے کی؟''

''ڈیڑھ؟ ۔۔۔ ڈیڑھ روپے کی!'' ذرا سوچنے۔

''ہاں ڈیڑھ روپے کی، روپے کے آنے بنانے آتے ہیں؟''

ماسٹر صاحب کے سامنے ''نہیں'' کہنے سر ہلانے کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا ''ہاں''۔ ''تو پھر بنا۔''

اور وہ آنے بنانے شروع کرتی ۔۔ کافی تو ہوں گے ڈیڑھ روپے کے آنے، خاصے ڈھیر سے، اور کیا! ۔۔۔ عید پر کوئی گیارہ آنے ہو گئے تھے تو واسکٹ کی جیب لٹک گئی تھی۔ اماں نے نہ جانے کس کام کے واسطے تین آنے قرض مانگے تھے تو اس کی جان نکل گئی تھی۔ اماں تھیں بھی چھٹی ہوئی نادہند جہاں کسی کے پاس چار

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

پیسے دیکھے اوران پرغریبی چھائی۔ پھر واپس دینے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ کون تھا جو تقاضا کر سکتا۔

''اری بول ڈیڑھ روپے کے کتنے پیسے ہوئے؟''

''ڈیڑھ روپے کے پیسے؟''

''ہاں کم بخت۔''

''سولہ۔'' وہ اٹھے ہوئے تھپڑ سے بچ کر کہہ دیتی۔

''سولہ، سولہ پیسے ہیں؟'' اور ماسٹر صاحب پر بھوت سوار ہو جاتا جیسے سولہ پیسے دے کر کوئی انھیں ٹھگے لے رہا تھا۔ وہ جی بھر کر مار چکنے کے بعد خود ہی پیسے بنا لیتے۔ ''چھیانوے، منحوس اچھا اب بتا تیرے پاس اتنے پیسے ہیں؟'' وہ پیسے بنوائی کا چانٹا وصول کر لیتے

''ہاں''

''اب تو بازار جاتی ہے؟''

''ہاں'' گو اسے یقین تھا کہ کوئی اسے بازار نہ جانے دے گا اور نہ ہی اتنی کتائی کے بعد اتنی ہمت رہ جاتی، دوسرے یہ سب بہانے بنائے جا رہے ہیں اسے الو بنانے کے لئے مگر اسے فرض کرنا ہی پڑتا کیونکہ فضا میں چانٹا منڈلاتا نظر آتا۔

''اب تو وہاں ایک پیسے کی دو کے حساب سے نارنگیاں خریدتی ہے۔''

''چہ! پھر وہی کھٹی نارنگیاں!'' خیر وہ مجبوراً خریدتی۔ ''کتنی ہوئیں؟''

''ایں؟'' وہ ایسی شکل بناتی گویا بس کوئی دم میں سوچ کر بتا ہی دے گی۔

''نارنگیاں''

''ارے بتا؟ کتنی ہوئیں تین نارنگیوں کے حساب سے؟'' بولائے ماسٹر صاحب۔

''تین؟'' وہ ہچکچا کر سوچتی۔ ''تین نارنگیاں، ہاں'' وہ وثوق سے کہتی۔

''تین'' ڈیڑھ روپے کی تین نارنگیاں؟

''نہیں۔۔نہیں'' وہ گڑگڑا کر ماسٹر صاحب کے وار کہنیوں پر روکتی۔

''تو پھر بتا۔۔بتا۔۔فوراً۔''

اسی طرح شام ہو جاتی ماسٹر صاحب پسینے میں ڈوب مونڈھال ہو جاتے جیسے کسی نے ٹھن چلر میں باندھ کر گھما ڈالا ہو۔ ان کے اعضاء بے قابو ہو کر الٹے سیدھے ہلنے لگتے۔ معلوم ہوتا اتنی دیر وہ بچوں کو پڑھا نہیں رہے تھے بلکہ اپنا نوشتہ تقدیر پڑھ رہے تھے۔ پست ہو کر وہ دوسرے دن نارنگیاں جبراً خریدوانے کا پختہ وعدہ کر کے چلے جاتے۔

جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج۔۔۔جہلم، چناب، راوی۔۔۔ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا جیسے تسبیح کے گول گول دانے۔۔۔جہلم، جہلم کے بعد۔۔۔چناب۔۔۔گول دائرے میں ایک

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

دوسرے کے کرتے کا پچھلا دامن پکڑے جیسے بچے ریل ریل کھیلتے ہیں۔ جہلم پھر چناب، پھر اس کے پیچھے راوی چلی جا رہی ہے پھر۔۔۔

''یاد ہو گیا۔'' ماسٹر صاحب ایک دم حملہ آور ہوتے۔

''جی جہلم، چناب۔۔۔۔''

''ٹھیک سے بیٹھ بے منو کے بچے، ہاں آگے۔''

''جہلم، چناب، را۔۔۔''

''نہیں مانے گا رے اچھو۔۔اے کیا ہوئی تیری سلیٹ، نکال، بستے میں کیا انڈے دے رہی ہے۔'' ماسٹر صاحب نہایت چابکدستی سے چوکھے چانٹے بانٹتے جاتے۔ کیا مجال جو کوئی کونا ڈھیلا پڑ جائے۔

''ہاں ہاں جہلم کہاں سے نکلتا ہے۔۔نکال پینسل۔۔۔ہاں۔۔۔ارے بول تو کیوں چپکی بیٹھی ہے۔''

''جہلم۔۔آ۔ر۔'' وہ بھولنے لگتی۔

''ارے آگے بھی تو بڑھ، ایک جگہ کیوں مرے رو گئی۔۔۔ہاں بتا۔''

''چناب۔'' قریب بالکل بھول کر ہانکتی۔

''ہاں، ہاں! ہاں کہاں سے نکلتا ہے؟۔۔۔دیکھ رہا ہوں، منو، بدذات۔۔ارے ہاں بتا۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے ماسٹر صاحب مچھلی مچھلی کھیل رہے ہیں۔ ادھر ادھر وہ چاروں طرف بھونک بھونک کر پڑھاتے اور کسی کو بھی نہ پڑھا پاتے۔

''بول مردار، کہاں بہتی ہے؟''

''جی زمین پر۔''

''ایں! زمین پر۔'' ماسٹر صاحب برا مان جاتے۔ گویا دریا کو زمین پر گھسیٹ کر کسی نے ان کی ہتک کر ڈالی۔ پر کچھ لاجواب سے ہو جاتے۔

''مگر یہ تو بتا، کہاں، کس جگہ سے نکلتا ہے اور کون سے خطے کو سیراب کرتا ہے؟''

''جی خطے؟''

''ارے ہاں نہیں تو کیا تیرے سر کو سیراب کرے گا۔''

''جی، سیراب۔۔تو۔۔'' وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی۔

''ہاں نہیں یاد۔۔۔اچھا اور اس کے ساتھ کون کون سے دریا بہتے ہیں۔۔اسی خطے میں۔''

''خطے میں تو۔۔دریا بہتے ہیں۔''

''نام بتا سب دریاؤں کے، چناب اور؟''

''جی چناب؟''

''ارے بھئی ہاں، منحوس اور؟''

''اور۔۔۔ر،ام۔۔۔آں اور چناب۔'' وہ دماغ کو خوب بھینچ کر زور لگاتی۔

''پھر بھول گئی دریاؤں کے نام۔ ایں؟''

''جی، وہ جمنا، گوداوری، کرشنا۔'' وہ جلدی جلدی بتاتی جاتی اور کہنی کی تکون بنا کر سر پر کھڑی کر لیتی۔ مگر ماسٹر صاحب پر تو جنون سوار ہو چکا تھا۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ کتنی کوڑھ مغز تھی، وہ ماسٹر صاحب سچ کہتے تھے، اسکے دماغ میں بھوسہ بھرا تھا۔ کاش اس کے جسم میں بھی کوئی اس قسم کا مادہ ٹھسا ہوتا جو مار سے ایسی ٹیسیں تو نہ اٹھتیں، اس نے کتنے کتنے قلم کے خول میں سے نکلے ہوئے لبریئے دار تنکے کھائے، بدمزہ اور پھیکے مگر دماغ ویسا ہی کند رہا اور ماسٹر صاحب تو کہہ چکے تھے کہ وہ بالکل نہیں پڑھ سکتی۔ بھیجا ہے ہی نہیں سر میں اور یہ تو وہی چناب تھا۔ جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج والا چناب۔ خدا غارت کرے اسے یاد ہی نہ آیا پھر اس کے دماغ میں گول گول تسبیح کے دانوں کی طرح جہلم، چناب، راوی چکروں میں رقص کرنے لگے۔۔ مگر ماسٹر صاحب تو کہتے ہیں، دریا بہتے ہیں۔۔ اچھا تو دریا بہتے ہیں! مگر یہ کم بخت کہاں الٹے سیدھے بہا کرتے ہیں ۔ کاش وہ گھر کے پاس آ کر ہی بہے ہوتے تو یوں اس کی زندگی میں کٹھن بند نہ بندھ جاتے۔ ان کم بخت دریاؤں سے تو ہزار گنا اچھا وہ نالہ تھا جو کھیت کے بیچوں بیچ رو پہلی سانپ کی طرح لہرایا کرتا تھا۔ اس کے کنارے بالکل مکھی کے برابر مینڈکیاں گھاس میں پھدکا کرتی تھیں۔ اور جب کاغذ کی ناؤ میں وہ ان ننھے مینڈکوں کو مسافر بنا کر نالے کے دھارے پر چھوڑ دیتی تو کشتی کس شان سے سینہ تانے بہتی چلی جاتی۔ وہ تالیاں بجاتی، اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی۔ اور جب کوئی تنکا یا لکڑی ناؤ میں پھنس کر اسے چک پھیریاں دیتی تو اس کے جوڑ کھل جاتے اور ننھے مینڈک بہادر تیراکوں کی طرح پانی میں چھلانگ مار کر کنارے پر آن لگتے ۔ اس نالے میں کبھی کبھی کہیں سے مچھلیاں بھی بہہ آتیں، تب تو کنارے پر سینکڑوں جانور دعوت اڑانے آن ڈٹتے۔ بڑا مزہ آتا۔۔

مگر جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج انھیں بھی تو یاد کرنا تھا۔

(9)

نوری تھی تو بڑی آپا کی لڑکی، سانپ کا بچہ سنپولیا۔ شمن نے اس سے دوستی بڑے سوچ بچار کے بعد کی تھی۔ کیونکہ گھر میں وہ تھی یا نوری۔ باقی سارے لڑکے جن سے ان کی ایک منٹ بھی نہ نبھتی، اس لئے نہیں کہ وہ لوگ اسے مارتے تھے، مارنے میں وہ خود کچھ کم نہ تھی۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ موقع بے موقع اس کی گڑیاں چیر ڈالا کرتے تھے، اور نوری کے پاس تو گڑیاں بھی تھیں جن کی وہ دونوں مل کر روز شادیاں کیا کرتیں۔ گھنٹوں اسباب کے کمرے میں کھڑکی پر چڑھی سر جوڑے گوڈے سے کھیلا کرتیں۔ جی گھبرا جاتا تو گلی میں کھیلتے ہوئے لڑکوں کو دیکھا کرتیں۔ گلی کیا تھی تھیٹر کی اسٹیج تھی۔ وہ گئی چندھی بڑھیا کی نوجوان بہو۔۔ کھڑکی میں سے صدیق نے پکار لگائی۔۔۔ دو لڑکے ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے، گالیاں دیتے گزر گئے۔۔۔ ''بیر لو بیر میٹھے بیر۔''۔۔۔''گردے کلیجی''۔۔''بیل، صابن، موتی''۔۔۔ اور پھر چھجے پر بیٹھی گھمڑ بندریاں جو اپنے بچوں کی جوئیں بین بین کر کھایا کرتی تھیں۔ پرانی مسجد کے ملاجی جن کے آتے ہی ڈر کر دونوں کھڑکی کے نیچے دبک جاتیں، دل دھڑکنے لگتے اور ناکوں پر پسینے آ جاتے۔ مگر پھر ان کے دلوں میں کھدبد ہوتی، رہ رہ کر جھانکنے کو جی چاہتا۔ وہ ڈری ہوئی چوہیوں کی طرح آہستہ سے اوپر ابھرتیں۔ ملاجی دیوار سے ناک لگائے گھنٹوں کھڑے عجیب بھیانک حرکتیں کیا کرتے۔ پہلے دن جب وہ بالکل بے خبر غور سے دیکھ رہی تھیں تو وہ ان سے نہ جانے کیا کہنے لگے، پہلے تو ان کو سنائی نہ دیا کہ وہ کیا اشد ضروری بات کہنا چاہتے ہیں۔ مگر جب وہ ذرا آگے جھکیں تو مارے خوف کے وہ وہیں جم کر رہ گئیں جیسے اژدہے کو دیکھ کر بندر مسحور ہو جاتے ہیں، اسی طرح سانسیں روکے، مٹھیوں سے جنگلہ پکڑے وہ ٹکٹکی گھورا کیں، پھر نہ جانے کیسے وہ ایک برقی طاقت سے جھٹکا کھا کر زخمی چڑیوں کی طرح پیچھے گریں اور اٹھ کر ایسی بے تحاشا بھاگیں جیسے ملاں جی چھلانگ مار کر جنگلے میں سے ان کی گردنیں پکڑ ہی تو لیتے۔ بڑی دیر تک ان کے حواس غائب رہے حلق خشک اور ہاتھ پیر بے قابو۔

پانی پی کر ذرا دم میں دم آیا تو ڈرتے ڈرتے انھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی ہمت ہوئی گویا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتی ہیں۔

''کہو بھئی مزاج تو اچھے ہیں؟''

اس کے بعد تو ایک دم سے کھو کھلے قہقہے لگا کر بیدم ہونے لگیں اور کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی دباتی رہیں۔ گویا ان کے سینوں میں بڑے ہی اہم راز دفن، خاموش اودھم مچا رہے ہیں۔ انھوں نے آپس میں کوئی تبادلہ خیالات نہ کیا جیسے وہ بڑی جہاں دیدہ ہیں۔ حالانکہ ان کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے اور ایسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ بات بھول بھول جاتی تھیں۔ کھانے کے وقت شمن کا جی متلانے لگا۔ بارہا بھیانک زخم کے غار کی طرح اس کے ذہن میں کوئی چیز پھیلنے لگتی۔ اگر وہ گاڑی کے پہیوں میں کسی انسان کو پستا ہوا دیکھتی تب بھی ایسی دہشت اس کے جی پر نہ بیٹھتی۔ اس کے تمام احساسات پر جیسے کسی نے اونچائی سے بھاری پتھر پٹخ دیا ہو۔ جس کے نیچے وہ زخمی کیڑوں کی طرح دبے ہوئے تلملا رہے تھے۔

کئی دن تک وہ اس دلچسپ کھڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں جیسے وہاں وہ کوئی قتل کر کے بھاگ آئیں تھیں اور لاش اب بھی پڑی سڑ رہی تھی۔ پھر دور ہی دور سے وہ معنی خیز نظریں ڈالتی گزر جاتیں۔ ان کا تخیل کھڑکی سے باہر کود جاتا اور پھر وہاں سے دہشت زدہ ہو کر بھاگتا۔ مگر رفتہ رفتہ ان کی ہیبت کم ہوگئی اور وہ صرف ان اوقات میں بھاگ آتیں جب ظہر کی نماز سے لوگ فارغ ہوتے اور گلی قبرستان کی طرح سنسان ہو جاتی۔ پھر تو وہ اور دلیر ہوتی گئیں اور اب یہ حال تھا کہ جان بوجھ کر ملاں جی کو آتے دیکھ کر دبک جاتیں اور پھر اچک اچک کر جھانکا کرتیں۔ ہر بار ان کے جی متلاتے، سوکھی سوکھی قے کے جھٹکے لگتے اور طبیعتیں مکدر ہو جاتیں، مجروح دماغ ہل ہل جاتے۔

نوری کی گڑیا شمن کا گڈا بلا ناغہ بیاہے جاتے، اور پرانے جوتے کے ڈبے کی پالکی میں دلہن بٹھائی جاتی۔ موتیوں کے کنگن سے آراستہ ہاتھ سے دلہن سب کو سلام کرتی اور مسہری پر سو جاتی، پھر گڈا دونوں ٹانگوں پر کودتا ہوا آتا اور برسی پر کھڑا ہو جاتا ۔۔۔ کھیل ختم!

پڑوس میں صدیقہ کی خالہ کی شادی ہوئی تو علاوہ منڈیر پر سے گہما گہمی دیکھنے کے انھوں نے بہت سی چیزیں دیکھ لیں، دلہن کی گود میں آئینہ رکھا گیا اور دولہا نے اس کا منہ دیکھا۔

''بیوی میں تیرا غلام ۔۔ منہ کھولو'' کھسیانے دولہا کو کہنا پڑا تھا اور پھر کھیر چٹائی گئی تھی، دولہا نے کیا جس جس کر دلہن کی مہندی لگے شرمائے ہوئے ہاتھ پر سے کھیر چاٹ لی تھی کہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے۔ جیسے کسی نے ان کی بغلوں میں گدگدیاں کر دی ہوں۔ دولہا دلہن کی پیاری سی لگاوٹ والی رسم پر بیویاں چہک چہک کر قہقہے لگاتی تھیں۔ شمن کو بھی ارمان بھر گدگدی محسوس ہوتی تھی اور نوری تو بضد تھی کہ چلو اندھیری کوٹھڑی میں دلہن دلہن کھیلیں۔ یہی نہیں بلکہ شادی کے بعد عورتیں دولہا کو چھیڑ چھیڑ کر مزے لے رہی تھی گویا وہ کوئی میٹھا سالذ و تھا جسے چکھ چکھ کر چٹخارے بھر رہی تھیں۔ پھر رات کو خوب دولہا کو کھسیانا کیا گیا جس میں چند نوجوان شوقین دروازوں کی درزوں اور روشندانوں پر بیویاں مکھیوں کی طرح چپکی پڑی تھیں۔ جبکہ ان کے خاوند اور

بچے گھروں میں پڑے واویلا مچا رہے تھے۔

گندے گڑیا کی شادی اب کی دفعہ اور دھوم سے ہوئی۔ نکاح کے چھوہاروں کے بجائے مرمرے اچھالے گئے اور دولہا نے دلہن کی ہتھیلی پر سے کھیر چاٹی۔ نوری اندھی نے گڑیا کا سارا دوپٹہ کھیر میں لپیٹ دیا۔ اس لئے شمن نے اٹھا کر بہو کو دہلیز پر پٹخ دیا جس پر نوری اور وہ خوب گتھم گتھا ہوئیں اور ایک دوسرے کے بال بھر بھر کے بکٹے نوچ پھینکے۔

گڑیا ویسے بھی میلی ہوگئی تھی۔ گھوڑے کا سامنہ، اس لئے جب نئی گڑیا بڑی آپا نے بنا کر دی تو انھوں نے اس کی ناک ڈورے کے بجائے کپڑے کی بنوائی اور چٹیا بھی کالا موزہ ادھیڑ کر لگائی۔ لمبا سا موباف ڈالا، پھر بھی انھیں اطمینان نہ ہوا تو ہاتھوں میں ڈورے کی انگلیاں تلوالیں۔ پھر ایک دن بڑی ہمت کے بعد انھوں نے نہایت ہی پوشیدہ جگہ جا کر اس کی واسکٹ میں روئی کی دو گولیاں رکھ دیں، مگر اس سے انھیں اتنی شرم آئی کہ آنکھ بھر کر گڑیا کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ مہین کریپ کا دوپٹہ اوڑھ کر کپڑے کی ناک اور ڈورے کی انگلیوں والی گڑیا بالکل جیتی جاگتی عورت لگنے لگی۔ توبہ! ان کا دل کسی کام میں نہ لگا اور وہ دن بھر اس کا بیاہ کرتی رہیں۔ لیکن ایک دن گودڑ کی تلاش میں جو بڑی آپا نے گڑیوں کا جائزہ لیا تو ان کی چوری پکڑی گئی۔ اس کی اور نوری کی وہ گت بنائی گئی کہ دونوں موت کی دعائیں مانگنے لگیں۔ انھوں نے ایک سرے سے گڑیا کی صدری ہی چھین لی اور کرتے میں کمر پر ٹانکے لگا دیئے اس دن سے گڑیوں کی طرف سے بالکل کھٹا ہوگیا۔ وہ انھیں بالکل کپڑے کا چیتھڑا نظر آنے لگیں۔ جن کی ناک کی جگہ تکونی کلی لگی ہوئی تھی اور انگلیوں کی جگہ ڈورے لٹک رہے تھے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(10)

اماں ثمن سے عاجز تھیں۔ سارے دن بھائیوں کو کوسنا پیٹنا، نوکروں سے لڑنا، ان کے کام میں ہارج ہونا، بھاوجوں کی زندگی اجیرن اور بھتیجوں کے لئے قہر کا سامان۔ ماسٹر صاحب نے توبہ کر لی اور قرآن پڑھانے والی ملانی بی نے کان اینٹھ لئے کہ ''توبہ، نوج کسی کی اولادیوں ہاتھ سے نکل جائے۔''

اور سب سے زیادہ تو وہ نوری کو خراب کئے دیتی تھی۔ وہی ہوا جس کی بڑی آپا کو دھڑکا لگا ہوا تھا، ثمن نے نوری کو کوڑی کام کا نہ رکھا اور وہ روز بروز گئی گزری ہوتی جاتی تھی، اس وقت اسے مرنے والا اور بھی یاد آ رہا تھا کیونکہ ایک تو نوری ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی دوسرے اس کی اپنی صحت رفتہ رفتہ گر رہی تھی۔ کھانا تو کسی دن ہی ہضم ہوتا ہوگا اور نیند تو اس کے حصے کی اللہ میاں کے یہاں ختم ہی ہو گئی تھی۔ اس کا ایک رشتہ کا دیور حال ہی میں ڈاکٹری پاس کر کے آیا تھا۔ وہی بے چارہ بھابی جان میں ڈالے ہوا تھا۔ اس کے دوروں کا علاج دنیا جہاں کے حکیم ڈاکٹر ہار گئے، نہ ہو سکا، اگر تھوڑا بہت کیا تو رشید ہی نے کیا۔

ویسے دوروں کا کیا ٹھیک، کہہ سن کے تھوڑی پڑتے ہیں۔ بس اتنا اتفاق یا خدا کی مہربانی کہو کہ دورے کے وقت رشید کہیں آس پاس ضرور ہی مل جاتا، ورنہ نجانے کیا ہوتا۔ ہزار سی دوائیں پی ڈالیں مگر دوروں سے پیچھا نہ چھوٹا۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ وہ سنجھلی کے مہاسوں کا علاج کر دے مگر وہ ٹال ہی گیا۔ آخر کو بے چاری سنجھو کی شادی ایک وکیل صاحب سے ہو ہی گئی تھی۔ سنجھو بے چاری ان جانوں میں سے تھی جو نہایت سلیقے سے پیدا ہوتی ہیں، شریفوں کی طرح گھر میں رہتی ہیں پھر کوئی اللہ کا نیک بندہ بیاہ لے گیا۔ وہاں جب تک جی میں طاقت رہی بچے پیدا کئے، پالے پوسے، پھر کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو کر دکھ سہتی رہیں اور ایک دن اللہ نے مٹی عزیز کر لی۔ سب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ''واہ کیا جنتی بیوی تھی۔''

پر سنجھو بھی مری نہیں تھی۔ اس کی تو اب زندگی شروع ہو رہی تھی۔ ادھر وہ بیاہ کر گئی اور اُدھر بڑی کو دوروں نے آ دبوچا اور اس بری طرح کہ توبہ بھلی۔ طبیعت نڈھال اور جی کچھ کھویا کھویا سا رہتا۔ دل بہلانے کو اس نے ہارمونیم بھی سیکھنا شروع کیا۔ ''ابن مریم ہوا کرے کوئی'' گھنٹوں بے تال سر ہارمونیم کی پیں پیں کے ساتھ چلتا مگر دل اور بھی بے قابو ہوتا گیا۔ رشید آ کر گھنٹوں بیٹھتا۔ اسے مرض کے متعلق ہدایتیں دیتا۔ کبھی ایک آدھ سوئی بھی اس کے بازو میں لگا دیتا۔ بازو میں سوئی لگواتے وقت اس کے بڑی گدگدی ہوتی اور وہ لوٹ پوٹ ہو جاتی، پر دو چار دن کو دورے تھم جاتے۔ مگر بڑے بھیا کو رشید سے خواہ مخواہ کا بیر پڑ گیا۔ بات یہ ہوئی کہ ان

کی بہن جو سدا کی بہانے باز تھی، پیچش کا نسخہ لکھوانے کا تقاضا کئے جاتی تھی اور رشید بے چارا بھول بھول جاتا تھا، پر ان کا کہنا تھا وہ جان بوجھ کر کسی کے بہکانے کی وجہ سے ٹال مٹول کرتا تھا۔ اور بڑی آپا اپنے دونوں بچوں کی قسم کھا کر کہتی تھی کہ بڑے بھیا کا نوکر ہی ایسا مکر ہایا تھا کہ نسخہ لکھنے کو رشید میاں نے کئی دفعہ کاغذ مانگا، سنی ان سنی کر گیا۔

''وہ بے چارے تو سبھی کو بھگتنے کو تیار ہیں۔'' وہ کہتی۔ پھر بھیا نے جو شکایت کی تو بڑی آپا بگڑ کھڑی ہوئی کہ ''وہ کسی کے نوکر نہیں ہیں۔ میری وجہ سے آ جاتے ہیں تو سارے گھر کو مرض اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔''

اور بات بھی سچ تھی، بڑی کی سسرال والوں پر اسی کا حق تھا۔ میاں مر گیا تھا تو کیا تھا اس کا کنبہ تو موجود تھا۔ وہ آج چلی جاتی تو کون اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ یہ تو اس کا ہی جی تھا جسے مارے بیٹھی تھی۔

کہتے ہیں بڑے بھیا کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ان بے چارے کے دل میں کہاں سے بیٹھتی، یہ ان کی لاڈلی بیگم ہی کے کرتوت تھے، سو بس وہ پیچھے لگ گئے۔ جہاں رشید آتا وہ آن بیٹھتے اور وہ بے چارا جلدی سے چلا جاتا۔ ارے کہیں یوں لشتم پشتم بھی دور بے ٹھیک ہوئے ہیں۔

غضب تو جب ہوا جب انھوں نے اس کے خط پکڑ لئے اور صاف بڑی سے کہلوا دیا کہ اگر یہ پتے بازی بند نہ ہوئی تو ابا جان تک نوبت پہنچ جائے گی۔ اگر ایسا ہی ہے تو نکاح کر لو شرافت سے، بڑی آپا کی ساس کے کان میں بھی بھنک پہنچی اور بڑھیا صلواتیں سناتی، دہائی دیتی چڑھ دوڑی۔ وہ لے دے مچی کہ رشید بے چارے کا آنا بند۔ اس دن سے دورے بھی پھیکے پڑ گئے۔ کس کے بوتے پر پڑتے۔ مگر بڑی کا غصہ تین تاؤ کھا گیا اور بس اسے تو پھر اپنے بچوں کی ماتا نے بے چین کر دیا، یہی وجہ تھی کہ اس سے نوری کی بربادی ثمن کے ہاتھوں نہ دیکھی گئی۔ مجبوراً اسے اسکول بھیج دیا گیا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(11)

ثمن نے جب اسکول میں قدم رکھا تو پہلے اس نے چاروں طرف سے اطمینان کرلیا کہ کدھر کدھر سے ثمن کو حملے کا خطرہ ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے میٹرن کو سمجھا دیا کہ مہربانی کر کے نہ تو اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرے جائیں اور نہ اسے گھر کی یاد نہ آنے کے لئے پیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ وہ اس قسم کے دکھاوے سے بخوبی واقف تھی اور منجھو کو پرکھ چکنے کے بعد اس کو یقین ہوگیا تھا کہ کسی سے محبت کرنا یا کروانا حد سے زیادہ مکاری ہے۔ پیار سے وہ ایسی بھڑکتی جیسے نئے چڑیا پھٹکی سے۔ وہ ان باتوں کی عادی ہی نہ رہی تھی۔ نہ جانے کتنے دن سے نرم اور اخلاص بھرے الفاظ اس کے کانوں کے پاس بھی نہ پھٹکے تھے۔ ہر بات کے جواب میں گھر کی سننے کی عادت پڑ چکی تھی۔ لہٰذا وہ کوئی کام شاباشی سننے کے لئے کرنا ہی نہ جانتی تھی۔ بلکہ جب تک ہر قدم پر اسے ڈانٹ نہ ملتی وہ کچھ ناامیدی ہو جاتی۔

جماعت میں جب وہ داخل ہوئی تو اس نے ایک بے اعتباری کی نگاہ سب چہروں پر ڈالی۔ اسے ان کا گھورنا اور مسکرا کر آپس میں کانا پھوسی کرنا بہت ناگوار ہوا۔ جب ٹیچر کمرے میں آئیں تو سب کھڑی ہوگئیں مگر وہ اُلوؤں کی طرح بیٹھی رہی۔ اس پر لڑکیوں کے قہقہے نکل گئے اور وہ ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کر اس بے عنوانی پر رائے زنی کرنے لگیں۔

''کیا آپ کی پیٹھ میں درد ہے۔ جو آپ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔'' رعب دار مس ممتاز نے کٹتے ہوئے لہجے میں معلوم کرنا چاہا۔

''ایں!'' اس نے منہ پھاڑ دیا۔

لڑکیاں ہنسی سے لوٹ گئیں اور خفت کی وجہ سے ثمن کے گال لال ہو گئے۔ اسے مس ممتاز شروع سے ہی قابل نفرت لگیں۔ وہ اس سے آپ کر کے بول رہی تھیں۔ جس میں علاوہ انتہائی تکلف کے ذرا طنز کی چاشنی بھی موجود تھی۔ مس ممتاز نے کوئی اور بات نہیں کی۔ اس دن کیا پڑھایا گیا اور کیا پڑھا گیا۔ یہ اس کی خاک سمجھ میں نہ آیا۔ کیونکہ گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے میں اسے اس قدر کشمکش کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ کچھ نہ سن سکی

تین چار دن جماعت میں خاموش بیٹھی رہی اور اب اس میں اتنی سمجھ آگئی تھی کہ سب لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی، بیٹھ جاتی، اندر باہر آتی جاتی اور حاضری کے وقت بجائے ''کیا ہے؟'' کے اب وہ ''جی حاضر'' بولنے لگی تھی۔ مگر بولنے کے بعد بڑی دیر تک اس کے کان تمتمایا کرتے۔ کیونکہ جب پہلے روز اس نے حاضری دی تھی تو لڑکیوں کا ہنستے ہنستے پتلا حال ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ مس ممتاز کے رعب دار چہرے پر بھی دیر تک مسکراہٹ منڈلاتی رہی تھی۔

ہفتے بھر بعد اسے نیچی جماعت میں اتار دیا گیا، اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر لڑکیوں نے اس

معاملہ کو سانحہ بنا دیا، جدھر وہ جاتی اشارے ہونے لگتے۔ لڑکیاں اس کی بیوقوفی کے چرچے کر کے ٹھٹھے لگاتیں اور اب ہر ایک کی زبان پر تھا کہ وہ اتار دی گئی۔ مس ممتاز نے رپورٹ دی کہ وہ بہت کمزور ہے اس درجہ میں کام نہیں چلا سکتی۔

اس نئی چھوٹی جماعت میں چھوٹی لڑکیوں کے درمیان وہ ان سب کی اماں معلوم ہوتی۔ کیونکہ یہ لڑکیاں ذرا اس سے ڈرتی تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اسے معلوم ہوگیا کہ وہ ان سب سے عقل، عمر اور علم میں بہت آگے ہے۔ اس کو سبق وغیرہ کچھ یاد کرنے کی ضرورت نہیں اس نے تیزی سے لڑکیوں پر رعب گانٹھ لیا۔ دو مہینے بعد جب وہ گھر واپس گئی تو پہلے سے چوگنی بدزبان، خودسر اور ڈھیٹ ہوگئی تھی۔ اب اسے مار لینا بھی آسان نہ تھا۔ وہ نہایت گستاخ نگاہوں سے گھور کر ترکی سے جواب دے دیتی۔ اس کے علاوہ اسے کھانے کی چیزیں چرانے کی بڑی مہارت ہوگئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ جھٹ نعمت خانہ میں سے کچھ نکال کر منہ میں رکھ لیتی اور ایسے مزے سے تھوڑا سا چرا کر بغل میں دبا لیتی کہ خوب ہاتھ ہلا ہلا کر چلتی جب بھی کسی کو پتہ نہ لگتا اور لقمہ منہ میں لے کر وہ گنگناتی ہوئی نکل چلی جاتی۔ تاکہ ہر کوئی سوچے اس کا منہ خالی ہے اس کے علاوہ پیسے اور روپے تک اڑا لیتی مگر کسی کو اس کی طرف شبہ کرنے کا خیال تک نہ آتا۔ چوری کی چیز وہ نہایت تندہی کے ساتھ سب کے ساتھ مل کر ڈھونڈتی یہ طریقہ اس کی بے گناہی کو اور مضبوط بنا دیتا۔ لڑکیوں سے اس نے اور بھی غلیظ باتیں سیکھ لی تھیں جو وہ نہایت فخر سے نوری کو سکھاتی۔

پھر جو وہ اسکول آئی تو اسے ایک نئی ٹیچر سے پالا پڑا۔ یہ ٹیچر بہت کم عمر معلوم ہوتی تھیں لہٰذا آتے ہی اس نے انھیں دق کرنا شروع کیا۔ کچھ دن اس کی شرارت بھر جنگ جاری رہی لیکن جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ ہار رہی ہے۔ انھوں نے اس کی شرارتوں پر کونے میں یا بینچ پر کھڑا کر دینے کے بجائے بالکل توجہ نہ دی اور جیسے ہر بات کو ٹال جاتیں۔ کونے میں کھڑے ہو کر تو وہ مزے سے لڑکیوں کا منہ چڑا چڑا کر ہنسایا کرتی تھی۔ جس پر استانی جل کر اسے بینچ پر کھڑا دیتیں۔ بینچ پر کھڑے ہو کر وہ لڑکیوں پر بن بن کر گرتی اور خوب ہنسی پڑتی۔

مگر چند ہی دنوں میں اس نے اپنے آپ کو ہزاروں ذمہ داریوں میں جکڑا پایا۔ کلاس کی مانیٹر وہ، بورڈ وہ صاف کرے، پاک کی فکر اسے رکھنی پڑے، نقشہ ٹانگنے کی کیل مضبوط ہے کہ نہیں، لڑکیاں غل مچائیں تو اس کی مصیبت، اس کے علاوہ مس چرن یعنی اس نئی ٹیچر کی کتابیں اور چھتری وہ اپنے ڈیسک میں وقتاً فوقتاً رکھے۔ اور کبھی کبھی ان کے کمرے پر امتحان کی کاپیاں پہنچانے جائے۔ کمرے میں مس چرن بالکل استانی نہیں لگتی تھیں بلکہ بڑی بے تکلفی سے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہتیں۔

''اچھا بھئی چائے پیوگی یا نیبو کا شربت۔'' وہ پوچھتیں اور اسے شرم آنے لگتی۔ کبھی کسی نے اس سے ایسی عجیب باتیں نہ کیں تھی۔ تھوڑی سی دیر میں وہ دونوں سہیلیوں کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگتیں۔ اس نے انھیں تمام گھر کے قصے سنائے۔ بڑی آپا سے وہ بڑی خفا تھی اور شانو اور ستو کی شرارتوں پر تو ان کے اچھو لگ گئے۔ نوری انھیں کچھ کچھ پسند تھی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

مس چرن نے اسے گھر کا کام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں بلانا شروع کیا۔ شمن کو اس قدر فخر محسوس ہوتا کہ کام ختم ہو جاتا تو اسے بڑا رنج ہوتا، مس چرن نے اسے اسکول کے علاوہ کام دینا شروع کیا اور دوسرے امتحان پر اسے ڈبل درجہ چڑھا دیا گیا۔ خوشی تو اسے اس بات کی ہوئی کہ مس ممتاز جس درجے کو پڑھاتی تھیں۔ وہ اس سے بھی آگے ہوگئی۔

اس کی زبان پر ہر وقت مس چرن کا نام رہنے لگا۔ لڑکیوں نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ جس سے بجائے کم ہونے کے ان کا خیال ایک رومانی چیز بن کر اس کے دماغ پر چھانے لگا۔ مس چرن کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کا دل ان کی طرف کھنچنے لگتا۔ وہ کہیں بھی ہوتیں اسے ان کے وجود کا احساس نبض کی طرح دھڑکتا اپنی رگ رگ میں سرایت کرتا ہوا معلوم ہوتا۔ وہ اگر سامنے سے گزر جاتیں تو شمن جو کام کرتی ہوتی اسے گڑبڑا دیتی۔ بات کرتی ہوتی تو زبان لڑکھڑا جاتی اگر وہ کسی اور درجے کو کوئی کھیل کھلاتی ہوتیں تو اس کے لئے پڑھنا دشوار ہو جاتا۔ رہ رہ کر ان کے قہقہے اسے سر سے پیر تک لرزا دیتے۔ سب کا خیال تھا مس چرن سیاہ فام اور بہت ہی کم رو تھیں۔ لیکن شمن کی آنکھیں کچھ اور ہی دیکھا کرتیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مس چرن سے بھی حسین کوئی اور شے ہو سکتی ہے۔ اسے اپنے رشتہ داروں سے لگاؤ تھا کچھ یونہی سا، خدا سے ڈرتی تھی مگر اس کے خیال میں غرق کبھی نہ ہو سکی۔ لیکن مس چرن اس کے لئے اپنے خون اور ایمان سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ عموماً ان کی تخیلی مورت کو عقیدت اور انتہائی جوشیلے محبت بھرے جذبات میں ڈوبی، پوجا کرتی۔۔۔ وہ آئیں مس چرن۔۔۔ وہ گئیں۔۔۔ وہ ان کی ساڑھی ہلی اور بلاؤز چمکا۔

اس کا پڑھنے میں بھی زیادہ دل نہ لگتا، مارے باندھے سے صرف مس چرن کی خاطر پڑھ لیتی تھی۔ گویا گھر کا کام مستعدی سے کر کے وہ مس چرن کے قدموں میں عقیدت کے پھول چڑھا دیتی تھی، اور تخیل کے ساتھ اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم بھی مس چرن کے قرب میں رہنے لگا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے آپ کو ان کے پاس محسوس کرتی۔۔۔ وہ کھڑی ہے، مس چرن کا خیالی ہیولا پاس سے گزر گیا ہے۔ وہ خود سو رہی ہے، مس چرن اسے تھپک رہی ہیں۔۔۔ وہ پیاسی ہے۔ حلق چٹخا جا رہا ہے اور مس چرن اس کے منہ میں ٹھنڈے ٹھنڈے خوشبودار عرق نچوڑ رہی ہیں۔ ان کا ہاتھ اس کے ماتھے پر ہے۔ وہ برف کی بنی ہوئی ہیں اور اس احساس سے وہ بغیر نیند کے اونگھنے لگتی، وہ دیکھتی رات کو اندھیرے میں روتی ہوئی بھٹکتی پھر رہی ہے۔ ٹھنڈی گھاس پر پڑی سردی سے کانپ رہی ہے۔ مس چرن اسے اپنے پروں بھرے پھولدار تکیہ پر لٹائے ہوئے ہیں۔ وہاں وہ ڈر کے مارے مکر سادھے پڑی ہے کہ اگر ہوش میں آ گئی تو سارا خواب بکھر جائے گا۔

مس چرن کا خیال اس کی جان کو مرض کی طرح لگ گیا۔ کچھ ان دنوں بورڈنگ میں آلو کھاتے کھاتے لڑکیوں کے ہاضمے بھی بگڑ چلے تھے اور شمن تو ہرا لا بلا ڈٹ کر کھا جاتی تھی۔ اس کی نیند بہت خراب ہوگئی۔ راتوں کو اٹھ کر بڑبڑاتی اور جیسے ہی آنکھ کھلتی اسے محسوس ہوتا کہ مس چرن کھڑی ہیں۔ اگر وہ ہلی تو غائب ہو جائیں گی۔ اندھیرے میں ان کے وجود کو گھور گھور کر وہ سونے کی کوشش کرتی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ایک رات کو اس نے اپنے آپ کو برآمدے میں مس چرن کے کمرے کے آگے کچھ ٹٹولتے ہوئے پایا۔ وہ ایک دم ڈر گئی، وہ کیسے اتنی دور تک سوتی ہوئی چلی آئی۔ جلدی جلدی کمرے میں آ کر بچھونے میں دبک گئی۔ یہ کیا ہو گیا تھا اسے؟ وہ خود تھی یا اس کا بھوت جو راتوں کو اسے گھسیٹے پھرتا تھا۔

دو تین دن بعد پھر اس نے مس چرن کے کمرے کے آگے خود کو ہچکیوں سے روتے ہوئے پایا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کیوں رو رہی تھی؟ یہ اسے نہیں معلوم ہوا۔ اسے واپس اپنے کمرے تک آتے میں بہت ڈر لگا۔ برآمدے میں اندھیرا اور جاڑوں کی وجہ سے سب کے کمرے بند تھے۔ وہ ڈرپوک نہ تھی اور بلی وغیرہ سے اسے خوف نہ آتا تھا۔ مگر لوٹتے وقت وہ تیز تیز بھاگنے لگی۔ گویا بہت سی غیر مرئی چیزیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب وہ میٹرن کے کمرے کے پاس پہنچی تو ہلکی سی لالٹین جل رہی تھی، موڑ پر ایک بھیانک سایہ زور سے اس کے آگے جھپٹتا چلا گیا، اس کی چیخ نکل گئی اور آنکھیں ہیبت سے پھٹ گئیں۔

میٹرن جاگ گئی اور نکل کر اس نے آواز دی "کون ہے؟" شمن دوڑ کر اس سے چمٹ گئی۔ میٹرن بھی بوکھلا گئی کہ یہ کیا بلا ہے اور اس نے زور سے اسے پرے دھکیل دیا۔

"یہ میں ہوں شمشاد، شمن۔" اس نے جلدی جلدی زمین سے اٹھتے ہوئے کہا "یہاں بھوت دوڑا میرے پیچھے۔" ابھی وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔

"بھوت! کہاں ہے بھوت؟ چلو اپنے کمرے میں۔" میٹرن اسے کمرے کی طرف دھکیلنے لگی، وہ خود ڈری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"رات کو بھی دنگا مچاتی ہیں۔" وہ بڑبڑائی اس کے کمرے میں آ کر میٹرن نے بجلی جلائی تو وہی بھوت بالکل شمن کے پاس کھڑا تھا۔ وہ پھر چیخی "بھوت!"

"کہاں ہے! ارے یہ تو تمھاری اپنی پرچھائیں ہے پگلی لڑکی۔" شمن کو بہت شرم آئی اور وہ چپکے سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ میٹرن بجلی بجھا کر بڑبڑاتی چلی گئی۔ مگر اسے بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس کا دل برابر دھڑک رہا تھا اور تمام جسم تنا ہوا تھا۔

اس نے رات کی بات کسی سے نہ کہی، توبہ! اگر مس چرن کو معلوم ہو جاتا کہ وہ رات کو بھوت بن کر ان کے دروازے پر رویا کرتی ہے تو وہ ضرور اس سے نفرت کرنے لگتیں۔ وہ تو انھیں اتنا بھی نہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس دماغ پر اس بری طرح چھائی ہوئی ہیں مگر یہ بات اوروں سے زیادہ دن نہ چھپی رہی اور پرنسپل صاحبہ نے ایک دن مس چرن سے کہہ دیا کہ وہ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو خراب کر رہی ہیں۔ بات یہ تھی کہ مس ممتاز ان کی چھوٹی بہن تھیں اور جب سے مس چرن آئی تھیں ان کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ علاوہ شمن جیسی مرنے والی لڑکیوں کے اور قریب قریب ساری لڑکیاں انھیں پسند کرتی تھیں۔

مس ممتاز بیڈمنٹن کھلاتی تھیں، اور مس چرن باسکٹ بال۔ زیادہ تر لڑکیوں کو باسکٹ بال پسند تھی۔ اور مس ممتاز کا کہنا تھا کہ مس چرن لڑکیوں سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہو کر ٹیچروں کا رعب کم کئے دیتی

تھیں۔ انھیں کے بھڑکانے سے لڑکیاں بیڈمنٹن کی بجائے باسکٹ بال کھیلنے لگی تھیں۔ یہ مس ممتاز کی ہتک تھی اور ساتھ ساتھ ان کی بہن پرنسپل کی۔ شمن کو بیڈمنٹن سے نفرت تھی کیونکہ مس ممتاز ان لڑکیوں کو بہت ذلیل کرتی تھیں جو ذرا کمزور تھیں۔ انھوں نے ٹیم بنائی تھی۔ سب سے اچھی کھیلنے والی لڑکیاں ایک طرف اور پھر سب سے برا کھیلنے والی جن میں شمن بھی تھی، دوسری طرف ـــ روز اچھی کھیلنے والی لڑکیاں جیتیں اور یہ ہارتیں۔ لہٰذا اس ذلت سے بچنے کے لئے جس دن بیڈمنٹن کی باری ہوتی شمن دردِ سر یا کوئی اور بہانہ کر کے مس چرن کو کھلاتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ ان کی ہر حرکت کا عکس وہ اپنے دل دماغ میں محفوظ کر لینا چاہتی۔ یوں انھوں نے گیند اچھالی، یوں اپنے پتلے سے ہاتھ کو ٹیڑھا کر کے جنبش دی ـــ وہ گئی گیند۔ لڑکیاں کہتی تھیں کہ ان کے ہاتھ سوکھے اور کالے ہیں مگر شمن کو وہ سنگِ مرمر کے سے نظر آتے تھے۔

راتوں کو وہ اب بھی برآمدوں میں سسکیاں بھرتی بھٹکا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جو رات کو اس کی آنکھ کھلی تو ہکابکا رہ گئی۔ پرنسپل ٹارچ لئے مس چرن کے کمرے میں لمبا سا چوغہ پہنے کھڑی تھیں۔ اور مس چرن پریشان شمن کو سیدھا بٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو رہی ہے۔ پھر ایک دم سے وہ چپ ہوگئی اور منہ پھاڑے مس چرن کو تکتی رہی۔ وہ مس چرن کے پلنگ پر بیٹھی تھی ! سچ مچ کا پلنگ !! وہ خواب داہمہ نہیں بلکہ سبز پھول کڑھا ہوا تکیہ، بھورا کمبل جس میں کشمشی گوٹ لگی تھی۔

اسے گھسیٹ کر اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

صبح پرنسپل نے اس سے بہت سے سوال کئے مگر اس نے منہ پھلا لیا اور کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ بھلا وہ کیسے اتنی بہت سی باتیں بتا دیتی جو وہ سوچا، دیکھا اور محسوس کیا کرتی تھی۔

تیسرے دن مس چرن اسکول چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ کسی لڑکی سے ملنے بھی نہ آئیں بس ایک دم چوکیدار ان کا سامان لے گیا۔ اور اس کے بعد دو بریں ہاتھ میں لئے نکلیں اور سیدھی پھاٹک سے باہر چلی گئیں۔ اسکول میں کھلبلی پڑ گئی۔ لڑکیاں ایک دوسرے سے سوال کرنے لگیں کچھ معلوم نہ ہوسکا، بس اتنا پتہ چلا کہ کچھ شمن پر بات اٹھی تھی جس پر مس چرن اور پرنسپل میں کھٹ پٹ ہوگئی۔ لڑکیوں نے شمن کو چاروں طرف سے گھیر کر سوالوں کی بارش کر دی، مگر وہ کچھ نہ بتا سکی۔ جب مس چرن کے جانے کی خبر پکی ہوئی تو ان کی ساری چاہنے والیوں نے رونا شروع کیا۔ اس پر پرنسپل صاحبہ اور مس ممتاز نے آکر سب کو خوب ڈانٹا۔ لڑکیاں بڑبڑا ہو کر چپ ہوگئیں۔

مگر شمن نے ایک آنسو بھی نہ بہایا، وہ خاموش چور بنی سب سے الگ الگ پھرتی رہی۔ مگر سارے وقت تول تول کر قدم رکھتی تھی جیسے کوئی چٹخی ہوئی چیز اٹھائے پھر رہی ہے جس میں ٹھیس لگ گئی تو چکنا چور ہو کر بکھر جائے گی۔

مس چرن کے جانے کے بعد وہ بہت سخت دل ہوگئی۔ اسے اتنا تو تجربہ ہوگیا کہ منجھو بی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور خود اس میں ہی کہیں چھپا ہوا تھا اور یہ ماننے کے لئے وہ قطعی تیار تھی۔ اسے اپنے دماغ کے اس حصے سے سخت نفرت تھی جو ہمیشہ سارا الزام اسی پر تھوپ دیا کرتا تھا۔ اس نے مس چرن کے متعلق سوچنا بہت کم

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کر دیا۔ ان کا خیال اس کے دماغ میں چھپے ہوئے زخم پر ٹہوکے لگاتا جس سے اسے روحانی اذیت ہوتی۔

وہ اس سال فیل ہوگئی۔ لہٰذا اسے مقامی مشن اسکول میں داخل کروا دیا گیا یہاں نوری بھی اس کے ساتھ جاتی۔ مشن میں مس چرن سے بھی زیادہ سیاہ فام ٹیچر تھیں۔ مگر شمن کو ان میں سے ایک بھی پسند نہ آئی۔ نوری بڑی تیز تھی اور بڑی آپا بھی اسے برابر مار مار کر پڑھاتی رہتی تھیں۔ اس لئے وہ بہت جلد اسکول میں جم گئی۔ مگر شمن سے نہ جانے لوگوں کو کہاں کا بیر تھا کہ وہ مستعدی سے کام کر کے بھی لے جاتی تو وہ اس سے اور بہتر کام کی توقع رکھتے۔ اسے کامل یقین تھا کہ وہ کند ذہن تھی۔ اور یادداشت تو اس کی بہت خراب تھی۔ سب کہتے تھے کہ وہ بہت جلد سب بھول جایا کرتی تھی۔ مس چرن کو وہ آخر بھول ہی گئی اور اسے غور کرنے پر بھی ان کا ناک، نقشہ، لباس، ہنسی، ان کا باسکٹ بال کھلانا یاد نہ آتا۔ جب شمن ان کے کمرے میں پڑھتی تھی تو وہ ان کا ہلکے ہلکے گنگناتے جانا، ایسے کہ شمن کو بجائے خلل کے ایک طرح کی مدد سی مل جاتی تھی۔ فضا کو کچھ اور چکنا اور ہموار سا کر جاتا۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا کہ وہ کسی مشکل سوال پر اٹک گئی ہے کہ مس چرن کے گنگنانے کی چھوٹی چھوٹی لہریں اس کے سوال کی گتھی سے ٹکراتیں اور وہ ڈھیلی ہو کر کھل جاتی، مگر نہیں، وہ یہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ دو برس اس نے مشن میں پڑھا، اسے ایک دفعہ بڑا درجہ ملا۔ اور دو چار انعام بھی ملے تھے مگر اس نے وہ سب لاپروائی سے پھینک دیئے۔ اسے کسی چیز کی قدر کرتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا، وہی زخم سا اس کے دماغ میں ٹیسیں مارنے لگتا جو مس چرن کے خیال سے دکھا کرتا تھا۔ دو برس اس نے بائبل پڑھی اور یسوع مسیح کی تعریف میں بہت سی نعتیں سیکھ گئی، مگر اسے یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ گرجے میں گھٹنے ٹیکنے کے لئے مونجھ کے گدے تھے، جن میں سوئیاں سی لگی تھیں جو بہت چبھتی تھیں۔

کئی دفعہ اس کا ارادہ ہوا کہ وہ بھی چپکے سے یسوع مسیح کی بھیڑ بن جائے مگر اماں کے ڈر کے مارے ہمت نہ پڑی۔ اسے یہ بات معلوم کر کے بہت حیرت ہوئی کہ یسوع خدا کے بیٹے تھے، مگر پھر بھی لوگوں نے ان کو چین سے نہ چھوڑا۔ آخر یہ دنیا اس قدر گناہ گار کیوں ہے؟ لوگ جھٹ پٹ اچھی باتیں سیکھ کر مزے سے جنت میں کیوں نہیں چلے جاتے۔

مقدس ماں کنواری تھی! یہ سوچ کر اسے ذرا ہنسی آتی، اور وہ خود بھی تو کنواری تھی اگر خدا نہ کرے بیٹھے بٹھائے خدا باپ اس کے یہاں بھی ایسا ہی بھولا بھالا منا سا یسوع پیدا کر دے تو وہ کیا کرے۔ یقیناً اماں تو اس کے لئے دودھ دیں گی نہیں اور کپڑے تو خیر وہ پرانے کرتوں کے بنا لے گی۔ مگر پھر اسے یاد آتا کہ جب اس کے دھوبی کی لڑکی کے ایسا ہی منا پیدا ہوگیا تھا۔ تو سب نے کیسی تھڑی تھڑی کی تھی۔ شمن نے اس کو بہت سمجھایا کہ وہ بیوہ ہے تو کیا "خدا باپ" کی قدرت میں کسی کو کیا دخل ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے، مگر وہ کہتی تھی کہ "نہیں بی بی، میں نے تو پاپ کیا ہے۔" اور باوجود گھنٹوں سوچنے کے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ پاپ ہوتا کیا ہے اور لوگ کیوں کرتے ہیں۔ گھر آکر اس نے اماں وغیرہ کو جب یسوع کی تعریف میں نعتیں سنائیں تو انھوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور اسے بہت ڈانٹا کہ کیا اب وہ عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لہٰذا مجبوراً اسے واپس اسی پرانی درس گاہ میں بھیج دیا گیا جہاں پہنچ کر مس چرن کا داغ پھر ہرا ہوگیا اور مس ممتاز سے نفرت چوگنی بڑھ گئی۔

(12)

اس بار اسکول کی نئی زندگی نئی بلاؤں کے ساتھ شروع ہوئی جو اس پر یکا یک ٹوٹ پڑیں۔ نہایت گندی، شرمناک اور نفرت انگیز مصیبتیں۔ کئی دن تو وہ خودکشی کے منصوبے باندھتی رہی کیونکہ یوں رنجھ رنجھ کر مرنے سے تو ایک دفعہ زہر نگل لینا ہزار درجہ آسان تھا مگر گھر میں تو کسی قسم کا زہر دستیاب ہونا بھی تو مشکل تھا۔ جسمانی تبدیلیوں سے تو وہ اور بھی بدحواس ہونے لگی تھی۔ اور گھنٹوں تنہائی میں آنسو بہایا کرتی۔ اسے پہلی جماعت کی وہ بھیانک استانی یاد آجاتیں جو بالکل گوشت کا بے ہنگم لوتھڑا تھیں۔ ویسے ہاتھ پیر تو ان کے سوکھے مارے تھے مگر پیٹ اور کلیجہ پر گوشت کے پلندے لدے ہوئے تھے۔ لڑکیاں ان کا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ اور عجیب عجیب بے ہودہ لطیفے ان سے وابستہ کرلئے تھے۔ ان کی نفرت محض نفرت نہ تھی، بلکہ اس میں ایک طرح کا خوف اور کراہت پوشیدہ تھی۔ اصلی گھن تو شمن کو ان سے اس دن ہوگئی تھی جس دن وہ بھولے سے ان کے غسل خانہ میں گھس چلی گئی تھی۔ وہ ہمیشہ نہاتے وقت دروازے میں کنڈی چڑھانا بھول جایا کرتی تھیں۔ ملاجی کے بعد یہ دوسرے ہستی تھی جسے دیکھ کر اس پر فالج کی سی حالت طاری ہوگئی تھی۔

وہ خاموش تنہائیوں میں پڑی نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی۔ مستقبل بھیانک خوابوں کے نئے نئے چولے بدل کر اس کے سامنے ناچا کرتا۔ کاش کوئی ایسی دوا ہوتی جسے کھا کر وہ چوہیا برابر ہوجاتی، وہ بہت ہی تیزی سی بڑھ رہی تھی۔ جسم کے مختلف حصے مختلف اوقات میں بڑھ رہے تھے۔ پہلے تو جیسے اس کی ٹانگوں کو جسم سے نفرت ہوگئی اور وہ بے طرح لمبی ہونے لگیں۔ رات کو وہ محسوس کرتی اس کی ٹانگیں بڑھ رہی ہیں، لمبی لکیروں کی طرح لہراتی، پلنگ پر سے اتر کر دیوار پر سے رینگتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بہہ رہی ہیں۔ وہ جلدی سے کہنی کا سہارا لے کر ٹانگوں کو دیکھتی تو وہ جھٹ سے کینچوے کی طرح سکڑ جاتیں، گویا اس نے انھیں عین وقت پر پکڑ لیا ورنہ بھاگ ہی گئی ہوتیں۔ وہ کنکھیوں سے لیٹ کر دیکھتی کہ اب کیا کر رہی ہیں اس کی ٹانگیں۔ مگر وہ ہوشیار سانپوں کی طرح مکر کئے پڑی رہتیں۔ یہی نہیں اس کے جسم کا ہر حصہ غیر سا ہو چلا تھا۔ ناک ایک دم چہرے سے روٹھ کر اپنے راستے پر چلنے لگی۔ اس نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک شہزادے کی ناک تین فٹ لمبی ہوگئی تھی، بے چارہ شہزادہ! کوئی اس سے بات بھی نہ کرتا۔ اس کی چوٹی بھی کچھ عجیب بے تکی سی ہوگئی تھی، جیسے چائے دانی کا کنڈا۔ اینٹھی ہوئی چھوٹی سی دم جو اس لمبوتری گردن پر کسی طرح نہ جمتی۔ ایک مرض کا علاج تو اتفاق سے اس کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے اماں کی بیماری کو بھانپ لیا تھا۔ گو اس سے چھپائی گئی تھی۔ مگر اس کی تیز نگاہوں نے اس شیشی کو دیکھ لیا تھا جس نے ان کی جان بچائی تھی، موقع پا کر اس نے وہ دوا چڑھالی۔ اثر

فوری ہوا اور وہ قطعی اچھی ہوگئی۔ بھلا اگر وہ کسی کو اپنا مرض بتا دیتی تو اتنی جلدی کوئی دوا تھوڑی کر دیتا اس کی تو ہر بات کو نالا جاتا تھا۔ دوسرے سنجھلی بہن نے اسے ایک دفعہ اس قسم کی بات کرنے پر بہت بے شرم کہہ کر ڈانٹ دیا تھا اور غضب تو یہ تھا کہ نوری اس تمام شرمناک رازوں کی ٹوہ میں لگی رہتی مگر وہ ہمیشہ اس سے دور رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ نوری حقارت سے مسکرائے گی اور سب سے جا کر شکایت کر دے گی۔ اپنے دکھوں میں وہ آپ ہی گھلا کرتی، مگر خاک گھلا کرتی تھی! گوشت تو جگہ بے جگہ تھپا چلا رہا تھا۔ اس نے بھاگنا دوڑنا کم کر دیا تھا۔ جیسے ہوا سے بھی ٹیسیں چبھتی تھیں۔ جسم پکا پھوڑا ہوگیا تھا اور پنڈلیوں میں اینٹھن ہوتی تھی۔ بڑی جماعت کی لڑکیوں سے اسے بہت نفرت تھی۔ اور وہ ان کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتی تھی۔ دھپا دھپ جب وہ رسی کودتے وقت زمین پر پیر پٹختیں تو ان کے کرتوں میں بلیاں سی لڑتی معلوم ہوتیں۔ مگر شمن کسی نہ کسی طرح کھیل میں شرکت کرنے سے بچ جاتی۔ اسے ہر روز سزائیں ملتیں لیکن وہ سب برداشت کرتی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے کوئی معقول بہانہ نہ پایا تو کیچ سے بلیڈ سے اپنا پیر کاٹ لیا اور بڑی دیر تک اپنی کامیابی پر مسکراتی رہی۔

ایک دم اس کی طبیعت خراب رہنے لگی، کھڑے کھڑے چکر آجاتے، ہاضمہ خراب رہتا، منہ پر کالے اور سفید سفید چکتے پڑ گئے، ماتھا پسینوں سے لد گیا اور سارے جسم میں کھلبلی مچتی رہتی۔ خون جیسے کھولتے ہوئے تیل کی طرح بھاری بھاری اسے جسم میں لہراتا ہوا محسوس ہوتا۔

اسے ست دیکھ کر کسی نے پروا نہ کی۔ بس سزائیں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ اماں ابا کے پاس بھی بہت بری شکایت گئی۔

اسی زمانے میں سالانہ ڈاکٹری معائنے کا وقت آیا تو اسے ہزاروں فکروں نے گھیر لیا۔ وہ کئی دن پہلے سے سہمی ہوئی رہنے لگی، یہ اسکول میں اس کا پہلا معائنہ تھا۔ وہ ہزاروں بہانے تلاش کرنے لگی۔ مگر جب جلاد تلوار اٹھا لیتا ہے تو پھر بچاؤ مشکل ہوجاتا ہے۔

جب میٹرن نے اس سے کپڑے اتارنے کو کہا تو اس نے اسے ''گدھی'' کہہ دیا جس پر میٹرن کو روتے روتے دورہ پڑ گیا۔ سوکھی ماری بڑھیا میٹرن بھلا اس کے دکھوں کو کیا سمجھ سکتی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اس کے دو طمانچے لگائے مگر وہ اس سے بھی کشتی لڑتی رہی۔ ڈاکٹرنی نے اس سے بہت سے بیہودہ سوال کئے۔ جن کا اس نے ''نہیں'' میں ہی جواب دیا۔ جان بوجھ کر وہ اس کے پیچھے ہی پڑ گئی۔

اس کے بعد اس کا دوبارہ جو معائنہ ہوا تو اس نے بہت ہی فیل مچائے۔ اس مردار ڈاکٹرنی کو لوگوں کو ٹٹولنے کا وہ شوق تھا کہ حد نہیں۔ بلا کی طرح چمٹ گئی۔

اسے زبردستی دوا پلائی اور چند ہی دن میں اس کا خوفناک مرض پھر سے پھوٹ نکلا۔ اور غضب یہ کہ سارے اسکول میں دھوم مچ گئی۔ لڑکیاں مارے تجسس کے نجانے کیا سوچنے لگیں۔ نوری اسے دیکھنے کے بہانے بھید لینے کئی دفعہ آئی۔ مگر شمن نے اسے ڈانٹ ہی بتائی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''سچی بتاؤ شمن۔'' وہ بولی۔

''کیا؟''

یہی۔۔کہ۔۔۔۔برجیس کہتی ہے کہ تمھارے بچہ پیدا ہوا ہے۔''

ہیبت کے مارے چیخیں مارنے لگی۔ اچھا تو یہ بات تھی مگر ڈاکٹر نے تو کچھ نہ بتایا، حد ہوگئی نہ زیادتی کی۔ کسی نے اگر ابا کو لکھ دیا تو موت سمجھ لو۔ گیندا کی جو گت بنی تھی وہ یاد تھی مگر پھر اس کا ننھا منا بچہ اسے بے طرح یاد آنے لگا۔

''تو پھر گیا کہاں؟'' اس نے دل ہی دل میں سوچنا شروع کیا۔ شاید چھپا دیا گیا ہو۔ لیکن وہ پالتی بھی کیسے۔ اسکول کا کام، امتحان سر پر، بھلا بچے کو کون پالتا۔ لیکن یہ ان کی لوگوں کی زیادتی تھی کہ اسے دکھایا بھی نہیں گیا۔ وہ دیکھتی شکل وصورت کس کی ہوگی۔ بہت ہی ذرا سا ہوگا، اور پریشانی دور ہو کر اسے ایک طرح کی فکر سی لگ گئی۔

اس کا بخار اترا اور وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ جب بھی کسی نے بچہ وچہ نہیں دکھایا۔ ایک دن اس نے باتوں باتوں میں سعادت سے ذکر بھی کیا۔ سعادت آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

''مگر تمھاری شادی تو ہوئی نہیں۔''

''ہیں۔۔۔شادی نہیں ہوئی تو پھر سعادت۔۔۔؟'' وہ چپ رہ گئی۔ اس نے جو تخیل میں ننھا منا چوہے برابر بچہ بنا رکھا تھا آہستہ آہستہ دھندلا ہونے لگا۔

''مگر نوری جو کہتی تھی۔''

''نوری کو کیا معلوم۔'' سعادت بزرگانہ انداز سے بولی۔ ''کسی سے کہنا بھی مت پگلی کہیں کی۔''

پھر سعادت نے اسے بہت سی باتیں بتائیں اور وہ ہنستے ہنستے بے دم ہوگئی۔ شمن کو بھی ہنسی آ گئی۔

جب وہ تنہا پلنگ پر لیٹی تو اسے اس خیالی بچے کے کھو جانے کا بہت دکھ ہوا۔ نوری کی اطلاع کے بعد وہ سچ مچ کا ایک ننھا منا سا کلبلاتا ہوا بچہ کہیں اپنے سے قریب ہی محسوس کرنے لگی تھی، بعض وقت تو اسے یہ شبہ بھی ہونے لگتا کہ وہ اس کے پہلو میں پڑا سو رہا ہے اور اگر ذرا بھی ہلی تو جاگ جائے گا۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کے اعضاء اکڑ سے جاتے اور وہ سانس روک دیر تک پلنگ پر ہلے جلے بغیر پڑی رہتی۔ اکثر سوتے سوتے اسے بچے کے رونے کی آواز آتی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رات کے اندھیرے میں اس واہمے کو تلاش کرتی رہتی۔ حتیٰ کے پھر اس کی آنکھ لگ جاتی۔ وہ اس ننھی سی جان کے ساتھ نہ جانے کب تک اسی طرح آنکھ مچولی کھیلتی رہتی۔ اگر سعادت اس پر حقیقت کا انکشاف نہ کر دیتی اور اب؟ اب نہ جانے کیوں بچے کے خیال سے ہی اسے شرم آنے لگتی، توبہ! کیسی بری بات تھی۔

زندگی جیسے دھندلکوں میں سے نکل کر روشنی میں آتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے سب دکھ دور ہونے لگے۔ گو اس کی سانس گھٹتی، مگر وہ سب باتوں کی عادی ہوگئی، زندگی نے رکھ رکھاؤ خود ہی سکھا دیا۔

(13)

بات ختم ہوگئی تھی مگر اس واقعہ کی نوری نے وہ تھڑی پیٹی کہ ایک دن پکڑ کر اسے ٹھونک دیا۔ گھر میں وہ نوری کو بڑی آپا سے چھپا کر چار چوٹ کی مار دیا کرتی تھی۔ مگر مجال تھی جو وہ شکایت ہی کر جاتی۔ بڑی آپا تو خیر اسے مارلیتیں مگر پھر وہ نوری کو زندگی کا مزہ چکھا دیتی۔ یہاں آ کر تو نوری بڑی مہذب بننے لگی تھی۔ چڑیا کی بیٹ تک کو وہ باتھ روم کہنے لگی تھی۔ اور بڑی اترا کر ''دیکھئے دیکھئے'' کہہ کر بولتی تھی۔ پھر اسے شمن نے اس کی سہیلیوں کے سامنے مارا۔ نوری جوان عورتوں کی طرح ماتم کر کر کے رونے لگی۔ اور شام تک اپنا بستر بوریا اٹھا کر اپنی سہیلی جلیس کے یہاں جا پڑی، بڑی آپا کو ایک نہایت ہی دردناک خط لکھا جس پر وہ اس کے مرحوم باپ کو یاد کر کے خوب روئیں اور پرنسپل کو ایک منت بھرا خط لکھا کہ یتیم بچی نوری کو شمن کے پنجے سے نجات دلائیں۔ نوری ہنسی خوشی جلیس کے کمرے میں رہنے لگی اور شمن کے کمرے میں بڑی بڑی آنکھوں والی رسول فاطمہ آ گئی۔

رسول فاطمہ سے شمن کو جو نفرت تھی وہ جنون کی حدوں سے بھی آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے رونق تھیں۔ جیسے چپٹی تھالی میں دو مینڈک رکھے ہوں۔ باریک سیدھی سیدھی تنکوں جیسی پلکیں اور کھردرے بھورے رنگ کے بپوٹے، ہر وقت ان میں بے کسی، غربت اور بیوقوفی جھلکتی رہتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے شمن کو ایک دم ان آنکھوں پر غصہ آنے لگتا۔ اور جی چاہتا ان میں گرم لوہے کی کیلیں ٹھونک دے۔

وہ بات بے بات اسے جھڑک دیتی۔ اگر بھولے سے اس کا میلا دوپٹہ یا بوسیدہ کتاب شمن کی میز یا بستر پر رکھی رہ جاتی تو اس کا دماغ توازن بگڑ جاتا اور وہ جھلا کر اسے دور پھینک دیتی۔ یہ نفرت اور بھی بڑھتی گئی جب اس کے ہر ظلم کے جواب میں رسول فاطمہ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے سڑے ہوئے ہونٹوں میں سے ٹیڑھے میڑھے دانت نکال کر گھگھیانے لگتی۔ اور کبھی تو وہ چیزوں کو بے رحمی سے ایسے پھینکتی کہ وہ اس کے منہ پر جا لگتیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''اوں، بھئی ہمیں یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔'' وہ اسے مذاق سمجھتی تھی گویا شمن اتنی گری پڑی تھی کہ رسول فاطمہ سے مذاق کرے گی۔ وہ پھن کچلے ہوئے سانپ کی طرح بھنا جاتی مگر رسول فاطمہ اس کی طرف پیار سے دیکھ کر اپنی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں مٹھاس پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔

اسکول میں ساتھ سونے کی سخت ممانعت تھی۔ مگر رسول فاطمہ کو اس قدر ڈر لگتا تھا کہ وہ آخری گھنٹی بج جانے کے بعد شمن کے پلنگ کے قریب پلنگ لے آتی۔ شمن نے کئی دفعہ حقارت سے اسے دھتکارا بھی لیکن وہ سچ مچ اس کے پیر چھونے لگی۔ اس نے بتایا کہ جب سے اس کی ماں طاعون میں مری ہوئی دو دن تک گھر میں پڑی رہی تھی تب سے اسے مُردوں سے بہت ڈر لگنے لگا تھا۔ اور اندھیرا ہوتے ہی اسے چاروں طرف سے روحیں گھیرنا شروع کر دیتی ہیں۔

''اچھا چپ رہو۔'' شمن نفرت سے اس کو ہر بات پر ڈانٹتی اور وہ خاموش ہو کر ہولے ہولے قرآن شریف کی آیتیں پڑھ کر چاروں طرف پھونکتی مگر جب اس نے ان مقدس آیتوں کی برکت شمن پر پھونکنا چاہی تو اس نے ایک چانٹا اس کے منہ پر جما دیا۔

''سور یا، ہمارے منہ پر تھوک دیا۔'' اس نے دانت پیس کر رسول فاطمہ کو اس پلنگ پر گرا دیا۔ رسول فاطمہ بہت ہی سوکھی ماری تھی ذرا سے ٹھوکے سے بیدم ہو جاتی۔

ایک دفعہ رات کو شمن کو اپنی گردن پر چوہا سا پھدکتا محسوس ہوا، اندھیرے میں وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ چوہا رسول فاطمہ کے پلنگ پر بھاگ گیا۔۔۔ وہ phr لیٹ گئی۔ نیم غنودگی کی حالت میں اسے پھر چوہا پٹی پر رینگتا معلوم ہوا۔ دھندلکے میں بڑے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ چوہا نہیں بلکہ سوتے میں رسول فاطمہ کا ہاتھ ہل رہا تھا۔ وہ کروٹ بدل کر سو گئی۔

جیسے اس نے خواب میں دیکھا کہ چوہا پھر رینگا۔ اور قبل اس کے کہ وہ اسے جھٹک سکے وہ اسے پچھاڑ کر اس پر پوری طرح قابض ہو گیا۔ اس کے جسم کی ساری رگیں اکڑ کر تانت کی طرح تن گئیں۔ ساری قوت ایک دم سن سے اس کے جسم سے نکل گئی اب وہ کبھی جنبش نہ کر سکے گی۔ رسول فاطمہ کی سوکھی ہوئی انگلیاں کیلوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ مگر وہ اسے نہ روک سکی۔ جیسے شیر اپنے شکار کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نگلتا ہے۔ بالکل اسی طرح۔۔ وہ سہمی ہوئی خاموش لیٹی رہی اور چوہے دوڑتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی ڈوبی ہوئی طاقت ابھرنے لگی۔ ایک ہی دفعہ اس کا سارا جسم بغاوت پر تن گیا اور اس نے چاہا ایک ہی جست میں وہ رسول فاطمہ کو پچھاڑ کر اٹھ بھاگے، مگر وہ ہلی بھی نہیں۔ احساس ذلت نے اس کی ساری طاقت سلب کر لی۔ اُف۔۔۔ اس کی یہ گت اور وہ بھی رسول فاطمہ کے ہاتھوں۔ اگر وہ جاگنے کا اعلان کرتی ہے تو پھر تو اسے رسول فاطمہ کو مار ڈالنا چاہئے۔ اس نے سوچا، وہ ایسے ہلے گویا سو رہی ہے۔ مگر کچھ دیر میں جاگ جائے گی تو شاید رسول فاطمہ ڈر کر اسے چھوڑ دے گی۔۔ مگر بھلا، وہ ایک بھنتی تھی اور فیصلہ جلدی چاہتا تھا۔ لہٰذا ایک دم جھلا کر اس نے اتنی زور سے کروٹ لی کہ اس کی کہنی رسول فاطمہ کی ابلی ہوئی آنکھ میں لگی مگر ذرا اوچھی، کروٹ لے کر اس نے اپنے جاگنے کا اعلان کر دیا

''کون ہے؟''

''میں۔۔۔ میں ہوں تمہاری رسول فاطمہ۔''

کیا؟ اس کی رسول فاطمہ؟ اگر وہ اتنی ڈری ہوئی نہ ہوتی تو اسے اس گستاخی کا اسی دم مزہ چکھاتی، مگر موقع نہ تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے زور سے اپنی چارپائی دور دھکیلی، ایسے کہ رسول فاطمہ کا پرانا پچکا ہوا صندوق چورا ہو گیا۔

صبح اٹھ کر اسے رسول فاطمہ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ پڑتی تھی مگر وہ بھری بیٹھی تھی کہ وہ بولے تو بس اس کی جان کو ہی آ جائے۔ لیکن رسول فاطمہ بھیگی بلی بنی شمن کا تازہ رنگا ہوا دوپٹہ چن رہی تھی، یہ دیکھ کر وہ جل گئی اور ایسے زور سے جھٹکا دے کر دوپٹہ چھینا کہ رسول فاطمہ گر پڑی۔۔۔، ساری اس کے ہاتھوں کی گھائیاں چھل گئیں مگر وہ برا نہ مانی بلکہ رحم طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی، جیسے یہ چنگیزی مظالم اسے بہت ہی بھاتے ہیں۔ شمن نے بھنا کر جو دوپٹے کی چنٹ کھولی تو کئی شوب کھایا ہوا دوپٹہ مسک گیا۔ اب تو اس نے واقعی اسے ایسے دھکیلا کہ بچاری کی نئی تین پیسے کی صراحی چکنا چور ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی بے جان آنکھیں زخمی مینڈکوں کی طرح پھول کر اور ابھر آئیں اور ان میں غلیظ نمی جھلکنے لگی۔

ذرا ذرا سی بات پر شمن اسے دھتکارتی رہتی۔ لیکن وہ یا تو چپکی سہتی رہتی یا پھر ہیں ہیں کر کے بے جان ہنسی ہنسنے لگتی۔ گویا اس کی ٹھوکروں میں جفا کی چاشنی بھری تھی۔

''بھئی ایسا بھی مذاق کس کام کا، لے کے ساری چوڑیاں توڑ دیں، ظالم کہیں کی!'' وہ اسے اس قدر پیار سے دیکھنے لگی کہ شمن گھبرا کے کمرے سے بھاگی۔ اس کا جی چاہا سب کچھ جا کر میٹرن سے کہہ دے مگر اس کے پیر رک گئے۔۔ کیا کہے گی وہ اس سے جا کر؟ ابھی گذشتہ مہینے چھوٹی کلاسوں کی بچیوں کو یہودہ کھیل کھیلنے پر سزا ملی تھی۔ وہ لحافوں میں دبکی ہوئی ایک دوسرے کو بچے جنوا رہی تھیں! توبہ!!

رسول فاطمہ کی صورت دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ شام کو وہ سعادت کے ساتھ بیٹھ کر گھر کا کام کر رہی تھی کہ ایک چھوٹی بچی نے دروازے کی آڑ سے اسے بلایا ''یہاں آیئے شمن باجی''۔۔۔ یہ چھوٹی بچیاں بورڈنگ میں بڑی لڑکیوں کی لونڈیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ چھوٹے موٹے کام، رقعہ پیغام لے جانا، چمن میں سے پھول چرا کر لانا، کتابیں لاد کر ادھر ادھر لے جانا اور اس کے بدلے میں کبھی کبھی بڑی لڑکیوں کے سر یا پیر دبانے کی عزت حاصل کرنا۔ جتنی زیادہ ہر دل عزیز لڑکی ہو گی اتنی ہی زیادہ چھوٹی لڑکیاں اس کی خدمت میں حاضر رہیں گی۔ شمن ان چھوٹی لڑکیوں میں زیادہ عزیز نہ تھی کیونکہ ابھی وہ خود نہایت چھچھوری سی تھی۔

''کیا ہے؟'' اس نے رکھائی سے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

''یہ رسول فاطمہ آپا نے دیا ہے''۔ ایک پرچہ دے کر وہ لڑکی شرماتی ہوئی بھاگ گئی۔ رسول فاطمہ نے نہ جانے کن خوشامدوں اور رشوت دہی کے بعد لڑکی کو پیغام بری کے luy راضی کیا ہو گا کیونکہ عام لڑکیاں خصوصاً

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

چھوٹی لڑکیاں اس سے بہت نفرت کرتی تھیں۔

پرچہ لے کر ثمن کے ہاتھ کانپنے لگے۔اس نے سعادت کی نظر بچا کر جلدی سے سویٹر کے گریبان میں چھپا لیا اور واپس پڑھنے آ بیٹھی۔لیکن پریشانی کی وجہ سے اس سے خاک بھی نہ پڑھا گیا۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اسے اغوا کرنے کا خط لکھا ہے اور وہ واقعی خطرہ میں ہے۔

اس نے چاہا کہ کوئی بہانہ کر کے باہر چلی جائے، خط پڑھنے کے لئے وہ بے چین ہونے لگی۔لہٰذا وہ غسل خانے جانے کا بہانہ کر کے اٹھی، خط میں لکھا تھا:

''میرے من مندر کی دیوی

آہ، اپنے عاشق سے کیوں ناراض ہو، کب تک خفا رہو گی۔اگر ایسی ہی مجھ سے نفرت ہے تو اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دو۔۔۔یہ تم نے کیا جادو کر دیا ہے۔۔۔ایک دفعہ اپنے پیروں پر سر رکھ کر معافی مانگ لینے دو۔

تمہاری حسن کی پروانہ

رسول فاطمہ

ہیبت کے مارے وہ شل ہوگئی۔کس قدر بدمعاشی کا خط لکھا گیا تھا۔اب؟ کمرے میں واپس جانے کا خیال سے اس کا دم نکلنے لگا۔وہ کوئی ایسا بہانہ کرے کہ سعادت اسے اپنے کمرے میں پناہ دیدے۔سونے کی گھنٹی بج گئی اور وہ کوئی عذر نہ تراش سکی۔گھنٹی کی ضربوں کے ساتھ اس کا دل بھی اونچی آواز میں دھڑکنے لگا اور وہ ڈری کہ سعادت نہ سن لے۔

غیر ارادی طور پر قدم رکھتی ہوئی وہ کمرے میں آئی۔اس نے رات کے کپڑے نہیں بدلے، پیر لٹکائے پلنگ پر بیٹھی رہی۔نیم وحشی خیالات اسے پریشان کرنے لگے ایک لمبی آہ کمرے میں سرسرائی اور رسول فاطمہ نے کروٹ لی۔ثمن آہستہ سے تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔اب اندھیرے میں اس نے محسوس کیا کہ رسول فاطمہ کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے جسم میں چبھ رہی ہیں۔اس پر ایک دم سے نامعلوم خوف طاری ہو گیا اور جی چاہا کہ کسی کی آغوش میں یوں چھپ جائے جیسے چیل جھپٹا مارتی ہے تو چوزے دوڑ کر مرغی کے پروں کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ باہر نکل آئی اور برآمدے میں کھمبے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو سردی لگ جائے گی۔'' رسول فاطمہ اس کے ساتھ ساتھ رینگ آئی تھی۔مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور غسل خانوں کی طرف چل دی۔۔۔جب وہ وہاں سے نکلی تو رسول فاطمہ کھڑی کھڑی تھی۔۔۔وہ چپ نہیں اوڑھے تھی اور اس کے بدوضع رات کے کپڑوں میں سے اس کا حقیر مریل جسم ظاہر ہو رہا تھا۔وہ اسے دھکا دیتی ہوئی ہاتھ دھونے کے نل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور غیر ارادی طور پر پانی کی دھار اپنی انگلیوں میں سے چھاننے لگی۔

''چلو گی نہیں ثمن۔۔؟'' رسول فاطمہ منمنائی۔ثمن نے کچھ جواب نہ دیا۔۔نل بند کر کے وہ اپنے حلق میں گیلی انگلیاں ڈالنے لگی۔حلق میں گدگدی ہوئی، کوا اینٹھا۔

''اُو۔۔۔اوق'' وہ قے کرنے لگی باوجود دھکیلنے کے رسول فاطمہ اس پر چڑھی چلی آئی اور گھبرا گھبرا کر اس کی پیٹھ سہلانے لگی، واقعی اسے قے ہونے لگی۔ہر جھٹکے پر اس کے گلے کی نسیں پھٹنے لگتیں اور معلوم ہوتا زبان ٹوٹ آئے گی۔جب ذرا جی ٹھہرا تو رسول فاطمہ دیوانوں کی طرح روتی ہوئی میٹرن کو بلا کر لائی۔میٹرن نے باورچی کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور اسے الائچی چبانے کو دی۔

''مجھے مریضوں کے کمرے میں پہنچا دیجئے ۔۔۔نہ جانے جو پھر قے ہوئی تو۔''

رسول فاطمہ بورڈنگ کے اصول سے واقف ہو کر بھی اس کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگی۔مگر میٹرن نے اسے ڈانٹ بتائی کیا عجب کوئی چھوت کی بیماری ہو!

دیر تک وہ بدبودار رضائی اوڑھے بیمار بنی مسکراتی رہی۔۔اس کا حلق بری طرح جکڑ رہا تھا اور کنپٹیاں دکھ رہی تھیں۔مگر اسے معلوم ہوتا تھا کہ چیل سے بچ کر وہ مرغی کے پروں میں دبکی ہوئی ہے۔

ایک تو رات کا کھانا نکل گیا، دوسرے صبح جو بدبودار بسکٹ ملتے تھے وہ بھی بند کر دیئے گئے تو مجبوراً اسے دوپہر تک تندرست ہونا پڑا۔کھانے پر وہ حسب معمول رسول فاطمہ کے پاس نہیں بیٹھی۔چونکہ دعا ہو گئی تھی اس لئے رسول فاطمہ اٹھ کر اسے بلانے نہ آ سکی۔کھانا کھاتے میں جو ایک دفعہ اس کی نظر میز کے دوسرے سرے پر گئی۔تو اس نے دیکھا کہ وہ کچھ کھا نہیں رہی ہے اور اس کے لئے حسب معمول کھانا نکال کر لگا دیا ہے۔اس کی مسکین صورت اور پھیلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ثمن کا دل پھر قے کرنے کو چاہنے لگا۔اس نے اسی دن میٹرن سے کہہ دیا کہ وہ کھانے پر اپنی جگہ بدلنا چاہتی ہے سعادت کے پاس ایک جگہ تھی وہاں وہ بیٹھنے لگی۔

نماز کے وقت وہ کچھ نہ بول سکی۔جب رسول فاطمہ اس کے قریب نیت باندھ کر کھڑی ہو گئی تو پورے وقت وہ یہ کوشش کرتی رہی کہ سجدہ کرتے وقت اس کی کہنی رسول فاطمہ سے نہ چھو جائے۔اس لئے وہ بار بار آیت بھول جاتی۔

رات پھر مصیبت بن کر چھانے لگی اور اس پر پریشانی نے حملہ کر دیا۔آج وہ بالکل بے بس ہو گئی تھی۔کوئی بچاؤ کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔بڑی دیر تک وہ نفلیں پڑھتی رہی پھر اس نے ''یا حافظ'' کا ورد کیا۔آج اسے خدا بے طرح یاد آ رہا تھا۔اور وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی مگر کیا دعا اس نے مانگی؟ اس کے منہ سے تو ایک لفظ بھی نہ نکلا اور پاس ہی رسول فاطمہ دوزانو بیٹھی ہاتھوں کا چلو اوپر اٹھائے ہل ہل کر دعا مانگ رہی تھی۔ثمن کا جی اور پریشان ہو گیا۔اس کو ایسا معلوم ہوا رسول فاطمہ کے چلو میں ڈھیری دعا جمع ہو گئی ہے اور جی چاہا ایک ہاتھ ایسا مارے کہ ساری دعا باجرے کے دانوں کی طرح بکھر جائے اور جب رسول فاطمہ اسے بٹورنے جھکے۔۔۔تو۔۔۔مگر اس خیال کے ساتھ ہی اسے ترکیب سوجھی۔۔۔رات ہو چکی تھی اور میٹرن اپنا چکر ختم کر کے اپنے کمرے میں جا چکی تھی، ان دونوں کو عبادت میں مشغول دیکھ کر وہ کچھ نہ بولی۔کیونکہ یہ مذہبی معاملہ تھا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

،ایک دفعہ اس نے لڑکیوں کو میدان میں شب قدر منانے سے روکا تھا تو غل مچ گیا تھا۔ دوسرے دن مقامی اخباروں کی سرخیاں عیسائی میسٹرن کے خلاف زہر اگل رہی تھیں۔

وہ چپکے سے اٹھے اور آہستہ سے نماز کے کمرے کی کنڈی چڑھا کر سیدھی اپنے کمرے میں۔۔۔رسول فاطمہ نے چونک کر اسے پکارا۔''ثمن'' مگر وہ تیز تیز قدم چل پڑی۔

کمرے میں پہنچ کر اس کا دل آزاد چڑیا کی طرح ہلکا پلکا ہو گیا۔۔۔ پلنگ پر لیٹ کر وہ خاموش دبے قہقہوں میں ڈوب گئی۔

نماز کا کمرہ دور تھا اتنی دور کہ اگر رسول فاطمہ چیختی تب کہیں اس کی آواز سنائی دیتی۔ خاموش سر جھکائے وہ اس کی آواز کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن سوائے جھینگروں کی چیں چیں کے وہ اور کچھ نہ سن سکی۔۔صبح رسول فاطمہ اس کی شکایت کر دے گی۔ پھر۔۔ پھر؟۔۔۔وہ طرح طرح کے بہانے سوچنے لگی، اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک خوفناک سانپ پر پتھر پٹخ کر بھاگ آئی ہے اور اب وہ وہاں پڑا دم توڑ رہا تھا۔ کہتے ہیں سانپ کو مار ڈالو تو ناگن بدلہ لینے آتی ہے ۔۔۔۔لیکن رسول فاطمہ کے بعد تو اسے کسی ناگن کا خوف نہ تھا۔ رسول فاطمہ دنیا میں تنہا آئی تھی، تنہا رہتی تھی اور تنہا ہی چلی جائے گی۔۔کل سے وہ اپنا کمرہ بھی بدل لے گی۔۔۔۔مگر یہ رسول فاطمہ غل کیوں نہیں مچاتی۔۔۔؟ صبح نماز کے کمرے کے آگے لڑکیاں ایسے جمع تھیں گویا رات کو کوئی چوری ہو گئی ہے اور تالہ ٹوٹا پڑا ہے۔ وہ بھی بے غرض بنی ادھر سے گزری، رسول فاطمہ جانمازوں میں لپٹی ہوئی پڑی تھی۔ دو چار لڑکیاں اسے سہارا دے رہی تھیں۔ وہ بھاگ کر میسٹرن کو بلانے گئی تھیں۔۔۔رسول فاطمہ بخار میں جل رہی تھی اور اس کی مردہ آنکھیں انگاروں کی طرح لہولہان ہو رہی تھیں۔

میسٹرن نے اسے بیماروں کے کمرے میں لے جا کر لٹایا اور بہت پوچھا کہ کون اسے وہاں بند کر گیا مگر وہ یہی کہتی رہی کہ کوئی نہیں، وہ خود نماز پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔

''پھر دروازہ کس نے بند کیا؟''

''کسی نے بھی نہیں۔'' وہ برابر ٹالتی رہی۔

ثمن کے دل پر رسول فاطمہ کی ایسی دہشت بیٹھی کہ اس نے میسٹرن سے خوشامد کر کے اپنا کمرہ بدلوا لیا۔ سعادت اکیلے کمرے میں رہتی تھی اس لئے اس کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔ ثمن کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ پڑھیں گی، ساتھ رہیں گی، سعادت سے اس کی بہت بنتی تھی۔

(14)

جب اس نے دوڑ کر سعادت کو اس کے کمرے میں آنے کی خوش خبری سنائی تو بجائے خوشی سے اچھل پڑنے کے وہ خاموش ہو گئی۔ ایک دم سے اٹھ کر وہ میسٹرن کے پاس گئی جہاں دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ جب وہ باہر نکلی تو میسٹرن چلا رہی تھی۔ اس نے زور سے دروازہ بھیڑ دیا اور منہ پھلائے لوٹ آئی۔

ثمن کی ساری خوشی خاک میں مل گئی وہ تو سمجھتی تھی کہ سعادت اس کے کمرے میں آنے سے خوش ہو گی۔ اسے بڑی ذلت محسوس ہوئی مگر اس نے جی کو سمجھایا کہ چونکہ سعادت ہمیشہ سے بورڈنگ میں بہترین کمرے میں رہتی آئی ہے، اس لئے وہ اس کے آنے کو اپنی حق تلفی سمجھ رہی ہے۔ سعادت اسے خاموش دیکھ کر اسکول کا کام کرنے بیٹھ گئی اور وہ تاریخ و جغرافیہ کے چکر میں پڑ کر سب کچھ بھول گئی۔

دو دفعہ رسول فاطمہ نے چپکے سے اسے بلایا مگر وہ نہ گئی۔۔۔رسول فاطمہ کے پاس جانے کی ممانعت بھی ہو گئی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے اسے دق بتا دی تھی۔ یہ بھی سنا تھا کہ گرمی کی چھٹیوں کے بعد اسے واپس نہ آنے دیا جائے گا۔

سعادت ویسے تو اب خوش رہنے لگی تھی لیکن پھر بھی بعض وقت ثمن کو محسوس ہوتا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ جیسے اس کی موجودگی سے کمرہ گھٹا جا رہا ہو کیونکہ اس نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ پڑھنے کے بعد فوراً اٹھ کر اپنی ایک سہیلی کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔

اس کی یہ سہیلی نجمہ، ہائی اسکول کے زمانے میں اس کے ساتھ رہتی تھی پھر جب ٹائیفائیڈ کی وجہ سے سعادت فیل ہو گئی تو وہ اس سے ایک درجہ آگے ہو گئی تھی۔ وہ ایف اے میں تھی اور ہائی اسکول کی لڑکیوں سے بہت بزرگانہ برتاؤ کرتی تھی۔ جب وہ سعادت کے کمرے میں آتی تو ثمن کو دیکھ کر ذرا دیر کو بھڑک جاتی۔ بیٹھتی تو بالکل خاموش ورنہ جلدی سے بہانہ کر کے چلی جاتی۔ نجمہ سے ثمن بالکل بے تکلف نہ تھی اور عموماً اسے دیکھ کر وہ ذرا پریشان ہو جاتی تھی۔ کبھی ثمن اپنے کمرے میں آتی تو نجمہ بھی جو جنس جنس کر سعادت سے باتیں کرتی ہوتی ایک دم خاموش ہو جاتی اور دوسرے لمحے اسے کوئی نہایت ضروری کام نکل آتا اور وہ چلی جاتی، مگر نجمہ کو

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

دیکھ کر ثمن کچھ عجیب طرح بے چین ہو جاتی۔ جتنی دیر کھڑی وہ باتیں کرتی رہتی، ثمن کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا کرتا۔ وہ جلدی سے اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بے کار کے کام کرنے لگتی۔ مگر جب وہ چلی جاتی تو ثمن کو بہت افسوس ہوتا کہ آخر اس نے اسے اچھی طرح دیکھا کیوں نہیں۔ وہ اس کی اودی پھولدار شلوار کی تڑپتی ہوئی سلوٹیں، سفید چکن کا کرتا، جس کا گریبان ذرا نیچے کو کھنچا ہوا تھا اور کمر پر چست کرنے کے لئے متوازی پلیٹیں پڑی تھیں، شانوں پر پھولا پھولا جھول اس کی کمر کو اور بھی پتلا بنا دیتا اور اس کا کاسنی چنا ہوا دوپٹہ جو شانوں پر سے ہوتا ہوا بغل میں گھوم جاتا تھا اور آنچل تازہ پھولوں کے گچھے کی طرح سمٹ کر بازو پر جھولا کرتا، جب وہ مڑ کر جانے لگتی تو اس کا چوٹی کا پھندنا اس کے کولھوں پر ٹھمکیاں لیتا اور اودی شلوار کے پائنچوں میں سے اس کی سانولی ایڑیاں خاصی گوری معلوم ہوتیں جیسے مور کے بھورے رنگ کے انڈے!

نجمہ بڑی نازک تھی معلوم ہوتا تھا اس کے جسم میں ایک بھی پکی ہڈی نہیں۔ ثمن کا دل اسے چھونے کے خیال سے گھبرانے لگتا۔ گرم اور نرم ایسی کہ اگر ہاتھوں میں لے کر زور سے دباؤ تو ابلے ہوئے انڈے کی طرح پھسل جائے۔

ایک دن یونہی وہ ثمن کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ثمن پریشان ہو گئی اور جب اس نے اپنے دوپٹہ کا آنچل جھٹکا تو وہ ثمن کے بازو پر آن گرا، ثمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے چھت پر سے اس کے اوپر سانپ ٹپک پڑا۔ وہ سن بیٹھی رہی پھر آہستہ سے کھسک کر آنچل گرا دیا۔۔۔ لیکن فوراً ہی اسے افسوس ہونے لگا جیسے اس نے گود میں سے کوئی بڑی پیاری چیز پھینک دی۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ کاش پھر نجمہ اسی الھڑ انداز سے آنچل پھینکے اور دل ہی دل میں آن الجھے مگر نجمہ چلی بھی گئی۔

بعض وقت جب نجمہ، سعادت سے باتیں کرتی ہوتی تو ثمن اسے نگل جانے والی نگاہوں سے گھورنے لگتی۔ وہ اس کے ہونٹوں کی خفیف سی جنبش اور وہ سر کو موڑ کر ذرا اپنے شانے پر دیکھنا جیسے وہاں کی کسی کی پیار بھری نظروں کا جواب دے رہی ہے یا جب وہ اپنی گداز انگلی میں انگوٹھی گھما کر معصومیت سے چھت کی طرف دیکھتی تو ثمن پاگلوں کی طرح اس ننھے سے ڈرامہ کو دیکھا کرتی۔ نجمہ اسے محسوس کرتے ہی ایک دم خاموش ہو کر ہونٹ بھینچ لیتی گویا پوچھ رہی ہے۔

''کیا کہتی ہو۔۔۔ کہہ بھی چکو نا''۔۔۔ مگر ثمن کھسیا جاتی اور ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں رینگنے لگتا۔۔۔ زور سے پیٹ میں جیسے ایک دم بھوک چبھتی اور پھر پیاس لگنے لگتی۔۔۔ مگر وہ بے تو جہی سے کوئی اوٹ پٹانگ کام کیا کرتی۔

پھر اسے اور کچھ ہونے لگا۔ بیٹھے بیٹھے اسے نجمہ کے ہونٹوں کی جنبش، آنچل کا گچھا اور کمر پر لگی ہوئی پلیٹیں یاد آ جاتیں۔ وہ تھوڑی دیر تو ان سے لطف لیتی۔ مگر پھر جھنجھلا کر انھیں دور دھکیل دیتی۔ ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ سعادت نجمہ کے کمرے میں سے اس کا سائن کی صدری پہن آئی۔ کلاس میں جب ثمن نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی گرم رکابی پکڑ لی ہو۔ اس نے جلدی سے گھبرا کر ہاتھ ہٹا لیا مگر

وہ دوسرے لمحے وہ سعادت کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگی۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا چکنے چکنے سانپ اس کی ہتھیلی میں سرک رہے ہیں۔ دوپہر کے وقت گرمی کی وجہ سے سعادت نے صدری اتار کر کرسی پر لٹکا دی اور کھانا کھانے چلی گئی۔ ثمن نے کھانے پر سے آ کر جو صدری کو دیکھا تو زور زور سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ دوبارہ اسکول شروع ہونے کی گھنٹی بج گئی مگر ثمن بہانے بناتی رہی۔

''چلتی ہو کہ نہیں۔۔۔ مس جری کا گھنٹہ ہے دیر ہو گی تو کھا لیں گی۔''

''تم چلو۔۔۔ میں ذرا۔۔۔'' وہ لوٹا اٹھا کر غسل خانے جانے کی تیاری کرنے لگی۔

جب سب لڑکیاں بورڈنگ سے چلی گئیں تو ڈرتے ڈرتے زمین پر لوٹا رکھ کر اس نے صدری کی طرف دیکھا، پھر بھی اس کو اطمینان نہ ہوا اور وہ جا کر دروازہ بند کر آئی۔ آہستہ آہستہ وہ بے پیر وہ بڑھی، دھڑکن ایکا ایکی اتنی تیز ہو گئی کہ معلوم ہوا سینہ ہی پھٹ جائے گا۔ ایک مست کن بھبکا اس کی ناک میں پہنچا اور اسے چکر آنے لگا۔۔ باہر کسی نے کوڑے کے ڈربے کو ٹھوکر ماری اور جلدی سے اس نے صدری پلنگ پر پھینکی۔۔ مگر دروازے سے وہ لوٹ آئی۔۔ جلدی میں اس نے صدری کے بجائے کرسی کے پلنگ پر ڈال دی! اور جو سعادت دیکھ لیتی تو؟ غضب ہو جاتا۔ وہ ضرور بھانپ لیتی کہ صدری جگہ سے بے جگہ کی گئی ہے۔

کلاس میں مس جری نے کیسے ڈانٹا اسے کچھ سنائی نہ دیا۔ وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئی۔۔۔ مگر بڑی دیر تک اس کی انگلیاں صدری کے مس سے جھنجھناتی رہیں جیسے ان میں میٹھی میٹھی مرچیں لگ گئی ہوں!

اسکول ختم ہوا تو وہ وہیں کیاریوں کے پاس منڈیر پر بیٹھ گئی۔ پنسل کو اینٹ پر گھستے ہوئے اس نے سوچنا شروع کیا۔۔۔ آج اسے معلوم ہو رہا تھا گویا اس نے کوئی حسین چوری کی ہے۔ ایک دفعہ اسکول میں پارٹی ہوئی تھی تو اس نے چپکے سے ایک رس گلا اٹھایا تھا مگر کسی کے پیر کی چاپ سن کر وہ جلدی سے اسے نگل گئی اور ہاتھ دھونے کے نل میں سے پانی پینے لگی۔ اس رس گلے کا ذائقہ بمشکل چند سیکنڈ اس کی زبان پر ٹھہرا ہو گا۔ مگر اب تک وہ جب چاہتی تخیل کی مدد سے اس کی مٹھاس منہ میں کھینچ لاتی اور تخیل کا سارا منہ لذت سے بھر جاتا۔ آج بھی وہ صدری کی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں کھینچنے لگی۔ عطر تو نہ تھا مگر کچھ ضرور، سعادت میں تو وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ مرغی کے بچے جیسی بو آتی تھی مگر اس خوشبو میں تو کچھ لونگوں کے بگھار کی سی مہک تھی۔ بالکل ہی نئی اور آسانی سے کھینچ کر نتھنوں میں گھٹنے لگتی تھی۔

اب تو اسے نجمہ کی طرف آنکھ اٹھاتے بھی شرم آتی تھی مگر قوت احساس اسے سب کچھ بتا دیتی تھی۔۔۔ کہ نجمہ اب کدھر دیکھ رہی ہے۔۔۔ اس کے بکھرے ہوئے بال کدھر کو زیادہ جھک گئے ہیں۔ آج اس نے صندلی شنگھائی کے ریشم کا کرتا پہنا تو وہ ایسا جسم پر چپک گیا ہے جیسے جسم پر صندلی وارنش چڑھا دی گئی ہو۔۔۔ آج اس کے ہموار چمکیلے دانت دنداسہ لگانے سے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے شراب کے گلاس میں موتی تیر رہے ہوں۔ سفید سفید چمکیلے دھاردار موتی نجمہ کے دانت دور سے دیکھنے میں بہت تیز معلوم ہوتے تھے جیسے نیولے کے نوکیلے دانت۔ ثمن آہستہ آہستہ اپنے دانتوں پر زبان پھیرتی تو بڑی گدگدی ہوتی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ثمن جب کمرے میں پہنچی تو نجمہ کے قہقہے نے اس کے پیر پکڑ لئے۔ سعادت اور نجمہ پچھلے اسباب کے کمرے میں ہنس بول رہی تھیں۔ اب کچھ دن سے نجمہ جب آتی سعادت سے کوئی ایسی چیز مانگتی جسے نکالنے کے لئے اسے صندوق کھولنا پڑتا۔ وہ اٹھ کر اندر جاتی اور پیچھے پیچھے نجمہ بھی چلی جاتی۔ پھر وہ گھنٹوں وہاں بیٹھی ہلکے ہلکے بولا کرتیں۔ ثمن کا دل کسی کام میں نہ لگتا اور سانس روکے نجمہ کی آواز پر کان لگائے بیٹھی رہتی۔ اس کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ بھی اٹھ کر اندر جا بیٹھے مگر سعادت سے اسے نفرت ہونے لگی کہ وہ جان بوجھ کر اسے نجمہ سے دور رکھتی ہے۔

اسکول میں فینسی ڈریس شو ہوا تو انھوں نے کالج کی لڑکیوں کی بھی دعوت کی۔ ویسے بورڈنگ دور نہ تھا اور لڑکیوں کو ملنے کی بھی ممانعت نہ تھی مگر عموماً ان کے جلسے اور تہوار جدا ہوتے تھے۔ عید کا موقع تھا اور ڈنر بڑا شاندار ہونے والا تھا۔ ہر لڑکی کا مردانہ لباس پہننے کو دل چاہتا تھا لہٰذا ڈے اسکالر لڑکیاں حسب فرمائش اپنے اپنے گھروں سے لے آئیں۔ ثمن نے بھی ایک سوٹ منگوالیا۔

مردانے لباس پہن کر لڑکیاں شرم کے مارے گر گر پڑیں۔ خصوصاً وہ تو بے حال ہو گئیں جنھوں نے داڑھی مونچھیں لگائی تھیں۔ کچھ تو کمروں میں گھسی بیٹھی تھیں۔ شرم کے مارے چادریں اوڑھے ہوئے اور زیادہ بہادر لڑکیاں گھسیٹ گھسیٹ کر نکال رہی تھیں۔ اختر موئی نے مولانا شوکت علی کی وضع کی داڑھی اور ٹوپی پہن رکھی تھی جسے دیکھ کر لڑکیوں کی چیخیں نکلی جا رہی تھیں مگر وہ مزے سے ٹہل رہی تھی۔ ایک لڑکی نے عرب نوجوان کا لباس پہن رکھا تھا جس میں وہ بالکل زنانی معلوم ہو رہی تھی۔

اس کے پاس نوری ریشمی ساڑھی پہنے پھدک رہی تھی۔ بچاری نوری نے تو ساڑھی بھی نئی پہننا شروع کی تھی اس لئے اس کے لئے وہی عجیب و غریب چیز تھی۔ مگر وہ عرب نوجوان خورشید کے پیچھے لگی تھی، جو مصری لباس میں بالکل پنجابن لگ رہی تھی۔

ثمن اپنا سیاہ سوٹ پہنے تین دفعہ دروازے میں سے نکلی مگر پھر ڈر کر بھاگ گئی۔ دو چار لڑکیوں نے اسے گھسیٹا مگر پھر چھوڑ دیا۔ سوٹ پہنے تو کئی لڑکیاں گھوم رہی تھیں مگر ثمن کا برا حال تھا گویا ننگی مادرزاد ہو۔ سب مہمان ہال میں جمع تھے اور برابر کالج کی لڑکیاں گزر رہی تھیں۔ اس نے دیکھا سعادت دھوبی بنی ہوئی ہے، سفید پگڑی اور لمبی لمبی مونچھیں اور کپڑوں کی گٹھڑی شانے پر اور اس کے ساتھ۔۔۔ اس کے ساتھ نجمہ دھوبن بنی ہوئی۔۔۔ نام کو دھوبن تھی مگر وہ تو پوری پدمنی بنی ہوئی تھی۔ گھوم گھیر کا جھلمل کرتا لہنگا اور شوخ گوٹے سے تھپا ہوا باریک دوپٹہ۔۔۔ اور وہی صدری، وہی لونگوں کے بگھار کی مہک میں بسی ہوئی ساٹن کی صدری، آج اس نے دنداسہ بھی لگایا تھا اور لپ اسٹک بھی اور گال بھی ہلکے رنگدار تھے اور پیر؟ اس کے پیر دیکھ کر ثمن کا دم نکل گیا۔۔۔ مور کے انڈوں جیسی ایڑیوں میں لال روشنائی۔۔۔ وہ ننگے پیر تھی اور چاندی کی پازیب زمین پر گھسٹ رہی تھی، ماتھے پر اس نے ٹیکہ لگا رکھا تھا جو بالکل ہیرے کی طرح دمک رہا تھا۔ ثمن شرما نا ورما نا سب بھول کر مبہوت اسے دیکھتی رہ گئی۔

''ارے شمشاد کو دیکھنا!'' نجمہ زور سے ہنسی اور سب لڑکیاں اسے دیکھ کر قہقہہ لگانے لگیں۔

''ہائے اللہ بالکل لڑکا لگ رہی ہے۔۔۔'' نجمہ کا منہ لال ہو گیا۔

''تم کیوں نہیں چلتیں۔۔۔ چلو نا۔۔۔ سعادت نے رکھائی سے کہا۔

''آؤ۔۔۔ بھئی دھوبی تم تو جاہل ہو۔۔۔ اور یہ صاحب بہادر۔۔۔ ہمیں تو یہ پسند ہیں۔'' نجمہ مذاق میں ثمن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگی اور ثمن کو ایسا معلوم ہوا وہ سو رہی ہے۔۔۔ یہ سب خواب میں ہو رہا ہے۔

ثمن کے لباس سے کوئی متاثر نہیں ہوا مگر معلوم ہوتا تھا کہ جب بھی نجمہ اس کی طرف دیکھتی۔ اس کا منہ تمتما اٹھا اور وہ قہقہے مارنے لگتی۔ ثمن بھی اسے برابر دیکھ رہی تھی، آج وہ اس کے بالکل قریب بیٹھی تھی ایسے کہ کئی دفعہ نجمہ کا جالی دار دوپٹہ اس کے ہاتھوں پر آن گرا۔

مگر سعادت کچھ مکدر سی بیٹھی تھی۔ اسے نجمہ کا ہنسنا اور بات بے بات ثمن سے بے تکلف ہونا ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ کھانے پر مارے گھبراہٹ اور جوش کے ثمن سے کچھ نہ کھایا گیا۔ کئی مرتبہ نجمہ کی پازیب کھل گئی تو اسے باندھنی پڑی۔ پھر بھاری جھمکوں سے اس کے کام دُکھ رہے تھے، بار بار ان کی خبر لینا پڑتی تھی۔ گو زبان سے وہ نجمہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیتی تھی لیکن اس کا بھولا بھالا چہرہ، اس پر بدمعاشوں جیسی مونچھیں، بال جو بار بار ہیٹ سے باہر پھسل آتے تھے، ہر بات پر شرما کر گھبرا جانا اور پھر خاموشی سے کھسیا کر مسکرا دینا۔۔۔ ایسی باتیں تھیں کہ نجمہ کو ثمن سے بے تکلف ہوئے بغیر نہ رہا گیا اور وہ اسے ثمن کہنے لگی۔

جب ثمن نے کچھ کہا تو اس پر بھی نجمہ کو بہت ہنسی آئی، سعادت نہایت سنجیدہ بنی اپنی ایک استانی سے آنے والے امتحان پر گفتگو کر رہی تھی۔ اس نے مونچھیں اتار دی تھیں اور صافہ کو دوپٹہ کی طرح اوڑھے ہوئے تھی۔ بجائے دھوبی کے وہ بڑی بی معلوم ہو رہی تھی۔

جب انعام دیئے جانے کا وقت آیا تو نجمہ گھبرا گھبرا کر سعادت کو ڈھونڈنے لگی۔ لیکن سعادت اپنے کمرے میں تھی۔۔۔ نجمہ بھاگی ہوئی گئی۔ ثمن کا دل بیٹھنے لگا۔ نجمہ، سعادت پر مری جا رہی تھی۔ اس کا جی نہ مانا تو وہ بھی کمرے میں گئی۔۔۔ وہاں اس نے دیکھا سعادت بری طرح پلنگ پر پڑی رو رہی ہے۔ نجمہ اسے منا رہی ہے، مگر سعادت کے غصہ کی انتہا نہیں۔۔۔ اسے دیکھ کر وہ چپ ہو گئیں۔ اتنے میں چند لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں اور کہا۔ ''نجمہ باجی مس جرمہ بلا رہی ہیں۔'' نجمہ مجبوراً اٹھ کر چل دی۔ ثمن بھیگی بلی کی طرح ساتھ ساتھ۔ ہال میں تمام فینسی ڈریس والیاں دو دو کے جوڑوں میں گزر رہی تھیں۔ جب کوئی عجیب جوڑا گزرتا تھا تو خوب تالیاں بجتیں۔

''ارے دھوبن۔۔۔ کہاں ہے۔۔۔ نجمہ۔'' مس جرمی پکار رہی تھیں۔

''میں تمھارا دھوبی کہاں ہے؟''

''سعادت کی طبیعت خراب ہو گئی۔'' نجمہ نے مردہ آواز سے کہا۔

''یہ تو برا ہوا۔۔۔ اچھا تم کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ۔۔۔ جلدی کرو، اب تمھاری باری ہے۔۔۔''

بغیر کچھ کہے سنے نجمہ نے ثمن کا ہاتھ پکڑ لیا اور آگے بڑھ گئی۔ نہ جانے ثمن کہاں پیر رکھتی تھی اور کہاں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

پڑتا تھا۔ اسے تو بس اتنا احساس تھا کہ نجمہ کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ ہے اور وہ ہوا میں معلق ہے۔ نجمہ کو انعام ملا ۔۔۔ انعام تو تین تھے مگر پھر لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دینا شروع کئے یہاں تک کہ ہر لڑکی کے لئے انعام کا اعلان ہو گیا۔ نیا پیرانوری کو اس کی سڑی ہوئی دوست برجیس نے دیا اور برجیس کو افسر نے، پھر تینوں، انعاموں پر فخر کرنے لگیں۔

نجمہ نے ثمن سے اور کوئی بات نہ کی ۔۔۔ انعام لینے کے بعد وہ واپس سعادت کے پاس آ گئی اور جب جلسہ ختم ہونے کا آخری گیت گایا جا رہا تھا تو ثمن کی آواز گلے میں ہی گھٹ گئی۔ سعادت بالکل خاموش کھڑی تھی اور نجمہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے سر سے سر ملائے آخری گیت گا رہی تھی ۔۔۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں غرق دنیا سے بہت دور تھیں۔

رات کو جب ثمن پلنگ پر لیٹی تو بڑی دیر تک ہچکیوں کے مارے اس کا برا حال رہا ۔۔۔ خاموش وہ اپنی ہتھیلیوں میں دانت گڑوئے اپنی آواز کو گھونٹتی رہی۔ سعادت آج کمرے میں نہیں تھی۔ آج چونکہ چھٹی تھی۔ اس لئے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے کمرے میں جانے کی اجازت تھی۔ وہ نجمہ کے یہاں تھی۔ یہ اسے کیا ہو گیا تھا خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بالکل بڑی آنکھوں والی رسول فاطمہ کی طرح۔ اوہ! آج اسے رسول فاطمہ یاد آنے لگی اور ایسا معلوم ہوا کہ وہی اس کی قاتل تھی، اس نے ہی تو رات بھر اسے سردی میں اکڑنے کو بند کر دیا تھا۔

اور اب وہ بھی رسول فاطمہ کی طرح ۔۔۔! اُف شرم اور نفرت سے اسے پسینہ آ گیا ۔۔۔ ٹھنڈی ٹھنڈی آگ سے اس کا سینہ دہک رہا تھا۔ نجمہ، نجمہ، اس کی روح پکار رہی تھی۔

رسول فاطمہ! اس کی سوکھی کلائیاں اور چوہے کی شکل کے ہاتھ، خراب صحت اور بدوضع جسم ۔۔۔ ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اوہ! وہ اس کی قاتل تھی ۔۔۔ وہ اس کی آخری التجا بھری سانسیں، وہ گھٹی ہوئی آہیں، ثمن کو معلوم ہوا کہ جیسے مکڑیوں کی طرح اس کے جسم پر رینگ رہی ہیں۔

مگر وہ تو مری نہیں تھیں۔ میٹرن نے کہا تھا، وہ پہاڑ پر چلی جائے تو اچھی ہو جائے گی ۔۔۔ کاش، کاش وہ پہاڑ پر چلی جائے! ثمن دعائیں مانگنے لگی۔

مگر نجمہ؟ رسول فاطمہ کے متعلق پشیمان ہو کر اسے نجمہ کے خیال میں غرق ہونے کا تھوڑا سا حق محسوس ہونے لگا۔

نیند نہ آئی۔ بے چینی سے وہ پلنگ پر لوٹتی رہی مگر نجمہ ایک خوفناک بے رحم خواب کی طرح اس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی۔ جس وقت اس نے رسول فاطمہ سے نجات پائی تھی تو اسے خیال ہوا تھا کہ سانپ کو مار ڈالو تو ناگن بدلہ لیتی ہے۔ تو ۔۔۔ یہ نجمہ اس سے بدلہ لے رہی تھی۔ خوف سے اسے پھر رونا آنے لگا اپنے پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکاریں سن سن کر وہ نیم جاں ہو گئی۔ تڑپ تڑپ کر وہ نہ جانے کب سو گئی۔

(15)

وہ ہر ممکن کروٹ سے لیٹی مگر نیند نہ آئی۔ نجمہ ایک بھیانک خواب کی طرح اس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی۔ جب اس نے رسول فاطمہ سے رہائی پائی تھی تو اسے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اس نے سانپ کو کچل ڈالا۔ مگر جبھی اس کے دل میں دبا چھپا خوف بھی سمایا ہوا تھا کہ اگر ناگ کو مار ڈالو تو ناگن بدلہ لینے آتی ہے۔ وہ اپنے ناگ کی مردہ آنکھوں میں دشمن کی تصویر دیکھ کر اسے ڈسنے پر تل جاتی ہے۔ تو یہ نجمہ اس سے رسول فاطمہ کے زخموں کا بدلہ لے رہی تھی۔ دکھ اور خوف سے وہ تڑپ کر رو دی۔ ساری رات پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکاریں سرسراتی رہیں۔ جنھیں سن سن کر وہ نیم جان ہوئی۔

صبح اٹھ کر اس نے سعادت سے بات نہ کی ۔۔۔ وہ خود کچھ کھچی کھچی نظر آ رہی تھی۔ ثمن خاموش لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ چھٹیوں کے تین دن پہاڑ بن بن کر اس کے تنہا اور مجروح جسم کو پیستے رہے۔ سعادت روز رات کو غائب ہو جاتی اور بھرے بورڈنگ میں ثمن کو قبرستان کا سا سناٹا چھایا نظر آتا۔ لائبریری میں وہ نہ جانے کتنی دیر بیٹھی موٹی موٹی ڈکشنریوں کو بے معنی نظروں سے گھورتی رہی۔ ان میں سے ایک میں بھی تو اس کے مرض کا علاج نہ تھا۔ کسی خوفناک انجام کی آمد کے خوف سے وہ سہمی جا رہی تھی۔ یہ اس کے دل کا غبار جو آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا، اب پھوٹ چلے گا۔ جیسے کسی نے اس کی خاموش دعاؤں کی آہٹ سن لی۔ اس کا دل غبارے کی طرح پھولنا شروع ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر تھوڑی دیر اور نجمہ اسی طرح مذہب دروازے میں کھڑی رہی تو یہ غبارہ پھوٹ ہی جائے گا۔ مگر نجمہ آہستہ سے بڑھ کر الماریوں میں کتابیں دیکھنے لگی۔ وہ ثمن کی پیٹھ کے پیچھے کھڑی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی پیٹھ پر کوئی انگیٹھی دہک رہی ہو۔ سارے جسم پر گرم گرم نکتے سے پھدکتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ سانس روکے کتاب کے صفحہ پر جھکی رہی۔ غبارہ آہستہ آہستہ پچکنے لگا۔ ''ارے تمھارے پاس ہے یہ کتاب۔ میں کہہ رہی تھی کون لے گیا اٹھا کر۔'' نجمہ نے اس کے پاس کی کرسی گھسیٹی۔ ثمن نے جلدی جلدی کتاب کے ورق تندہی سے الٹنے شروع کر دیئے۔

تھوڑی دیر نجمہ بیٹھی باتیں کرتی رہی، ادھر ادھر کی فضول بکواس۔ اتنی دیر ثمن چوری چھپے اس کی ساخت کی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

صدری جس کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور بغل میں دبا ہوا کافوری دوپٹہ کا گچھا دیکھتی رہی۔ نجمہ بے چینی سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ اس کی کاہی اطلس کی مچلتی ہوئی شلوار آہستہ آہستہ لہرا رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم چپ ہوگئی اور بڑے غور سے ثمن کو خوفزدہ اور مسرت بھرے دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگی۔

''ثمی!'' نجمہ نے اتنے آہستہ سے کہا جیسے کسی نے دو باریک بالوں کو آپس میں رگڑ دیا ہو۔ ثمن کی آنکھیں لرزتی ہوئی انھیں اور فوراً جھپک گئیں۔ نجمہ نے اپنی دو انگلیاں آہستہ سے ثمن کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔۔۔۔ ایک دم اس کی ہتھیلی میں تشنج ہوا اور وہ سمٹ کر نجمہ کی انگلیوں کو نگلنے لگی۔ دروازے میں سعادت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نجمہ نے تیزی سے اپنی انگلیاں چھین لیں اور عجب تھکی ہوئی ہنسی اس کے ہونٹوں پر مچلنے لگی۔

''سعادت!'' اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''آؤ تا کہاں چلی گئی تھیں۔ میں تمھیں۔۔۔۔'' مگر سعادت نے ایک تلخ جنبش سے اس کی بات ٹال دی اور بڑی مشغولیت سے کتابیں دیکھنے لگی۔

نجمہ سعادت کے پیچھے پیچھے گئی۔ ثمن نے دیکھا وہ کسی اہم مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لئے گیلری کے آخری کونے پر رک گئیں۔ نجمہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ جسے سعادت ٹال کر جانا چاہتی تھی مگر نجمہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

جلد ہی یہ بات بورڈنگ میں پھیل گئی کہ سعادت اور نجمہ کی جنگ ہوگئی۔ نیز ثمن پر بھی مشتبہ نظریں پڑنے لگیں۔ گو یقین تو نہیں پھر بھی اہل نظر کا خیال تھا کہ کچھ اس کا بھی دخل ہے۔ سعادت کا پرانا دردسر کا مرض عود آیا۔ اور نجمہ کو گوشت کی بو سے قے ہونے لگی۔ لہٰذا دونوں نے کھانا نہ کھایا۔ لڑکیوں کے گروہ کھسر پھسر کرنے اور قہقہے لگانے لگا۔ سعادت کی علالت تو طویل ہوگئی مگر نجمہ بدستور کھانے کے کمرے میں آنے لگی۔ وہ ایک دم بہت ملنسار ہوگئی جن لڑکیوں سے وہ کبھی بات بھی نہ کرتی تھی ان سے ہنس ہنس کر مذاق کرنے لگی۔ لیکن بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں ایک پوشیدہ فکر جھلکنے لگتی۔ اس کا ہر مزاحیہ جملہ زبردستی ڈھالا ہوا معلوم ہوتا۔ ویسے تو لڑکیاں اس کی بات کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دیتیں لیکن اس کے جاتے ہی جلی کٹی کہنے لگتیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ اس کی ظاہری خوش مزاجی کی اصل وجہ کیا تھی۔ اسے صرف سعادت کا غم منانے کے لئے ان کی مدد کی ضرورت تھی مگر کسی کو اسے رکھائی سے جواب دینے کی ہمت نہ تھی کیونکہ وہ استانیوں میں کافی پسند کی جاتی تھی اور اپنی جماعت میں ہمیشہ اول رہتی تھی۔

موقع کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے ثمن آہستہ آہستہ کسی نہ کسی طور سے اس کے قریب میں رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ نہیں تو وہ اس کی ڈاک ہی پکڑنے کی فکر میں رہتی تا کہ اسے دینے کے بہانے ہی اس کے کمرے میں جا سکے۔ بار بار کسی جملے کے معنی پوچھنے یا مفید کتاب کا پتہ معلوم کرنے اس کے پاس چلی جاتی۔ نجمہ کا رویہ بڑا سلجھا ہوا ہوتا۔ اگر غلطی سے وہ ذرا بے تکلف ہو جاتی تو فوراً واپس کھنچ جاتی اور جلدی سے اسے کمرے میں ٹال دیتی۔ یہاں تک کہ بعض وقت تو ثمن کو اس کی رکھائی سے بڑی چوٹ لگتی۔ تین دن ہو گئے

سعادت اور نجمہ کے درمیان پر چہ بازی ہوتی رہی۔ لیکن ملاپ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس عرصہ میں نجمہ کئی دفعہ ثمن کے کمرے میں بھی آئی، ہنس ہنس کر باتیں بھی کیں، مگر کچھ خشک سی ہو کر فوراً چل دی۔ کئی بار دونوں باغ میں بھی ملیں مگر عموماً خاموشی نے انھیں جلد ہی بھاگ جانے پر مجبور کیا۔

امتحان شروع ہونے والے تھے یہ امتحان بھی بورڈنگ میں شاندار تہوار کی طرح آتے ہیں۔ کئی دن پہلے سے لڑکیاں ایک دوسرے کو وش (Wish) کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ پھل پھول کا تبادلہ شروع ہو جاتا اور بہت سی تو دوپٹے ساڑھیاں چوڑیاں وغیرہ دیتی لیتی ہیں۔ آپس کے لین دین سے زیادہ یک طرفہ دین ہو جاتا ہے یعنی لڑکیاں جو دوسروں پر مرتی ہیں وہ بڑے دل کھول کر دیتی ہیں۔ وہ خواہ کتنی غریب ہیں، وظیفہ پر گزارہ کر رہی ہیں، خیرات میں کتابیں اور ہدیے ملتے ہیں مگر جس پر مرتی ہیں اس کے لئے چوری کریں گی، ڈاکے ڈالیں گی، بھیک مانگیں گی مگر اپنی چہیتیوں کو دس دس روپے کی چوڑیاں، پانچ چھ روپے کے ہار پھول اور گجرے ضرور پہنا دیں گی۔

جس لڑکی کی زیادہ مرنے والیاں ہوں گی اتنی ہی زیادہ اسے چیزیں ملیں گی۔ اس کے علاوہ عین امتحان کی صبح ہار اور گجروں سے لاد دیں گی۔ اور بعض چہیتیاں تو ایسی پھولوں میں چھپ جاتی ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی بڑے لیڈر کا جلوس نکل رہا ہو۔ بعض مرنے والیاں پھولوں اور گوٹوں کے گہنے پہنا کر بالکل دلہن بنا دیتی تھی۔ اور پھر یہ دلہنیں شرماتی لجاتی امتحان کے کمرے میں چلی جاتیں۔ ہر مرنے والی کا ہار پہننا لازمی تھا۔ بعض حاسدوں کا خیال تھا کہ اتنے ہار مرنے والیوں کے نہیں ہوتے تھے۔ بس دکھانے کو یہ لڑکیاں خود منگا کر پہن لیا کرتی تھیں تا کہ لوگ سمجھیں ان کی اتنی مرنے والیاں ہیں۔

شام ہی ثمن نے بھی نجمہ کے لئے سوا روپے کا موٹا سا گجرا منگوایا۔ رات کو جب تک وہ جاگتی رہی، اس پر پانی چھڑکتی رہی۔ بار بار اس نے ان خوش نصیب پتیوں کو چھوا جو کل نجمہ سے معانقہ کرنے والی تھیں۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ان پتیوں کی آڑ میں چھپ رہتی۔

صبح اس نے گھبراہٹ میں ناشتہ بھی نہ کیا۔ گجرے کو کبھی اس ہاتھ میں لیتی کبھی اس میں۔ وہ کس طرح نجمہ کے گلے میں ہار ڈالے گی۔ شاید سیتا جی کو رام چندر جی کے گلے میں ورمالا ڈالتے وقت بھی اتنی الجھن نہ ہوئی ہوگی۔ بلا سے انھیں مذاق اڑانے والی لڑکیوں اور میٹرن کی تیز نگاہ کا تو ڈر نہ تھا۔ اور یہ اجڈ غیر شاعرانہ دماغ کی لڑکیاں تو بس انسان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی تھیں۔ وہ برآمدوں میں کھڑی ہو جاتیں۔ اور چونکہ خود کسی پر نہ مرتی تھیں۔ اس لئے ہر مرنے والی کی گھبراہٹ اور گجروں کا مذاق اڑاتیں۔ جس سے بعض وقت چہیتیاں بھی مجروح ہو جاتیں اور عام کھسیانہ پن اور بدمزگی پھیل جاتی، مرنے والی بگڑتیں تو یہ دوسری لڑکیاں جو انہیں بازار والیوں کی طرح نیچ سمجھتی تھیں کتے ہوئے طعنوں سے ان کے کلیجے چھلنی کر دیتیں۔ ان کی کمزوریوں کو شارع عام پر کھول کر بکھیر دیتیں۔ مگر یہ مرنے والیاں بھی بڑے پتھر کے کلیجے والیاں ہوتی ہیں، کوئی طعنہ، کوئی ملامت انھیں ان کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بے حس اور بے حیا ہو جاتی ہیں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

بعض تو ایسی مرنے والیاں تھیں جن کے گھر والے تک ان کے اس جنون سے عاجز تھے۔ اگر ان پر ذرا بھی سختی کی جاتی تو وہ پاگل سی ہو جاتیں اور پھر مجبوراً ان کے ساتھ رعایت کرنا پڑتی۔

جب پھولوں میں لدی پھندی نجمہ اپنے کمرے میں سے نکلی تو ثمن کے ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ جیسے تیسے کر کے اس نے ہار نجمہ کے گلے میں ڈال دیا۔ نجمہ نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کی قیمت ادا کر دی۔ لیکن بجائے امتحان کے کمرے میں جانے کے وہ سعادت کے پاس بیماروں کے کمرے میں چلی گئی۔ نہ جانے کیوں ثمن کے پیر بھی اس کے پیچھے پیچھے اٹھ گئے۔

الٹے پیروں وہ واپس ہوئی اور بوجھل پیروں کو گھسیٹتی ہوئی کھوئی کھوئی جماعت میں چلی گئی۔ وہاں تو اس کے دل میں جیسے منوں مٹی پڑ گئی، سعادت بالکل تندرست اور خوش بیٹھی تھی۔ اس کا گجرا جو اس نے اتنے ارمانوں سے نجمہ کو دیا تھا، جوڑے میں لپٹے ہوئے تھی۔

سعادت اور نجمہ پھر ایسے ہی ملنے لگیں گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ نجمہ کے امتحان ختم ہو گئے اور اب سعادت کے امتحان شروع ہوئے۔ ثمن نے نجمہ کو سوا روپے کا گجرا پہنایا تھا۔ اس نے سعادت کے لئے تو کڑوروں ہار پھول منگائے مگر ثمن کے لئے شاید منگانا بھول گئی۔ اسے کسی نے بھی ہار نہ پہنائے۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ چوری چھپے خود ہی ہار منگا کر پہن لیتی۔ پھولوں میں لدی ہوئی لڑکیوں کی قطار کے آخر میں سر جھکائے وہ امتحان کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

''ثمن ۔۔۔۔ بھئی مجھے گجرے نہیں اچھے لگتے۔ یہ پھول میں گھر سے لائی ہوں اچھے ہیں نا ۔۔۔''

بلقیس نے اسے مڑ کے شگفتہ پھولوں کا گچھا دیا۔ بلقیس ڈے اسکالر تھی اور آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ ثمن کو معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کا نگاتن ڈھانک دیا اور اسے باغ کے باغ بخش دیئے۔ پرچہ کرنے میں اس کا دل نہ لگا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے رعائتی ترقی ملی۔

امتحان کا نتیجہ معلوم ہوتے ہی چھٹیاں ہو گئیں اور دو مہینے کے لئے لڑکیاں اپنے گھروں کو چل دیں۔ بسیرا لینے کے لئے پھر سے چڑیاں اڑ گئیں۔ دو مہینوں کا بسیرا!

دوسری منزل

(16)

دوبارہ جو وہ اسکول میں آئی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بلقیس کی بڑی بہن جو حال ہی میں انگلینڈ سے آئی تھیں پرنسپل ہو گئی تھیں اور بلقیس اور اس کی چھوٹی بہن جلیس مع لمبے چوڑے خاندان کے پرنسپل صاحبہ ہی کے ساتھ اسکول کے احاطے میں آن رہی تھیں۔ سعادت کو ڈاکٹروں نے ایک سال کے لئے پڑھنے کو منع کر دیا۔ اس کی صحت میں گھن سا لگ گیا تھا۔ نجمہ پاس ہو کر کسی اور کالج میں لاہور چلی گئی تھی۔ ثمن کو دنیا اُجاڑ اور سنسان معلوم ہوتی، دل کی تنہائی میں ہوکیں سی اٹھتیں۔ نجمہ کا خیال پھوڑا بن کر ٹیسیں مارتا۔ اس میں کس قدر دکھ بھرا ہوا تھا مگر زندگی کی چاشنی بھی تو تھی۔ نجمہ نے اسے اپنی ایک تصویر کبھی دی تھی جسے اس نے اپنا بہترین مونس و غمخوار پایا۔ سعادت بھی اسے اب بہتر رنگ میں یاد آتی۔ ویسے جہاں نجمہ کا سوال نہ تھا وہ اس کی بہترین دوست تھی کاش اس نے نجمہ کو بھی دیکھا ہی نہ ہوتا اور اگر دیکھا تھا تو؟ وہ آگے کچھ نہ جانتی تھی مگر اسے سعادت سے دوستی ٹوٹ جانے کا صدمہ تھا۔ نجمہ تو ایک شعلہ تھی کہ وقتاً فوقتاً تاپنے کی حاجت ہو مگر سعادت ایک میٹھا چشمہ تھی جس سے کلاس میں، کلاس کے باہر کھیل کود میں بھی بے پناہ رنگینیاں اور ہمدردیاں وابستہ تھیں۔ سعادت کو ہنسنے کا مرض تھا۔ اور وہ ثمن ذرا سی ۔۔۔ باتوں پر گھنٹوں چمن کے سبزے پر لوٹیں لگاتیں۔ سعادت بہت ہوشیار تھی اور وہ ایک معلم جیسی مدد بھی دیتی۔ یہی نہیں وہ اگر ثمن کو بددل یا سست دیکھتی تو بڑی سختی سے ڈانٹتی۔ ثمن کو اس کی ڈانٹ میں مادرانہ پیار اور فکر کی جھلک نظر آتی اور بعض وقت وہ اترانے کے لئے فخر سے نخرے دکھاتی۔ ''تمہاری بلا سے ہمیں فیل ہو جانے دو۔'' وہ اترا کر کہتی۔

''بس جی بس، زیادہ بکواس نہ کرو ۔۔۔۔ ورنہ۔'' سعادت ڈانٹتی۔

''ورنہ ۔۔۔۔ ورنہ کیا؟''

''ورنہ یہ ۔۔۔ کہ ۔۔۔ کچھ نہیں ۔۔۔ میری پیاری بہن کیسی ۔۔۔ آؤ۔'' اور وہ ثمن کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی ۔۔۔ مگر جب نجمہ آئی تو؟ ۔۔۔ تو سارا شیرازہ بکھر گیا اور ثمن سعادت کی موت کی دعائیں مانگنے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لگی۔اس کے سفلی جذبات بالکل شیطانی اعمال بن گئے توبہ!

بلقیس سے ثمن کی دوستی بھی عجیب وغریب طریقے پر ہوئی۔ایک دن بلقیس اور وہ بیڈمنٹن کھیل کر پسینہ سکھانے کے لئے چمن کی بینچ پر بیٹھی تھیں کہ ایک دم سے بلقیس نے پوچھا۔

''تم نجمہ پر مرتی تھیں نا۔''

''نہیں۔۔۔نہیں تو۔۔۔واہ۔''ثمن گھبرا گئی اور قسمیں کھانے لگی۔

''ارے،ہم سے جھوٹ بولتی ہو۔۔۔ہونہہ۔۔۔جیسے ہم جانتے نہیں اور سعادت تمھارے سے جلتی تھی ۔۔۔۔کیوں؟''

''جی ہاں،کبھی بھی نہیں۔''

''تو اس میں بات ہی کیا ہے۔میں خود پہلے نجمہ پر مرتی تھی۔مگر آپا بی نے مجھے بتایا کہ لڑکیوں کو ہمیشہ لڑکوں پر مرنا چاہئے۔''

''توبہ!''ثمن نے بدک کر کہا۔

''ہاں اور کیا۔ان سے تو شادی کر کے ہمیشہ ساتھ بھی رہ سکتے ہیں کیوں ہے نا بھئی؟''

''مگر۔۔۔۔۔یہ تو۔۔۔۔ہائے اللہ بری باتیں نہ کرو بلقیس۔''

''اس میں بری بات کیا ہے۔جبھی تو اب مجھے اب کوڑیالے اچھے لگتے ہیں۔میں بڑی بھی تو ہوں تم سے۔''بلقیس روش پر سے کنکریاں چن کر ہوا میں اچھالنے لگی۔

''کوڑیالے؟''

''ہاں۔۔۔ارے؟کوڑیالے!تم نہیں جانتی کیا ہوتے ہیں۔۔۔چہ ہٹو بھی الو ہو تم۔''بلقیس قہقہہ لگا کر گھاس پر لوٹ گئی۔''ارے کوڑیالے پگلی۔۔۔کالے اور سفید۔''اس نے ٹھنڈی گھاس پر گال رگڑ کر ہلکی سی پھریری لی۔۔۔زہریلے نف۔۔۔''نماز کی گھنٹی بج گئی اور وہ دونوں بات ختم نہ کر پائیں۔

دو تین دن بلقیس کھیلنے ہی بورڈنگ میں نہ آئی جو ثمن کی الجھن کی دور ہوتی۔اس کے جی میں کھد بد ہو رہی تھی۔اس کا جی نہ مانا اور اس نے لغت میں دیکھا۔مگر اس میں لکھا تھا۔''کوڑیالے۔۔چتی دار سانپ،سیاہ اور سفید سخت زہریلے۔۔۔۔جن کے کاٹے۔۔۔۔۔''اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کوڑیالے سانپ بلقیس کو کیوں پسند ہیں۔

''بلی بتاؤ نہ کوڑیالے کون ہوتے ہیں۔''اس نے موقع پا کر پوچھا۔

''کوڑیالے دل کے ٹکڑے،جان ہوتے ہیں۔۔۔اور کون ہوتے ہیں۔''

''اونہہ تو بتاؤ نا۔''

کئی دن ثمن پوچھتی رہی اور بلقیس ہنس ہنس کر ٹالتی رہی۔مگر ایک دن اس نے ثمن کو ایک تصویر دکھائی یہ ایک وجیہہ نوجوان کی تھی جو سیاہ شیروانی اور سفید پاجامہ پہنے تھا۔ایک دم وہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگیں اچھا تو یہ

تھے کوڑیالے! کالی شیروانی یونیورسٹی کا یونیفارم تھا اور یہ تصویر رشید کی تھی۔ویسے بلقیس اور جلیس بورڈنگ میں نہیں رہتی تھیں پر جب کبھی ان کا دل چاہتا وہ سارے قوانین بالائے طاق رکھ کر بورڈنگ میں آن دھمکتیں۔پرنسپل کی بہنیں تھیں۔بھلا کس کی مجال تھی جو چوں بھی کر جائے۔پھر ان کا دل لگنے لگا اور بلقیس ثمن کے کمرے میں مستقل رہنے لگی۔مگر جب جی چاہتا بغیر اجازت بھاگ جاتیں۔جلیس بدمزاج تھی اور نوری کی جماعت میں تھی۔وہ دونوں ایک کمرے میں رہتیں مگر روز جوتا چلتا۔ثمن اور بلقیس نہایت بزرگانہ طریقے پر انھیں سمجھانے جاتیں اور ملاپ ہو جاتا اور پھر دونوں ایک دوسرے کا دوپٹہ اوڑھے ہاتھ گلے میں ڈالے چمن میں گھومنے لگتیں۔

پہلے پہل تو نوری نے بلقیس پر مرنے کی کوشش کی اور جلیس نے ثمن پر۔مگر بلقیس نے نہایت جنگلی پن سے دونوں کو کھسیانا کر دیا اور پھر کچھ سوچ بچار کے بعد نویں جماعت کی ایک لڑکی کو دونوں نے چاہنا شروع کر دیا۔مگر بلقیس نے وہاں بھی ان کا ناک میں دم کر دیا۔جہاں کوئی چیز گم ہو جاتی تو وہ فوراً چلا چلا کر جلیس اور نوری پر الزام لگاتی کہ وہ اپنی چہیتی کو دے آئی ہونگی۔بات یہ تھی کہ ایک دفعہ بچاریاں بلقیس اور ثمن کے منگائے ہوئے پھلوں میں سے دو نارنگیاں چرا کر دے آئی تھیں۔مگر اب بلقیس کی سڑی ہوئی چپل بھی گم ہو جاتی تو وہ یہی کہتی کہ نوری اور جلیس اپنی دوست کو کھلا آئیں۔اس پر نوری اور جلیس خوب روتیں اور خوشامدیں کرتیں کہ ہولے ہولے بولو کہیں وہ سن نہ لے۔شاہ جہاں ان دونوں سے دوگنی بڑی تھی اور زیادہ منہ نہ لگاتی تھی پر جب اس نے بلقیس کا ڈکرانا سنا تو دونوں کو کمرے سے نکال دیا۔دونوں روتی ہوئی بچھونوں پر جا پڑیں۔اوپر سے بلقیس اور ثمن نے بھی چھیڑنا شروع کیا۔خوب گیت جوڑ جوڑ کر ٹہل ٹہل کر گائے۔نوری اور جلیس قسمیں کھا کر کہتی تھیں کہ''شاہ جہاں آپا نے ہمیں نکالا تھوڑی،یہ کہا مہربانی سے چلی جایئے۔۔۔مگر بلقیس کہتی تھی کہ شاہ جہاں نے پہلے تو دھکا دیا اور اوپر سے چپلیں لگائیں۔بے چاریوں کے دل ٹوٹ گئے اور اس دن سے شاہ جہاں کی جانی دشمن ہو گئیں۔جلیس ویسے ہی دل جلی تھی۔بے چاری کا ناطقہ بند کر دیا۔اس تلخ تجربے کے بعد دونوں نے مرنے کی مزید کوشش نہ کی اور زیادہ تر وقت بدذاتی کرنے،کچے آم توڑنے اور مرنے والیوں کو دق کرنے میں صرف کرتیں۔

بلقیس کی پانچ بہنیں تھیں ان میں سب سے بڑی پرنسپل تھیں۔بڑی حسین،نازک اور شرمیلی سی۔کسی طرح پرنسپل نہ لگتیں۔ساری کی ساری لڑکیاں ان پر لٹو ہو گئی تھیں۔ثمن خود لٹو ہو جاتی اگر اس نے بلقیس سے ان کا کچا چٹھا نہ معلوم کر لیا ہوتا۔جناب بہت ڈرپوک تھیں۔بیڈمنٹن کھیلنے میں ہار جاتیں تو لڑنے لگتیں۔اور کم از کم گیارہ آدمیوں سے بیک وقت عشق لڑا رہی تھیں۔جن میں سے دو تو پروفیسر تھے اور باقی کوڑیالے!

پرنسپل کی بہن ہونے کی وجہ سے بلقیس بورڈنگ میں الٹے سیدھے حکم چلایا کرتی تھی۔کھانے کے کمرے سے سوائے بیمار لڑکیوں کے اور کسی کو کھانا کمرے میں منگوانے کی اجازت نہ تھی اور اگر ایک گلاس بھی ادھر سے اُدھر ہو جاتا تو آفت آجاتی۔مگر بلقیس کے کمرے میں جھوٹی رکابیوں کے ڈھیر سڑا کرتے۔میٹرن دیکھتی اور خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔کیونکہ اس سے پہلے میٹرن صرف اس لئے نکال دی گئی تھی کہ وہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

آئے دن لڑکیوں کی رپورٹ دفتر میں لے جاتی تھی اور لڑکیوں میں بلقیس، جلیس اور ان کی چند لاڈلیاں تھیں۔ اور لڑکیاں بھی بلقیس جلیس کی خوشامدوں میں لگی رہتیں۔ خصوصاً وہ بدنصیب بچیاں جنھیں بورڈنگ سے کھانا مفت ملتا تھا یا فیس معاف تھی وہ اپنی دانست میں پرنسپل صاحبہ کی خیرات پر پلتی تھیں۔

بلقیس کوڑیالوں کے نت نئے قصے آ کر سناتی۔ وہ اور جلیس کافی چھوٹی تھیں جبھی سے ان کے کوڑیالوں کی تعداد اطمینان بخش تھی۔ پانچوں بہنوں کے سارے عاشق اگر جمع کئے جاتے تو خاصی پلٹن بن جاتی۔ آہستہ آہستہ بورڈنگ میں کاڑیالوں کا ذکر عام ہونے لگا۔ ڈے اسکالر لڑکیوں کے بھائی بند چٹکلوں اور قصوں کے ذریعہ بورڈنگ کی نیم مردہ زندگی میں راس رچانے آنے لگے۔ چھوٹی موٹی خرید و فروخت، پرانی کتابوں کی ردوبدل، لاسلکی کے سلسلے سے زندگیاں آگے چلنے لگیں۔ اور فلم دھلوانے یا پرنٹ بنوانے کے بہانے عشق لڑنے لگے، بالکل جیسے ہزار سال پہلے کی دنیا میں لوگ تصویروں پر عاشق ہو جاتے تھے۔ اسی طرح یہ نادیدہ عشق بھی چلتے، لڑکھڑاتے اور گر پڑتے۔

اور یہ کوڑیالے تھے بھی غضب کے۔ اور کچھ نہیں تو لڑکیوں کے نام عید کارڈ ہی چلے آ رہے ہیں۔۔۔ بگڑ رہی ہیں، کوس بھی رہی ہیں، لیکن سارے بورڈنگ میں گھمائے جا رہے ہیں۔ ہر ایک کو فخر یہ دکھائے جا رہے ہیں ایسے گویا کچھ پرواہ ہی نہیں۔ دیکھ دیکھ کر لڑکیاں۔۔۔ اوئی اور ہائے توبہ چلا رہی ہیں۔ ایک عورت اور مرد ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں نیچے ٹیڑھے میڑھے شعر لکھے ہیں۔

آہستہ آہستہ یہ مرض اور پھیلا ہر لڑکی نے اپنے چچیرے، ممیرے، خلیرے بھائی کا رومان جوڑ جاڑ کر سنانا شروع کیا۔ بلقیس کے عاشقوں کی تعداد کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ اس کے بھائی کے جتنے دوست تھے وہ سب تو رجسٹرڈ عاشق تھے اور بھی جسے پینگ بڑھانی ہوتی وہ بھائی رشید سے دوستی کر لیتا اور اس بہانے مزے سے امیدواروں میں نام ڈال کر روز آن موجود ہوتا۔ جتنے بھی کالج میں روشن خیال اور انقلابی لڑکے تھے وہاں مختلف سماجی اور سیاسی مشکلات پر بحث کرنے اور آئندہ پود کو روشن خیال بنانے کی تجویزیں سوچنے آ جایا کرتے۔ سب بہنیں نہایت روشن خیال، عموماً نیم شب خوابی ہی میں ان سب سے ملتی جلتیں۔ تاش کیرم کا زور بندھتا نغمہ سرائیاں ہوتیں، باغیانہ بحثیں ہوتیں، کونوں کھدروں میں نہیں سب کے سامنے عشق چلتے۔ پرنسپل صاحبہ کا بنگلہ روشنی سے معمور تھا جس میں پانچوں بہنیں ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جگمگایا کرتیں۔

رات کو کھسر پھسر بلقیس ان کے قصے سناتی۔ بارہ بج جاتے مگر ختم نہ ہو پاتے۔ ایک دو ہوں تو کوئی بھگتے یہ ان عاشقوں کی ذریت سے کون نہ اکتا جائے گا۔ بابر مرزا تھے تو آپا بی کے عاشق مگر گدگدیاں بلقیس کے بھی کیا کرتے۔ حیدر صاحب تو ابا کی عمروں کے تھے۔ مگر اس پر دیوانے تھے۔ وہ تین قلم ان سے چھین چکی تھی۔ جن میں سے ایک اس نے شمن کو دے دیا تھا۔ وہ تو ان کی انگوٹھی بھی چھین لیتی۔ مگر انھوں نے ہنس کر کہا تھا کہ وہ دہلی سے ننھی منی انگوٹھی منگوا رہے ہیں۔

''یہ انگوٹھی تو تمھاری کمر میں آ جائے گی۔'' انھوں نے اس کو دونوں ٹانگوں میں بھینچ کر اس کی کمر کو اپنی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

انگلیوں کے چھلے میں لینے کی کوشش کی جس سے اس کے بڑی گدگدی ہوئی تھی۔ شمن یہ قصے سنتے سنتے شل پڑ جاتی۔

''تو کیا تم ان سے۔۔۔

''تو کیا تم ان سے شادی کرلوگی؟''

''بھئی کیا پتہ، دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''اگر تم حیدر صاحب سے شادی کرلوگی تو بچارے عباس کا کیا ہوگا۔ انصار تو اللہ قسم مر جائے گا۔ اور عشرت یہ ڈیڑھ بالشت کا عشرت بھی تم سے محبت کرتا ہے، چہ توبہ!'' شمن کو ان سب پر ترس آنے لگا۔ ''ہا! بچارے عاشق!'' اچھی تو میں کیا کروں۔ آخر یہ سب جلیس پر...... اس بے چاری کا ایک کالیا ہے اور ایک بچارا ادھا نفیس۔۔۔۔۔ چہ نفرت، میں تو تھک گئی۔ وہ عاجز ہو کر کہتی اور سچی بات تھی۔ ان انقلابیوں میں زیادہ تر غریب، جسمانی طور پر ٹھٹھرے، چیچک مارے اور روسیاہ ہی تھے جو اپنی روح کو تسلی دینے کی خاطر حسن کی جلا چاہتے تھے۔ اور پروانوں کی طرح شمعوں کے متلاشی تھے۔ جلیس سب سے چھوٹی تھی پھر بھی آثار یہ کہتے تھے کہ اپنے زمانے کی نادر شاہ نکلے گی۔ ٹوٹے پھوٹے رنگروٹ ابھی سے قطاریں باندھ رہے تھے۔ کاش بلقیس اپنے عاشقوں میں سے ردی ردی چھانٹ کر بورڈنگ کی لڑکیوں کو دے دیتی جو بے چاریاں خیالی پلاؤ سونگھا کرتی تھیں۔

''تم بھی اپنی باتیں بتاؤ۔'' بلقیس کہتی۔

''واہ۔ ہماری کوئی بھی بات نہیں۔''

''چہ کیسی ہو تم۔ تمھیں کوئی نہیں چاہتا؟''

شمن کا دل بجھ جاتا۔ شرم اور احساس کمتری سے اس کے گال تمتما جاتے۔ لہٰذا ایک دن۔۔۔ اس نے سوچ بچار کے بعد نام لے ہی دیا۔ حالانکہ اسے اپنے سارے سگے، سوتیلے اور رشتہ کے بھائیوں سے نفرت تھی۔ اور وہ بھی تو ہمیشہ اسے دق ہی کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی تو دیسی بھائیوں جیسی حرکت نہ کی تھی۔ جس کا دوسری لڑکیاں مزے لے لے کر ذکر کرتی تھیں۔ مجبوراً ہی اس نے اسحاق بھائی کا نام لے دیا تھا۔ لیکن اسے خوب معلوم تھا کہ اگر ان کے یا ان کی بیوی کے کان میں اس بات کی بھنک بھی پہنچ جاتی کہ شمن ان کے عشق کے قصے گھڑ کر سناتی ہے تو آفت آ جاتی۔ وہ اماں سے جوتے لگوائے جاتے کہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا۔ اسے ویسے سوائے اسحاق بھائی کے سب ناپسند تھے ان کی بڑی لڑکی سے اس کی دوستی بھی رہ چکی تھی۔

''تو وہ تمھیں پیار کرتے ہیں؟''

پیار سے شمن کو نفرت تھی۔ دوسرے اسحاق بھائی سے پیار کروانے کا خیال سے اس کا دم لوٹنے لگا تھا۔ لسی پی کر جب وہ دودھ کے جھاگ مونچھوں میں سے چوس لیتے تو اسے ابکائی آ جاتی تھی۔

''واہ پیار نہیں کرتے تو تمھیں کیا چاہتے ہیں! بلقیس کو اس پر رحم آنے لگا تو شمن نے جی کڑا کر کے

سوچا کہ اگر اتنی دور سے وہ اسحاق بھائی سے پیار کروا لے تو اس کا جی کیسے متلا سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے شرماتے ہوئے اقبال کر ہی لیا کہ اس نے پیار کیا تھا۔ اسحاق بھائی سے ایک قلم چھیننے کا ذکر بھی اس نے خوب مزے لے لے کر بیان کیا۔ حالانکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اسحاق بھائی کے پاس صرف سڑے ہوئے نب اور کھرچے ہوئے ہولڈر تھے جو کوئی بیوقوف بھی چھیننے کا ارمان نہ کرے گا۔ پر بلقیس کو کیا خبر؟

بلقیس اور شمن کی دوستی ایسی بڑھی۔ کہ دن رات ساتھ رہتیں، ساتھ اٹھتی بیٹھتیں اور ساتھ ہی پڑھتیں۔ بلقیس اسے بہت پسند تھی، سعادت سے بھی زیادہ، پتہ نہیں نجمہ سے کم یا زیادہ! نجمہ اور چیز تھی۔ دہکتی ہوئی شراب اور بلقیس صاف نتھرا ہوا پانی، میٹھا پانی۔ گو وہ بڑی بے شرم تھی اور بغیر کسی جھجک کے کپڑے اتار دیتی تھی۔ نہانے جانے سے پہلے وہ کپڑے اتار کر چیونٹیوں اور مچھروں کے کاٹنے کے نشان اپنے جسم پر ڈھونڈا کرتی تھی۔ اگر کوئی آجاتا تو وہ خود جھینپ کر لوٹ جاتا۔ بلقیس کو ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔

''واہ بھلا لڑکیوں سے کیا شرم؟'' وہ ڈھٹائی سے کہتی۔ ایک دفعہ میٹرن نے ڈانٹا تو بلقیس نے اس سے کہہ دیا کہ ''چونکہ تمہارا جسم چکڑ سے جیسا ہے اس لئے مجھ سے جلتی ہو۔'' اس پر میٹرن روئی پیٹی اور بلقیس کو بھی ڈانٹ پڑی مگر وہ کہیں سننے والی تھی۔ اس کا جسم بڑا خوبصورت اور سڈول تھا، جسے دیکھ دیکھ کر وہ آئینے میں آپ ہی آپ مسکرایا کرتی۔ کبھی اس کے ہونٹ جھوٹ موٹ روٹھنے کے انداز میں آپ ہی آپ ابھر آتے اور کبھی خود بخود جھینپ کر وہ آئینے کے پاس بھاگ آتی۔ نہانے کا ارادہ کر کے وہ کپڑے کبھی نکالتی بلکہ نہا کر یونہی لحاف میں دبک جاتی۔ جب خوب گرم ہو جاتی اور سارے جسم کے روئیں سونے کے تاروں کی طرح چمک اٹھتے تو وہ کپڑے نکالتی۔ لیکن وہ گھنٹوں فیصلہ نہ کر پاتی کہ اودی شلوار پر کپاسی دوپٹہ اوڑھے یا کاسنی! وہ اس بارے میں شمن کی رائے لیتی۔ شمن بے چاری گردن موڑے موڑے بتا دیتی۔ اسے کچھ ڈر سا لگتا تھا بلقیس سے، کیونکہ کئی دفعہ باتیں کرتے میں اس کا دل بے اختیار اس کی گردن پر انگلیاں پھیرنے کو چاہنے لگتا۔ وہ نرم نرم سڈول سی گردن جسے وہ بڑے پیارے انداز سے ایک طرف موڑے رہتی۔

بھائی رشید کو پہلے تو بلقیس کا ایک عاشق ہی سمجھتی تھی۔ کیونکہ ان کی ایک تصویر جو اس نے کوڑیالوں کی تشریح کے سلسلے میں دکھائی تھی، میز پر اب بھی رکھی تھی۔ جب بلقیس نے بتایا کہ وہ اس کے سگے بھائی ہیں تب وہ سمجھی یہ بھی اسی خاندانی خوبی کے حامل تھے۔ جس کالج یا یونیورسٹی میں پڑھا، تین چار زخمی چڑیاں تڑپتی چھوڑیں۔ کالج کی بہت سی لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں۔ کئی امیر لڑکیاں تو ان سے ٹیوشن بھی لیتی تھیں۔ وہ خود تو چاہے فیل ہو جاتے ہوں مگر جن لڑکیوں نے ان سے دو چار سبق لے لئے وہ شرطیہ کامیاب ہو گئیں۔

''خدا قسم تم فوراً مر جاؤ گی رشید پر۔'' بلقیس شمن سے کہا کرتی۔ مگر شمن کو بورڈنگ سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تو پھر بھلا مرنے کا موقع کیسے ملتا۔

مگر قسمت نے ایک عجیب طریقے سے اسے رشید سے ملوا دیا۔ سالانہ پکنک کے موقع پر پرنسپل صاحبہ اپنے بھائی اور چند نوجوانوں کو بھی ساتھ لے گئیں۔ وہ سب دوسری موٹر میں گئے اور پیڑوں کی آڑ میں نہاتے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

دھوتے رہے۔ وہ تو لڑکوں کو اس خیال سے لے گئی تھیں کہ کوئی لڑکی ڈوب ڈاب جائے تو وہ لوگ نکال لیں۔ وہ سب دور ہی دور تھے لہٰذا پردہ ہی پردہ تھا۔ پر لڑکیوں کے دل ادھر ہی اُدھر لگے ہوئے تھے۔ وہ بھول بھول کر ادھر جا نکلتیں۔ چیخ چیخ کر ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے کو دھکے دے رہی تھیں۔

''شمن رشید سے ملوگی؟ وہ ادھر ہے پیڑ کے پیچھے۔'' بلقیس نے الگ لے جا کر کہا۔

''واہ بھئی میرا پردہ ہے۔'' شمن نے گھبرا کر کہا۔

''اونہہ تم چلو تو میں اس کی آنکھیں بند کر لوں گی۔''

بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ بلقیس اپنے دوپٹے سے اس کی آنکھیں بند کر دے گی۔ پھر شمن جھجکتی ہوئی گئی۔ رشید کا قد لمبا سا تھا اور جسم چھریرا، آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس سے اس کی ناک بھی چھپ گئی۔ صرف ہونٹ کھلے تھے اور آہستہ آہستہ تھرک رہے تھے، جیسے اسے سخت ہنسی آ رہی ہو۔ گھنے بالوں کا ایک جنگل سر پر کھڑا تھا۔ مچل مچل کر دوپٹے کے بیچوں میں سے بال نکل رہے تھے۔ گریباں کا ایک بٹن کھلا تھا جس میں سے اس کی بھوری گردن کی نسیں ہنسی روکنے کی وجہ سے پھڑکتی نظر آ رہی تھیں۔

''ہی ہی ہی۔'' وہ ایک دم سے ہنس پڑا۔ شمن اور بلقیس بھی ہنسنے لگیں۔ رشید ٹٹولنے لگا۔

''ارے بھئی! کہاں ہیں یہ تمہاری دوست شم شم۔ ان سے کہو ہم سے ہاتھ تو ملائیں۔''

بلقیس نے اسے بہت گھسیٹا مگر وہ نہ مانی۔

''دیکھو بھئی پھر ہم زبردستی پکڑ لیں گے ہاں پھر برا نہ مانے کوئی۔ ہم آنکھیں کھولتے ہیں۔'' رشید نے دھمکی دی۔

مجبوراً شمن نے اپنا ڈرا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رینگا۔ پھر فوراً چھڑانے لگی۔ کیونکہ رشید نے تو مضبوط پکڑ لیا۔

''ارے یہ تمہاری شم شم کا ہاتھ ہے؟ نہیں جی یہ تو چوہیا کا پنجہ ہے۔'' شمن نے ہنسی روکنے کے لئے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

''تو کیا ایک ہی ہاتھ ہے بس؟ اور باقی کا جسم؟ ارے بلی ان کے پیر بھی ہیں یا نہیں؟''

''ہیں!'' بلقیس ہنسی دبا کر بولی۔

''کتنے؟''

''اچھا! اور۔ اور بلی ان کے کان؟ ۔۔۔ کان ہیں؟''

''ہاں ہاں بھئی۔''

''اور ناک؟'' شمن ہاتھ چھڑوانے کے لئے دوہری ہو ہو گئی مگر بے کار۔

''بھئی ایسی باتیں کرو گے تو ہم بولیں گے بھی نہیں۔'' بلقیس نے کہا۔

''اچھا جانے دو ۔۔۔۔ یہ بتاؤ ناک کہاں ہے؟ ان کی ناک! رشید نے پھر ٹٹولنا شروع کیا۔

اندھوں کی طرح اس کی انگلیاں ٹھٹکتی ہوئی شمن کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ بھویں، پلکیں، نتھنے، ہونٹ۔ یہاں تھوڑی دیر کو ٹھٹک گئیں۔ پھر گالوں پر سے ہوتی ہوئی بالوں پر۔

''ارے بلو! ان کے چٹیا تو ہے ہی نہیں! کیسی ہے یہ چٹیا؟'' وہ اس کا کان نوچنے لگا۔ ہنسی کے مارے دونوں کا برا حال ہو گیا اور شمن جھٹکا مار کر بھاگی۔

''ارے بے ایمانی۔۔۔۔ بے ایمانی۔۔۔ ارے پکڑیو بلی۔'' رشید نے دوپٹہ نوچ کر شمن کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ گئی۔

لیکن اب اس کی جھجک ٹوٹ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بہانہ کر کے پھر بلقیس اور وہ رشید کے ساتھ کھیتوں میں خربوزے چرانے گئیں۔ وہاں اس نے دونوں کو کیچڑ میں گھٹنوں تک پھنسا دیا۔ وہاں سے نکل کر جامنوں کی تاک میں لگ گئے۔ دونوں نے اپنے دوپٹے بچھا دیئے اور بھاگ بھاگ کر پکی پکی جامنیں بیننے لگیں۔ رشید کو لڑکیوں کے دوپٹوں کا استعمال بہت اچھا آتا تھا۔ وہ بجائے انہیں لڑکی کے کندھوں کے اپنے سر پر باندھنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اور پھر دوپٹوں کی گیندیں کیا عمدہ بنتی تھیں۔ دوڑ ورکی چوٹ لگتی تھی کہ بس۔

جب پکنک سے لوٹ آئی تو شمن کو معلوم ہوا وہ بادلوں میں جھول کر آئی ہے۔ پلنگ پر لیٹ کر سونے سے پہلے اس نے پوری پکنک کو شروع سے لفظ بہ لفظ دہرایا۔ بلقیس کے دوپٹے میں سے رشید کے مچلتے ہوئے بالوں کے لچھے، وہ اس کے بے چین ہونٹ اور گردن کی کپکپاتی ہوئی نسیں اور پھر ایسا معلوم ہوا رشید کا ہاتھ رینگ رہا ہے۔ جلدی سے اس نے گردن دیوار کی طرف موڑ لی اور سو گئی۔

صبح ہی بلقیس نے بتایا کہ رشید اس پر بے طرح عاشق ہو گیا ہے۔

''ہٹو! تمہیں کیسے معلوم؟'' شمن کا دل دھڑ کنے لگا۔

''میں پہچان لیتی ہوں۔ جیسے ہی تمہارا نام لو سرخ ہو جاتا ہے اور کیا۔''

شمن خود رشید کے نام سے لال سرخ ہو گئی۔ لہٰذا گھل مل کر دونوں رشید کی باتیں کرتی رہیں مگر کسی بہانے سے بھی وہ رشید سے نہ مل سکی۔ نہ ہی اس کا دل ایسا بے قرار تھا۔ اچھی بھاری خوراک مل چکی، ابھی وہی ہضم نہیں ہوئی تھی۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، پکنک کی بہاریں آنکھوں میں سمائی رہتیں۔

لیکن خدا شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے۔ بلقیس کی سالگرہ نے دنیا ہی بدل دی۔ اس کی جماعت کی ساری لڑکیاں اور کئی سہیلیاں جن میں شمن بھی شامل تھی مدعو کی گئیں۔ شمن کے پاس کوئی تحفہ بھی نہ تھا۔ صرف ایک سر پر باندھنے کا ریشمی رومال تھا وہی اس نے کاغذ میں لپیٹ کر چپکے سے بلقیس کو دے دیا۔ مگر بلقیس مارے شرارت کے سارے ہال میں اسے نچاتی پھری۔ شمن نے دروازے کی آڑ میں سے دیکھا کہ وہ اسے اپنے سر پر باندھ رہی تھی کہ رشید نے آ کر چھین لیا اور دوپٹے کی طرح اوڑھ کر منہ چڑانے لگے۔

''اوں۔۔۔ شمن دیکھو یہ رشید نہیں مانتے۔ بھئی ہمارا رومال؟'' مگر رشید رومال لے کر باہر بھاگ گیا۔

''دیکھو بھئی منع کر لو رشید کو، ہمارا رومال چھین لیا۔'' اس نے شمن سے شکایت کی۔ پھر وہ کھڑکی میں سے رومال کو

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

حسرت سے دیکھنے لگیں۔ رشید اسے گلے میں ڈالے ہاکی کھیل رہے تھے۔

شام کو سب لڑکیاں وغیرہ تو چلی گئیں مگر شمن کو پرنسپل صاحب کی خوشامد کر کے بلقیس نے روک لیا۔ وہ دونوں اور جلیس مل کر کیرم کھیل رہی تھیں کہ رشید دراتے چلے آئے۔

''رشید، رشید ارے پردہ ہے پردہ!'' بلقیس اور جلیس چلائیں اور شمن کو دوپٹوں میں چھپانے لگیں۔

''کس کا پردہ ہے؟ لڑکیاں تو گئیں!''

''نہیں بھئی شمن نہیں گئی۔ ارے بھئی رشید۔ آپا بی رشید نہیں مانتے۔''

''دیکھو جی اگر آپا بی سے شکایت کی تو ہاں بس۔'' رشید نے دھمکی دی۔ ''پردہ ہو یا نہ ہو۔ ہم کیرم ضرور کھیلیں گے۔'' وہ گھس ہی آئے۔

تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد یہ طے ہوا کہ رشید اپنا منہ ڈھانک کر کھیلیں۔ بلقیس اور شمن ایک طرف اور جلیس اور رشید دوسری طرف۔

''بھئی کچھ بد کر کھیلو۔ ویسے مزہ نہیں آئے گا۔''

''اکنی اکنی۔'' جلیس بولی۔

''نہیں بھئی رشید لوٹ کر رکھ دے گا ہمیں۔ دو دو پیسے۔'' بلقیس چلائی۔

''اچھا بھئی میں ہاروں تو اکنی دوں گا اور تم ہارو گی تو چٹنی۔''

''نہیں نہیں جناب چٹنی کی نہیں ہے۔ ایسی زور سے مارے گا کہ کیا بتاؤں۔'' بلقیس نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ رشید کی اکنی اور ان دونوں کی چٹنی مگر ہلکے کی۔ زور سے مارے کی نہیں۔ پردے کی وجہ سے رشید وہی ریشمی رومال کا گھونگھٹ کاڑھ کر بیٹھ گئے اور اب کھیل شروع ہوا۔

چھیڑنے کے لئے انہیں سب دلہن دلہن کہہ رہے تھے۔ رومال باریک تھا اور اس میں سے ان کی آنکھیں صاف چمک رہی تھیں۔

''بلقیس یہ تو سب دیکھ رہے ہیں!'' شمن نے چپکے سے شکایت کی۔

''خبردار رشید جو تم نے شرارت کی۔ خدا قسم مار ڈالوں گی۔'' بلقیس نے ڈانٹا۔ کھیل پورے شباب پر آ گیا تو پردہ ورد سب غائب۔ رشید نے بے ایمانی کی لہٰذا بلقیس نے ہر بار اس کا ہاتھ ہلا دیا اس لئے وہ ہار گیا۔ دوسرے کھیل میں رشید نے ذرا سنجیدگی سے کھیلنا شروع کیا اور بلقیس اور شمن کا دم نکلا۔ وہ چیخ کر اس کا ہاتھ ہلا دیتیں تاکہ وہ گز بڑا جائے مگر قسمت میں ہار لکھی تھی۔ کھیل جیت کر رشید نے بڑی احتیاط سے رومال کا گھونگھٹ کاڑھ لیا اور آستینیں چڑھا لیں۔

''بھئی زور زور سے مارنے کی نہیں ہے۔'' بلقیس اس کے اوپر چڑھ بیٹھی۔

''خوب میری اکنی نکل گئی تو کچھ نہیں اور اپنی باری پر چلیں رونے کو خدا قسم آج ہڈی نہ توڑ دوں تو بات

نہیں۔۔۔۔'' اس نے پھر انگلیاں تولیں۔ جیسے ہی اس نے مارنے کا ارادہ کیا تو ثمن نے ہائے کر کے ہاتھ چھڑا لیا۔

''دیکھا تم نے؟ تمہاری دوست حد سے زیادہ مکار ہے۔ یعنی میں نے مارا نہیں اور ''ہائے'' ان سے کہو سیدھی بیٹھیں۔ جگہ بے جگہ لگ جائے تو ہم ذمہ دار نہیں۔''

بڑی دیر تک وہ چٹنی مارے بغیر ڈراتا رہا۔ مار چکتا تو چھٹی ہوتی۔

''بھئی ایک ہی تو بے چاری چٹنی ہے، مزے لے لے کر ماریں گے ہم تو۔'' اتنے میں پرنسپل صاحبہ کے نوکر نے آ کر حکم دیا کہ بورڈنگ کی سب لڑکیاں جائیں۔ سب کو۔۔۔۔ رہ کون گیا تھا سوائے ثمن کے!

''اچھا تو یہ چٹنی ادھار رہی۔'' رشید نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''اچھے رشید ہمیں بورڈنگ تک پہنچا آؤ۔'' بلقیس گڑگڑائی۔

''ہشت ہم سونے جا رہے ہیں۔'' رشید اترائے۔

''اچھی ہمارا بھیا کیسا۔'' بلقیس ان کی گردن میں جھول گئی۔

پانچ منٹ کا راستہ ہنس ہنس کر آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ دیر تک پھاٹک پر کھڑے ہو کر بحث ہوتی رہی۔ رشید کہتے تھے ثمن کا ہاتھ ملا کر مہذب لوگوں کی طرح خدا حافظ کہنا چاہئے اور ثمن کھسیانی کھڑی پھاٹک کی وارنش ناخنوں سے کھرچ رہی تھی۔ جب بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی تو جل کر بلقیس نے ثمن کو اس پر دھکا دے دیا۔ بہت سمٹی پھر بھی اسے دونوں ہتھیلیاں اس کے سینے پر ٹکانی پڑیں۔ گھبرا کر رشید ارے کر کے ہٹ گیا اور ثمن اندر بھاگ گئی۔

بہت دیر تک وہ بلقیس کے چٹکیاں نوچتی اور کوستی رہی۔

(17)

نمائش آئی اور بلقیس کی وجہ سے ثمن کو کئی دفعہ جانے کی اجازت مل گئی۔ نمائش بھی ایک عظیم الشان تہوار ہے۔ سال کے سال میدان حشر بپا ہو جاتا ہے۔ سال بھر کے سوئے ہوئے مردے صور کی پکار پر جاگ اٹھتے ہیں اور پندرہ دن کے لئے ارمانوں کی دنیا میں بسنت کھل اٹھتی ہے۔ خرید و فروخت کے لئے نکے کس کے پاس ہوتے ہیں۔ دوسرے نمائش میں کون بیوقوف خرید و فروخت میں وقت گنوائے۔ ایک آفت برپا ہوتی ہے۔ جس دکان پر جاؤ کالی شیروانیوں اور کالے برقعوں کا جمگھٹ۔ برقعوں کی مجال نہیں جو ایک دم کے لئے ان شیروانیوں کے سائے سے دور رہ سکیں۔

بندے خرید وہاں موجود، چوڑیاں چھانٹو، ہاتھ گھسائے دیتے ہیں، ساڑھیوں کی دکان پر کھڑے آوازے کس رہے ہیں، کھلونوں والی کی دکان پٹی پڑی ہے۔ غرض جہاں دیکھو کوڑیالے پھنکار رہے ہیں۔ لڑکیاں ہیں کہ بدحواس ہوئی جاتی ہیں۔ اگر شکایت کرتی ہیں تو الٹا اپنا آنا بند! غرض سولی پر جان ننگی ہے۔ ویسے بے کوڑیالوں کے بھی دنیا تلخ اور اجڑی ہوئی ڈانٹ ڈپٹ کر دور ہٹا دیا تو باقی کیا رہ گیا نمائش میں؟ یہ جگمگاتے جواہرات؟ وہ زریں ملبوسات؟ جی نہیں یہ اوروں کی دولت ہیں، مفلس طالب علم کو تو اپنی زندہ دلی ہی میں ہزاروں نمائشیں مل جائیں گی۔

بلقیس بہت دنوں سے ثمن کی تصویر کے لئے کہہ رہی تھی۔ رشید اپنے دوست کو انگلینڈ بھیج کر انلارج کرانے کو کہتے تھے۔ میٹرن کی آنکھ بچا کر دونوں کھسک گئیں اور روپے کی آٹھ والی تصویریں کھنچوانے لگیں۔

''جلدی سے کھینچئے۔'' انھوں نے وہاں کھڑے ہوئے فوٹو گرافر سے کہا۔ یونیورسٹی کے لڑکوں کی طرح وہ بھی سیاہ اور سفید تھا۔

''آپ تصویر کھنچوائیں گی۔'' وہ خندہ پیشانی سے مسکرایا۔

''اور کیا بھئی جلدی کیجئے۔''

''جلدی ہی لیجئے تو آیئے یہاں بیٹھئے اسٹول پر۔'' اس نے نیا سگریٹ سلگایا۔ ثمن اور بلقیس کی رائے ہوئی ذرا سا پاؤڈر اور لپ اسٹک لگالی جائے تو اچھا ہے تصویر میں کچھ تو آ ہی جائے گا۔

''آئینہ نہیں ہے آپ کی دکان میں۔۔۔ ذرا۔۔۔۔؟'' انھوں نے پوچھا۔

''آئینہ۔ ہوگا کیوں نہیں۔۔ ادھر آیئے۔'' وہ ان دونوں کو پچھلے کمرے میں آئینہ دکھانے لے گیا۔ وہ پاؤڈر لگاتی رہیں اور وہ کھڑا مسکراتا رہا۔

''عطر بھی تو لگایئے۔'' وہ شرارت سے بولا اور جیبیں ٹٹولنے لگا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''عطر؟ ۔۔۔عطر؟''

''ہاں ہاں صاحب عطر کی خوشبو بھی تو آتی ہے تصویر میں یہ دیکھئے میرے پاس ہے۔'' اس نے انگلیوں میں عطر لے کر ان کے کپڑوں میں لگانا شروع کیا اور بڑی بے تکلفی سے!

''رہنے دیجئے۔'' ثمن نے جھلا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''اچھا اچھا صاحب ۔۔۔ بیٹھئے اسٹول پر ذرا اچھی طرح بیٹھئے۔'' اور وہ دونوں بیٹھ کر ادائیں لینے لگیں۔

''یوں بیٹھئے ۔۔۔ اور دوپٹے کو سنبھالیے میرے خیال میں تو دوپٹہ اتار ہی دیجئے۔'' وہ کیمرے سے زیادہ ان کے دوپٹے وغیرہ پر توجہ دے رہا تھا۔

''ہائے اللہ کتنا بیہودہ فوٹو گرافر ہے۔'' ثمن نے بلقیس کے کان میں کہا۔

''آپ کو تصویر کھنچوانا ہو تو کھنچئے ورنہ۔'' وہ ہمت کر کے ڈانٹنے لگی۔

''مگر یہ آپ کے گال پر پاؤڈر'' ۔۔۔۔۔ اس نے شرارت سے مسکرا کر پیار سے بلقیس کے گال کو چھوا اور سگریٹ کا دھواں بالکل ان کے منہ پر چھوڑنے لگا۔

دونوں ایسی گھبرائیں کہ فوٹو گرافر کو شاید رحم آ گیا اور وہ ہٹ گیا۔

''اچھا صاحب ریڈی'' ۔۔۔۔ دونوں ریڈی ہو گئیں۔ دو چار بار کپڑے میں سر ڈال کر پھر بولا۔

''اونہوں یہ آپ نے بال کیسے بنائے ہیں۔ لائیے میں ٹھیک کر دوں۔''

''آپ کو اس سے کیا؟ آپ تصویر کھینچ رہے ہیں یا۔۔۔ چلو ثمن چلیں۔''

''ارے ارے آپ تو خفا ہو گئیں۔ بیٹھئے بھئی ثمن ۔۔۔ اوہ معاف کیجئے گا چہ میں تو آپ کے فائدے کے لئے ہی کہہ رہا تھا۔ بالکل خراب آئے بال تو فوٹو گرافر کو الزام دیں گی آپ، کہ تصویر بگاڑ کر رکھ دی۔ اور کیا۔'' وہ کچھ روٹھا سا گیا پھر وہ دونوں راضی ہو گئیں اور اس نے ان کی ٹھوڑیاں پکڑ پکڑ کر بال سنوارنا شروع کئے۔ بلقیس نے جھٹک کر اس کے سینے پر سے سر ہٹا لیا جسے وہ بری طرح کھینچ کر بال بنا رہا تھا۔ وہ شرارت سے ہنسا اور ثمن کی طرف چلا کہ اتنے میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی اور تھوڑی سی دیر میں تین چار آدمی اور آ گئے۔ ثمن اور بلقیس کو ڈر لگنے لگا۔

''ہم جاتے ہیں۔''

''تو ۔۔۔ جائیے ۔۔۔ خدا حافظ'' ۔۔۔۔ وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

''ایں؟ ۔۔۔۔ یہ آپ۔'' نوادر بولا۔ ''تشریف لائیے۔''

''ہم ۔۔۔ تصویر کھنچوانے آئے تھے ۔۔۔ مگر ۔۔۔ اتنی دیر لگا دی۔''

''تو تشریف لائیے اندر ۔۔۔ معاف کیجئے گا۔ ذرا میں کھانا کھانے گیا تھا۔''

''اور ۔۔۔ اور ۔۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ فوٹو گرافر جو ابھی ابھی یہاں تھا۔

''جی میں ہی ہوں فوٹو گرافر۔ تو آئیے۔'' اس نے فخریہ اپنی کالی شیروانی کو دیکھ کر کہا۔ ''آئیے تشریف لائیے۔''

''تو وہ کون تھا؟'' بلقیس ہکلائی۔

''کون؟''

''اوہ ۔۔ وہ حمید ۔۔۔ ارے صاحب وہ تو کالج کے ایک صاحب ہیں پرنٹ لینے آئے تھے ..... آئیے اندر آ جائیے۔'' اس نے بات ٹالنا چاہی۔

''ہیں؟'' وہ بیوقوفوں کی طرح وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔

''آئیے ۔۔۔۔ پھر۔'' فوٹو گرافر نے اپنے اوزاروں سے کھڑبز کرنی شروع کی۔

''نہیں ۔۔ اب ہم کل کھنچوائیں گے ۔۔ آج دیر ہو گئی۔''

دونوں گھبرائی ہوئی بھاگیں وہاں سے، دل دھڑک رہے تھے۔ میٹرن ان کی تلاش میں سرگاڑی پیر پہیہ کئے پھر رہی تھی۔ یہ دونوں ملیں تو پڑی ڈانٹ۔

''ارے اور ہم آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔'' دونوں جھوٹ بولیں۔ اس دن بلقیس کی وجہ سے بات بن گئی ورنہ میٹرن ان بہانوں کو خوب جانتی تھی۔ کتنی لڑکیاں روز اسی طرح کھو کر مل جایا کرتی تھیں اور بڑا مزہ بھی آتا ہے یوں جان بوجھ کر کھو جانے میں۔ جی بھی تو نہیں چاہتا واپس ملنے کو کاش کسی طرح ساری عمر کے لئے یوں ہی نمائشوں میں بھٹکتے پھریں اور میٹرنیں نہ پکڑ سکیں۔

دوسرے دن وہ تصویر کھنچوانے نہ جا سکیں مگر نمائش میں وہی کوڑیالہ حمید برابر آ ہیں بھرتا، شعر پڑھتا، ان کے پیچھے لگا رہا، اسے ان دونوں کے نام تو معلوم ہو ہی گئے تھے۔ شرارت میں وہ اپنے دوستوں کو ثمن اور بلقیس کہتا تو وہ فوراً چمک کر جواب دیتے ''ہاں فوٹو گرافر صاحب!''

''آؤ ثمن بندے خریدیں۔'' ایک اترا تا اور لڑکیوں کی نقل کر کے اپنے دوست کو چھیڑتا۔

''ہاں بلقیس! چلو تصویر کھنچوائیں۔'' دوسرا اٹھلا کر جواب دیتا۔

ثمن اور بلقیس جل جاتیں مگر انھیں ہنسی بھی آ رہی تھی۔ جب تک وہ ساتھ رہتے وہ جلتی رہتیں۔ مگر جیسے ہی وہ بچھڑ جاتے ان کی آنکھیں بے چینی سے تلاش کر کے انھیں ڈھونڈ لاتیں اور پھر ڈھکے چھپے جملے کسے جانے لگتے۔ نمائش کے پھاٹک کے پاس ثمن اور بلقیس کو ایک چھوکرے نے ایک بنڈل لا کر دیا کہ یہ وہ دکان پر بھول آئی تھیں۔

''تمہارا ہو گا بلقیس۔''

''نہیں تو میں نے کچھ خریدا ہی نہیں، کھولو تو دیکھیں کیا ہے اس میں؟''

کھول کر دیکھا تو نانیاں! چاکلیٹ!! اور مٹھائیاں!!! مارے خوشی کے چیخ نکل گئی اور دونوں بنڈل پر ٹوٹ پڑیں فوراً ان کی نگاہیں اٹھیں اور اس کوڑیالے کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ہلکی سی سر کی جنبش سے اس نے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

انھیں سلام کیا اور فوراً دونوں بگڑ گئیں۔ بلقیس نے رائے دی ''پھینک دو۔'' مگر بھوک کا تقاضا ہوا یہ بے وقوفی ہو گی۔ بورڈنگ میں جیب خرچ ہی کتنا ملتا ہے۔ دونوں وہاں سے چل دیں کچھ ردوکد کے بعد دونوں نے جیبوں میں مٹھائیاں بھر لیں۔

جب نمائش ختم ہوگئی تو ثمن اور بلقیس کے نام عاشقانہ خط آئے۔ بڑے جوتے پڑتے اگر بلقیس پرنسپل صاحبہ کو سب صاف صاف نہ بتا دیتی۔ ہاں تصویریں کھنچوانے کا واقعہ گول کر گئیں۔ بات دب دبا گئی۔ بلقیس نے بتایا کہ غریب کوڑیالہ کتنے ہی خط بھیج چکا ہے مگر سب پرنسپل صاحبہ نے پھاڑ کر جلا دیئے۔ جب بات بہت بڑھی تو اٹھا کر سارے خط انھوں نے پی۔ وی۔ سی کو بھیج دیئے۔ اس کے بعد یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ کوڑیالے کا زہر بھی پھیکا پڑ گیا۔ رشید کو بھی اس معاملہ کی خبر مل گئی اور اس نے یہ بات اور لڑکوں میں پھیلا دی اور سارے لڑکوں نے مل کر مگوڑ مارے کوڑیالے کو ناکوں چنے چبوانے شروع کیے۔ بلقیس کی رائے تھی کہ خواہ مخواہ بے چارے کو پریشان نہ کیا جائے۔ آخر اس نے ایسا کیا جرم کیا تھا۔ الٹا اسی کا تو ہر طرح کا نقصان ہوا تھا۔

سالانہ جلسے کا ڈرامہ ہوا تھا تو اس کی تصویریں کھینچنے کے لئے رشید ہی کو بلایا گیا۔ ویسے ڈرامہ کی ساری لڑکیاں اس کے سامنے آئی تھیں۔ باہر کا کوئی آدمی بلایا جاتا تو بے کار خلل مچتا۔ جبلا کو اعتراض ہوتا۔

ثمن لڑکا بنی تھی اور مونچھیں لگا کر تو مارے شرم کے اس کا دم نکلنے لگا۔ بلقیس اس کی محبوبہ روز النڈ بنی تھی۔

''ارے بلی یہ چھوکرا کون ہے؟'' رشید نے حیرت سے پوچھا اور ثمن اپنی تلوار پھینک کر جھاڑیوں میں چھپ گئی اور تصویر کھنچوانے سے قطعی انکار کر دیا مگر تصویر کھنچوانا ضروری تھی اور اسے محبوبہ روز النڈ کا ہاتھ چومنا تھا اور یہاں تو اسے کھڑا ہونا ہی وبال معلوم ہو رہا تھا۔ ٹانگیں لرزی جاتی تھیں اور ہاتھ ٹھنڈے تھے۔

''ارے چھوکرے ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہو۔'' رشید نے کہا اور ثمن چڑ کر منمنانے لگی۔

بلقیس نے رشید کو ڈانٹا۔

''واہ ثمن تو ڈیوک کا بیٹا ہے۔ چھوکرا چھوکرا کیے جاتے ہو۔''

''اچھا تو ڈیوک کے بیٹے کم بخت کی مونچھیں تھیں! خوب!''

''ہشت جھوٹے مونچھیں تھوڑی۔ کاجل ہے۔'' بلقیس نے پیار سے ثمن کی مونچھ کو دیکھا۔ ''ہائے بالکل تو اصلی لگ رہی ہیں۔''

اگر پرنسپل صاحبہ آ کر ڈانٹ نہ دیتیں تو مذاق کبھی ختم نہ ہوتا اور نہ تصویریں کھنچتیں۔

''آپا بی اب کے ڈرامہ ہو تو ہمیں لڑکی بنایئے گا۔'' رشید نے پرنسپل صاحبہ سے کہا۔

''بھئی جب کالونچ لگا کر لڑکیاں مرد بن سکتی ہیں۔ تو پھر میں کیوں نہیں لڑکی بن سکتا۔ بھئی واہ!''

جب سب جانے لگے تو رشید نے چپکے سے ثمن سے کہا۔

''اے۔۔۔۔ دیکھو جی میاں لڑکے ہماری چنٹی اُدھار ہے کہیں ہضم نہ کر جانا۔'' وہ ہنسی روکتی جھلاتی بھاگ آئی۔

(18)

ثمن اور رشید کا رومان پینگیں بڑھاتا رہا۔ روزانہ بلقیس اس کا ایک پرچہ ثمن کو لا کر دیتی۔ اس پرچہ میں کچھ بھی نہ ہوتا سوائے اس پرانی چٹنی کے ارمان بھرے ذکر کے، اسے رشید ثم ثم یا میاں لڑکے لکھتا۔ سوائے رشید کے ثمن کو کچھ بھی تو یاد نہ رہا۔ ششماہی امتحان میں وہ بری طرح فیل ہوئی اور گھنٹوں شرم سے روتی رہی۔ رعائتی درجہ مل گیا۔ حساب میں وہ ہمیشہ سے کمزور تھی۔ پرنسپل صاحبہ نے اسے ٹیوشن دلوا دی۔ کہہ سن کر رشید ہی اسے ٹیوشن دینے پر مقرر کیا گیا اور کوئی شریف و معقول آدمی ملتا ہی کہاں تھا۔

یہ طالب علم اور معلم کا رشتہ بھی کس قدر رومان انگیز ہوتا ہے۔ بات بے بات عشق ابل پڑتا ہے۔ پڑھائی تو خاک بھی نہ ہوتی۔ ثمن اور رشید گھنٹوں آسانی سے باتیں کیا کرتے۔ جب بہت دیر ہو جاتی تو دوسرے دن کی امید دل میں لے کر جدا ہو جاتے۔ پڑھنے کے لئے ثمن کو پرنسپل صاحبہ کے بنگلے پر ہی جانا پڑتا۔ شام ہی سے بنگلہ اندر سبھا کا اکھاڑہ بننا شروع ہو جاتا۔ دوستوں کے جمگھٹ شروع ہو جاتے۔ خاصا بے تکلف جماؤ جمتا۔ جس میں بے تکلف زندگی پر مباحثے ہوتے۔ انسانی حقوق پر لیکچر دیئے جاتے۔ پانچ چائے کے ٹکڑوں کے گرد ستاروں کے پرے جمتے۔ مہذب اور لطیف معاشقے چلتے اور بنگلہ قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

ایک دن وہ اور بلقیس برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رشید کی تازہ شرارتوں پر بات چیت کر رہی تھیں کہ پھاٹک کھلا اور کسی نئی لڑکی کا سامان آنا شروع ہوا۔ سامان بہت سا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی بہنیں آئی تھیں۔ مگر سامان کے ساتھ کوئی نہ آئی۔ اس دن چونکہ میچ تھا اور رشید گئے ہوئے تھے لہٰذا ثمن بنگلہ پر نہ گئی تھی۔

دوسرے دن پرنسپل صاحبہ دو لڑکیوں کو لئے ہوئے اپنے دفتر میں چلی گئیں۔ لڑکیاں خوبصورت ہی نہیں امیر بھی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک تو ان میں سے چھ سات سال کی تھی اور دوسری پندرہ سولہ سال کی۔ ان کے ریشمی ملبوسات اور فیشن سے متاثر ہو کر لڑکیاں کلاموں میں سے نکل نکل کر جھانکنے لگیں۔

کھانے پر پرنسپل صاحبہ نے بلقیس اور جلیس کو بلا کر ان دونوں لڑکیوں کو ان کے سپرد کر دیا۔ اور چاروں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

نہایت مہذب بنی بنگلے سے آیا ہوا کھانا میز کے صاف ترین کونے پر بیٹھی کھاتی رہیں۔ کھانے پر آج ویسے بھی ضرورت سے زیادہ صفائی تھی۔ ٹوٹے ہوئے تام چینی کے ڈونگے اور بے قلعی رکابیاں اس خاص میز پر نہ تھیں۔ بلکہ نئی پلیٹیں جو کبھی دعوتوں پر نکال لی جاتی تھیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا بھی بہت تھا چونکہ جمعہ تھا اس لئے مکھن نکلے ہوئے دودھ کی پھیکی پھیکی کھیر بھی تھی۔ اتنے میں پرنسپل صاحبہ اور ایک لحیم شحیم حسین بیگم، نہایت زریں لباس پہنے داخل ہوئیں اور ان نئی لڑکیوں کے پاس جا کر باتیں کرنے لگیں۔ لڑکیوں کی کھسر پھسر سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی اماں جان تھیں۔

نو وارد لڑکیوں کی اماں نے بھی کھانا چکھا اور منتظمین کی تعریف کرتی رہیں۔

''ایسا مزیدار کھانا تو گھر پر نہیں ملتا۔'' مرغن کھانوں کا اشتہار، چربی کی پوٹ نوابزادی بولیں ''اتنا لذیذ اور صحت بخش!'' کباب پراٹھوں سے تھکی ہوئی بیگم کی زبان میں اتنا احساس ہی کب رہا ہوگا جو کھانے کی اچھائی برائی پرکھ سکتیں۔ کھانے کے درمیان ہی سے لڑکیاں اور بیگم پرنسپل کے ساتھ واپس جانے لگیں تو بضد بلقیس اور جلیس کو بھی ساتھ لے لیا۔

شام کو بلقیس ان دونوں لڑکیوں کو لئے ہوئے واپس آئی۔ وہ اب تک بھڑکیلے لباس پہنے تھیں اور ساتھ ساتھ بلقیس بھی ایک خوبصورت سا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ سارے وقت وہ ان لڑکیوں کے ہمراہ رہی۔ بورڈنگ میں تو یہ لڑکیاں کیا آئیں، عجائبات آ گئیں۔ اپنا کام چھوڑ پھاڑ کر ساری لڑکیاں دیکھنے ٹوٹ پڑیں۔ اتنی دیر میں ان کا کمرہ بھی سج کر تیار ہو گیا تھا۔ علاوہ خوبصورت مسہریوں کے سنگھار میز جو نہایت ہی عجیب چیز معلوم ہوتی تھی اور میزیں، لیمپ، قالین، غالیچے، ریشمی پردے غرض معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں کسی نے پھولوں سے لدا ہرا بھرا گلدستہ کھڑا کر دیا۔ شمن ان کے کمرے کے سامنے سے بھی نہ گزری۔ بورڈنگ میں جب سے اس کی بلقیس سے دوستی ہوئی تھی۔ وہ دوسری لڑکیوں سے بہت دور ہٹ گئی تھی۔ پرنسپل صاحبہ کی منظور نظر ہو کر وہ سب کی نظروں سے گر چکی تھی۔ وہ اسے خوشامدی، مغرور اور خود غرض سمجھنے لگی تھیں۔ آج جب بلقیس نئے مہمانوں کی آؤ بھگت میں غرق تھی وہ بے سہارا اور تنہا اُلو کی طرح اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کھانے پر بلقیس لڑکیوں کے ساتھ بنگلے پر چلی گئی اور مسکراتی ہوئی طعن آمیز نظروں کے درمیان وہ خاموش اپنی جگہ بدبودار سالن اور خشک چاول نگلتی رہی۔

بلقیس کچھ چیزیں لینے کمرے میں آئی تو شمن نے منہ پھلا کر شکایت کرنا چاہی مگر بلقیس بڑی جلدی میں تھی۔

''اچھی نواب صاحب آج آئے ہوئے ہیں، بے حد خوبصورت کپڑے ہیں، نسیمہ نے مجھے زبردستی یہ دوپٹہ دے دیا۔ آپا کا حکم ہے کہ لڑکیوں کا دل نہ گھبرائے، کوئی بات بھی ہے کہتی ہیں پرسوں نواب صاحب کو پہنچانے دہلی تک چلو۔'' وہ جلدی جلدی چیزیں سمیٹتی رہی۔

''اور کوکو تو غضب کی پیاری ہے، رشید پر تو فدا ہے۔ سارے دن کندھے پر چڑھی رہی۔'' وہ ذرا جھینپی

ہوئی سی جلدی سے چل دی۔

دو چار روز کی چھٹیاں آ گئیں۔ بلقیس جلیس ان لڑکیوں کے ساتھ ان کے والدین کو خدا حافظ کہنے دہلی چلی گئیں۔ جب وہ آئیں تو بھی بلقیس سے کوئی بات نہ ہوئی۔ رشید کسی میچ میں گئے ہوئے تھے اس لئے شمن پھر بنگلے سے دور ہی رہی۔ پھر وہ پڑھنے پہنچی تو اس نے فضا کچھ بدلی پائی۔ حالانکہ رشید کو وہ تیس روپیہ ابا سے ہزاروں چالیں چل کر دلواتی تھی مگر وہاں آج اس طرح کا برتاؤ کیا جا رہا تھا گویا وہ کوئی یتیم لڑکی ہے جس پر رحم کھا کر وہ پڑھا دیا کرتا تھا۔ رشید موجود نہ تھے۔ وہ لڑکیاں زیادہ تر بنگلے پر رہتیں اور ساتھ ساتھ بلقیس بھی آہستہ آہستہ بورڈنگ سے اپنی چیزیں بین بین کر گھر لے جا رہی تھی۔

رشید آئے تو اس دن بالکل پڑھائی نہ ہوئی۔ اول تو نسیمہ کے ساتھ کیرم کھیلتا تھا۔ دوسرے کوکو برابر کندھوں پر کود رہی تھی۔ علاوہ بلقیس اور جلیس کے قریب قریب ہر ایک فرد ان لڑکیوں پر مکھیوں کی طرح چپکا ہوا تھا۔ ان دونوں نے تو جس دن سے وہ آئیں تھیں اپنے کپڑے چھوڑ کر ان کے ہی پہننے شروع کر دیئے تھے۔ پرنسپل صاحبہ تک کو زبردستی کر کے نسیمہ نے اپنا شان کا ستاروں نکا دوپٹہ اوڑھا رکھا تھا۔ نسیمہ پیچھے پڑ جاتی تھی اور اپنا زیور اور اپنا کپڑا انھیں پہنا کر ہی دم لیتی۔

نسیمہ کی سنگھار میز جیسے کیسٹ کی دکان! بلقیس جلیس تو ہر وقت منہ پر الا بلا پوتا کرتیں۔ سارے بورڈنگ کی لڑکیاں ان کے کمروں پر جمع ان کی تعریفوں میں چہکا کرتیں۔ نسیمہ نے تھوڑے ہی دنوں میں میدان پر پورا قبضہ کر لیا۔ قریب قریب ہر لڑکی پاؤڈر، لپ اسٹک، پرانے ریشمی جمپر یا دوپٹہ یا چپل کے احسان کے نیچے دب گئی۔ ان کے ساتھ ان کی بچپن کی کھلائی بھی تھی جسے سارا بورڈنگ ان کی نقل میں بے بے کہتا تھا۔ موٹی چوڑی مرد مارسی عورت خوشامدی لڑکیوں کو ہزار دھتکاریں بتاتی پر وہ اس کے قدم چومنے کو تیار رہتیں۔

نسیمہ اور کوکو پر بورڈنگ کی کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ نوکروں کے رہنے کی اجازت نہ تھی مگر ان کے کیس میں مجبوراً پرنسپل صاحبہ نے دے دی۔ وہ لوگ کھانا اپنے کمرے میں کھاتیں۔ کھانا تو خیر ان کی ''بے بے'' خود اپنے ہاتھوں سے پکاتی تھی۔ چینی کے برتن بھی ان کے اپنے تھے۔ انھیں دو کمرے مع دو غسل خانوں اور اسباب کے کمرے کے ملے ہوئے تھے۔ اچھا خاصا گھر تھا۔ ان کے برآمدے کی طرف سے کسی کو گزرنے کی اجازت نہ تھی۔

جلد ہی سنگھار کا مرض پھیلنے لگا۔ غریب لڑکیوں نے لال رنگ کی روشنائی اور چارآنے والا پھنسیوں پر لگانے کا پاؤڈر ہی تھوپ لیا۔ جدھر دیکھو لال پیلے گال اور مصنوعی گھونگر والے بال نظر آتے۔ بجلی کے آلے نہ ملے تو سلائیں گرم کر کے ہی بال الجھا لئے۔ سچے ستارے اور گوٹے نہ جڑے تو پن اور چھوٹے پترے ہی چپکا لئے۔ ان لڑکیوں کی وجہ سے بورڈنگ میں بزاز، چوڑی والے اور پھل والے کو بھی آنے کی اجازت مل گئی اور کچھ نہیں تو قرض پر ہی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ کم بختوں کے پاس نہ جانے کہاں سے قارون کا خزانہ آن ٹوٹا تھا کہ سارے بورڈنگ کو قرض دینے کے بعد روزانہ ٹوکریوں پھل اور بنڈلوں بسکٹ آتے اور لنگر بنتے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

۔حلوے بنتے اور پارٹیاں ہوتیں۔آج کوکو کی سالگرہ ہے، سارے بورڈنگ کی دعوت، پرنسپل صاحبہ کے خاندان بھر کی دعوت۔آج نسیمہ کا جی گھبرا رہا ہے، بلقیس کی سالگرہ کی دعوت وہ خود کر رہی ہے مع سارے خرچہ کے۔اوپر سے بلقیس اور جلیس کو بھی جوڑا مل رہا ہے۔خیرات میں مرنے والیوں کا بھلا ہو رہا ہے۔ثمن اب حساب میں اتنی کمزور نہ رہی تھی جتنی نسیمہ اردو میں۔اس نے ساری عمر کانونیٹ میں گزاری تھی۔اب اس اسلامی اسکول کی عاقبت سدھارنے بھیجی گئی تھی۔لہٰذا رشید اسے پچھتر روپے پر اردو، جغرافیہ اور حساب پڑھانے لگے تھے۔نسیمہ نویں جماعت میں تھی۔گو اس کی انگریزی کئی استانیوں سے اچھی تھی اور اردو میں دوسری جماعت کی بھی قابلیت نہ تھی۔انگریزی کے گھنٹے میں وہ ثمن کی کلاس میں بھی آجاتی۔سوال سننے سے پہلے وہ جواب دے دیتی اور اتنا صحیح کہ استانیوں کی باچھیں کھل جاتیں۔نیز دوسرے لڑکیوں پر اور جوتا باری ہوتی۔سارے وقت نسیمہ یا کچھ کچھ بلقیس بولا کرتیں اور استانیاں انھیں شاباشی دیا کرتیں۔باقی لڑکیاں گھبرائی اور شرمندہ بیٹھی پھنکاریں سنا کرتیں۔

یہی نہیں کھیل کے میدان میں نسیمہ نے سب کو چت کر دیا۔وہ کبھی دھاندلی بھی کر جاتی۔بازپرس پر نہایت تیز انگلش میں بولنے لگتی جس پر ساری لڑکیاں جھک جاتیں اور انگریزی کی مداح استانی اس کی ساری گستاخیاں انگریزی کے پیارے سے جملے سے معاف کر دیتیں۔نہ جانے کیوں ثمن کی پہلی نظر میں نسیمہ کو دشمن کا عہدہ دے دیا تھا۔ہر موقع پر اس کی اور نسیمہ کی ٹکر ہو جاتی۔دونوں کی گستاخ نظریں ٹکراتیں مگر جھک جاتیں اب بھی رشید ملتا اس سے دو چار میٹھی باتیں کہہ دیتا مگر وہ بات نہ رہی تھی۔ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کچھ بھولتا جا رہا ہے پرنسپل کی نظروں سے بھی وہ اتر گئی تھی اور بورڈنگ میں تو اس کی حیثیت تھی ہی ایک غیر جیسی۔نوری تو جلیس کے ساتھ کوکو کا دم چھلا بن چکی تھی۔غرض ایک بار پھر اسے ایک ناقابل بیان سنسان تنہائی کا احساس ہوا ۔اور اس شدت سے کہ اس نے ہر چیز سے بغاوت کر دی۔

سب سے پہلے تو وہ کتابوں پر ٹوٹ پڑی۔نسیمہ کی زبان تیز تھی مگر معلومات صفر کے برابر تھیں تھوڑے ہی دن میں اس نے نسیمہ کی قینچی کا جواب بگڑی مگر حفظ کی ہوئی انگریزی میں دینا شروع کیا۔پورے پورے صفحے رٹ کر اس نے نسیمہ کو چت کر دیا۔اڑیل گھوڑے کی طرح وہ پیر جما کر کھڑی ہو جاتی اور ساری مسکراہٹوں اور قہقہوں کا جواب وہ رکتی ہوئی زبان میں دیتی رہی۔اسے کھیل سے نفرت تھی مگر جلتی دھوپ میں اس نے مشق کی۔یہاں تک کہ وہ کھیل میں بھی چوٹ کھائی شیرنی کی طرح سب پر حاوی ہو گئی۔

نسیمہ کے احسانات تو خیر تھے ہی جادو کے منتر، ثمن کی ضدیں، ہٹ دھرمیاں اور گستاخیاں بھی بیکار نہ گئیں۔رفتہ رفتہ ساری وہ لڑکیاں جو کسی طرح نسیمہ کی نظروں سے اتر گئی تھیں۔ثمن کے جھنڈے تلے آگئیں۔نسیمہ کو اب بورڈنگ میں بہت کم وقت گزارنے کو ملتا تھا کیونکہ اسکول سے آکر فوراً وہ اردو کی کمزوری دور کرنے بنگلے پر چلی جاتی تھی۔کوکو بھی اب وہ پھول جیسی گڑیا نہ رہی تھی بے بے کے تو بس کی نہ تھی۔بدتمیز بچوں کے گروہ میں ملی خاک دھول میں لوٹا کرتی اور وہ کوکو جسے چومنے کے لئے لڑکیاں بے اختیار کلاسوں سے نکل

پڑتی تھیں اب چھپتیں کھا کر کمروں سے نکلتی۔پھل بھی کچھ کم آنے لگے تھے کیونکہ زیادہ تر بنگلے پر چلے جاتے۔نسیمہ تو زیادہ تر کھانا بھی وہیں کھاتی۔

ثمن کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔وہ اب اکیلی رہتی تھی۔بلقیس کے جانے کے بعد اس نے کسی کو نہ آنے دیا تھا۔وہ ایک تقریر کو رٹنے میں مشغول تھی جو اسے دوسرے دن کرنا تھی کہ اتنے میں بلقیس آئی۔وہ کچھ شرمندہ اور پشیمان سی تھی کسی کتاب کے بہانے سے وہ دیر تک میز ٹٹولتی رہی۔پھر بیٹھ گئی۔ثمن نے بات نہ کی تو خود ہی بولی:

''پوئٹری بک میری کھو گئی ذرا اپنی دے دو۔''ثمن نے کتاب اٹھا کر سامنے ڈال دی۔

''کل کے لئے تیاری کر لی۔''

''ہاں''۔

''لاؤ میں سن لوں۔''بلقیس نے قریب آکر اسپیچ کی کاپی لے لی۔ثمن کے گلے میں آنسو اٹکنے لگے۔جی چاہا سنائے کھری کھری مگر بلقیس کی جھکی ہوئی نظریں دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

''چہ خدا قسم۔نسیمہ مر بھی جائے تو بول نہیں سکتی۔پتہ ہے اس نے ابھی تک نوٹس بھی تیار نہیں کئے ہیں۔''

''بھئی وہ تو بغیر نوٹس کے بھی بول سکتی ہے۔''

''خاک بھی نہیں۔رشید نے اتنی غضب کی تقریر تیار کر کے دی جناب نے پڑھی تک نہیں۔''

''میری اور عیسی کی لڑائی ہو گئی۔''وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

''ہیں؟۔۔۔۔ہئو!''

''سچ!''

''مگر؟''

کمینہ ہے! پتہ ہے تمہیں اتوار کو ۔۔۔۔۔''وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ثمن نے بالکل تجسس کا اظہار نہ کیا۔

''مجھے کہنے لگے کہ آٹھ پلیٹوں کا فلم ہے چار نسیمہ کی تصویریں کھینچ لینے دو پھر تمہاری اور جناب بعد میں معلوم ہوا کہ صرف چھ تھیں جن میں سے ایک جلیس نیکر پہن کر کھنچوائے گی۔جی ہاں گویا میں مرتی ہوں ان فلموں پر۔''

''ایک ہی فلم تھا۔''

''ہاں کہنے لگے دلی سے لانا پڑے گا۔اور خدا قسم بیہودہ ہوتی ہیں بعض لڑکیاں یعنی رشید بے چارے نے جناب کی سینکڑوں تصویریں کھینچیں ۔۔۔۔اور اب۔۔۔۔چہ حد ہے۔''بلقیس روہانسی ہو گئی۔''ایک لفظ نہیں پڑھیں۔آپا نے کہا تو فوراً دو مہینے کی ٹیوشن کا چیک لا کر دے دیا۔یہ آپا بی خدا قسم اتنی وہ ہیں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

۔۔۔نہ جانے کیوں دبتی ہیں۔'' آپا غریب پانچ بہنوں اور ایک لاڈلے بھائی کی اکیلی کفیل تھیں۔

''تم بھی تو دبتی تھیں''۔۔۔۔ثمن نے کہہ ہی دیا۔

''جی ہاں جوتی دبتی ہے چڑیل سے۔۔۔۔ ہنہ۔ وہی زبردستی کرتی تھیں۔ پتہ بھی ہے عیسیٰ کو اب کے اپنے گھر مسوری لے چلنے کو کہتی ہیں۔''

بلقیس ثمن سے رونا رو کر چلی گئی۔ سہ پہر کو ۔۔۔ میٹرن سے نسیمہ کے لڑنے کی آواز سن کر ساری لڑکیاں کھڑی ہوگئیں۔ بات یہ تھی کہ بزاز آیا تھا اور پرنسپل صاحبہ کے حکم سے لوٹا دیا گیا۔ میٹرن سے جو نسیمہ نے کہا تو وہ مجبوری ظاہر کرنے لگی۔ جس پر نسیمہ خوب بگڑی مگر شکست ماننا پڑی۔ وہ باہر نکل کر جو کچھ خریدنا تھا خرید لائی۔ میٹرن چوں نہ کر سکی۔ شام کو ہال کے سامنے نوٹس ٹانگا گیا کہ بورڈنگ میں کسی سودے والے کو آنے کی اجازت نہیں، خرید و فروخت صرف اتوار کو ہوگی اور بورڈنگ کے باہر کے کمرے میں ساری لڑکیوں نے یہ ظالمانہ نوٹس پڑھا اور بڑبڑائیں گویا بزی انھیں خریداری کرنی تھی۔

تیسرے چوتھے دن ثمن جو کمرے میں گئی تو بلقیس کو خاموش پلنگ پر بیٹھے دیکھا اسے دیکھ کر وہ خاموش ٹکٹکی رہی پھر منہ پھیر کر بستر پر اوندھی گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ہائیں بلی کیا ہوا؟'' آج بہت دن بعد ثمن نے اسے پیار سے پکارا۔

''ہائے ثمن!'' بلقیس اس سے لپٹ کر پھوٹ پڑی۔ بڑی دیر تک وہ اسے عیسیٰ اور نسیمہ کے عشق کا حال بتاتی رہی۔ عیسیٰ آئی۔سی۔ایس کے مقابلے میں بیٹھ چکا تھا اور اس کے باپ کی سفارش سے اسے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو جائے گا اور آج بلقیس نے جب اس کی دی ہوئی البم اٹھا کر پھینک دی تو وہ الٹا برا مان گیا۔

''بلقیس تم میری البم لے لینا۔'' نسیمہ نے اسے چھیڑا۔ ''میں اب دوسری منگوا رہی ہوں پیرس سے۔''

ہنہ۔ گویا بلقیس کسی کی بے کار چیزیں جمع کیا کرتی ہے اور پھر عیسیٰ نے معافی بھی تو نہیں مانگی۔ خیر وہ آج ہی عباس اور انصار کو چائے پر بلائے گی۔ ثمن کو بھی چلنا ہوگا۔

پرنسپل صاحبہ کے پرچہ پر ثمن کو جانے کی اجازت مل گئی۔ آج خوب جمگھٹا تھا۔ بلقیس بہت سجی ہوئی تھی۔ مگر نسیمہ نے ضد میں کپڑے نہ بدلے تھے۔

''بلی اس دوپٹے کے ساتھ کا جمپر بھی لے لیتیں۔۔۔ میرا تو جی کھٹا ہو گیا ہے۔ چھپی ہوئی جارجٹ سے۔'' نسیمہ نے چھچھورے پن سے سب کے سامنے یہ ظاہر کر دیا کہ بلقیس اسی کے دیئے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ بلقیس خون کا سا گھونٹ پی گئی مگر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ جب اس نے عباس اور انصار دونوں سے انگریزی شاعری پر فاضلانہ بحث کر کے بلقیس کو بالکل پس پردہ ڈال دیا۔

رشید نے ثمن سے کچھ نہ کہا۔ اس کی ہتھیلی میں کہیں سے ایسی باریک پھانس لگ گئی تھی کہ نکلتی ہی نہ تھی۔ ثمن دیر تک اس کی نائی پن کی مدد سے پھانس ڈھونڈتی رہی مگر نہ ملی۔ کھانے پر کچھ نسیمہ اور بلقیس میں تیز تیز

جملے چلے جن پر سب نے بلقیس ہی کو ڈانٹا۔ یہاں تک کہ انصار کمینہ بھی کہنے لگا کہ بلقیس بڑی کٹ حجتی کرتی ہے۔ بلقیس کھانا چھوڑ کر چلی گئی جس پر نسیمہ کو ہنسی آ گئی۔

بورڈنگ جانے سے پہلے نسیمہ اور بلقیس میں پھر چخ چل گئی۔ بیچ بچاؤ کروا دیا گیا مگر بلقیس کو پھر سب نے ڈانٹا۔ نسیمہ کے ساتھ ثمن کو اس نے جانے بھی نہ دیا اور وہ اکیلی ہی چلی گئی۔ عیسیٰ، عباس اور انصار ساتھ جانے کو بلبلاتے رہے مگر پرنسپل صاحبہ نے کہا کہ بورڈنگ کی حدود میں لڑکوں کا جانا ٹھیک نہیں۔

رو رو کر بلقیس نے ثمن کو رات کو اپنے کمرے میں رکھ لیا۔ بڑی دیر تک وہ اس کا رونا روتی رہی، سونے سے پہلے رشید کسی کام سے کمرے میں آئے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

''اچھی بلی بجھاتے جاؤ''۔۔۔۔ بلقیس نے اٹھنے کی تکلیف سے بچنے کے لئے رشید سے خوشامد کی۔ وہ بلی بجھا کر اندھیرے میں بلقیس کی ناک پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کی ناک چھوڑ کر دوسرے ہاتھ سے انھوں نے ثمن کی چھنگلیا کو آہستہ سے دبا کر چھوڑ دیا اور جلدی سے باہر نکل گئے۔۔۔ ثمن دیر تک سن پڑی جاگتی رہی۔

دوسرے دن کھانے کی چھٹی میں ہال کے سامنے نوٹس ٹنگا تھا کہ بنگلے پر آنے کے لئے پہلے پرنسپل صاحبہ کی لکھی ہوئی اجازت کی ضرورت ہوگی۔ معنی خیز نظریں نسیمہ پر پڑ رہی تھیں اور سر جوڑ جوڑ کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شام کو ایک پوٹلی میں نسیمہ کو دی ہوئی ساری چیزیں اس کے کمرے پر بلقیس کا نوکر دے گیا۔ نسیمہ جھاڑو دیتی ہوئی مہترانی کو بلا کر پوٹلی جوں کی توں اسے دے دی۔ نہ جانے کتنے جھلملاتے دوپٹے، کرتے، جوتے، البم، پاؤڈر، لپ اسٹک کے ڈبے، بندے، انگوٹھیاں اور پنیں۔۔۔۔ لڑکیوں کی حسرت بھری نگاہیں دیکھتی رہیں۔ اور مہترانی سب کچھ سمیٹ لے گئی۔ امتحانوں سے پہلے ہی گرمی کی وجہ سے نسیمہ اور کوکو پہاڑ پر چلی گئیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اب نہ آئیں گی۔ ان کا فرنیچر غریب لڑکیوں میں بانٹنے کیلئے چھوڑ دیا گیا۔۔۔ مگر وہ فرنیچر بنگلے پر پہنچ گیا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(19)

چھٹیاں آئیں تو گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ ویسے ہی گھر اسے ناپسند تھا مگر اب کے چھٹیوں میں تو حد ہو گئی۔ نوری سیدھی اپنی ددھیال چلی گئی۔ اس کا دل بری طرح گھبراتا گو وہ کئی مضامین میں کمزور تھی مگر کتاب الٹ کر دیکھنے کو تو جی نہ چاہتا۔ گھر ویسے بھرا پڑا تھا، اور غل غپاڑہ مچا رہتا تھا مگر ثمن کا کوئی دوست نہ تھا۔ اس کی بھاوج کے بچہ ہوا اس اودھم میں تنہائی ذرا کم ہو گئی مگر پھر بھی اسے ہر چیز بے تکی، ادھوری اور بے ڈھنگی معلوم ہوتی۔ کالج میں ہر چیز کتنے انتظام سے ہوتی تھی۔ یہ تھوڑی کہ ہر چیز لشتم پشتم!

بلقیس کا خط آیا اور اس کے ساتھ رشید کا پرچہ بھی۔ بڑے بھیا نے خط کھول کر دیکھ لیا اور بڑی لے دے مچی۔ مگر ثمن چالاک! اس نے کہہ دیا کہ یہ اس کی سہیلی کے چھوٹے بھائی نے لکھا ہے اور رشید لکھتا بھی تو بچوں جیسی باتیں تھا۔ اس نے وہی اپنی پرانی ادھار کی چٹنی مانگی تھی۔ بڑی تھکی ہوئی آواز میں ڈوبی ہوئی بھیک!

کچھ دن بعد بلقیس پہاڑ پر چلی گئی اور خط آنے بند ہو گئے۔ ایک خط سے اسے معلوم ہوا کہ وہ اور جلیس نینی تال میں پڑھیں گی۔ اس کے بعد جب وہ کالج واپس گئی تو اسے معلوم ہوا کہ رشید انگلینڈ چلا گیا۔

ثمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے فلم کی ریل چلتے چلتے بیچ میں سے ٹوٹ گئی اور ہال کی بجلیاں پھک سے روشن ہو گئیں۔ ان کی کرخت روشنی کی نوکیلی شعاعوں سے اس کی آنکھیں چندھیا کر جھپک گئیں۔ خاموش اور خوفزدہ سانس روک کر سمٹ گئی۔ بچہ شرارت کرنے میں انگلی کاٹ لیتا ہے تو اسے جھٹ کرتے میں چھپائے سہا ہوا کونے میں دبک جاتا ہے۔ ثمن کے احساسات بھی دکھ اور شرم سے خوفزدہ ہو کر نہ جانے دل کے کس سنسان کونے میں اوندھے منہ جا گرے۔ شاید ہمیشہ کے لئے!

بلقیس کا خط آیا بھی تو اس میں رشید کا کوئی ذکر نہ تھا۔ وہ بھی شاید اس کی طرح آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ جب کوئی اچانک کیچڑ میں پھسل پڑتا ہے تو رحم دل جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں تاکہ گرنے والا چوٹ تو جی کھول کر سہلا سکے۔ ثمن زیادہ مرہم پٹی کی قائل نہ تھی۔ بڑی بے رحمی سے سب کچھ دور جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

اسے اب گھر پر بھی دلچسپی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے چوری چھپے سائیکل سیکھ لی اور بھائیوں سے بھی پریم بڑھانا شروع کر دیا۔ نوری جب ددھیال سے آئی تو حد درجہ پکی ہو گئی تھی۔ پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ چھپ چھپ کر اس نے عجیب و غریب کپڑے سینا سیکھ لئے تھے حالانکہ اسے ابھی ان کی بالکل ضرورت نہ تھی مگر بڑے پراسرار طریقوں سے پہنے جاتے، میلے ہوتے اور دھو کر بند صندوقوں میں سکھائے جاتے۔ وہ اپنے ایک رشتہ دار کے بھائی سے محبت کرنا سیکھ آئی تھی جس کے نام کے پہلے حروف سے وہ بن بن کر شرمایا کرتی۔ ثمن نے اسے رشید کے متعلق کچھ بھی نہ بتایا تھا۔ اور اب بتانے کو رہا بھی کیا تھا۔ وہ جان جان کر اسے بھائی رشید کہتی۔ لفظ بھائی پر غیر معمولی زور دے کر۔

بڑی آپا بالکل بدل گئی تھی۔ اس کی دوستی مونچھوں والی عزیز بیگم سے ہو گئی تھی۔ عزیز بیگم کے میاں انھیں قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر وہ تو بڑی آپا سے دوپٹہ بدل رشتہ قائم کر چکی تھیں۔ وہ تو گھر ہی میں آن رہتیں مگر لوگوں نے ایسا غل مچایا کہ حد نہیں۔ بچاری آپا رو رو کر اپنے مرحوم میاں اور سسر کو کوستی رہی۔ عزیز بیگم سے سارے گھر کو نفرت تھی، بڑے لڑکے تو ان کا نام سن کر ہی چڑ جاتے۔ گو وہ پردہ کرنے کے قابل نہ تھے، پھر بھی وہ ان سے چھپ چھپ کر انھیں یاد دلاتیں کہ وہ جوان ہو رہے ہیں لہٰذا خطرے کی حد میں آ چکے ہیں۔ اور چھوٹے ان کی مونچھوں سے جھینپتے تھے۔ جنھیں وہ کند چمٹی سے کچھ یوں ہی سا چھدرا کر لیتی تھی۔ انھیں دیکھ کر ثمن کو بے اختیار نجمہ یاد آ جاتی۔ گو صورت میں بہت بل تھا مگر نہ جانے کیا بات تھی جو دونوں میں موجود تھی۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ جس میں غنودگی اور بیداری ایک ساتھ ڈبکیاں کھاتی نظر آتیں، وہ نپی تلی چھوٹی سی چال ----گرم گرم سانسیں اور دہکا ہوا رنگ۔

اسی زمانے میں ثمن کی ایک خالہ کا لڑکا اعجاز ان کے گھر میں آ کر رہنے لگا۔ اعجاز کا باپ مر چکا تھا۔ اور اماں نے دوسرا نکاح کر لیا تھا۔ سوتیلا باپ اس کے حق میں سوت سے بدتر تھا۔ وہ اسے اور خالہ دونوں کو بری طرح کوٹتا تھا۔ اس لئے اسے یہاں بھیج دیا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اعجاز کو کوئی کس بات پر مار سکتا تھا۔ وہ عموماً چپ چاپ اُلو کی طرح بیٹھا بولنے والوں کے ہونٹ تکا کرتا۔ شرارت تو وہ کرنا ہی نہ جانتا تھا لوگ ارمان کرتے ہیں کہ ان کے بچے شریر نہ ہوں۔ مگر اعجاز کو دیکھ کر وہ بھی کانپ اٹھتے۔ وہ بالکل مار کھائے ہوئے بندر کی طرح ایک جگہ بندھا چاروں طرف آنکھیں دوڑایا کرتا۔ اس کی آنکھیں ایک ہی وقت میں بھوکی، ندیدی اور متحیر نظر آتیں۔ بغیر مانگے بھی اس کی ہر ہلکی سی جنبش سے التجا اور بھکاری پن ٹپکتا۔ کھانے پر سب سے پہلے بغیر پکارے پہنچ کر دسترخوان کی سلوٹیں دور کرنے لگتا۔ اور چمچوں کو قرینہ سے سجاتا۔ جب تک کھانا شروع نہ ہو جاتا وہ صبر سے بیٹھا میٹھی میٹھی پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتا۔ ایک ہی شوق کے ساتھ اچھی بری ہر چیز نگل جاتا۔ نمک، مرچ، کھٹاس، مٹھاس کے امتیاز سے بے نیاز ہر کھانے کی ہر چیز اسے مزے دار معلوم ہوتی، عموماً وہ سب کے بعد کھانا ختم کرتا اور بچی کھچی روٹی اور رکابی کی پوچھن کا بڑا سا لقمہ بنا کر منہ میں رکھ لیتا۔ یہ آخری لقمہ وہ بڑے انہماک سے دیر تک چباتا رہتا۔ ہاتھ منہ دھو لیتا لیکن کھانے کا مزہ قائم رکھنے کے لئے وہ کبھی کلی ہرگز

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

نہ کرتا۔ ویسے منہ ہاتھ دھونے پر بھی اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ صبح ہی صبح برتن دھونے کے نل سے منہ دھو کر بڑی نفاست سے کرتے کے دامن سے منہ پونچھ ڈالتا مگر دیکھنے میں پھر بھی نہایت غلیظ نظر آتا، گدلی اور مردہ رنگ کی جلد اور مٹیالے بال اور ملگجے کپڑے۔

گھر کے کام کاج میں وہ بڑی مستعدی دکھاتا، عموماً اپنے سے چھوٹوں کا کام کر دیتا۔ اسے مرغیوں کو دانہ ڈالنے اور کتوں کو جھوٹے ٹکڑے کھلانے کا بہت شوق تھا۔ وہ دسترخوان سے سارا کوڑا کرکٹ سمیٹ کر احاطے کے کسی سنسان کونے میں مرغیوں اور کتوں کو پکار کر ڈال دیتا۔ لیکن جلد ہی لوگوں کو اس کے اس شوق کی اصلیت معلوم ہوگئی۔ کتوں کو دینے سے پہلے وہ سالن لگے ہوئے ٹکڑے بچی بچائی ہڈی سے چپکی ہوئی بوٹی اور ایسی ہی دوسری کارآمد چیزیں منہ میں رکھ لیتا۔ اتنا کھانے پر بھی ایک طرح کی بے چین بھوک اس کی آنکھوں میں بلبلایا کرتی تھی۔

اعجاز کا پیار کا نام اجو تھا۔ نہ جانے کم بخت پر کس کو پیار آتا ہوگا۔ مگر لوگ بچوں کے نام رکھتے وقت دوسروں کے احساسات کو تھوڑے خیال رکھتے ہیں۔ وہ بڑا فرماں بردار تھا۔ ابا کو انگریزی بالوں سے سخت نفرت تھی اور لڑکے سر منڈواتے وقت غدر مچا دیتے تھے مگر جیسے ہی نائی آتا اجو اپنا بے ہنگم سر لے بیٹھتا اور مسکرا مسکرا کر منڈوا لیتا۔ انعام کے دو پیسے لے کر وہ کمر بند میں بڑی سی گانٹھ باندھ لیتا۔ مگر ابا کو یہ انعام دے کر بالکل خوشی نہ ہوتی۔ اپنے اصول پر قائم تھے مگر اجو کا گھٹا ہوا سر دیکھ کر نفرت کی ایک لہر ان کے دل میں بھی اٹھتی ۔۔۔ سب کو اس کے سر سے نفرت تھی۔ بچپنے میں ایک ہی رخ لیٹے رہنے سے اس کا سر ایک طرف کیڑا لگے ہوئے خربوزے کی طرح پچکا ہوا تھا۔ چپت کھا کر وہ خوش مزاجی سے ہنس پڑتا۔ جس پر رحم کا جذبہ ذرا سر اٹھاتا ۔۔۔ لیکن فوراً ہی یہ رحم ایک غیر فانی نفرت میں تبدیل ہو جاتا۔

چھوٹے بڑے ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے، نوکر گھرکیاں دیتے اور برابر والے اس سے گھن کھاتے ۔۔۔ اس پر طرہ یہ کہ جب شمن پیدا ہوئی تھی تو خالہ نے اجو کے نام کا ٹھیکرے میں روپیہ ڈال دیا تھا ۔۔۔ ٹھیکرا تو تھا نہیں کیونکہ شمن کے پیدا ہونے پر میم آئی تھی مگر زبانی بات ہوگئی تھی۔ اماں بھی چپ ہوگئی تھیں۔ کہ خالہ کا دل نہ ٹوٹے ماں غریب ہزار جان سے بیٹے پر قربان تھیں۔ جب کوئی تہوار آتا وہ نئے کپڑوں کا جوڑا اور تل کے لڈو لے کر آ جاتیں۔ اجو اچھا بیٹا بن کر وہ لڈو پاندان کی تھالی میں لے کر ہر ایک کے سامنے پیش کرتا۔ مگر سب کے انکار پر سارے لڈو اسی کو ٹھونگ لگانے پڑتے۔ علاوہ غریب ہونے کے خالہ بد مذاق اور پرانے فیشن کی بھی تھیں۔ اتنے بڑے گھوڑے کے لئے پھول دار کرتا اور لال ٹول کا رومال لاتیں۔ عید کے دن صبح تڑکے ماں بیٹے اٹھ کر باسی یخ پانی سے غسل فرماتے اور کورے کلف دار کپڑے پہن کر اجو سب کو سلام کرنے ان کے بچھونوں پر پہنچ جاتا۔ ساتھ ساتھ دعاؤں کی پوٹلی بغل میں دبائے ہنستی مسکراتی خالہ ہوتیں۔ مگر سب ہی تو اس خلل اندازی پر بڑبڑاتے اور کوئی بھی جی سے دعا نہ دیتا۔ اجو پڈنگ ہو یا کیک سب کو پنین ہی کہتا۔ تاش کھیلتے میں جب وہ اسپیڈ اور ڈائمنڈ کے بجائے وہی حکم اور اینٹ کہتا تو منجھلے بھیا کا خون کھول اٹھتا۔

"اجو کے بچے سلام کر۔ ناک پکڑ کر ۔۔۔ ادھر ۔۔ اور ادھر بھی۔" اجو ناک پکڑ کر چاروں طرف سلام کرتا۔ "اچھا اب ایک ٹانگ پر کھڑے ہو ۔۔۔ جلدی جلدی۔" وہ اس کے ٹخنوں پر کھٹاک سے چھڑی مارتے۔ "نہ بھیا کیوں مارے ڈالتے ہو نگوڑے کو۔" خالہ گڑگڑاتیں۔ اور پھر اجو سے خوشامد میں دوسروں بچوں کے بستر تہ کرواتیں، بکھرے ہوئے جوتے موزے رکھواتیں۔ ایک پیسہ، آدھی چوسی ہوئی آم کی گٹھلی، جھوٹے دودھ چاول کا لالچ دے کر اجو سے ہر ممکن خدمت لی جا سکتی تھی۔ اور غریب ہزار گٹھلیوں اور جھوٹی ہڈیوں کے نیچے دبا ہوا کوڑیا غلام کی طرح کام کرتا۔

جب شمن اجو کو دیکھتی تو وہ اسے موٹی سی گستاخ گالی نظر آتا۔ اس کے جذبات کھول کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور اس کا جی چاہتا کسی کی بوٹیاں دانتوں سے چبا کر تھوک دے۔ اوپر سے عاقبت نااندیش خالہ نے اجو کی گت دیکھ کر سوچا اگر منگنی کا ذکر چھیڑ دیا جائے تو شاید آئندہ داماد سمجھ کر اس شدت سے آزار نہ پہنچایا جائے ۔ لہٰذا وہ بیچ صحن میں بیٹھ کر ارمان بھری باتیں کرنے لگیں۔ سب دم بخود رہ گئے اور شمن کے تو تن بدن میں چنگاریاں چھٹنے لگیں۔ مارے نفرت کے وہ اس کے منہ پر تھوک بھی تو نہ سکی ۔۔۔ مگر اجو پر کچھ عجیب ہی اثر ہوا وہ ہکا بکا تھوڑی دیر چاروں طرف دیکھتا رہا پھر ۔۔۔ ایک دم اس کی چمڑی پر نہ جانے جسم کی کن کن رگوں سے خون جھلک آیا، اٹھ کر وہ بے تحاشا باہر بھاگ گیا۔

اس دن سے شمن سے وہ بے طرح شرمایا اور جھینپا سا رہنے لگا۔ شمن کو دیکھ کر وہ مفلوج سا ہو جاتا۔ اور اگر پاس سے بھی گزر جاتی تو وہ شل ہو جاتا۔ اس کی غیر فانی بھوک کے بعد یہ پہلا جذبہ تھا جو اس شدت سے اجو پر حملہ آور ہوتا تھا۔ وہ گھر میں قدم رکھتا تو شمن کے پتنگے لگنے لگتے۔ امیدوار دامادوں کی سی سنجیدہ شرم اور تکلف دیکھ کر اس کا جی چاہتا اس کے منہ پر جوتا مار دے ۔۔۔ اور بدترین جملے اس کی شان میں دہرائے ۔ ایک اور بھی زبردست انقلاب پیدا ہو گیا اس میں ۔۔۔ وہ اس کی چلبلی بیوقوفیاں جو وہ لوگوں کے خوش کرنے اور ہنسانے کو کیا کرتا تھا یک لخت بند ہو گئیں۔ گو وہ شمن سے شرمایا رہتا لیکن چھپ چھپ کر گھنٹوں اس کی ہر جنبش کو گھورا کرتا۔

رات کو سب بچوں کے پلنگ برابر ڈال دیئے جاتے۔ اجو کسی نہ کسی بہانے سے اپنا پلنگ شمن کے قریب اڑا لیتا۔ کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے کیونکہ لوگ اسے حد درجہ کا بے وقوف جانتے تھے ۔ لیکن شمن کا ہی جی جانتا تھا جب سب سو جاتے تو اجو آہستہ آہستہ اس کے پیروں میں اپنے پیر کا انگوٹھا اور انگلیاں ملا کر چٹکیاں لیا کرتا۔ وہ اسے ڈانٹ کر دور جھٹک دیتی مگر وہ سوتا بن جاتا اور رات کو آنکھ کھلتی تو اسے اپنے پلنگ پر چوہے سے پھدکتے معلوم ہوتے، شاید وہ ساری رات جاگا کرتا تھا کیونکہ دم بھر کو شمن چین سے نہ سو پاتی۔ اجو کا ہاتھ یا پیر اس کی پنڈلی یا ران کو سہلایا کرتا۔

"کیا ہے اجو ۔۔۔ ہم مار دیں گے۔" اس نے کئی بار جوتا اٹھا کر مارا ۔۔۔ مگر سویا ہوا اجو آہستہ آہستہ اسے خوفزدہ کرنے لگا۔ وہ اس سے بچنے کے لئے بوڑھی انا کی پٹی سے پٹی ملا کر سونے لگی اور دوسری طرف

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

پلنگ دیوار سے اڑا لیتی اور ان سے وہی بادشاہ اور بادشاہ زادی کی بوسیدہ اور بدمزہ کہانیاں سنا کرتی۔ شمن کیا خاک کہانیاں اسے رٹی پڑی تھیں۔ پڑی ہوں ہاں کیا کرتی۔ اس کے خیالات بہت دور کسی نہایت ہی دلچسپ ہلکی پھلکی کہانی کا تانا بانا جوڑنے میں مشغول ہوتے۔ اس لطیف کہانی کی وہ ہیروئن ہوتی اور ہیرو؟ نہ جانے کون کون۔ بھلا کس کی مجال تھی جو اس کی ان کہانیوں کا ہیرو بننے سے انکار کرے۔ اس نے ایک بار ''ہیر رانجھا'' فلم دیکھی تھی ہیر نے کیا بھولے پن سے آنکھ مچولی کھیلنے میں رانجھے کو پکڑ لیا تھا۔ کچھ ایسی ہی دل دھڑکانے والی معصوم سی ملاقات اس کی اور رشید کی ہوئی تھی ۔۔۔ پلنگ میں جب۔۔۔ وہ۔۔

وہ سو جاتی۔ سائیں سائیں۔۔۔ خواب اسے لمبے لمبے پینگ دے کر جھلاتے۔ ایک ہی بار اوپر چڑھتی چلی جا رہی ہے، پھر چڑھتی ہے اور پھسل پڑتی ہے۔ چکنی چکنی زمین اس کے پیروں کے نیچے گدگدیاں کرتی مچل مچل کر بھاگ رہی ہے۔۔۔۔ وہی بلقیس کا کمرہ اور کیرم کا تختہ۔۔۔۔ رشید، بلقیس کے دوپٹہ کو گھونگھٹ کاڑھے ہے۔۔۔ وہ پردہ کرتی ہے نا رشید سے۔۔۔ رشید کی بے ایمان آنکھیں دوپٹے کی مہین چلمن میں سے جھانک رہی ہیں۔۔۔ وہ ہار گئی۔۔ جیتا ہوا رشید اس کی کلائی پکڑے دو انگلیوں کو ملائے چٹنی مارنے کو تیار ہے۔۔۔ کہ ایک دم سے ٹھنڈی ٹھنڈی دم گھونٹنے والی خلا اسے لپیٹ کر پھرکی کی طرح گھما ڈالتی ہے۔۔۔ گرم گرم پانی کی بے آواز دھاریں کندھوں اور کنپٹیوں پر سے پھسلتی رینگتی چلی جا رہی ہیں کہ ایک دم سے وہ جاگ پڑتی۔۔ اوہ! اجو کے بھوکے ہاتھ!!

دبی ہوئی خوفزدہ چیخ کے ساتھ وہ دیکھتی کہ اجو اس کے سرہانے سے بھاگ کر پانی پینے کے مٹکوں کے پاس بڑا مشغول نظر آ رہا ہے۔ وہ اس کی لرزتی ہوئی پھنکار کا کوئی جواب نہ دیتا اور پانی پی کر خاموش اپنے پلنگ پر جا گرتا۔ گھنٹوں خوف سے شمن کانپا کرتی ہزاروں نبضیں جگہ بے جگہ جھنجھنایا کرتی۔

نفرت میں خوف کا اور اضافہ ہو گیا۔۔۔ اجو دن بھر تو بالکل معصوم دکھائی دیتا لیکن۔۔۔۔ لیکن رات کو بھوت کی طرح ڈراؤنا نظر آتا۔ اس کی صورت اور بھی مسخ ہو چکی تھی۔ دن رات سر اوندھائے پڑھنے میں جتا رہتا۔۔۔ تعجب تو یہ ہے کہ اس کی وہ غیر فانی بھوک ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ کئی بار بلانے پر وہ دسترخوان پر آتا۔۔۔ دو چار لقمے بے توجہی سے کھا کر چل دیتا۔ اب اسے دودھ میں بساند، خربوزوں میں ہیک اور آموں میں کھٹاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میٹرک میں رٹ رٹا کر وظیفہ پانے لگا۔ لیکن شاید ہی کوئی دن جاتا ہوگا جبکہ وہ رات کو شمن کے سرہانے یا پائینتی کھڑا نظر نہ آتا ہو۔۔۔ اب وہ ہاتھ نہیں لگاتا تھا بلکہ بے چینی سے ٹہلتا۔۔۔ رک جاتا، جھکتا اور پھر جھجک جاتا۔ ایک دن شمن کا دوپٹہ پلنگ کے نیچے لٹک رہا تھا۔ اس نے جھک کر اٹھایا۔۔۔ پھر گھبرا کر اس کے اوپر ڈال دیا۔ لیکن فوراً ہی وہ پچھتانے لگا کہ آخر اس نے جلدی کیوں پھینک دیا دوپٹہ۔۔۔ دوبارہ اٹھانے کی کوشش اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں نے خاک میں ملا دی۔۔۔ شمن کو کلبلاتا دیکھ کر وہ جلدی سے پانی پینے لگا۔

عموماً شمن جاگ بھی جاتی تو پڑی پڑی اس ڈرامے کو دیکھا کرتی۔ جونہی وہ اسے دلیر ہوتا دیکھتی کروٹ

لے کر جاگنے کی دھمکی دیتی۔ گو وہ خوب جانتی تھی کہ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بیداری کا اعلان کر سکے۔۔۔۔ کروٹ لے کر وہ کبھی کبھی بڑبڑانے لگتی۔

''مر جائے۔۔۔ مر جائے کاش اجو مر جائے''۔۔۔۔ وہ کچھ نہ سمجھتا اور جھک کر اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے لگتا۔۔۔۔ مگر ایک دن تو شمن کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔ نہا کر وہ گیلے بال کھولے سوئی۔۔۔ رات کو اسے ایسا معلوم ہوا کوئی اسے بالوں سے پکڑے جھونکے دے رہا ہے۔ جھلا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور چیخیں مارنے لگی۔ اس کی سانس رک گئی۔ منہ پھٹا تھا مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اجو اس کے بالوں میں بھوکے کتوں کی طرح منہ دیئے سسکیوں سے رو رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے اجو کے اس نے زور سے چپل اٹھا کر ماری۔

صبح کو اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر چپل نہ ملی۔

''میں نے رات کو کتے کے کھینچ ماری تھی۔۔۔ نہ جانے کدھر گئی۔''

''اوئی کتا رات بھر بندھا رہا ہے ۔۔۔۔ کتا کہاں سے آیا''۔۔۔ کسی نے کہا۔

''اے شاید موری کھلی رہ گئی ہو۔۔۔ کوئی جنگلی کتا ہوگا۔''

''ہاں جنگلی ہی تھا۔۔۔ ایسا ڈراؤنا۔'' شمن نے سہارے پر چننا شروع کیا۔

''یہ کتے موندی کاٹے انھا بھی تو لے جاتے ہیں۔''

''کتے چپل کا کیا کریں گے؟''

''اے یونہی اللہ مارے اٹھا لے جاتے ہیں۔ میری نئی دلی کی جوتی کلیم میاں کی کتیا اٹھا لے گئی۔۔۔ حرام خور نے ساری چھلنی کر ڈالی۔''

بات بھٹکتی ہوئی کہیں سے کہیں پہنچی۔ مگر شمن کی الجھن نہ گئی۔۔۔۔ آخر چپل ہو گئی کہاں؟ اس دن سے اجو کا پلنگ دوسرے چبوترے پر پہنچ گیا۔ شمن نے شکر کیا۔ کم بخت سے جان تو چھوٹی۔ اس کے بعد اس نے اجو کو حد درجہ بے تعلق اور اپنے پڑھنے لکھنے میں غرق دیکھا۔ جوتی کھا کر جیسے اس کا پیٹ ہی بھر گیا۔ چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور شمن کے جانے میں دو چار دن رہ گئے تھے کہ اجو کو اسکول سے پیدل آتے میں لو لگ گئی۔ ویسے تو کسی کو پتہ نہ چلا لیکن شام کو جب اسے سستی سے پڑے رہنے پر ابا نے ڈانٹ کر پیڑوں میں پانی دینے کے لئے کہا تو لپک کر اٹھ بیٹھا، دو چار قدم چلا بھی مگر پھر جھوم کر زمین پر آ رہا۔ دیکھا تو ایک سو پانچ بخار۔۔۔۔

شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے خدا نے اس کی دعا قبول کر لی اور اجو چلا۔۔۔۔ رات بھر اسے بخار اور ہذیان نے جھنجھوڑا اور دوسرے دن بھی بے ہوشی میں گزر گیا۔ ویسے ابا کو کسی کی خبر نہیں رہتی۔ لیکن اگر کوئی بیمار ہو جائے تو گھر کو اوٹ پٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر مرغی کی بھی ٹانگ ٹوٹ جاتی تو ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ اجو کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی وہ اٹھ کر بھاگتا۔ سارا گھر اس کا ہاتھ چھونے گیا، مگر شمن نے جا کر جھانکا بھی نہیں۔ باری باری سب کی ڈیوٹی لگائی گئی تو شمن کو بھی جبراً جانا پڑا، مگر وہ ارادہ کر کے گئی تھی کہ مردار کو ہاتھ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

بھی نہیں لگائے گی مگر جب اسے بے سدھ دیکھا تو ترس آ گیا اور وہ برف کی ڈلی لے کر اس کے سر پر رگڑنے لگی۔ سر میں بھپکے نکل رہے تھے ہونٹ پپڑائے ہوئے تھے، اور آنکھوں کے کونوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اجو کی حالت قابل رحم تھی۔ باہر برف کی قلفیاں گھل رہی تھیں۔ شمن ندیدی نہ سہی پر جی تو لوٹ رہا تھا۔ اس نے چاہا چپکے سے کھسک جائے مگر اجو نے پانی کے لئے ہونٹ چبانے شروع کئے۔ اس نے برف کی ڈلی لے کر اس کے گرم گرم دہکتے ہوئے ہونٹوں سے لگا دی، ہونٹ اس کی انگلی سے چھو گئے! وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اجو نے آنکھیں کھول دیں اور بغیر آنکھیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا۔ ایک مسخ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی ۔۔۔ شمن بھاگ کر جانے لگی۔

''شمن'' اس نے ایک بار حلق سے نکالنے کی کوشش کی مگر وہ باہر آ کر ملائی کی برف کھانے لگی، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور حلق جل رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی برف کے چھلکے اس کا گلا بھینچنے لگے۔ برف کی پیالی رکھ کر اس نے اپنی انگلیوں کے پورے بھاپ سے گرم کرنا شروع کئے جیسے کسی لاش کو چھو لینے سے ان کا خون جم کر رہ گیا ہو۔

وہ گھر سے پلنگ پر پانی چھڑک کر پڑ رہی۔ جسم میں گرم گرم سلاخیں دوڑتی معلوم ہوتی تھیں۔ حلق بار بار کاغذ کے ٹکڑے کی طرح خشک اور بے لذت ہو جاتا۔ اجو کی بخار سے جھلسی ہوئی آواز اس کے کانوں میں سانپ کے پھنکار کی طرح رینگ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے جذبات کیوں بے طرح اتھل پتھل ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن جب اجو کو بستر بدلنے کے لئے اٹھایا گیا تو شمن کی کھوئی ہوئی چپل وہ دونوں ہاتھوں میں بھینچے ہوئے اوندھا پڑا تھا ۔۔۔ بخار اتر کر حرارت غریزی سے بھی پارہ نیچے گر گیا تھا اور آنکھیں پتھرا چلی تھیں!

(20)

سوتے سوتے جو آنکھ کھلی تو شمن نے گھر میں عجیب طرح کی چہل پہل دیکھی۔ ایک لمبا بانس لئے چپراسی کمروں کے جالے لے رہا تھا اور مہترانی پر موری صاف نہ کرنے پر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ بڑی آپا ناک پر کپڑا باندھے تختوں کے نیچے سے کوڑا نکال رہی تھیں۔ اماں الماریاں کھول کر چینی کے برتن نکلوا رہی تھیں۔ معلوم ہوا کلکتے والے چچا مع اپنے ہونہار سپوت عباس کے تشریف لا رہے تھے۔ عباس اکلوتے ہونے کے علاوہ انگلینڈ سے انجینئری پاس کر کے آئے تھے۔ کلکتے والے چچا حد درجہ نالائق اور نکمے تھے مگر یہ ان کا بیٹا نہ جانے کس طرح ہیرا نکل آیا۔ گورنمنٹ سے وظیفہ لے کر انجینئری پاس کر آیا۔ چچا بچارے کے دن پھر گئے۔ خاندان میں ان کی حیثیت ہمیشہ ایک خوفناک چھوت کی بیماری کی سی رہی۔ جہاں جا کر پڑ جاتے دھکے دے کر نکالے بغیر نہ نکلتے۔ اماں تو ان سے پردہ کرنے لگی تھیں۔ لڑکیاں یونہی دعا سلام کر کے چلی آتیں اور وہ نوکروں کی دھتکاریں اور مذاق کا نشانہ بنتے۔ جب تک ہمت قائم رہتی جمے رہتے پھر کہیں اور ٹھوکریں کھانے چلے جاتے۔ عباس کو ایک ماسٹر نے ترس کھا کر رکھ لیا تھا اور آج وہ چمکتے ستارے کی طرح آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرنے واپس آیا تو سارے خاندان کی آنکھیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ منجھلے اور چھوٹے ماموں اسٹیشن پر ہار پھول لے کر پہنچے۔ خالہ بی نے تو چار اسٹیشن پہلے ہی ناشتہ کا انتظام کروایا تھا۔ شمن کے یہاں چینی کے برتن اور چاندنیاں، قالین نکلنے لگے تھے۔ اور کوٹھے کا کمرہ سجنے لگا تھا۔

خیر خدا خدا کر کے عباس میاں مع اپنے بدقماش باپ اور پھوہڑ ماں اور چیچک رو بہن فہمیدہ کے دوپہر کی گاڑی سے پہنچ ہی گئے۔ اماں نے عباس کو بھینچ کر گلے لگایا اور چچا کو چچ چچ دعا دی۔

''اے فہمیدہ ماشاءاللہ کتنی بڑی ہو گئی۔'' بڑی آپا اسے پیار سے لپٹا کر بولیں۔

''تم نوری کے ساتھ سوتا ۔۔۔ اچھا!''

خالہ بی جل کر کوئلہ ہو گئیں۔

''اوئی! بھلا اپنی عمر کی لڑکیوں کو چھوڑ کر نوری کے پاس کیا جی لگے گا۔ اے بٹی تم اپنی ثمینہ آپا کے پاس

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

جاؤ، تمھارا منہ ہاتھ دھلوا دیں گی۔ کیا کھڑی کھڑی تک رہی ہو منہ! اے ثمینہ بہن ذرا غسل خانے لے جاؤ۔''

بڑی آپا حیرت زدہ ہو گئیں۔ اندھیر ہے کہ نہیں، رانڈ بیوہ کا کسی خیال نہیں ذرا اپنی بیٹیوں کے آگے یتیم کا حق بھی مارنے سے نہیں چوکتے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ چچا سب سے پہلے حق دار کا خیال کریں گے مگر فہمیدہ کو ثمینہ اور احمدی سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لے اڑیں۔

''اے ثمن عباس کے لئے گرم پانی بھجوا دیا ہوتا کہ ذرا منہ ہاتھ بھی دھل جائیں۔'' اماں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بڑی کا مزاج بڑا تیز تھا۔

''اے ثمن خالہ اتنا سوچیں گی۔۔۔۔نوری؟۔۔۔جاؤ ذرا میری بچی انگیٹھی پر پانی گرم کر کے اوپر لے جاؤ۔'' بڑی آپا بولیں۔

مگر اس سے قبل کہ نوری پانی گرم کرتی چھوٹی ممانی منہ دھلوا کر یہ عباس میاں کو لئے اوپر سے اتر آئیں۔ سب کے سب منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ مسکراتی ہوئی اسے کرسی پر بٹھا کر پان لگانے لگیں۔

چچا غریب تو بولا گئے اور سمجھے بھی نہیں کہ کیوں اتنی خاطریں ہو رہی ہیں۔ بے چارے کو بڑی الجھن سی محسوس ہوتی۔ وہ تو بے چارے الٹی خوشامدوں کے عادی تھے۔ جب آتے تھے ڈیوڑھی میں پلنگ ڈلوایا جاتا تھا۔ وہیں بیٹھک میں کھانا چلا جاتا۔ سارے کنبے کی خوشامدوں سے وہ بول کھا گئے۔ پر جلد ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ خاندان میں ضرورت سے زیادہ لڑکیاں ہیں اور لڑکے کم اور نکھٹو! بوکھلا بوکھلا کر کبھی وہ عباس کے لئے ثمینہ کو پسند کرتے اور کبھی نوری پر رحم آ جاتا۔ ثمینہ کی عمر جا رہی تھی تو نوری کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ یتیم تھی۔ کبھی بلقیس پر مہربان تو کبھی حسنہ پر۔ کبھی ثمن پر عنایت کی بارش تو کبھی احمدی پر۔ ان کا بس چلتا تو وہ ساری لڑکیوں کو ایک دم بیاہ لیتے۔

وہ کسی کام کو کہتے تو سارے گھر میں کھلبلی پڑ جاتی۔ مائیں لڑکیوں کو دوڑاتیں اور وہ بے چاریاں کھسیانی ہو کر رہ جاتیں۔ ایک مقابلہ ہو رہا تھا گویا۔ دیکھیں کہ کون چچا چچی کی خاطروں سے بے حال کر کے نرالی یعنی عباس کو جیت لے جاتا ہے۔ بڑی آپا نے تو ایک نئی ترکیب نکالی۔ وہ یہ کہ کر نوری انگریزی کے جملوں کے معنی پوچھنے عباس کے سر پر سوار کر دی۔ مگر ثمینہ ماشاء اللہ خود ہوشیار تھیں اور عباس کی زیادہ تر توجہ ان کی ہی طرف رہتی تھی۔ نوری کو وہ بچہ سمجھتے۔ ثمن کو بد مذاق اور احمدی کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس بے چاری کا نتیجہ تو صاف ظاہر تھا۔

ثمینہ بھی کچھ لجائی شرمائی عباس کے مذاق کا جواب دیتی رہتیں۔ ان کے لئے سویٹر بننا شروع کر دیا تھا جسے خالہ بی بھی بنواتی تھیں۔ بلقیس حد سے زیادہ شرمیلی تھی۔ پر اماں کے ٹہوکوں پر مجبور ہو کر آگے بڑھتی اور پیچھے کھنچ آتی۔ شام کو تاش چوپڑ کا جماؤ ہوتا۔ چچا گانیاں بک بک کے پل باندھ لیتے۔ ایک دفعہ اسی طرح گالی بکنے پر اماں نے ان سے پردہ کر لیا تھا پر آج سب مہذب بیویاں کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ خالہ بی پنکھے کے پیچھے منہ چھپا کر ہنس دیتیں۔ چچا خوب بد تمیزیاں کرتے مگر شریر بچہ سمجھ کر معاف کر دیے جاتے۔ چچی اجلی

دیواروں پر پیک کی پچکاریاں مارتیں کہ اماں لرز لرز اٹھتیں مگر کیا مجال تھی کہ جو بول جائیں۔ بات یہ تھی کہ عباس باوا اماں کے غلام تھے۔

یوں تو عباس ثمینہ ہی سے سب سے زیادہ متاثر تھے مگر جونہی وہ کسی کام سے بھتی وہ احمدی، ثمن یا بلقیس پر مہربان ہو جاتے۔ مذاق تو وہ سب ہی لڑکیوں سے کرتے اور ان کے مذاق کا رخ دیکھ کر ہی سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ جاتی۔ ویسے ثمینہ سب سے بڑی تھیں اور پہلا حق ان کا تھا۔ یہاں تو بحث کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ثمن کے باپ کے احسانات چچا کی جان پر بہت تھے لہٰذا یہاں بھی بحث کی کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔ نوری یتیم تھی اور یہاں خاندان کی شرافت اور عباس کی عالی ظرفی کا سب کو یقین تھا پھر فیصلہ کیسے ہو گا؟ سب منتظر تھے۔

ویسے عباس بہت ہی دلچسپ تھے۔ جونہی وہ اندر آتے لڑکیاں کسی نہ کسی بہانے سے جمع ہو جاتیں۔ اور پھر یا تو ان کا بٹن ٹوٹ جاتا جسے بلقیس، احمدی یا ثمن ٹانکتیں یا ثمینہ کی چھنگلیا کے پاس والی انگلی میں نظر نہ آنے والی پھانس چبھ جاتی جو کسی سے نہ نکلتی پر بھالے کی طرح کھٹکا کرتی۔ جب عباس اس پھانس کو نکالتے تو انھیں ایسے ایسے جملے سوجھتے کہ ثمینہ پسینہ پسینہ ہو جاتی۔

''بھئی اس شریر انگلی کا تو بس ایک علاج ہے۔'' وہ ہنستے۔

''بھلا کیا علاج ہے وہ۔ آپ کر دیجئے نا'' ثمینہ شرماتیں۔

''اس کا علاج یہ ہے کہ ایک جگمگاتی ہوئی انگوٹھی۔۔۔۔''

''ہٹئے!'' وہ شرما کر ہاتھ کھینچ لیتی۔ خالہ کی باچھیں کھل جاتیں۔

''اچھا خیر! اب کچھ نہ کہوں گا۔''

اس کے علاوہ نوری روز بروز انگریزی کے الفاظ میں کمزور ہوتی جاتی۔ بڑی آپا غم و فکر سے کھلنے لگتی اور ذہنوں کے مارے نوری کو نگلے لیتی۔ چچا مرغ مسلم کھاتے کھاتے ادھ مرے ہو گئے۔ چچی نے گاجر کا حلوہ اتنا لگا! کہ معدہ جواب دے گیا۔ فہمیدہ کے دوپٹوں کو رنگتے اور چنتے ثمینہ اور احمدی کے انگوٹھے سوج گئے۔ سب سانس روکے فرائض میں غرق صبر سے نتیجہ کا انتظار کر رہے تھے۔ دیکھئے اونٹ کس کل بیٹھتا ہے، کس کی قسمت جاگتی ہے۔

ثمن کو عباس پسند تھے اس لئے ہی نہیں کہ ان کے بال گھنگریالے اور آنکھیں غلافی تھیں بلکہ وہ ہنستے جو بہت تھے۔ بیٹھے بیٹھے گال میں چٹکی بھر لینا، ایک دم سے دردِ سر کا بہانہ کر کے گھٹنے پر لیٹ جانا، پان بجائے ہاتھ کے منہ میں لینا اور لیتے وقت انگلی دانتوں سے دبانے کی کوشش کرنا، جھولے میں ران یا گھٹنا ٹہل دینا وغیرہ۔

جاڑوں کے دن سب رضائیاں اوڑھ کر بیٹھ جاتے اور ان رضائیوں کے بادلوں میں عباس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح کوندتے۔ لڑکیوں کے گروہ میں ننھی ننھی لرزشیں مچل مچل کر بکھر جاتیں۔ وہ دور بھنتیں لیکن پھر سمٹ آتیں۔ گھر کے بزرگ بھی ''بچوں'' کے نئی مذاق سے ذرا دور پان چھالیہ میں غرق بیٹھے رہتے مگر ان کے کان ان ہی کی طرف لگے رہتے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

رات کو جب سب لڑکیاں کھسر پھسر کرتیں تو عباس کی ڈالی ہوئی چنگاریاں دہک اٹھتیں۔ سوائے ثمینہ کے وہ سب ایک دوسرے سے بے تکلف تھیں اور ان کے دلوں میں ذرا بھی تو رشک نہ تھا۔ گوپیوں کی طرح وہ مل جل کر ایک ہی کرشن کی بنسری میں لے پرنا چتیں اور جب عباس راس رچانے کے لئے کھانے یا آرام کے کمرے میں آتا تو وہ سب کچھ بھول کر اس کے گرد منڈلانے لگتیں۔ مگر ثمینہ زیادہ تر فہمیدہ کی دیکھ بھال میں لگی رہتیں۔ وہ انہیں اکیلے میں بھابھی کہہ کر چھیڑا کرتی۔ مگر ثمینہ نے اسے سب کے سامنے کہنے کو منع کر دیا تھا۔ وہ اب عباس سے اور بھی زیادہ شرمانے لگی تھیں۔ خالہ بی دن رات گوگھر دلچکوں اور کرنوں کے ذکر کیا کرتیں۔ ان کی اندھیری کوٹھڑی میں کچھ دن سے مراد آبادی اور تانبے کے برتنوں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

بڑی آپا بھی غافل نہ تھیں۔ انہوں نے چٹ پٹ چوہے دتیاں تڑوا کر نئے فیشن کے دست بند بنوانے شروع کر دیئے تھے اور ہر وقت چینی کے ان سیٹوں کا ذکر کرتیں جو وہ کلکتہ یا بمبئی سے منگوانے والی تھیں۔ جو ایک دم سے سب کچھ ساتھ طے ہو گیا تو بے چاری مارے ہولوں کے مر نہ جائیں گی۔

ثمن کی اماں دم سادھے ہوئے تھیں۔ کیونکہ ذرا سی دیر میں بڑی آپا اپنے بے وقت مرنے والے میاں کو یاد کر کے ماتم شروع کر دیتی تھیں۔ نانی ہو کر نواسی کا پیغام چھین لیتیں؟ پھر بھی آپا احتیاطاً طعنے دیتی رہتی۔

''اے ہے لوگ یتیم بیوہ کا خون چوسنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ارے بھئی لوگوں کو تو بہت مل جائیں گے۔ یتیم کو جو جائے تو بہت جانو۔ قرآن پاک میں بھی یہی لکھا ہے کہ پہلے یتیم بیوہ کا حق۔۔۔ پھر۔۔۔'' مگر خالہ بی تو یہ باتیں سن کر بالکل بھولی انجان بن جاتیں وہ جہیز کی تیاری میں منہمک تھیں۔ اس کے علاوہ اور بھی قیاس آرائیاں ہوتیں جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں لوگ موسم دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں۔ اسی طرح بڑی آپا خالہ بی سے اور چھوٹی ممانی سے باتیں کرتیں۔

''نہیں بی میری بات مانو یا نہ مانو پر دیکھ لینا وہ بلقیس سے تو کرنے کا نہیں ہاں اپنی نوری۔۔۔'' ممانی آپا کو خوش کرتیں۔

''اے بی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو ثمینہ تو کیا ثمن سے ہی کرے تو بہت، جانو۔۔۔'' بڑی آپا جواب دیتیں۔

''دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔۔۔ ویسے تمھاری خالہ پنجے جھاڑ کر پیچھے تو پڑ گئی ہیں۔ اے کل آنکھ کے نشہ کا لحاف بنایا ہے کہ موا چھپھورا رذالوں جیسا۔۔۔ میں نے تو کہہ دیا بہن۔۔۔''

غرض ایسا معلوم ہوتا تھا میدان میں گھوڑے چھوٹ چکے۔ کبھی ایک آگے تو کبھی دوسرا آگے۔ یا جیسے انٹرویو ہو رہا ہے لوگ اپنی اپنی کر چکے ہیں۔ نتیجے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ چچا چچی پیغام دے ہی نہیں چکتے اور نہ ہی منہ سے پھوٹتے ہیں۔ کھایا پیا اور پیر پسار کر سو گئے اور یہاں سب کی نیندیں حرام ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہر ایک کے دروازے پر بارات کھڑی ہے مگر دولہا اندر قدم نہیں رکھ چکتا۔

ادھر عباس نے آنکھ مچولیاں کھیلنا شروع کر دی تھیں۔ بلقیس جب پچھلے برآمدے سے چھالیا نکال رہی

تھی تو نہ جانے عباس کدھر سے آن پہنچے اور پکڑ لیا۔ بڑی مشکل سے بھاگی اور پھر ایک دن جو ثمن ایک دم ڈریسنگ روم میں چلی گئی تو وہ ثمینہ خاتون کو گھیرے کھڑے تھے۔ ثمینہ تو بھاگ گئی پر جب ثمن جانے لگی تو عباس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

''کہو گی تو نہیں؟ کیوں ثمن۔''

''کیوں نہیں کہوں گی ٹھہر جایئے ذرا۔'' ثمن نے ذرا شرارت سے کہا اور ہنسی۔

''نہیں نہیں۔۔۔ دیکھو کسی سے نہ کہنا۔۔۔ سنو۔۔۔'' اور وہ کوئی بہت ضروری بات سنانے اور قریب آ گئے۔

''اچھا بھئی چھوڑیئے تو، کسی سے نہ کہوں گی'' وہ اپنی جان چھڑانے لگی۔

''اُونہوں۔۔۔ قسم کھاؤ۔۔۔ ہمارے سر کی قسم کھاؤ پہلے۔'' عباس نے گھسیٹ کے اسے اور قریب کر لیا۔

''اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ آپ کے سر کی قسم۔۔۔ چھوڑیئے۔'' وہ بوکھلائی۔

''لیکن۔۔۔ سنو تو۔۔۔'' انہوں نے اسے بھینچنا چاہا۔

''ثمن'' انہوں نے تڑپ کر بھاگتی ہوئی مچھلی کو پکڑنے کی ناکام کوشش کی۔

دیر تک وہ جھلائی ہوئی باتیں کرتی رہی۔ عباس کے قرب سے نہ جانے کیوں اسے اتنی گھن آئی۔ وہ ان سے مذاق کر سکتی تھی۔ مگر دور سے۔ یہ اتنے قریب کی چھلیں اسے بڑی کڑوی معلوم ہوئیں۔

کیوں؟ وہ دیر تک سوچتی رہی۔ عباس کے بال رشید سے کتنے ملتے جلتے تھے۔ وہ کچھ قہقہے بھی اسی کی طرح لگاتے تھے مگر۔۔۔ تو پھر کیا چیز تھی جس سے اسے گھن آئی۔ لوگ ایک ہی چمچہ منہ میں ڈال ڈال کر کھاتے ہوں تو جی متلا ہی جاتا ہے۔

اس منہ کا لعاب اس منہ! تو یہ! تھوڑی ہی دیر پہلے ثمینہ بھاگی تھی۔۔۔ اور۔۔۔

عباس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور جانے کے خیال سے وہ اداس ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی بددل ہو جاتیں اور سارے بڑے بوڑھے بھی سہم جاتے۔ وہ ایک ایک دن ٹال رہا تھا اور بڑی سنجیدگی سے لڑکیوں کو اندھیرے اجالے گھیر رہا تھا اور ادھر بھی چاروں طرف پھلجھڑیاں کھلی تھیں۔ دانے ڈالے جا رہے تھے۔ جال پھینکے جا رہے تھے اور شکاری لاسہ لگائے اس میں بیٹھے تھے۔

شادی بیاہ کے دن رات چرچے ہوتے مگر چچی اور چچا منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ آخر خالہ بی کے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ چچا کے جواب سے ایسا معلوم ہوا کہ ایک آندھی آئی اور آبادیوں کی آبادیاں ویران کرتی چلی گئی۔ آئی۔ سی۔ ایس کا انٹرویو ہوتا ہے۔ کامیاب طلباء کیسے ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔ نذر و نیاز پوری کی جاتی ہے۔ اور جو بے چارے قسمت کے مارے رہ جاتے ہیں ان کے یہاں چھوٹی موٹی موت سی ہو جاتی ہے۔ ہزاروں ارمانوں کا خون اور لاکھوں تمناؤں کا قتل۔ لیکن اگر یہ معلوم

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہو کہ گورنمنٹ نے دھاندلی کرکے آئی۔ سی۔ ایس کا عہدہ ہی توڑ دیا تو یہ ایک قومی وملکی موت کہلائے گی۔ یہی ہوا کہ چچی نے چلنے سے پہلے سب کو عباس کی شادی کا زبانی بلاوا دے دیا۔ اس شادی کا جو انگلینڈ جانے سے پہلے ہی ان ماسٹر صاحب کی لڑکی سے طے ہو چکی تھی۔ جنہوں نے عباس کو تعلیم دلوائی تھی۔ لڑکی کانی بھی تھی اور غریب بھی مگر گھڑ بہت تھی۔

گھڑ بہو نے نہ جانے کتنے جہیزوں، چوہے دیتوں اور آنکھ کے نشہ کے لحافوں پر جھاڑو پھیر دی۔ ایک دم اماں کو مرغیوں پر پیار آنے لگا۔ گاجر کے حلوے ختم ہو کر دوبارہ نہ بنے۔ فہمیدہ کو جو خالہ جوڑا دے رہی تھیں اس کا دوپٹہ نہ جانے کہاں کپڑوں کے نیچے ہو گیا اور کرتے پاجامے کا کپڑا احمدی کا بھا گیا۔ دیواروں پر پیک کی پچکاریاں لمبے اور گہرے زخموں کی طرح دلوں کے پار ہونے لگیں۔

چچا اور چچی ایک ضروری کام کی وجہ سے فوراً روانہ ہونے پر مجبور ہو گئے اور شمینہ کے ہسٹریا کے دورے پھر سے شروع ہو گئے۔ نوری کی یتیمی مواد بھر رسولی کی طرح ابھر آئی اور منجھلی ممانی بلقیس کو نامراد نصیبوں جلی کے خطابوں سے پکارنے لگیں۔

چچا اور چچی خوفناک پھوڑوں جیسی ٹیسیں کلیجوں میں چھوڑ گئے۔ چچی دو تکیے بستر میں بھولے سے باندھ لے گئیں اور فہمیدہ شمینہ کے چاندی کے بندے اتارنا بھول گئی۔ چچا سارے تاش کے پتے تھوک میں سان گئے اور عباس نہ جانے کتنی آہیں اور شب بیداریاں چند معصوم دلوں میں چھوڑ کر چل دیا۔

(21)

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی اس کا داخلہ ایک امریکن مشنری کالج میں ہو گیا۔ اب شمن کو معلوم ہوا کہ دنیا کتنی لمبی چوڑی ہے۔ اب تک وہ جیسے انڈے کی سطح پر رینگ رہی تھی۔ چکنی بے رنگ اور لامتناہی۔۔۔ مگر پھر بھی محدود۔ جتنا بھی چلے جاؤ وسعت ختم نہیں ہوتی۔ پھر بھی جہاں تھے وہیں۔ کالج میں قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے ڈاک گاڑی میں اڑی چلی جا رہی تھی کہ جنکشن آ گیا اسے بہت جلد اس جنکشن کے غل غپاڑے میں ڈوب جانا پڑا۔ ادبی جلسے، دلچسپ لیکچر، پرزور تقریریں، ہنگامہ خیز سیریں اور قیامت انگیز عشق بازیاں۔ پہلی بات جو دو لڑکیاں کرتی ہیں۔ وہ عاشقوں اور چاہنے والوں کی ہی ہوتی ہیں۔ لڑکیاں ایک دوسرے کا بھاؤ اسی ذریعہ سے معلوم کرتی ہیں۔ مثلاً میری پرساری یونیورسٹی مرتی ہے، مینا رائے پر سیاست کی پوری کلاس فدا ہے اور کملا پر سنسکرت کے پنڈت جی تین سال سے مر رہے ہیں کشور پر فارسی کے استاد نیم جان تھے۔ باقی لڑکیوں پر بھی حصہ رسدان کے چچیرے اور ممیرے بھائی اور پڑوسی فدا تھے۔ کم از کم کالج کی فضا میں تو ان کا یہی حصہ تھا۔ کالج کے قوانین بڑے سخت تھے۔ ویسے تو کسی کا سگا باپ بھی بغیر چھان بین کے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود عشق کا اتھاہ ساگر پڑا ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اس معاملے میں چھلے ہوئے منہ اور سڑے ہوئے پیلے دانتوں والی میٹرن کی بھی کچھ نہ چلتی تھی۔

ان میٹرن سے سب کو ہی بغض للّٰہی تھا۔ شاید جنگ عظیم میں ان کا عاشق مارا گیا تھا۔ یا شاید چھوڑ چھاڑ کر چل دیا اور غریب نے اس بہانے کی آڑ میں پناہ لے لی۔ ہر لڑکی کے راز معلوم کرنے کے فکر میں گلی رہتیں۔ جہاں دس بجے اور اللہ کی بندی بکل گل کرنے کے لئے سر پر سوار! خود دو دو گھنٹے پہلے سے سونے کی تیاریاں شروع کر دیتیں۔ غسل کر کے منہ پر پالش کی جاتی۔ گنتی کے چار بال امیٹھ کر گھونگر بنائے جاتے اور یہی گھونگر بنی ہوئی بتیوں کی صورت میں ان کی پیشانی پر تھرکتے نظر آتے۔ ڈھیلا ڈھالا جاپانی کمونا جس پر اژدہوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور بغیر ایڑی کی سلیپریں پہن کر جب وہ چلتیں تو ان کا ڈھلا ہوا جسم ایسے کلبلاتا گویا ان اژدہوں میں جان پڑ گئی ہے۔

باوجود انتہائی نفرت کے ہر لڑکی کو ان کی خوشامد میں اتوار کو ان کے مرحوم عاشق کی تصویر کی تعریف کرنی پڑتی۔ یہ تصویر ایک فوجی گورے کی تھی۔ نہایت کریہہ فٹ بھر لمبا کرخت چہرہ اور اوپر کا تنگ ہونٹ دانتوں پر سے ایسے کھنچا ہوا جیسے کسی پر غصہ میں دانت پیس رہا ہے۔ منڈی بھویں اور چھدرے بال۔ بیالوجی کی لڑکیوں کا خیال تھا کہ میٹرن اور اس گورے کے بیچ مل جاتا تو یقیناً گھوڑے کی کوئی عجیب الخلقت قسم پیدا ہوتی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

یہ میٹرن کسی لڑکی کو بغیر عاشق کے تصور ہی نہیں کر سکتی تھی۔ حالانکہ خود بے چاری نن تھیں۔ ایک دفعہ پریما کا سگا بھائی آیا تو وہ برآمدے میں ہی کھڑی تھی۔ اجازت لینے کا خیال بھی نہ آیا اور وہ اس سے باتیں کرنے لگی بلکہ ثمن کو بھی ساتھ گھسیٹ لے گئی۔

بے چارا انریندر حد سے زیادہ بوکھلایا ہوا رہا۔ پھر بھی جونہی میٹرن کو پتہ چلا، ہانپتی ہوئی موقع واردات پر پہنچی۔ بہتیرا پریما نے کہا کہ وہ اس کا سگا بھائی ہے دوسرے نہایت چغد ہے مگر وہ نہ مانی اور رپورٹ کر دی۔ مگر پریما ایک چلتی پرزہ، وہ داؤ لگایا کہ پرنسپل بھی خاموش ہو گئیں، پہلے تو وہ ملاقاتی کارڈ ڈھونڈ کر ان پر ملنے والوں کے نام لکھے گئے اور پھر ان پر ثمن اور پریما کے سرپرستوں کے دستخط کرائے گئے جو ایک بی اے کی لڑکی نے کر دیئے، ان کارڈوں کی رو سے ثمن کو نہ صرف پریما کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت تھی بلکہ وہ اس کے گھر چھٹیوں میں جا کر دن رات رہ سکتی تھی۔ حالانکہ ثمن اور پریما صرف دو ماہ سے کلاس فیلو تھیں لیکن ان کارڈوں پر لکھا تھا کہ ان کے والدین خاندانی دوست ہیں۔ یہ کارڈ پرنسپل کی میز پر چپکے سے رکھ دیئے جب پرنسپل آئیں تو پریما نے بڑی معصومیت سے کارڈوں کا ذکر کیا۔ بلکہ اخبار کے نیچے سے نکال ان کے ہاتھ میں پکڑا دیئے انٹی میٹرن پر ڈانٹ پڑی۔

لہٰذا اتوار کو ثمن پریما کے ساتھ اس کے گھر گئی۔ نریندر کے ساتھ اور چھ سات دوست بھی تھے مگر پریما نے زبردستی کی اور موٹر لبالب بھر گئی۔ دوپہر کا وقت، چلچلاتی دھوپ، لو کے تھپیڑے جھلسائے دے رہے تھے۔ مگر ثمن کے جسم میں ٹھنڈی چنگاریاں رینگ رہی تھیں۔ عمر میں پہلی بار اتنے ڈھیر سے کھردرے کوٹ، بڑے بڑے جوتے اور بے ضرورت ہیٹ اس سے اتنے قریب آئے تھے۔ شاید ان دونوں پر رعب ڈالنے کے لئے سب لڑکے اترا رہے تھے۔ وہ پریما سے بے حد بے تکلف تھے ان میں سے ایک جسے سب بٹو بٹو کہہ رہے تھے، پریما کے شانے سے لگا اونگھ رہا تھا اور ہر جھکولے کے ساتھ اس کا سر پریما کے سینے پر آن گرتا جس پر پریما دانت پیس کر اس کے گھنے بالوں کے گچھے جھنجھوڑ ڈالتی۔ انور اس کے برہنہ بازو پر اپنی تین دن کی مونڈی ہوئی مونچھیں چبھونے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ نہایت فراٹے سے نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ قصہ ثمن کو سنانے میں غرق تھی۔ موٹر اجاڑ ٹیلے میں گھومتی ہوئی برآمدے کے سامنے رک گئی۔ بیٹھے بیٹھے جوڑ سن ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ٹانگیں کھینچ کھینچ کر نکالیں اور سب چیختے چلاتے اندر پہنچے۔

ثمن سب سے پیچھے تھی اس نے دیکھا کہ پریما کسی سے صوفے پر کشتی لڑنے میں مشغول تھی اور بڑی مشکل سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نریندر اور اس کے دوست چیخ چیخ کر ان دونوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ آخر کو پریما پست ہو کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

''شاباش رائے صاحب!'' نریندر نے حریف مخالف کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

''ارے ثمن۔۔۔ رائے صاحب یہ ہے ثمن!'' پریما نے تعارف کرایا۔

''ہوں''۔ وہ چشمے کے نیچے سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر بولے۔ ان کے ہونٹوں میں ایک لمبا سا

سگار جھول رہا تھا اور اس میں سے دھوئیں کی لمبی لمبی چسکیاں لے کر وہ ہونٹ کے کونے سے باریک ڈوروں کی صورت میں پھونک رہے تھے۔ پاس ہی سنول پر رنگوں کی طشتری اور برش بکھرے پڑے تھے اور سامنے ایک عورت کی نامکمل تصویر دیوار پر چسپاں تھی۔

ثمن آنکھ بچا کر غور سے انہیں دیکھنے لگی۔ خوب مضبوط مگر چھریرا جسم، اونچا قد اور تپے ہوئے سونے جیسا رنگ، اس پر چاندی سے بھی زیادہ اجلے بالوں کا ڈھیر کا ڈھیر! یہ عجیب و غریب صورت دیکھ کر ثمن ایسی بوکھلائی کہ اسے یاد بھی نہ رہا کہ وہ کتنی دیر سے انہیں گھور رہی ہے کہ ایک دم سے رائے صاحب بولے۔

''اے۔۔۔ کیا نام ہے اس لڑکی کا؟۔۔۔ کچھ جنگلی سی معلوم ہوتی ہے۔''

''ثمن'' دو تین گلے ایک دم چلائے۔

''چمن؟''

''نہیں۔۔۔ ثمن۔''

''ادھر آ۔۔۔ چمن!'' رائے صاحب نے دھوئیں کی ڈوریاں پھونکتے ہوئے کہا۔ ثمن اٹھ کر گئی۔ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے وہ اس کے قریب آ گئے اور ایسے تمسخر سے دیکھنے لگے گویا وہ کوئی عجیب و غریب جانور ہے۔ شرارت سے ان کے چہرے کے چھوٹے چھوٹے عضلات مسکرا رہے تھے اور بھنویں پھڑک رہی تھیں۔ ایک دم سے انھوں نے آنکھوں کے پپوٹے کھینچ کر دیکھے۔

''زبان نکالو'' انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ثمن نے بے ساختہ زبان نکال دی جس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا اور وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ آئی۔

''کیا بات ہے کچھ بھوکی معلوم ہوتی ہے۔ ارے پریما کچھ دانہ پانی تو ڈال دو اس چڑیا کے لئے۔۔۔ کیا ہے تیرا نام۔۔۔ چمن؟'' ''رائے صاحب!'' پریما چلائی۔

''ثمن۔۔۔ یہ ثمن کیا ہوتا ہے؟ نہیں ہم تو اسے چمن کہیں گے، اسے کھانے کو دو کچھ۔۔۔ ارے ٹھہرو، تو اتنی پیلی کیوں ہے، کیا تیرے پاس پاؤڈر سوڈر کچھ نہیں۔۔۔ ادھر آ۔'' اس سے پہلے کہ ثمن کچھ سمجھتی۔ رائے صاحب نے اس کے گالوں پر برش سے سرخ رنگ لگا دیا۔ کھسیا کر وہ ہتھیلیوں سے گال رگڑنے لگی۔

''بڑے خراب ہیں آپ، بلے'' پریما نے انھیں دھکیل دیا اور ثمن کو غسل خانے میں لے گئی۔ شام کو رائے صاحب اور سب لوگ تیرنے کے لئے حوض میں اترے۔ ثمن کو تیرنا نہیں آتا تھا اس لئے وہ کنارے پر پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گئی۔ رائے صاحب جب دو تین دفعہ اوپر سے کود کے اور بڑی دیر تک تیرائی کے کمالات دکھاتے رہے۔ کبھی چت تیرتے تو کبھی پٹ اور کبھی دیر تک پانی میں غوطہ لگا جاتے۔

''ارے یہ جل کوا کیسا بیٹھا ہے۔'' انھوں نے ثمن کو کنارے پر پیر لٹکائے دیکھ کر چھیڑا۔ ''یہ پانی میں کیوں نہیں اترتی۔'' جب پریما نے بتایا کہ وہ تیرنا نہیں جانتی تو انھوں نے اس کے کان میں کچھ کہا اور غوطہ مار گئے۔ ثمن حیرت سے منہ پھاڑے پانی کو گھورتی رہی۔ کہ اب نکلیں گے اور اب نکلیں گے، کہ ایک دم سب

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

چلائے۔

''مگر۔۔۔مگر!'' اور شمن غڑاپ سے پانی میں اور بدحواس ہو کر رائے صاحب کو ناخنوں سے کھرونچنے لگی جو اسے ڈوبنے سے بچانے آئے تھے۔

''ہیں ہیں۔۔۔۔ارے نوچے گی تو پھر مگر مچھ کو دے دوں گا۔''

شمن کھسیا کر بسورنے لگی اور سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

رات کو جلدی جلدی کھانا کھایا گیا، اس کے بعد ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔ سب کی رائے ہوئی کہ ناچ ہو۔ پہلے تو پریما نے اپنے تازہ سبق کا مظاہرہ کیا اور جب وہ تھک گئی تو سب چلائے۔ ''رائے صاحب، رائے صاحب''

پہلے تو رائے صاحب خاموش رہے۔ پھر انھوں نے سگار طشتری میں ڈال دیا اور لیمپ کی طرف پشت کر کے خاموش کھڑے ہو گئے۔ باجا بجتا رہا اور وہ پاؤں جمائے دیوار پر گھورتے رہے۔ پھر آہستہ سے انھوں نے کرتا اتار کر ہوا میں اچھال دیا اور اپنے برہنہ بازوؤں کو سہلاتے رہے، پھر۔۔۔شمن کا منہ حیرت کے مارے پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ مڑے اور ان کا کسرتی جسم سر تال پر لہرانے لگا۔ جیسے کوئی سنگین بت یکایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھا ہو۔ وہی بدن جو کچھ دیر پہلے قدرے بوڑھا معلوم ہو رہا تھا کھنچے ہوئے ستار کی طرح بج اٹھا۔ سڈول قبضوں کی بے پناہ جنبش، پنڈلیوں کا مضبوط خم اور چوڑے چکلے سینے کا جلال ------ معلوم ہوتا تھا سر باجے سے نہیں بلکہ ان اعضاء کی لوچدار جنبش سے نکل رہے ہیں۔ انگلیوں کی حرکت، پیر کا دھاکہ اور مچھلیوں کی ہر لرزش نغمہ بن کر پھیل گئی۔ پشت پر روشن لیمپ چاندی جیسے گھنے اور خمدار بالوں کو ترشے ہوئے ہیروں کی طرح منور کر رہا تھا۔ ایک دم جیسے طوفان کی دوڑ تیز ہو گئی۔ ساز دوگنی میں بجنے لگے، قہر و غضب کا پرجلال دیوتا پراسرار دنیا سے نکل کر غیض و غضب کے کوڑے برسانے لگا۔ دھوم گرج کے ساتھ کائنات کو ہلا کر رکھ دیا۔ رائے صاحب ایک ہیبت ناک پہاڑ معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی سفید دھوتی سمندر جھاگ کی طرح قدموں میں لہریں لے رہی تھی۔ ان کے نقرئی بال ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے پہاڑ کے پیچھے سے سورج طلوع ہو رہا ہو۔

ساز رک گئے۔۔۔۔ ناچ ختم ہو گیا مگر شمن کا دماغ ناچتا رہا اور جب مذاق میں رائے صاحب نے زور سے ''ہو'' کر کے اس کے آگے تالی بجائی تو بے ساختہ اس کی گھگی سی بندھ گئی اور اگر سب نہ ہنس پڑتے تو وہ بالکل ہی بدحواس ہو جاتی۔ وہ حیران سب کی صورتیں دیکھنے لگی اور پھر خود بھی قہقہے مار کر ہنس پڑی۔

''ڈرپوک چوہیا!'' رائے صاحب نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجھول ڈالا اور اس کے پاس بیٹھ گئے۔

''بول سیکھے گی تو بھی؟''

شمن نے دانت نکال کر سر ہلا دیا۔

''ہے! بڑی آئی سیکھنے والی، پریما! ذرا اس چھوکری کو دیکھنا ابھی سے ناچ سیکھے گی۔ ارے بھئی لالا تو گندی۔۔۔میں ذرا اس کو ناچ سکھا دوں۔''

''میں کوئی بندریا ہوں؟۔۔۔۔واہ!''

''اوہو! بندریا نہیں تو پھر کیا بھالو ہے؟۔۔۔۔اچھا مٹھائی لا اور شاگرد بن جا۔''

''پہلے آپ سکھائیے تو پھر مٹھائی کھلاؤں گی۔''

''واہ بھئی خوب رہی، پہلے فیس دو تبھی تو ناچ سکھائیں گے ویسے ہی؟ بس دو مہینے میں تیتری کی طرح ناچنے لگے گی۔''

''واہ میں تو آپ کی طرح۔۔۔۔آپ۔''

''شمن رائے صاحب نے میری تو مٹھائی ہضم کر لی اور کچھ نہیں سکھایا۔'' پریما بولی۔

''ارے شش۔ خاموش۔۔۔ہاں کیا نام ہے لڑکی تیرا۔۔۔شمن؟ اچھا مٹھائی جانے دے۔ بس تو اب کے چھٹی میں آ کر ہمارے کرتے میں بٹن ٹانک دے اور ہم تمہیں ناچ سکھا دیں گے۔ سمجھی؟''

''بٹن؟''

''ہاں بٹن، سب کے کرتوں کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ جو پریما ہے نا، ایک دم ردی، نکمی! بس شوخی کرنا جانتی ہے۔'' پریما اس تعریف پر اترا اٹھی اور رائے صاحب کی گود میں لد گئی۔

بٹن ٹانک کر ناچ سیکھنے کا پکا ارادہ کر کے وہ پریما کے ساتھ ہی ہوسٹل لوٹ آئی۔ راستے بھر وہ رائے صاحب کی باتیں دوہرا کر ہنستی رہی۔ جسم کو پلنگ پر ڈال کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ میلوں کی دوڑ لگا کر آئی ہے۔ ناچ کے تاثر میں اب تک اس کی روح پھنسی ہوئی پیچ در پیچ گھوم رہی تھی۔ نہ جانے کیوں آج اس کا دل کسی مقناطیسی طاقت کے آگے ماتھا ٹیک دینے کو چاہتا تھا۔ آج اس کے دل میں عبودیت نوخیز کلی کی طرح کھل رہی تھی۔

''رائے صاحب کا نام کیا ہے؟'' اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں پریما سے پوچھا۔

''ارے پگلی! میرے پتا جی ہیں رائے صاحب!'' پریما ہنسنے لگی۔

''مگر۔۔۔۔مگر پریما!'' وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیوں؟'' اس نے کروٹ لے کر پوچھا۔

''کچھ نہیں پریما!'' وہ خاموش ہو گئی۔

''ہم انہیں رائے صاحب کہتے ہیں۔ انہیں سب ہی رائے صاحب کہتے ہیں۔ بڑے اچھے ہیں۔ میرے اوپر جان چھڑکتے ہیں۔''

شمن چڑ گئی۔ اس کا جی چاہا پریما کو ڈانٹے کہ وہ کیوں ان سے جان چھڑکواتی ہے مگر پھر یہ بات اسے انتہائی بے تکی معلوم ہوئی۔ وہ خاموش تکیہ اپنے سینے سے چمٹائے آگے پیچھے جھولتی رہی۔ لوہے کے پلنگ کے جھنجھناتے ہوئے تاروں سے اکڑ اکڑ اکڑ نکل کر اسے سوچنے میں مدد دینے لگا۔

(22)

شام کو لڑکیاں اونچے اونچے سیاہ بلومر اور جمپر پہن کر کالج کے میدان میں آزادانہ چھلانگیں لگاتیں۔ مالی، بیرے اور چوکیدار برہنہ رانوں اور سڈول پنڈلیوں کو گھور گھور کر آنکھیں سینکتے۔ چھوٹا مہتر بھی شام کو اسی وقت برآمدے جھاڑتا۔ میٹرن کو اس مہتر سے خاص عناد تھا۔ وہ ان کے ہاسٹل میں صفائی کرتا تھا اور بقول ان کے نہایت ہی بدمعاش اور بدنگاہ تھا۔ زیادہ تر وہ اسے ڈانٹتی ہی نظر آتیں۔ جب دیکھو ہاسٹل کے سنسان کونوں میں اسے گھیرے ایک آدھ تار مکڑی کے جالے کا، دو چار آوارہ تنکے دکھا دکھا کر ڈانٹ رہی ہیں۔ مگر وہ بھی بلا کا ضدی تھا۔ سر جھکائے اپنے سفید دانت چمکایا کرتا تھا۔ وہ اس پر جھلا جھلا کر چڑھی بیٹھتیں تھیں۔ مگر وہ انھیں ٹوٹی ہوئی جھاڑو سے بھی زیادہ ناکارہ سمجھتا۔ اس کی جھاڑو کے سپاٹوں سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ کبھی کا اپنی دانست میں کوڑے کے ساتھ جھاڑ چکا تھا۔ یہ ان کا ڈھیٹ پن تھا کہ پھر بھی ٹوٹی پڑتی تھیں۔ نہ معلوم اسے دیکھ انہیں کیا ہو جاتا تھا۔ جب وہ لڑکیوں کو گھورتا تو وہ بلبلا اٹھتیں۔ اپنی چھوٹی سی مونڈھیا پر بیٹھ کر تاسف سے سر ہلاتیں۔ انہیں تعجب تھا کہ ذہن میں لڑکیاں ان غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رینگتی ہوئی بھی نہیں محسوس کرتیں۔ وہ خود اپنا پھنسا ہوا فراک اور ابلتے ہوئے کولہے جو مونڈھیا کے چاروں طرف پہاڑ کی چٹانوں کی طرح جھونت رہتے، سمیٹنے میں مشغول رہتیں۔ نہ جانے اتنی نحیف و نزار مونڈھیا ان کا وزن کس طرح برداشت کر رہی تھی، وہ اس ظالمانہ انداز سے اس پر پہلو بدلتیں گویا وہ چھوٹے مہتر پر سوار اسے دلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کا بس نہیں تھا ورنہ وہ اس کی ہڈیاں چیر کر جھاڑو بنا ڈالتیں یا اس کے خون سے فرش دھلوا ڈالتیں۔ وہ اس کی بدمعاشی کو ہندوستان کی مذہبی تنگ نگاہی پر محمول کرتیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو یقیناً اس کی سیاہ روح پاک ہو جائے گی۔

بڑے رازداری کے انداز سے وہ لڑکیوں سے اس کے چال چلن کے بارے میں گھما پھرا کر سوال کرتیں۔ وہ انہیں چھپ کر جھانکتا تو نہیں؟ کمرہ صاف کرتے میں کوئی فحش اشارے تو نہیں کرتا؟ اس کی

مسکراہٹ بڑی لرزہ خیز تھی۔ ایک مہتر تھا نینی تال میں، جہاں وہ پہلے پہل نوکر ہوئی تھیں۔ وہ اکیلے دکیلے لڑکیوں کو پکڑ کر چوم لیا کرتا تھا۔ ایک اور بھنگی بھی جبل پور مشن اسکول میں انہیں نہاتے میں چھپ کر دیکھا کرتا تھا۔ یہ بھنگی لوگ، میم لوگوں کو بڑا حیران کرتے۔ ان کا عزت بھی بہت خراب کرتے ہیں۔ یہ قصے سناتے وقت ان کی دھنسی ہوئی بے رونق آنکھیں کسی گزشتہ زمانے کے خوان نعمت کی یاد میں بھوکی بھوکی ہو جاتیں، اور ہونٹوں پر شدت سے پسینہ پھوٹ نکلتا۔ ہا! بے چاری سفید دیو داسیاں بجائے وجیہہ قباؤں والے کاہنوں کے ان کالے بھنگیوں کے ہتے چڑھ رہی تھیں۔ ان کی سیاہ روحوں کو خدا باپ کے قدموں تک گھسیٹ لے جانے میں وہ خود غلاظت کی دلدل میں دھنسٹ جاتیں۔ ان میموں کی یہ گت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ ایک فاتح قوم ہندوستان کی جھلسا دینے والی ہوا اور ہندوستانیوں کی پاگل کر دینے والی تاریک ذہنیت کے آگے بالکل ہاری ہوئی اور پرشکستہ نظر آنے لگتی۔ وہ گلاب کو شرما دینے رنگتیں، تیل میں ڈوبے ہوئے پرانے چمڑے کی طرح سوکھ جاتیں۔ وہ آسمان کی نیلاہٹ سے زیادہ شفاف آنکھیں سوکھے تالاب میں پیاسے مینڈکوں کی طرح ابل آتیں، بال اور پلکیں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح غائب، جگہ جگہ گوشت کے ابھار، تنگ جوتوں میں سے ٹخنوں پر کے گوشت کے جھولتے ہوئے لوتھڑے، یہ تھیں وہ چیزیں جو باقی رہ جاتیں۔ میٹرن جب ہندوستان آئی تھیں تو جنگ عظیم کی لو سے جھلسی ہوئی مگر نوخیز کلی تھیں، اور اب گوبھی کی پالا ماری گانٹھ کی طرح بکھری جاتی تھیں۔ بھنگی سے ان کی ایسی لاگ ڈانٹ بڑھی کہ ایک دن وہ چھتری لے کر اس پر پل پڑیں۔ اسے مار کر وہ پسینہ میں شرابور روتی ہوئی کرسی پر گر پڑیں۔ لڑکیوں کے ٹھٹ کمرے پر ٹوٹ پڑے، بظاہر سب ہمدردی ظاہر کرتی رہیں لیکن کسی کو بھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ان کے ہاتھ پیر سہلاتی تاکہ ان کا جی ٹھکانے ہوتا۔ دوسرے ہوسٹل کی میٹرن کو خبر ہوئی اور وہ دوڑی ہوئی آئیں، لڑکیوں کو بھگا دیا اور ان کے جسم کو جوڑ بڑے فیتوں اور ڈوریوں سے مصنوعی گڑیا کی طرح جکڑا ہوا تھا ذرا ڈھیلا یا تو ہوش ٹھکانے ہوئے۔ علم نفسیات کی لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کر کے قہقہے لگانے لگیں۔ بات پرنسپل تک پہنچی اور چھوٹے مہتر کو میٹری بھون ہاسٹل میں بھیج دیا گیا۔

بے چاری معاملات کی اس الٹ پھیر کے لئے بالکل تیار نہ تھیں اور نہایت بردباری سے سر ہلا کر کہتیں کہ پرنسپل کو اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑے گا۔ ان کے دباؤ سے نکل کر بھنگی ساری لڑکیوں کو نہ خراب کر دے تو بات نہیں!

چھوٹے بھنگی کے بجائے بوڑھا مہتر جو بانی کالج کے زمانے سے کام کر رہا تھا نشاط محل میں صفائی کرنے لگا۔ اسے سب جمعدار کہتے تھے۔ ڈاکوؤں جیسی صورت، سیاہ پتھار اجیسے رنگت، شب بیداری اور بھنگ کی وجہ سے سرخ انگارہ آنکھیں، آواز ایسی جیسی گہری سی باؤلی میں کوئی بھوت گنگنا رہا ہو۔ نہایت صاف اور مقطع وردی، رعب دار چال۔ میٹرن جو کوئی بھی حکم دیتیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا "جانتے ہیں!" بے چاری ہیبت زدہ ہو کر رہ جاتیں۔ لڑکیوں سے روہانسی آواز میں اپنی بے عزتی کا گلہ کرتیں۔ جو زیادہ جی بھر آتا تو سارا غصہ انہیں پر اتار دیتیں! کیلے کے چھلکے بے جگہ کیوں پھینکے؟ ردی کاغذ جمع کر کے بڑی کھوج لگاتیں کہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اس پر کس لڑکی نے لکھا ہے۔ معلوم کر لینے کے بعد وہ سارے پرزے مع تزی تنبیہ کے ساتھ نوٹس بورڈ پر لٹکا دیتیں۔ لڑکیاں نوچ ناچ کر پھینک دیتیں۔ ایک دفعہ پرنسپل نے جو دینا بھر کی ردی بورڈ پر چسپاں دیکھی تو غریب کو الٹی ڈانٹ بتائی۔

دنیا میں ان کی صرف ایک دوست تھیں مس جونسن۔ چھ فٹ سے بھی کچھ نکلتا ہوا قد، سپاٹ سینہ اور مردوں جیسے کٹے ہوئے بال! شیو کرتی تھیں جوان کی لاابالی عادتوں کی وجہ سے دو دو دن نہ ہوتا۔ یہ ورزش اور کھیلوں کی تعلیم دیتی تھیں۔ نیک بخت اس زور سے گیند میں ہٹ لگاتیں کہ جی لرز اٹھتا۔ نئی نئی لڑکیاں تو ان کے سامنے ٹانگیں کھلے جمپر پہنتے شرماتیں۔ آواز پھٹی ہوئی جیسی پندرہ سولہ برس کے لڑکے کی ہوتی ہے۔ میٹرن اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو ''ڈارلنگ'' کہتی تھیں، اور جب کوئی سویٹر یا ان کا اور کوئی کپڑا ہیتیں تو جان جان کر لڑکیوں کو دکھاتیں۔ ذکر کرتے میں وہ ہمیشہ ''ڈیرمس جونسن'' ہی کہتیں، اور ان ڈیرمس جونسن سے لڑکیوں کو للہی بغض تھا۔ اول تو وہ سوائے ورزش کے احکامات کے بہت کم بولتیں۔ ثمن کو تو ان سے بات کرتے موت آتی، گڑ گڑ کرتی بھاری امریکن لہجے والی انگریزی زبان کا ایک لفظ بھی پلے نہ پڑتا۔ ورزش کرتے میں ذرا کسی نے غلطی کی اور دیوتی نے جھپٹ کر لگایا ایک مکا!

ایک دن کھیل کی نئی یونیفارم کے لئے مس جونسن لڑکیوں کا ناپ لے رہی تھیں۔ ثمن کو سخت گھبراہٹ معلوم ہوئی۔ ایک ایک لڑکی اندر جاتی اور ناپ دے کر واپس لوٹ آتی۔ ثمن کی جب باری آئی تو وہ ہچکچاتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی۔ مس جونسن ناپنے کا فیتہ لئے ایک کاپی پر جھکی کچھ لکھ رہی تھیں۔ ثمن کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ''گڑ گڑ'' نہ جانے انہوں نے کیا حکم دیا، مگر وہ گھبرا گھبرا کر دوپٹے کا پلو چباتی رہی۔

''گڑ ز۔۔۔۔ گڑ ز!'' وہ پھر کچھ بڑبڑائیں۔ ثمن نے دو قدم اٹھائے آگے نہ پیچھے! اب کے جو انہوں نے ڈانٹ کر ذرا صاف زبان میں قریب آنے کا حکم دیا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ کیا واہیات ہے؟'' وہ گرجیں۔

ثمن کسیانی زبردستی کی مسکراہٹ جمائے آگے بڑھی۔ فیتہ لے کر انہوں نے ناپنا شروع کیا۔

''ہاتھ اوپر کرو!'' ثمن کچھ نہ سمجھی۔

''اونہہ، بے وقوف ہاتھ اوپر'' ثمن نے بغلیں بھینچ لیں۔

مس جونسن نے ایک جھنجھوڑی دے کر اسے سیدھا کھڑا کیا، اور دو جھٹکے کندھوں میں جمائے۔ ثمن ذبح ہوئی بکری کی طرح روتی ہوئی فرش پر گڑی مڑی ہو گئی۔

''سیدھی کھڑی ہو۔'' مس جونسن کہتی رہیں اور وہ اسی طرح کھڑی، ناک سے رونے کی آوازیں نکالتی ہوئی بھاگ کر دروازے سے ٹکرائی۔

''ارے!۔۔۔۔ سلی گرل!'' مس جونسن کا دودن کا مونڈا ہوا بالائی ہونٹ مسکراہٹ سے پھڑ پھڑایا، مگر ثمن سیدھی اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر گر پڑی اور دیر تک گھوڑے کے ہنہناتے جیسی دبی دبی آوازیں

نکال کر روتی رہی۔

اس دن سے اسے مس جونسن سے ایسی شرم آئی کہ وہ برابر نیلی چٹھی جو بیمار لڑکیاں مس جونسن کے لیٹر بکس میں ورزش سے معافی مانگنے کے لئے ڈالتی تھیں دبے پیر جا کر ڈال آتی۔ ان نیلی چٹھیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ وہ اس کی ہیلتھ رپورٹ کے ساتھ چپکا کر ہوسٹل کی لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھیجی گئیں اور پھر ایک دن بورڈ پر اس کا نام ان لڑکیوں کی فہرست میں نظر آیا جو مسلسل خرابی صحت کی وجہ سے ڈاکٹری معائنہ کی محتاج تھیں۔

ہاسٹل کا یہ مختصر ہسپتال تعلیم گاہ سے ذرا ہٹ کر امرودوں اور نارنگیوں کے باغ میں واقع تھا۔ نہایت صاف ستھرے خوبصورت کمرے اور سامنے کھلا میدان۔ عام طور پر لڑکیاں اتوار کو غل غپاڑے سے بچنے کے لئے رات کے کپڑے پہن کر ان کمروں میں ذرا سا بیماری کا بہانہ کر کے جا لیٹتیں۔ یہ بھی مشہور تھا کہ کالج سے ملحق جو یونیورسٹی تھی، وہاں کے لڑکے آتے جاتے ان کمروں کی کھڑکیوں کی طرف تاکا کرتے تھے۔ اور کئی قصے بھی ان کھڑکیوں سے وابستہ تھے۔ کئی لڑکیاں بدمعاش لڑکوں کے ساتھ فرار ہونے سے پہلے ان ہی کمروں میں بیماری کا بہانہ بنا کر رہتی تھیں۔

اسپتال کی نرس ایک سیاہ فام حبشی نژاد امریکن نرس تھیں۔ پھیلے ہوئے جسم کی ٹھگنی سی عورت، نرسوں کے سفید براق لباس میں سنگ موسیٰ اور سنگ مرمر کا بنا ہوا مقبرہ معلوم ہوتیں۔

عام طور پر ان کی گفتگو ان فرار ہونے والی لڑکیوں کے متعلق ہوتی جو بھاگنے سے پہلے ان کے زیر سایہ رہی تھیں۔ ہر لڑکی کو وہ اصول صحت سمجھاتے وقت جسم کی خوبصورتی قائم رکھنے کی اہمیت پر مدلل لیکچر دیا کرتیں۔ ''بوائز'' کو گھیرنے کے تیر بہدف نسخے تو انہیں از بر یاد تھے۔

''پنڈلیوں سے بال فلاں پاؤڈر سے اڑاؤ تو موٹے نہیں نکلیں گے۔ کمر پر سے ساڑھی خوب کھینچ کر باندھو۔۔۔۔ ایسے۔'' وہ ساڑھی کو بالکل تہبند کی طرح کس کر بتاتیں۔ ''اتنا تنگ باڈی مت پہنا کرو، سارا جسم لٹک جائے گا۔ انگلش گرلز کو دیکھو۔'' وہ انگلش گرلز کا ایسے ذکر کرتیں گویا انگریزوں نے یہ ساری مفتوحات ان منڈی ہوئی ٹانگوں اور چست باڈیوں کے ہی بل بوتے پر زیر کر رکھے ہیں۔ جسم سے بدبو دور کرنے کی اور مختلف پوشیدہ دواؤں کے نام مفت بتایا کرتی تھیں۔ مگر بجائے شکر گزار ہونے کے لڑکیاں الٹی چراغ پا ہو جاتیں۔

یہ نرس ہر وقت امریکہ یعنی اپنے دیس کی تعریفیں کیا کرتیں، اور بڑے بڑے معززین کا ایسے ذکر کرتیں جیسے وہ ان کے سگے چچا ماموں تھے۔ عبادت کے لئے جب ساری لڑکیاں اور پروفیسر روز دوپہر کے کھانے سے قبل جمع ہوتیں تو وہ بھی امریکن استانیوں کے بیچ میں کالے تل کی طرح ملاحت سے چمکا کرتیں۔ ان کی آنکھیں سفید چمڑی کی قربت کے غرور سے اور بھی گڑ بوں میں جا کر چمکنے لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سب کو اس معجزے سے متاثر کرنا چاہتی ہیں، کہ دیکھو ہم سفیدی کے کتنے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ سفید میمیں بھی اپنے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہر انداز سے یہی کہتی معلوم ہوتیں کہ لوگو! دیکھو تم ہمیں اور عش عش کرو، ہم کتنے بلند ہیں کہ کیچڑ ہو یا کوئلہ ہم ہر ایک کو پاس بٹھا لیتے ہیں۔ یہ دیکھو ہم اس الٹے توے کے ساتھ کس خندہ پیشانی سے بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ اور تم ہمیں نک چڑھا اور مغرور کہتے ہو؟ نہ جانے یہ سفید قومیں سیاہ انسانوں کو انسان سمجھ کر اس کا احسان کس پر جتا نا چاہتی ہیں اور کس دھوم سے اس کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں۔ انگلش چرچ جدا ہے، اور وہاں کتوں اور ان کے ساتھ ہندوستانیوں کے جانے کی اجازت نہیں، مگر مہینہ میں ایک دفعہ باری باری سے سفید استانیاں کالے چرچ میں عبادت کر کے اسے مقدس بنانے ضرور چلی جاتیں۔ ہندوستانی لڑکیاں مارے غرور اور احسان کے بوجھ سے گردنیں اکڑا اکر عبادت گاہ میں داخل ہوتیں۔

ثمن کی ایک عیسائی ایلما تھی۔ بڑی منہ پھٹ اور زبان دراز جنوبی ہند کی مخصوص چاکلیٹی رنگت بھونرا سے سیاہ بال اور سادھوؤں کی سی سرخ ڈورے کھنچی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، اودے رنگ کے پکے جامن جیسے پھیلے ہوئے ہونٹ اور ستا ہوا چہرہ۔ اس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور دانت غیر معمولی نیلاہٹ مائل سفید تھے۔ جب وہ زور سے قہقہہ لگاتی تو بہت سے دانت چمک اٹھتے جو بڑے دھاردار اور زہریلے معلوم ہوتے۔ لڑکیاں اس کے متعلق عجیب عجیب باتیں کیا کرتیں۔ گو وہ عیسائی تھی لیکن گرجے بہت کم جاتی، اور اگر جاتی بھی تو صرف لڑکوں کے ساتھ مل کر حمد گانے۔ اس کی آواز بہت رسیلی تھی اور گانے کا بہت شوق تھا۔ غسل کرتے وقت وہ پوری آواز سے اوٹ پٹانگ گیت گایا کرتی۔ اس کے کمرے میں بجائے یسوع کے کرشن کی تصویر لگی تھی جس کے آگے وہ سونے سے پہلے گھٹنے ٹیک کر بائبل کی آیتیں پڑھ کر سینے پر صلیب کا نشان بنایا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی "مجھے سفید رنگت سے گھن آتی ہے۔ اور صلیب پر لٹکے ہوئے مسیح پر رحم آتا ہے اور رحم کے ساتھ عقیدت کا جذبہ بجائے عبودیت کے دل میں بغاوت کی آرزو پیدا کر دیتا ہے، دوسری طرف ہنستے کھیلتے بنسری بجاتے کنہیا جی کو دیکھ کر دل ناچ اٹھتا ہے۔"

پھر ایک دم سے اسے نہ جانے کیا ہوا کہ کرشن کی تصویر تو نکال کر پھینک دی۔ اور اس کی جگہ ایک اور تصویر لگا دی جس میں ایک بندر پیڑ پر بیٹھا کیلا کھا رہا تھا۔ دوسرا بندر نیچے سے ایک لکڑی اس کی پیٹھ میں چبھو رہا تھا اور پہلے بندر کا آدھا کھایا ہوا کیلا زمین پر گر رہا تھا۔ جس پر نیچے والا بندر مسکرا رہا تھا۔ جب لڑکیوں نے اس سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو وہ اپنے مخصوص قہقہے لگا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگی۔

"کرشن جی کی بنسری کو کیڑا لگ گیا تھا، اس میں سے مینڈک ٹرٹرا رہا تھا۔" وہ ہانکتی۔ "مکھن کا بڑا شوقین تھا نا، معلوم ہوتا ہے تھوڑا سا مکھن بنسری میں لگا رہ گیا جو دیمک چاٹ گئی۔"

اور پھر وہ منہ چڑا کر کہتی۔

"انہیں سوائے عورتوں سے مذاق کرنے کے اور کام ہی کیا تھا۔ سنا ہے بیاہی عورتیں زیادہ پسند تھیں۔"

اس پر لڑکیوں نے اس کی بڑی گت بنائی۔ پرنسپل سے شکایت کر دی۔ یہی نہیں وہ کئی بار ثمن سے الجھ پڑی۔

"یہ سب پیغمبر عورتوں پر کیوں فدا تھے۔ یوں تو ہنری ہشتم بھی پیغمبر تھا۔۔۔"

مگر ثمن غصہ سے بے قابو ہو گئی اور آنسو نکل آئے ایلما نے خاموشی سے معافی مانگ لی۔

تین چار دن بعد بندروں کی تصویر میں تغیر ہوا۔ پیڑ پر بیٹھا ہوا بندر جان بل بن گیا اور نیچے والے نے دھوتی پہن لی اور ہاتھوں سے چھوٹ کر گرتا ہوا کیلا ہندوستان کا نقشہ بن گیا۔

ایلما کو ڈرائنگ بہت بری آتی تھی، مگر وہ اس بھدی تصویر میں نت نئے گلکاریاں دکھاتی اور اپنے نیلگوں دھاردار دانت کھول کر لمبے لمبے قہقہے لگاتی۔

اس کی بیہودہ گوئی اس قدر بڑھی کہ ایک دن لڑکیوں نے بختی سے پرنسپل سے شکایت کر دی۔ دیر تک وہ اس سے بحث کرتی رہی جب دفتر سے نکلی تو بہت خاموش تھی۔ اور منہ اترا ہوا تھا۔ ثمن کو اس کی باتیں بری معلوم ہوتی تھیں، مگر اسے اداس دیکھ کر اس کا جی کڑھ گیا۔ اس نے بتایا کہ پرنسپل نے کہا ہے کہ اگر آئندہ اس کے متعلق شکایت سنی گئی تو رسٹی کیشن کر دیا جائے گا۔ اور وہ باقاعدہ عبادت میں شریک نہ ہوئی تو ہاسٹل سے نکال دی جائے گی۔ گو ثمن کو اس کی باتوں سے ڈر معلوم ہوتا تھا پھر بھی وہ اسے سمجھاتی رہی۔ دسمبر کی چھٹیوں کے بعد ایلما نے کالج چھوڑ دیا اور یونیورسٹی چلی گئی۔ وہیں کیلاش ہاسٹل جو یونیورسٹی میں لڑکیوں کے لئے خاص طور پر کھولا گیا تھا چلی گئی۔ مگر اکثر وہ ثمن کے پاس آیا کرتی۔

ثمن کو اس نے کچھ خشک سی کتابیں بھی پڑھنے کو دیں مگر ان میں اس کا قطعی جی نہ لگا۔ ایلما یونیورسٹی میں جا کر چمک اٹھی۔ کلاس میں اول رہنے کے علاوہ اسے یونین کا پریذیڈنٹ بھی بنا دیا گیا۔ جہاں وہ ہنگامہ خیز تقریروں سے لڑکوں اور پروفیسروں پر چھا گئی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(23)

اسکول اور کالج میں کتنا لمبا چوڑا فرق ہے۔ کہاں ایک مسلم درس گاہ اور کہاں امریکن مشن کالج۔ کہاں تو یہ حال کہ اگر کوئی لڑکی کھیل کھیل میں سیاہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن کر آجائے تو لڑکیوں کو دورے پڑ جائیں اور تہلکہ مچ جائے۔ جرمانے ہوتے پھریں اور کہاں اس کالج میں دوسری ٹرم شروع ہوتے ہی نئی لڑکیوں کو یونیورسٹی کے لڑکوں سے مہذب طریقے پر ملایا جاتا اور اس مقصد کے لئے ایک باقاعدہ دعوت ہوتی۔ پرنسپل اور استانیاں اور پروفیسر خود ہر ایک لڑکے کو ہر ایک لڑکی سے ملواتیں۔ تھوڑی دیر ساتھ رہتیں، اور پھر ان کو بے تکلف باتیں کرنے کے لئے چھوڑ جاتیں۔ اس جلسے کی بڑی زوردار تیاریاں ہوتیں، چائے پانی کے علاوہ ڈرامے اور ناچ گانے کا بھی ایک پروگرام تیار کیا جاتا۔ لڑکیاں بھی کپڑوں لتوں کا انتظام کرتیں۔ خوب شاندار جوڑے تیار کئے جاتے۔

نئی لڑکیاں تو جلسے کی دہشت سے ہی بے حال ہو جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی سخت عیب کی بات ہونے والی ہے، بہت سی تو اپنے گھروں پر اس کا ذکر ہی نہ کرتیں بلکہ چھپے چوری ہی گناہ کر لیتیں۔ پرانی لڑکیاں ان کا مذاق اڑاتیں۔

''سنو ثمن تمھیں اپنے ساتھی کا پیار لینا ہوگا۔'' پریما نے شرارت سے کہا۔

''ہائے!'' ثمن کو پسینہ آ گیا۔

''اور کیا پیار تو لینا ہی ہوتا ہے، اور پھر دوسرے دن پرنسپل کو ایک پرچے پر لکھ کر دینا ہوتا ہے کہ تم نے اتنے لوگوں کا پیار لیا۔'' اوروں نے تائید کی۔

''ہاں اور پھر جس نے سب سے زیادہ لئے ہوں اس کو انعام ملتا ہے۔''

''اور۔۔۔۔ اور جو نہ لے تو؟''

''جو نہ لے تو اس کو جرمانہ، اور سالانہ رپورٹ پر لکھ دیا جاتا ہے، کہ یہ لڑکی بالکل کمزور ہے۔۔۔ خراب!''

مارے پریشانی کے ثمن کی نیند اڑ گئی، جو ابا میاں کے پاس سالانہ رپورٹ پہنچی، اور انہوں نے دیکھا تو بس خیر نہیں۔ نہ جانے کن مصیبتوں اور سفارشوں سے بھیجا تھا، ورنہ وہ تو یہی کہتے تھے کہ اس کالج کی کلاسیں کھلوانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ دوسرے محیط بھیا جب سے انگلینڈ سے آئے تھے تعلیم نسواں کے حد سے زیادہ خلاف ہو گئے تھے، یہ الٹی ہی بات تھی، حمید بھائی نے انگلینڈ سے آکر بوڑھی نانی تک کا پردہ اتروا دیا۔ بے چاری ہزار بڑ بڑاتیں، پنکھوں کی آڑ لیتیں مگر بھنگی، بہشتی، باورچی، سب ہی گھر میں آتے۔ جوان جوان

بہوئیں مزے سے لینی بچوں کو دودھ پلایا کرتیں، خالہ اماں پیٹھ خوب آرام سے کھجوایا کرتیں، اور بیگم اماں نہایت بے تکلفی سے لینی چودہ پندرہ برس کی میراسے رانیں دبواتیں۔ بوڑھی نانی لرزتیں اور تھراتیں۔ بہشتی بھنگی سر پر ڈال کر آتے تھے اب یہ خود بے چاری گھونگھٹ کاڑھ لیتی ہیں۔

''نانی اماں اتنی بوڑھی ہو گئیں مگر مردوں سے شرمانا نہ چھوڑا۔۔۔۔۔'' حمید بھائی چڑاتے اور نانی غریب مڑ مڑ صورت دیکھتیں۔

مگر محیط بھیا نہ جانے کن متعفن موریوں کی غلاظت میں ہولی کھیل کر آئے تھے۔ کہ اور زیادہ پردہ کے حامی ہو گئے تھے۔ خاندان کی سب سے بے وقوف اور بے ہنگم لڑکی سے شادی طے کی اور ثمن کی تعلیم کے خلاف جہاد قائم کر دیا۔

بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ جلسے کا دن بھی آ ہی گیا، ثمن کو تو بخار سا چڑھ آیا۔ رات بھر اسے عجیب عجیب واہیے خواب بن بن کر ستاتے رہتے۔ کبھی کالج کے غنڈے اسے چیختے چلاتے اپنے پیچھے دوڑتے دکھائی دیتے۔ کبھی دیکھتی وہ شیشے چکنے پہاڑ پر الٹی پھسل رہی ہے اور کپڑے تار تار ہو گئے ہیں، ہتھیلیاں چھل گئی ہیں۔ کبھی دیکھتی میسرن چھوٹے بھنگی کی پیٹھ پر سوار اسے جھاڑو سے ہانک رہی ہے۔ وہ غسل خانے میں نہا رہی ہے کہ حبشی نژاد نرس نے چوپٹ دروازے کھول دیئے۔ وہ چیخ مار کر گڑی مڑی ہو گئی..... جب اس کے حواس درست ہوئے تو پریما اس کے منہ سے چادر اتار رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ کیا کوئی برا سپنا دیکھا تو نے؟''

''ہاں!'' وہ گھبرا کر آنکھیں مچانے لگی۔

''پگلی کہیں کی! ایسے زور سے چیخی کہ میں ڈر ہی تو گئی۔ اٹھ نا، چائے کی گھنٹی بھی ہو گئی۔''

سارے دن کسی کام میں جی نہ لگا۔ عام طور پر لڑکیاں بالکل بے فکری نظر آ رہی تھیں۔ غور سے وہ ہر لڑکی کو گھور کر اس کے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی، مگر کچھ بھی تو ظاہر نہ ہوتا ان کے چہروں سے۔ یا تو وہ واقعی بڑی بہادر تھیں یا اس کی طرح بن رہی تھیں۔

شام کو ہر کمرے میں کپڑے بدلے جانے کی اودھم شروع ہو گئی۔ سوئی دھاگہ بٹن سے لے کر ساڑھیاں بلاؤز اور بندے وغیرہ ایک دوسرے سے مستعار مانگے جانے لگے۔ ثمن نے اپنی لٹھے کی شلوار اور چنا ہوا دوپٹہ نکالا۔ آج اسے دوپٹہ بہت ناکافی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس باریک چنٹ کو کھول ہی رہی تھی جو اس نے انگلیوں میں چھالے ڈال کر بڑی کاوشوں سے بنائی تھی کہ پریما آ گئی۔

''ارے پگلی شلوار قمیض پہن کر جائے گی، وہ ڈانٹ بتائیں گی پرنسپل، کہ یاد کرو گی''

''کیوں؟''

''کیوں کیسی؟ معلوم نہیں کہ ساڑھی پہننی چاہئے کالج کی لڑکیوں کو۔''

''مگر میرے پاس تو اس وقت بس وہی چار خانہ والی ہے، اور جمپر بھی نہیں۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''تمھارا تو بالکل ہی دماغ خراب ہوگیا ہے، بھلا اس جلسے میں سوتی ساڑھی چلے گی۔ میرے پاس ہے ۔۔۔۔ آؤ۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لے گئی۔

شمن نے بہتیری کوشش کی، خوشامدیں کیں۔ مگر پریما نے اس کا سنی رنگ کی ساڑھی جس پر بھاری بنارسی فیتہ لگا تھا، اور بروکیڈ کا شلوکہ پہنا دیا۔ وہ تو ہلکا سا پاؤڈر ہی لگا لیتی! اور بس، مگر پریما نہ مانی اور زبردستی سرخی اور کاجل لگایا۔ پھر بھر بھر ہاتھ چوڑیاں اور جھومکے جن پر ملمع کیا ہوا تھا کہ اصلی معلوم ہوتے تھے اس نے خود ہی پہن لئے۔ نہایت سبک ایڑھی کا جوتا پہن کر چلنا اسے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پل صراط پر چل رہی ہے۔ جوتا ذرا پنجہ دباتا تھا مگر وہ سہہ گئی۔ آج اس نے پریما کی حرص میں قم قم کی بندی بھی لگائی۔

جلسہ کا شور شروع ہوگیا، جسے دیکھو بے طرح بج رہا تھا۔ مس جونسن تک نے آج اپنی مردانہ وضع کی فراک پر پھولوں کا گچھا لگا کر کچھ نسوانیت سی پیدا کر لی تھی۔ تھوڑا بہت زنانہ پن جوان میں باقی رہ گیا تھا آج ابھر رہا تھا۔ میٹرن بھی آج تنگ فراک کو اور زیادہ تنگ بنا کر منڈھے ہوئے تھیں۔ ان کے جسم پر بندھی ہوئی ڈوریاں اور فیتے بستر بند کے تسموں کی طرح ان کی فراک میں سے جھلک رہے تھے۔ ایلما بھی مہمانوں میں آئی تھی، اپنی سادہ دکھنی ساڑھی اور اونچے جوڑے میں وہ بالکل الورا کے غاروں کی دیوداسی معلوم ہو رہی تھی۔

شمن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارے مہمان اسی کو گھور رہے ہیں اور کوئی دم میں بھاری بنارسی فیتے کی ساڑھی اس کے جسم سے پھسل کر اسے برہنہ چھوڑ جائے گی۔ ساڑھی پہننے کی عادی نہ ہونے کی وجہ سے کبھی پلو کھینچتی، کبھی پلیٹوں کو ٹٹولتی کہ کھل تو نہیں گئیں، پھر ایک دم آنچل بہت زیادہ لمبا لگنے لگتا تو چپکے سے اس کا سرکا کر اڑس لیتی، ایک دم سے ایسا معلوم ہوا کہ قم قم کی بندی گولی کی طرح ماتھے میں اٹکی ہوئی چبھ رہی ہے، اور کوئی دم میں انار کے دانے کی طرح پھوٹ کر اس کے سارے چہرے پر بہہ جائے گی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ملمع کے جھمکے بوجھل ہو کر کان کی لوؤں کو کھینچنے لگے۔

اتنے میں پروفیسر اور پرنسپل بھی آگئیں اور تعارف کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اندھا دھند ہاتھ پکڑ کر جوڑے لگانے شروع کر دیئے، اور تھوڑی دیر میں زیادہ تر لڑکیاں ایک ایک لڑکے کی ہمراہی میں نظر آنے لگیں۔ جب شمن اس عجیب وغریب تماشے کو خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ چکی تو اسے سامنے بیٹھا ہوا پریشان حال لڑکا نظر آیا۔ شمن نے اسے چونک کر دیکھا، اس کی مغائرت بھری نظروں سے وہ اور بھی سٹپٹا گیا، اور بڑی طرح ہکلا کر اپنی ٹائی ٹٹولنے لگا، شاید وہ بھی آج شمن کی طرح پہلی دفعہ سوٹ پہن کر آیا تھا۔

جب ذرا حواس درست ہوئے تو اس نے نہایت گھبراتے ہوئے اور لڑکوں کی نقل میں چائے بنا کر پھل وغیرہ شمن کو پیش کرنے شروع کئے، انگریزی میں شمن شکریہ کہتی اور وہ جواب میں مستعدی سے ''کوئی بات نہیں میڈم'' کہتا مگر بوکھلاہٹ میں کئی بار ''میڈم کے بجائے ''سر'' کر جاتا اور وہ شرم سے نیلا ہو کر اس کے حلق میں پھندے پڑنے لگتے۔ اس کو اتنا گھبرایا ہوا دیکھ کر شمن کو ہنسی آگئی وہ کافی بہادری سے انگریزی کے گھسے گھسائے جملوں میں اس سے باقاعدہ باتیں کرنے لگی۔ چھوٹی سی بات کو نہایت شستہ اور قواعد سے مرصع انگریزی میں وہ

دونوں باتیں کرنے لگے۔ لیکن دو چار جملوں میں ہی گفتگو کا سارا مواد ختم ہوگیا۔ مجبوراً دونوں نے نہایت تندہی سے کھانا شروع کر دیا اور باقی وقت میں چائے کی پیالیاں ہونٹوں سے چپکائے رہے، کیونکہ چائے پیتے میں بولنا ضروری نہ تھا۔ بیچ بیچ میں وہ نہایت حسرت سے اور لوگوں کو دیکھتے جو ایک دانہ بھی نہیں کھا رہے تھے اور برابر قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک دم شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے گندے نالے کی متعفن کیچڑ اس کے حلق میں گھول دی، بڑی زور سے ابکائی آئی مگر اس نے گلہ بھینچ کر چائے کے بڑے سے گھونٹ سے لقمہ نگل لیا۔ گرم چائے نے سارے حلق اور معدے تک کھلسا دیا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے۔ اس کا ساتھی بڑی رحم کی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا، اس کی طرح وہ بھی ٹین کی مچھلی کھانے کی عادی نہیں۔ اس مچھلی کو کھانے کے لئے مشق کی ضرورت ہے اور مشق غسل خانے میں مسلسل الٹیوں کے بعد حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر اس وقت دونئی چڑیاں پنجرے کی تیلیوں کو حسرت سے تک رہی تھیں اور زبان بند تھی۔

شمن نے دیکھا کہ ایلما بڑے غور سے اسے دیکھ کر کچھ چپکے چپکے اپنے ساتھی سے کہہ رہی ہے ۔۔۔ پھر اس کا مخصوص قہقہہ فضا میں کھنکا اور دھار دار دانتوں کی قطاریں چمک اٹھیں۔ گھبرا کر دونوں نے چائے کی پیالیاں رکھ دیں اور ایک دوسرے سے چھپا کر رومال ڈھونڈنے لگے۔

ایلما نے تاک کر ایک پکا سا انگور پھینکا۔ شمن ایسی گھبرائی جیسے ڈوب ہی تو جائے گی اس کے رس میں۔ باوجود تندہی سے تلاش کرنے کے رومال نہ ملا اور اس کے بوکھلائے ہوئے ساتھی نے جلدی سے رومال نکال کر اس کا گال پونچھ دیا۔ شمن کو معلوم ہوا جیسے قم قم کی بندی اس کے سارے جسم پر بہہ گئی اور وہ بے چارہ بھی کرنے کو تو اس قدر ہمت کا کام کر گیا۔ مگر پھر اس بری طرح جھینپا کہ شمن کو ترس آ گیا۔ ایلما اور اس کا ساتھی بے حال ہو کر ہنسنے لگے، پھر وہ دونوں اپنی کرسیاں گھسیٹ کر ان کی میز پر آ گئے۔

''ارے مسٹر تم تو بہت چل نکلے ہو ۔۔۔ واہ بھئی!'' ایلما کے ساتھی نے اس زور سے بچارے کی پیٹھ ٹھونکی کہ بل کر رہ گیا۔

''شمن اپنے دوست سے ملاؤ نا۔'' ایلما نے کہا۔

''یہ ۔۔۔۔ یہ ۔۔۔'' وہ ہکلا کر بولی۔

''ہیں؟ ایسی کھانے میں مشغول ہو کہ نام بھی نہ پوچھا۔''

''جی ۔۔۔ نہیں تو۔'' حمایت میں بولا۔

''ارے بھائی اتنی دیر سے برابر کھا رہے ہو اور ۔۔۔''

''جی نہیں ۔۔۔۔'' وہ بھی ہکلایا اس پر دونوں نے پھر قہقہوں کی بھرمار کر دی۔

''اور تم بڑے آوارہ ہوتے جاتے ہو ۔۔۔ ابھی۔''

''میں سچ کہتا ہوں ۔۔۔ آ معاف کیجئے گا۔'' وہ جلدی سے شمن کی طرف مڑا۔ ''میں نے تو یونہی پونچھ دیا تھا کہ آپ کا رومال خراب نہ ہو۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

شکر ہے کہ ایلما اور اس کے ساتھی افتخار کے آجانے سے وہ دم گھونٹنے والا طلسم خاموشی تو ٹوٹا۔ افتخار نے دونوں کو چھیڑ چھیڑ کر بے تکلف بنا دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈرامہ شروع ہو گیا۔ ایلما افتخار کو کہیں چھوڑ کر ثمن اور اس کے ساتھی کے بیچ میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں جلسے کا لطف آ گیا۔ عجب مزاج تھا ایلما کا بھی۔ عشق بازی پر تل جاتی تو سب کو نچا کر پھینک دیتی اور ایک دم جی اکتا جاتا تو سب کو سوکھے پتوں کی طرح جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

ڈرامہ ختم ہوا اور جلسہ بھی بکھر گیا۔ لوگ جانے لگے۔ پریما اپنے بھائی نریندر کے ساتھ اسے ڈھونڈنے آ پہنچی۔ دوسرے دن چھٹی تھی اور پریما اسے اپنے ساتھ دو دن کے لئے گھر لے جانا چاہتی تھی۔ دونوں کپڑے بدل کر جورجسٹر میں دستخط کرنے گئیں تو میٹرن نے کہا پہلے پرنسپل سے لکھوا کر اجازت لاؤ۔ ایک ہندو لڑکی کے گھر جانے کے لئے عام دستور سے مختلف اور زیادہ پختہ اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پرنسپل کے پاس سے پریما روہانسی صورت بنائے واپس آئی۔

''کیوں، اجازت ملی؟''

''نہیں۔۔۔ ڈانٹ ملی اور جرمانہ؟''

''اچھا ہوا ہم پہلے ہی کہتے تھے ٹھیک نہیں۔ بہت نٹ کھٹ کرتی ہو تم۔'' میٹرن خوش ہو کر بولیں۔

''اور پرنسپل صاحبہ نے کہا ہے کہ کیونکہ یہ جرمانہ آپ کی کوششوں سے ہوا ہے لہٰذا آپ کو ہی چاکلیٹ کھانے کے لئے دے دیا جائے'' یہ کہہ کر اس نے ان کے سامنے اجازت کا پرچہ ڈال دیا جس میں نہایت شستہ سختی سے یاد دلایا گیا تھا کہ انہیں بے کار باتوں کے لئے پرنسپل کو حیران نہ کرنا چاہئے۔

اس کے بعد نہ پوچھئے کیا ہوا۔ میٹرن نے بے عزتی کی حد دیکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ استعفیٰ دینے کی دھمکی دینے لگیں جو وہ کبھی نہ دے چکی تھیں۔ ثمن اور پریما کپڑے بدل کر۔۔۔۔ دوسرے دن پہننے کے لئے کپڑوں کی پوٹلیاں باندھ کر نریندر کے ساتھ موٹر کی اگلی سیٹ پر جا کر ٹھنس گئیں۔ کچھ مہمان ابھی رخصت ہو رہے تھے۔ زور و شور سے شب بخیر کہا جا رہا تھا۔ جب موٹر احاطے میں مڑ کر پھاٹک سے گزری تو ثمن نے دیکھا اس کا جلسے والا ساتھی دیوار سے لگا کھڑا تھا جیسے وہ جاتے جاتے رک گیا ہو۔

''اوہ!'' اس نے پہچان کر پوچھا۔

''کون تھا؟'' پریما نے پوچھا۔

''کوئی نہیں، ایک۔۔۔۔ ایک۔''

''لڑکا تھا؟ ہوں۔۔۔ یہ بات ہے۔'' پریما نے زور سے اس کی چٹکی لی اور نریندر نے ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ ثمن ایک عجیب شیریں جذبے کے ماتحت مسکرا اٹھی۔ کیرم کھیلتے میں نشانہ ٹھیک بیٹھے تو دل جھوم اٹھتا ہے۔ بالکل اسی طرح کوئی چیز دماغ میں سرد اور شیریں لہر کی طرح تیر گئی۔

راستہ بھر پریما جماہیاں لے کر اونگھتی رہی اور نریندر نہ جانے غلطی سے یا قصداً اس کی ران کو کہنی سے پیتا رہا، مگر وہ کہیں اور تھی۔ دور موٹر سے بہت آگے وہ اڑی چلی جا رہی تھی۔

(24)

رات آرام سے گذری۔ دوسرے دن ثمن کرسی پر بیٹھی رائے صاحب کے کرتوں میں بٹن لگاتی رہی۔ اور وہ اس کے پیروں کے پاس قالین پر پھسکڑا مارے بیٹھے کہانیاں سناتے رہے اور سوئی میں تاگہ پرو کر بھی دیتے جاتے۔

''الٹا مت ٹانکو دیکھو بٹن سنا۔'' وہ بڑی معصومیت سے بٹن کو الٹ پلٹ کر غور سے الٹا اور سیدھا دیکھتے۔

''یہ سیدھا۔'' وہ بڑی ہچکچاہٹ سے کہتے اور ثمن ہنستی۔

پھر وہ اسے شہزادیوں، بھٹیاریوں اور جادوگرنیوں کے قصے سنانے لگے۔ یہ کہانیاں ثمن نے ہزاروں بار سنی تھی۔ مگر رائے صاحب ان میں دل سے باتیں جوڑتے جاتے۔ وہ بار بار بھول کر اس ایک بھٹیاری کا ذکر بیچ میں گھسیٹ لاتے جو ہر مسافر کے ساتھ چوسر کھیلتی تھی اور ساتھ اپنی بلی بٹھا لیتی تھی۔ جب ہارنے لگتی تو بلی کو اشارہ کر دیتی اور بلی لیمپ بجھا دیتی۔

''اتنے میں وہ چال بدل جاتی اور مسافر ہار جاتا۔'' رائے صاحب بڑے جوش سے کہتے۔

''واہ بھلا بلی لیمپ کیسے بجھا سکتی ہے؟''

''ایں؟'' رائے صاحب بڑے بھولپن سے چونکتے۔

''اور کیا، بلی کیسے بجھا سکتی ہے؟''

''پھو۔۔ کر کے۔'' وہ بلی کی نقل کرتے۔ ثمن ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی اور رائے صاحب بھی بچوں کی طرح کھلکھلا اٹھتے۔

''نہیں، اصل میں بھٹیاری جو تھی وہ چراغ جلا کر بلی کے سر پر رکھ دیتی، اور جب اشارہ کرتی تو بلی سر ہلا کر چراغ گرا دیتی، بس۔''

''مگر مسافر بڑے بے وقوف تھے، اول وہ چراغ بلی کے سر پر کیوں رکھنے دیتے تھے۔ بھلا بلی کا سر بھی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

چراغ رکھنے کی چیز ہے۔ دوسرے وہ اس کے ساتھ کھیلتے ہی کیوں تھے؟''

''چل ہٹ بھی، اب میں کیا جانوں، تو ہوتی تو ان سے ضرور پوچھتی۔''

''اور کیا، اور بھٹیاری کو پولیس سے پکڑوا دیتی۔''

''اونہہ ساری کہانی کا مزہ کرکرا کر دیا، پگلی کہیں کی، بھلا بھٹیاریوں کو پولیس پکڑ سکتی ہے؟''

کہانی کہتے وقت ان کے چہرے اور دماغ میں کتنا بچپن آجاتا تھا! ان کے چہرے کی جھریاں خفیف مسکراہٹیں بن جاتیں اور آنکھوں پر سے بڑھاپے کا غلاف سرک جاتا۔ یہی چہرہ اخبار پڑھتے وقت اور دفتر میں کام کرتے میں کس قدر بردبار اور خشک ہو جاتا تھا۔

شام کو رائے صاحب کرسی پر بیٹھ گئے اور پکارا۔

''بھئی ہمارے سر پر تیل کون ڈالتا ہے؟'' پریما اور نریندر لڑنے لگے۔ پریما کا کہنا تھا کہ وہ ہاسٹل میں رہتی تھی۔ نری سارا وقت رائے صاحب کو ہڑپ کرتا رہتا تھا۔ پھر بھی اس کا جی نہیں بھرتا۔ نریندر کہتا تھا، پریما کو ایک سرے سے تیل ڈالنے کا سلیقہ ہی نہیں۔

''چمن تیل ڈالے گی، نری پیروں کے انگوٹھے کھینچے گا اور پریما میری گود میں بیٹھے گی۔'' رائے صاحب نے فیصلہ کیا۔ پریما فوراً اٹھلا کر ان کی گود میں پسر گئی۔

رائے صاحب کے بال بالکل سفید نہ تھے، ان میں پلاٹینم کی سی دھندلی سیاہی جھلکتی تھی، جیسے پہاڑوں پر جمی ہوئی بلوریں برف پر ہلکا سا شام کا غبار چھایا ہوا ہو۔ بالوں میں غضب کا گھناؤ تھا اور ذرا سا چھو دینے سے ان میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ رائے صاحب ان بالوں سے کس قدر پرسرار اور غیر مرئی معلوم ہوتے تھے۔

شمن محویت کے عالم میں ان کے پالش کئے ہوئے خموں کو ڈری ڈری چھو رہی تھی۔ پاس ہی پریما گھاس پر اوندھی لیٹ کر اونگھنے لگی۔ نریندر بیڈمنٹن کورٹ بنوانے چلا گیا۔ اور شمن رائے صاحب کے بالوں کے گنجان کہرے میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ پرسکون انداز میں ان کی آنکھیں بند تھیں، مگر پلکیں کانپ رہی تھیں۔ وہ سوئے نہیں تھے۔ آدھے کھلے ہونٹوں میں سے سچے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے مصنوعی دانت اور سونے کے تار نظر آرہے تھے۔ ان کے تلخ تبسم کو نیند کے ہلکورے لیتے دیکھ کر شمن کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ نرم نرم ٹھنڈی دلدل میں دھنستی چلی جارہی ہے۔ کنپٹی کے پاس ننھی ننھی شریانیں، معلوم ہوتا دبی ہوئی زندگیاں پھڑک رہی ہیں۔ بنچوں بیچ ماتھے پر اودے قشقے کی طرح کھنچی ہوئی رگ، آنکھوں کے گوشوں میں چڑیا کے پنجوں کے نشان، پتھر میں سے تراشا ہوا مضبوط جبڑا! اس پر رعب اور نامعلوم سی دہشت طاری ہوگئی۔ بے خیالی میں اس کی سرد اور سہمی ہوئی انگلیاں ان کی مڑی ہوئی گردن پر جا ٹکیں!

''ارے کیا کر رہی ہے۔۔۔۔۔'' دنیا جاگ پڑی۔۔۔ شمن گھبرا کر اپنی انگلیوں کو چٹخانے لگی۔ رائے صاحب نے ماتھے پر شکن ڈال کر زور زور سے کھانسنا اور چھینکنا شروع کر دیا۔ شمن کو ان کی اس چھچھوری حرکت سے سخت کوفت ہوئی۔ وہ جاگ پڑی۔

''تھک گئی! چل ہاتھ دھو، آج تجھے چاٹ کھلائیں گے'' وہ پیار سے بولے۔ رائے صاحب اٹھ کر پریما کے کان میں گھاس کے تنکے سے گدگدی کرنے لگے۔ پریما ننھے بچوں کی طرح مچل مچل کر اٹھی اور گھاس پر بیٹھ کر سب نے چاٹ اور کافی اڑائی۔

رات کے کھانے کے بعد پریما بیٹھی اور تارہ جھاڑ پونچھ رہی تھی۔ کالج میں فرصت نہ ملتی تھی جو مشق کرے اور یہاں کھیل کود ہی اتنا ہوتا کہ کچھ یاد ہی نہ آتا۔ کل رائے صاحب نے اسے کوئی فلمی گیت گاتے سنا تو ملامت کرنے لگے۔ راگ راگنیاں بھول کر وہ ٹیں ٹیں میں پڑتی جارہی تھی۔ انہیں کتنا ارمان تھا کہ بہت نہیں تھوڑا ہی سہی کچھ تو آرٹ سے ان بچوں میں بھی لگاؤ پیدا ہو جاتا۔

طنبورا اٹھا کر انہوں نے نہ جانے کس راگ کا الاپ شروع کر دیا۔ پیر کے پنجے سے تال دیتے جاتے۔ دیر تک وہ کچھ گاتے رہے، شمن خاک نہ سمجھی مگر وہ ان کی گہری لو چدار آواز، رات کی خاموشی میں مل جل کر اسے نیند کے جھولے جھلانے لگی۔ نہ جانے کیا سُر تھے، دھیمے اور نرم جو احساسات پر پھوار کی طرح برستے رہے۔

قریب قریب ہر اتوار کو شمن ان کے گھر جاتی۔ ہر سال لڑکیوں کو ملنے جلنے والوں کا نیا ریکارڈ بھروانا پڑتا تھا۔ عام طور پر لڑکیاں کارڈ پھینک پھانک دیتی تھیں۔ کیونکہ جو گھر والوں کے دستخطوں کے لئے بھیجتیں وہ کبھی واپس نہ آتے۔ اب کارڈ بھروانے کے لئے بڑی مصیبت آئی۔ پہلے کارڈ پر جو دستخط تھے وہ جعلی تھے اور اس دفعہ پرنسپل نے کارڈ بجائے لڑکیوں کو دینے کے سرپرستوں کو خود براہ راست بھیج دیئے تھے اور وہاں سے شمن کے لئے یہ جواب آیا کہ کہیں جانے کی خاص ضرورت نہیں، اگر کوئی رشتہ دار ملنے آئے گا تو وہ اجازت نامہ ساتھ لائے گا۔ لیکن اس طرح بڑی گڑبڑ ہوئی۔ خود بڑے بھیا ملنے آئے اور گھنٹوں پرنسپل سے لڑے۔ وہ ابا میاں کے پاس سے ہو کر نہیں آرہے تھے لہٰذا اجازت نامہ ندارد تھا۔ غصے میں آکر وہ کارڈ خود بھر کر دستخط کر کے دے گئے۔ ایک اور لڑکی کا گارڈین ملنے آیا لہٰذا اس سے بھی اجازت نامہ طلب کیا گیا۔ وہ بہت چراغ پا ہوا۔ خیر یہ طے ہوا کہ وہ وہیں بیٹھ کر اجازت نامہ لکھے۔ میٹرن سوتے سے اٹھائی گئی تھیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی پرنسپل کے کمرے سے ملاقات کے کمرے تک پیغام رسانی کرتی رہیں، پھر قلم دوات منگوایا گیا۔ گھنٹوں لگ گئے پر ملاقات نہ ہو سکی۔ گارڈین بھنا کر چل دیا اور سر پھرے نے اخبار میں الٹی سیدھی چیزیں چھاپ دیں۔ ایک اور لڑکی کا سگا بھائی ملنے آیا اتفاق سے وہ سامنے ہی برآمدے میں کھڑی تھی، بے اختیار دوڑ کر لپٹ گئی۔ بڑی دیر بعد خیال آیا کہ اجازت تو لی ہی نہیں، اگر میٹرن کو خبر ہو گئی تو؟ اور واقعی سانپ کی طرح اس کی پسلی پھڑکی اور سر پر موجود!

''بغیر اجازت کس سے بات کر رہی ہو؟''

''اپنے بھائی سے۔''

''ثبوت کیا ہے کہ یہ تمہارا بھائی ہے؟''

''ثبوت؟ ارے یہ میرا سگا بھائی ہے، دوسرے کیا تم سمجھتی ہو یہ میرا عاشق ہے؟''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''کیا معلوم؟'' لڑکی جل گئی۔

''مگر یہ تو کہتا ہے کہ آپ سے ملنے آیا تھا۔۔۔۔آپ کا۔''

''ہشت۔'' اس کا بھائی بولا اور میٹرن کا تو یہ حال کہ انگاروں پر لوٹ گئیں۔لڑکی بولی۔''اگر آپ کو یقین نہیں کہ یہ میرا سگا بھائی ہے تو چلئے سائنس روم میں خون کا معائنہ کرا کے دیکھئے اور کیا!'' غرض آئے دن یہی جھگڑے ہوا کرتے۔روز روز کے قصوں سے منتظمین بھی تنگ آ گئے تھے۔لڑکیوں کی چالوں کے آگے کسی کی نہ بن آتی۔بڑی لے دے مچتی۔لہٰذا پھر کارڈ بھروانے کا تقاضا ہوا۔اب کے شمن کو دوسرے چال چلنا پڑی۔یعنی نہایت صفائی سے کارڈ پر دستخطوں کی نقل کر ڈاک سے پرنسپل کی خدمت میں بھیج دیا۔یہ ننھی ننھی چوریاں بڑی پیاری معلوم ہوتیں، اتنے رعب دار بزرگوں کو الو بنا کر لڑکیاں چپکے چپکے ان کے بھولپن پر ہنستیں۔ڈھائی، تین سو کارڈوں میں دو چار جعلی چلا دینا کچھ مشکل بات نہ تھی۔

شمن کا جانا صرف چند اتواروں کے لئے رکا اور وہ پھر جانے لگی۔رائے صاحب سے اس کی خوب گھٹتی۔بچوں میں وہ بچہ بن کر کھیلتے خوب بے ایمانیاں کرتے۔پریما کی تو ان سے باقاعدہ کشتی ہوتی۔پھر بھی اگر وہ پریما کی طرح شمن کے گدگدیاں کر دیتے یا گال نوچ دیتے تو وہ بری طرح جھینپ جاتی اور دیر تک الگ الگ رہتی۔ان کے سامنے ننھا سا بچہ بن جانے کی خواہش ہونے لگتی۔

ایک دن مذاق میں انہوں نے اسے بھینچ ڈالا تو کھسیا کر رو پڑی۔رائے صاحب کچھ متحیر اور کچھ پریشان ہو گئے۔اتنے زور سے تو انہوں نے بھینچا بھی نہ تھا۔جب شمن مسکرا دی تو وہ بن کر روٹھ گئے۔کھانے پر وہ نریندر سے کچھ گاؤں وغیرہ کے متعلق باتیں کرتے رہے اور پھر کسی کام سے اپنے دفتر میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔شمن ان کی بے رخی سے روہانسی ہو گئی اگر وہ واقعی خفا ہو گئے تھے تو؟۔۔۔۔۔بے اختیار اس کا دل بورڈنگ بھاگ جانے کو چاہا۔

پلنگ پر چت پڑی وہ سنسان دوپہر میں سوچا کہ، آخر اتنی جلدی اس کے آنسو کیوں نکل پڑے۔رائے صاحب کو دیکھ کر اس پر رقت طاری ہو جاتی تھی؟ پھر اسے نریندر کا خیال آ گیا۔وہ سب کے سامنے کتنا چپکا بنا رہتا تھا۔پراکیلے میں بری طرح سٹپٹا جاتا۔شمن اس کی گھبراہٹ سے اور بھی شیر ہو جاتی اور جب وہ شوق بھری کن انکھیوں سے اسے تاکتا تو بزرگانہ انداز سے مسکرا اٹھتی۔اب وہ بچہ نہ تھی، اسے معلوم تھا نریندر اسے چاہتا ہے! یہ چاہت کیا ہوتی ہے؟ نریندر اسے بالکل چغد معلوم ہوتا۔اس کی محبت کتنی بے تکی اور کتنی بے ہنگم تھی!

اور رائے صاحب؟ وہ تو اسے دیوتا نظر آتے۔بیٹھے بیٹھے اس کا جی چاہتا وہ لمبی لمبی ان کے صندل جیسے پاک قدموں میں لیٹ جائے۔وہ آہستہ سے اسے سہارا دے کر اٹھائیں اور اس کا چکر کھاتا ہوا سر اپنے پراسرار سینے سے لگا لیں۔ان کا فراخ سینہ جس میں سے مقدس مندروں کی سی مسحور کن خوشبو آتی تھی۔ایک بار ہی وہ اپنے نتھنے چوڑے کر کے اس مہک کو پی جائے اور ابدی غنودگی میں ڈوب جائے۔

پریما کہتی تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد انہوں نے دوسرا بیاہ نہیں کیا، دونوں بچوں کے لئے سب کچھ

بن کر رہ گئے۔کچھ لوگ تو انہیں چھچھورا کہتے تھے اور بعض انہیں فلسفی، مجذوب اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے تھے۔شمن کو وہ نارو جی اوتار معلوم ہوتے، پریما کے ساتھ رہ کر اسے ہندو دھرم بہت مقدس معلوم ہونے لگا تھا۔کبھی کبھی وہ قم قم کی نیکی کر لگاتی اور آئینے میں اسے اپنی شکل عجیب سی معلوم ہوتیں۔ننھی سی خونیں بوند سے اسے چہرے پر ہزاروں رنگینیاں اور سنگار پیدا ہو جاتے۔اس کی آنکھیں کچھ کچھ ایلما کی مست سادھوؤں کی سی آنکھوں سے مشابہ ہو جاتیں اور بال زندہ سانپوں کی طرح رینگنے لگتے۔معلوم ہوتا وہ ٹھنڈے ٹھنڈے شعلوں میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے۔۔۔۔اس وقت رائے صاحب کے طلسمی ہال اور دھلی ہوئی صبح کی طرح جھلملاتی پیشانی کے علاوہ اسے کچھ نظر نہ آتا۔اور وہ نہ جانے کن نامعلوم تاریکیوں میں بھٹکنے لگتی۔

شام کو کھانا کھاتے میں کچھ دھرم اور سماج کا ذکر چھڑ گیا۔پریما زور و شور سے لیکچر دینے لگی۔نریندر بھی بیچ بیچ میں بول اٹھتا۔ایکا ایکی رائے صاحب بولے۔

''ارے او چمن، تو ہندو ہے کہ مسلمان؟''

سب ایک دم خاموش ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''رام رام، جو کہیں مسلمان ہوئی تو اپنا دھرم تو بھرشٹ ہو گیا۔سمجھو۔''

''رائے صاحب ہمارا دھرم اتنا بودا نہیں کوئی اسے بھرشٹ کر سکے۔دنیا کی کوئی شکتی ہمارے دھرم کو آنچ نہیں پہنچا سکتی۔'' پریما بولی۔

''چل چل جانے دے۔'' انہوں نے پریما کے جوش کو ایک طرف جھٹک کر کہا۔

''کیوں رہی چمن، تو بتا۔''

''رائے صاحب دیکھئے میری طرف۔'' نریندر جوش سے چیخا۔

''نہ نہ بھئی میں کچھ نہیں دیکھتا، یہ جو لڑکی ہے نا! یہ اگر مسلمان ہوئی تو۔۔۔۔''

''رائے صاحب آپ۔'' پریما غصہ سے بے حال ہو گئی۔''اور آپ کے کتنے دوست جو مسلمان ہیں تو۔۔۔۔''

''ہمارے دوستوں کی اور بات ہے وہ۔۔۔۔مگر یہ لڑکی تو۔۔۔۔مجھے نہیں معلوم تھا، رام رام۔'' مارے شرم کے نریندر اور پریما رو ہانسے ہو گئے اور شمن نے سہم کر پلیٹ سے ہاتھ کھینچ لیا۔رائے صاحب کے چہرے پر ویسی ہی درشتی قائم تھی۔

''مذاق نہیں ہے، اب ہم سب کو پرائشچت کرنا پڑے گی۔سوا لگ، اور بھئی اس چھوکری کو ہندو بنانا پڑے گا۔۔۔کیوں پھر۔۔۔'' وہ جھک کر شمن کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

''تو لے تجھے ابھی ہندو بنائے دیتا ہوں۔۔۔'' گلاس میں ستے پانی لے کر وہ ناخنوں سے شمن کے منہ پر چھڑکنے لگے۔ازم شرم نہ جانے انہوں نے کیا پڑھنا شروع کیا۔ایک دم سے پریما دوڑ کر ان کے بازو سے جھول گئی اور زور سے شانے میں دانت گاڑ دیئے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''افوہ کتیا!'' رائے صاحب جلدی جلدی اپنا کندھا سہلانے لگے۔

''اچھا مت بنانے دو، ہم تو کہتے تھے چلو بھئی اچھا رہے گا۔ کوئی موٹا سا بنیا ڈھونڈ کر اس کا بیاہ کر دیں گے۔۔۔ مگر''

شمن تنتناتی ہوئی میز پر سے اٹھ کر کھڑکی میں جا بیٹھی اور آنکھیں بھینچ بھینچ کر جھوٹے آنسو نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

''ارے، رے رے، ہمارا بیٹا روٹھ گیا۔'' وہ پیچھے پیچھے آئے، دیر تک وہ اسے بہلاتے رہے مگر شمن روٹھی رہی۔

''آنکھیں میچیں کون آئے، آنکھیں میچیں کون آئے۔۔۔۔'' انہوں نے آنکھیں بند کر کے اس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ان کی بائیں آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ جس میں سے شرمیلی شراب شرارت سے جھلک رہی تھی۔ شمن ہنس پڑی، لپک کر رائے صاحب نے اسے اٹھا لیا اور کرسی پر ڈال دیا۔

شمن نے ایک کہانی سنی تھی کہ ایک آدمی اپنے ایک دوست کو دفن کرنے گیا تو اس کی تسبیح قبر میں گر گئی، بعد میں اسے یاد آیا تو اس نے سوچا چل کر لے ہی کیوں نہ آؤں۔ اس نے جا کر قبر کھولی اور نیچے اترا تو دیکھا مردہ غائب ہاں قبر کے سرہانے ایک کھڑکی کھلی ہے، اس کھڑکی کے اندر داخل ہوا تو سامنے اس کا دوست ایک مرصع تخت پر جلوہ افروز نظر آیا۔

''یار بڑے ٹھاٹ ہیں تمہارے تو۔'' اس نے کہا'' ہاں بھائی تمہاری دعا سے مزے میں ہیں اور بھائی تمہاری تسبیح رہ گئی تھی سو یہ رہی۔'' وہ بولا۔'' ہاں وہی تو لینے چلا آیا تھا، خیر تم سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اچھا بھئی السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام''

وہ آدمی قبر سے نکلا تو معلوم ہوا کہ دنیا ہی بدل چکی ہے۔ نہ گھر نہ بار، نہ بیوی نہ بچے! ایک سو دو برس کے بوڑھے نے بتایا کہ اس کے لگڑ دادا کے سکڑ دادا کے زمانے میں سنا جاتا تھا کہ کوئی آدمی اس نام کا رہتا تھا۔

تو یہ ہیں قدرت الٰہی کے کرشمے، یہاں تو علیک سلیک ہی ہوئی اور وہاں جگ بیت گئے۔ جب رائے صاحب نے اسے اٹھا کر کرسی پر ڈالا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آسمان پر ستاروں کے ہنڈولے میں چک پھیریاں کھا کر ایک دم رک گئی۔ ہر چیز اسے اپنے گرد ڈگمگاتی محسوس ہو رہی تھی اور مندروں جیسی مقدس خوشبو سے اس کا دماغ سن ہو کر رہ گیا۔ جلدی سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹھنڈے پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے صدیوں کے پیاسے ہونٹوں سے لگا لیا۔

(25)

دسمبر کی چھٹیوں میں اسے اس مرتبہ کوئی گھر سے لینے نہ آیا۔ گنتی کی دو چار لڑکیاں بورڈنگ میں رہ گئیں۔ وہ بھی اپنے اپنے مشغلوں میں ڈوبی رہتیں۔ پریما اور شمن ہر وقت ساتھ رہتی تھیں۔ اس کے جانے کے بعد شمن دن بھر پریشان بھٹکتی رہتی۔ کسی پیڑ کے نیچے دری ڈال کر ناولیں پڑھا کرتی۔ پھر کبھی کبھی شام کو دو چار لڑکیاں مل کر سینما چلی جاتیں۔ تب تو شمن اور بھی بوکھلا جاتی۔ خاموش کرسی پر لیٹ کر وہ رامائن کا ترجمہ پڑھا کرتی۔ سیتا جی کی زندگی پر اسے بڑا رشک آتا، کس مزے سے وہ رام چندر جی اور لچھمن جی کے ساتھ جنگلوں میں پکنک منایا کرتی ہوں گی۔ چودہ برس کی لمبی چوڑی حسین پکنک! ایلما کہتی تھی کہ اچھا ہی ہوا جو رام چندر جی کو بن باس ملا۔ کچھ تو غریبوں کی دکھ بھری زندگیوں کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ کتنے انسان ہیں جو جانوروں سے بدتر اور جنگلوں سے بھی گئی گزری زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ لیکن تاریخ میں کوئی ایک لفظ بھی ان کے بارے میں نہیں لکھتا۔ یہ بڑے لوگ اگر عیش و عشرت سے اکتا کر سنیاس لے لیں تو مفت کی پبلسٹی۔ لیکن ان جنم سنیاسیوں کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جو پیدا ہی ننگی دنیا میں ہوتے ہیں۔

چند ہی دنوں میں اس نے اَن گنت کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جن میں سے ''جین ایر'' نے اسے حد سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ آخری باب جہاں وہ اپنے اندھے آقا کے پاس لوٹ کر آتی ہے اس کو اتنا پیارا معلوم ہوا کہ تین چار بار پڑھ کر بھی سیری نہ ہوئی۔ ٹیگور کی کہانیاں، خصوصاً ''کاسٹ آوے'' پڑھ کر تو سچ مچ آنسو نکل پڑے۔ ہارڈی کے مشہور ناول ''ٹیس'' نے بھی اسے ہلا کر رکھ دیا۔ مگر سب سے زیادہ جس چیز نے اس کی رگ رگ کو نچا کر پست کر ڈالا، وہ بائرن، شیلے اور کیٹس کی شاعری تھی۔

جب کل پانچ چھٹیاں رہ گئیں تو پریما اور نریندر اسے لینے آ پہنچے۔ شمن کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ پریما سے ناراض تھی۔ نریندر کے ساتھ گھس کر بیٹھنے میں بھی اعتراض نہ ہوا۔ اور جب اس نے حسب عادت اس کا پیر کچلا شمن نے چناخ سے اس کے گال پر ایک تھپڑ جمایا۔ پریما بھی اس کی حمایت میں نریندر کی چٹکیاں بھرنے لگی۔ موٹر اڑی چلی جا رہی تھی اور اس سے بھی تیز شمن اڑ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ روحانی طور پر تو پہنچ بھی چکی ہے۔۔۔ رائے صاحب، پریما اور نریندر سے ناراض ہیں کہ وہ اسے اتنی دیر میں کیوں لائے۔ وہ اس کے انتظار میں کس قدر تھک گئے ہوں گے۔ اسے دیکھتے ہی وہ نقلی مگر اصلی موتیوں جیسے دانت ایک دم جگمگا اٹھیں گے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

مگر گھر پہنچ کر نہ ہی دانت جگمگائے اور نہ اس کے انتظار میں کوئی تھکا ہوا نظر آیا۔ رائے صاحب اپنے چند دوستوں کیساتھ شکار کو گئے ہوئے تھے آنے کے متعلق کچھ نہیں کہہ گئے تھے۔ گھر سونا سونا ہو رہا تھا۔ ثمن آ کر پچھتائی، اوپر سے نریندر نے بدمذاقیاں شروع کر دیں۔ پریما کو سوتا پا کر اس نے ثمن پر سچ مچ اعلان عشق کر دیا۔ اور وہ بھی اس بھونڈے طریقے سے کہ بس ٹوٹ ہی تو پڑے۔ ثمن کو اس پر بجائے غصے کے پیار سا آ گیا۔ وہ مسکرا دی اور جیسے ایک عقلمند ماں بچے کو شیشے کا گلاس مانگنے پر بڑے پیار سے بہلا دیتی ہے۔ اسی طرح ثمن نے نریندر کو چمکار دیا اور جب وہ ناامید ہو کر سسکیاں لینے لگا تو ثمن کا جی چاہا اس بے وقوف کا سر اپنے سینے سے لگا کر تھپکیاں دے، اور سلا دے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دم نہایت عقلمند اور بزرگ سمجھنے لگی۔ نریندر اسے بے حد یتیم اور بے کس معلوم ہو رہا تھا وہ بے چارہ اس کی بزرگانہ باتیں سن کر ویسے ہی حیرت زدہ ہو رہا تھا، بالکل ہی سٹپٹا گیا چائے پر کچھ جھینپا کچھ روٹھا بیٹھا رہا۔

شام کو رائے صاحب اچانک واپس آ گئے گویا ثمن کی خاموش پکار نے انہیں کھینچ بلایا۔ خاک اور دھول میں اٹے ہوئے کپڑے، روپہلی بالوں پر خاک کی افشاں جیسے سورج پر ہلکے ہلکے بادلوں کی پرچھائیاں، دھوپ کی رنگ کچھ اور جھلس کر شوخ ہو گیا تھا۔ اور جب پیڑائے ہوئے ہونٹوں کے درمیان ستاروں کی لڑیاں چمکیں، تو ثمن کا دل زور زور سے اچھلنے لگا اور اس کی نگاہیں مٹی میں لتھڑے ہوئے بھاری جوتوں پر جم گئیں۔

آتے ہی انہوں نے گلاس بھر برف کا پانی پیا اور خلاف معمول سر ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گئے۔ پریما اور نریندر ویسے ان سے اتنے بے تکلف تھے۔ مگر انہیں خاموش دیکھ کر بے چاروں کی زبانیں گنگ ہو جاتیں۔ ان کی ایک تنبیہی نگاہ چابنے کی طرح لگتی اور پریما جیسی بے چین ہستی بھی دبک کر رہ جاتی۔

''کیا بات ہے؟'' ثمن نے خاموشی اور سکون سے متاثر، آہستہ سے پریما سے پوچھا۔

''تھک گئے ہیں، یا شاید۔۔۔۔'' وہ رک گئی۔

''کیا؟''

''شاید مس فلپ سے لڑائی ہو گئی وہ بھی تو شکار کو گئیں تھیں۔'' پریما نے اسے ڈرائنگ روم کے آخری کونے میں لے جا کر کہا۔

''کون ہیں یہ مس فلپ۔''

''ہیں ایک، یہاں انسپکٹر آف اسکولز ہیں، رائے صاحب کی کلاس فیلو تھیں۔ شادی بھی طے ہو گئی تھی، مگر جب انگلینڈ میں رائے صاحب ممی سے ملے تو بس نہ جانے کیوں دو دن میں شادی بھی کر ڈالی، اب ۔۔۔۔۔ ارے تم نے ممی کی نئی تصویر نہیں دیکھی جو رائے صاحب نے بنوائی ہے، ٹھہرو ابھی دکھاؤں گی، ہاں تو ممی کی زندگی ہی میں یہ گھنٹوں آ کر بیٹھا کرتی تھیں، ممی آئرش تھیں اور اس قدر سیدھی کہ ہماری دادی جی خوب ان سے گھر کے کام کرواتی تھیں۔ دھوتی باندھتی تھیں۔ اور بڑی کاہل تھیں، یہ چڑیل جب ہی سے انہیں پھانسنے کی فکر میں تھی یہ فلپ کی بچی۔ رائے صاحب اسے بہت چاہتے ہیں، مگر جلاتے بھی خوب ہیں۔ مگر جب روتی

ہے تو پچھتاتے ہیں۔''

''بڑی بری ہے!'' ثمن کے دل نے پکارا۔

''ہاں، مگر رائے صاحب اسے کبھی نہیں مناتے۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ بس ملاقات ہو جاتی ہے کسی پارٹی، جلسے میں، اور رائے صاحب کی تو یہی عادت ہے کہ ذرا دیر میں ہنسا دیا اور ذرا میں رلا دیا۔۔۔ پھر اس دن۔۔۔۔''

''پریما'' رائے صاحب کی بھرائی ہوئی آواز لمبے چوڑے ہال میں گونجی۔

''ارے چمن بھی آیا ہوا ہے! کب آئے دوست۔'' رائے صاحب نے گویا اب اسے دیکھا، وہ ذرا مسکرا اٹھے۔ ''لے۔۔۔۔ بھئی ذرا اتار'' وہ کوٹ میں پھنسے ہوئے بولے۔

ثمن کوٹ اتارنے لگی، قمیض بری طرح پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی اور جسم جل رہا تھا۔ اور پراسرار مندروں کی سی خوشبو کا جھونکا اسے آہستہ سے جھنجھوڑ گیا، مگر وہ سنبھل گئی اور زمین پر بیٹھ کر جوتا کھولنے لگی۔ رائے صاحب نے پیر کھینچ لئے، اور جھک کر ہولے سے اس کے گال پر دو انگلیاں مار دیں۔ ثمن گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اور بیرا جوتے کھولنے لگا۔

کھانے کے کمرے میں ثمن کو چوہے سے رینگتے معلوم ہوئے۔ اس نے بجلی جلائی تو نریندر نامراد عاشقوں کے سارے ضروری تاثرات چہرے پر جمع کئے کرسی پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ ثمن جیسے اس کے حال دل سے بے خبر کرسی کھینچ کر پاس بیٹھ گئی۔

''کتنی گرمی ہے!''

نریندر چپ!

''آج تو آئس کریم بنتی۔''

نریندر چپ!!

''رائے صاحب کو فالودہ پسند ہے نا؟'' اس نے براہ راست پوچھا۔

چپ!

''اونہہ، کوئی سامنے کی کھڑکی ہی کھول دے پنکھے بھی تو مند ہیں، معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگ گئی ہے۔۔۔۔۔ ہائے کوئی۔۔۔۔''

نریندر نے ایک حقارت آمیز نظر اس پر ڈالی اور بھناتا ہوا کھڑکی کے کواڑ دھڑا دھڑ کھولنے لگا۔

''نری کیا بہت غصہ میں ہو؟'' اس نے پیار سے چھیڑا۔

''نہیں۔''

''ہاں؟۔۔۔۔ تو پھر آئس کریم کے ذکر پر مسکرائے کیوں نہیں؟'' باوجود کوششوں کے نریندر مسکراہٹ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کو نہ روک سکا۔

''او ہو ہو، بن رہے ہیں جناب، ندیدے کہیں کے، کہیں جاڑوں میں بھی کوئی آئس کریم کھاتا ہوگا۔

''تم جانتی کہ۔۔۔۔''

''ہونہہ، جیسے تم تو بہت جانتے ہو۔''

''اگر تمھیں کسی سے اتنا پریم ہوتا'' وہ انگریزی چھانٹنے لگا۔

''آہا، پریم، پریم کی نیا۔۔۔۔ پریم۔۔۔۔ کہو نا آگے؟''

''ہنہ۔۔۔۔ میں۔۔۔'' نریندر بھنایا۔

''دیکھو نریندر تم مجھے ڈانٹو گے تو۔۔۔۔ ہاں، اچھا نہ ہوگا، بڑے آئے ڈانٹ کے بولنے والے، اور اسی پہ کہتے ہو پریم ہے، خاک پریم ہے تمھیں، جی ہاں پریم ہوتا تو یوں اپنا ریکٹ چھپا کر نہ رکھتے، اور لو کاٹ توڑتے وقت پکے پکے خود نہ نگل جاتے۔''

''کیوں جھوٹ بولتی ہو، کتنے سارے توڑے، مگر اس نے پریما نے لپک لئے، ہنہ!''

''خیر لو کاٹ تو پریما نے لپک لئے اور ریکٹ کی بات گول ہی کر گئے، ہنہ جیسے میں کھا ہی تو جاتی تمھارا بلا۔''

ایک دم سے نریندر پیر پٹختا چل دیا، ثمن مسکراتی ہوئی اطمینان سے کرسی پر پھیل گئی۔

''یہ لو ریکٹ، اور مجھ سے بات نہ کرنا۔'' نریندر نے ریکٹ پٹخ دیا۔ کچھ دیر ثمن اسے دیکھتی رہی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''او۔۔ فوہ نری!''

''مجھ سے مت بولو جی، سو دفعہ کہہ دیا، ہاں نہیں تو۔''

ثمن مامتا کے معصوم جذبہ سے بے چین ہو کر ہنسنے لگی۔ اگر اس طرح، بالکل ایسے ہی فرہاد شیریں کے سامنے تیشہ پٹخ کر کہتا۔ ''ہم سے نہیں کھدتی نہر۔۔۔۔ جی! یقیناً وہ شہریار کو چھوڑ چھاڑ اسی کے گلے کا ہار بن جاتی، اور پھر حکم ملتا ہے ہم سے مت بولو جی!'' وہ خوب ہنسی۔

''اوہ، نری ڈیر!'' وہ نریندر کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ تکنے لگی۔ ایک دم سے نریندر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ریچھ کی طرح لپٹ گیا، ثمن نے گھبرا کر اسے دور دھکیلا، سارے بال اور کان کھسوٹ ڈالے، بے چارا اپنے ہوئے کتے کی طرح کونے میں دبک گیا، اور ثمن کچھ خوفزدہ کچھ شرمندہ بھاگنے لگی کہ آتی ہوئی پریما سے ٹکر ہوئی۔

''ارے کیا ہوا؟''

''آ۔۔۔ آ۔۔۔۔ کچھ نہیں، یہ نریندر مجھے مار رہا تھا۔'' وہ ایک دم بات پلٹ کر ہنسنے لگی پھر مصنوعی غصے سے گال پھلا لئے۔

''ہائیں نری کے بچے، یہ رہا تیرا ریکٹ اور کہتا تھا کہ گم ہو گیا۔''

''ہاں! جھوٹا سارے زمانے کا'' ثمن نے تائید کی۔

''کیوں مار رہا تھا بے چاری ثمن کو؟ کیوں؟ کیوں؟'' وہ ریکٹ کے جال سے نریندر کے سر پر ٹپے لگانے لگی۔

بچھرا ہوا نری بھنبھوڑ ہی کھاتا کہ اتنے میں رائے صاحب کمبل لپیٹے آ پہنچے اور بات ٹل گئی۔

''آج نریندر کو کیا ہو گیا ہے؟'' رائے صاحب نے اسے غصے اور شرم سے سرخ دیکھ کر کہا ''تم دونوں نے ستایا ہوگا، کیوں؟''

''پریم ہو گیا ہے بے چارے کو۔'' ثمن نے دبی زبان سے ہنسی روک کر کہا۔

''کیا ہو گیا ہے۔''

''پریم، پریم۔۔۔ رائے صاحب'' پریما نے چیخنا شروع کیا۔

''کسے؟ اپنے نری کو؟'' رائے صاحب بن کر فکرمند ہو گئے۔

''ہاں چہ بے چارا۔''

''میں مار دوں گا، ہاں۔'' نریندر غرایا۔

''ارے باپ رے! مگر کس سے ہو گیا ہے پریم؟''

''ایک ہے۔'' ثمن اترانے لگی۔

''جھوٹی، ہنہ'' نریندر مارے شرم کے اور بھی بھنا گیا۔

''ہا، بے چارا، رائے صاحب اب؟ اپنا نری تو۔۔۔۔''

''میں چھری مار دوں گا۔۔۔ پریما کی بچی۔''

''اور رائے صاحب۔۔۔۔'' قبل اس کے کہ پریما کچھ بولے نری نے کھٹ سے چھری کا دستہ اس کی انگلی پر رکھ دیا۔

کھانے پر نریندر کے عشق نے سب کو ہنسا دیا، خصوصاً ثمن تو بے تحاشا ہنستی رہی۔ اسے یہ کھیل نہایت مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا، رائے صاحب میں بھی اپنی پرانی شگفتگی لوٹ آئی، وہ دیر تک بیٹھے کانٹوں اور چھری کی مدد سے میز پر معمے بنا کر امتحان لیتے رہے، مگر انہوں نے صرف شوربہ پیا اور جلدی سے جا کر سو گئے۔

ثمن اور پریما اداسی سے نڈھال ہو کر ایک ہی پلنگ پر سو گئیں یعنی ثمن جاگتی رہی اور پریما سو گئی۔ ثمن نے جاگنے اور خود سے بات کرنے کی ایک عادت سی ڈال لی تھی۔ روزانہ سونے سے پہلے وہ خود اپنے حضور میں اپنے سارے احساسات اور تجربات ایک ایک کر کے پیش کرتی اور ان پر خود اپنا فیصلہ سنتی۔ یہاں تک کہ وہ نہ جانے کب سو جاتی۔ اس سونے میں اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے مزیدار کہانیاں سنا کر سلا دیا ہو۔ رائے صاحب نے جو ہولے سے اس کے گال پر دو انگلیاں چھوا دی تھیں وہ ایک دم تازہ ہو گئیں، ساتھ ہی اسے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

گزرے ہوئے جنم کی بھولی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔۔۔دور بہت دور، صدیوں پہلے، رشید نے کیرم کھیلتے میں اس کی کلائی کو پکڑا تھا۔ چٹکی مارنے کے لئے دو انگلیوں کو ملا کر۔۔۔پھر چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ سسکتی ہوئی چٹکی اب بھی اس کی رگ رگ میں چمکیں لے رہی تھی۔ اس نے اپنی کلائی پر سنسناتا ہوا گال رکھ دیا اور رائے صاحب کی دو انگلیوں کا مس کلائی میں رینگ گیا، اس طرح گویا اس نے اس نیم مردہ چوٹ میں نئی جان ڈال دی، اسے سکون کی نیند آ گئی۔

صبح اس کی آنکھ خلاف معمول دیر میں کھلی تو کالج کی گھنٹی کی آواز کہیں دور سنائی دی۔ ذرا ہوش آنے پر معلوم ہوا وہ کالج میں نہیں بلکہ پریما کے پلنگ پر ہے اور یہ آواز؟۔۔کسی نے کانسی کی تھالی رسوئی میں گرائی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

رائے صاحب اب بھی ست نظر آ رہے تھے۔ شمن وہ دیر تک مس فلپ کو کوستی رہی جس سے لڑ کر وہ اتنے مکدر ہو گئے تھے مگر پھر بھی اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں تازگی آ جاتی اور وہ ایک آدھ جملہ ضرور کس دیتے، دیر تک بیٹھ کر تاش بھی کھیلے اور بے ایمانیاں بھی کیں۔ آج شمن کا دل بے اختیار انہیں چھونے کو چاہ رہا تھا، لہٰذا وہ پریما کے ساتھ ساتھ ان سے لڑنے بھی لگی، نہ جانے کس بات پر انہوں نے زور سے اس کی انگلی چٹخا دی تو بچوں کی طرح مچل گئی، اس کا جی چاہتا تھا ایک دم ان کے مندر جیسے سینے کے پٹ کھل جائیں اور وہ سرگوں ہو کر ان میں سما جائے۔ مگر وہ روٹھی ہی رہی۔ پریما دھوبی کو کپڑے دینے چلی گئی۔ اور نریندر کا دورہ قائم تھا، وہ منہ پھلائے برآمدے میں پڑھتا رہا۔ کہ رائے صاحب آئے، شمن نے بن کر منہ پھلا لیا، انہوں نے اس کے پھولے ہوئے گالوں کی نقل میں اپنے گال پھلا لئے اور شمن کے ہنسنے پر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ شمن پر تو بھتنی سوار تھی، وہ نہ جانے کس بات پر جل اٹھی، اور ان کے چھیڑنے پر بکھر کر رونے لگی۔

''ارے۔۔۔ارے میرا چمن'' رائے صاحب نے اسے چھوا تو وہ اور بھی بگڑ گئی، وہ متعجب ہو کر صورت دیکھنے لگے، انہیں سنجیدہ دیکھ کر وہ ڈر گئی اور بری طرح ان سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

رائے صاحب نے ہنستے ہوئے اسے بچوں کی طرح تھپکنا شروع کیا۔ وہ خاموش ان کے سینے سے سر لگائے لمبی لمبی سانسیں بھرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ رائے صاحب نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تو وہ ایک دم موتی بن گئی۔ رائے صاحب! اسے تھپکتے رہے، پھر آہستہ سے انہوں نے اسے سرکا پلنگ پر لٹانے کا ارادہ کیا۔۔۔تو وہ ایک دم انہیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کانپ اٹھی۔

''نہیں، نہیں رائے صاحب۔'' اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا ہے۔۔۔کچھ۔۔۔ارے'' وہ اس کی آنکھوں کی وحشت سے ڈر گئے۔

''نہیں رائے صاحب مجھے گرائیے مت، رائے صاحب۔۔۔رائے صاحب۔۔۔رائے صاحب میں۔۔۔میں آپ سے پریم کرتی ہوں۔۔۔میں آپ سے۔۔۔پریم۔۔۔رائے صاحب میں اس کی آواز اور گھٹ کر سہم گئی۔

''ایں، چمن۔۔۔اچھا سو جاؤ۔'' وہ جلدی سے اس کی لپٹتی ہوئی انگلیاں الگ کرنے لگے۔

''نہیں۔۔۔نہیں رائے صاحب، میں مر جاؤں گی۔ رائے صاحب مجھے، رائے صاحب، مجھے دور نہ کیجئے۔'' رائے صاحب ایسے جھجکے جیسے کسی نے ان کے ماتھے پر پتھر مار دیا۔

''رائے صاحب۔۔۔میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی۔'' اس نے قریب ہو کر کہا، رائے صاحب چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''ارے پریما۔۔۔'' انہوں نے آواز دی۔

''مت بلائیے کسی کو، رائے صاحب میں مر جاؤں گی، میں پریم کرتی ہوں رائے صاحب۔''

سامنے دروازے میں نریندر کتاب لئے حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ جونہی اس نے شمن کو یہ کہتے سنا، اس کا چہرہ کانوں تک لال ہو گیا۔ جیسے کسی نے اسے ماں کی گالی دے دی ہو۔ شمن کی زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ ڈھیلی ہو کر پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑی۔

رائے صاحب چلے گئے، بغیر دوسرا لفظ زبان سے نکالے۔ اور شمن کا جی چاہا کاش پلنگ سمیت وہ زمین میں سماتی چلی جائے۔ نیچے، نیچے اتنے نیچے کہ بالکل زمین کے کلیجے میں جا چھپے، مارے ہیبت اور شرم کے وہ آنکھیں بند کئے اسی طرح شام تک پڑی رہی، کوئی ایسی ترکیب ہوتی جو وہ بنا کچھ کہے سنے اپنا منہ ڈھانکے وہاں سے بھاگ نکلتی۔ اس کے کمرے میں کوئی نہ آیا۔ مگر اسے صاف معلوم ہو گیا کہ نریندر اور پریما دوسرے کمرے میں ڈرے ڈرے کیا باتیں کرتے رہے۔ یہ اس نے کیا کر دیا؟ اب کیا ہو گا؟

کانپتی لرزتی، آنکھیں جھکائے جب وہ باہر نکلی تو نریندر جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا، وہ بھی اسے منہ دکھاتے ڈر رہا تھا۔ پریما نے عورت کی پوری بہادری سے اس کا پورا مقابلہ کیا، گویا وہ آج پہلی مرتبہ اس کا بہ حیثیت ایک اجنبی ہستی کے استقبال کر رہی ہے۔ وہ بڑے اخلاق سے بولی اور دونوں نے جا کر مہذب لوگوں کی طرح چائے پینا شروع کی۔ آج نہ کچالوؤں پر جھگڑا ہوا، نہ بسکٹوں پر چھینا جھپٹی ہوئی۔ اسکی ہمت نہ پڑی جو رائے صاحب کا نام بھی لیتی۔ پریما نہایت تپاک سے اسے پھل وغیرہ دیتی رہی۔ شمن بھی تکلف سے کھاتی رہی۔ کبھی کبھی اسے پریما آنکھ بچا کر دیکھ بھی لیتی۔ مگر ایسے گھبرا جاتی گویا اسے نہیں پہچان پائی، دونوں بے طرح سہمی ہوئی تھیں۔ وہ بے تکلف سہیلیاں ایک دوسرے سے بہت دور غیریت کی خشکی میں جا پڑی تھیں۔

ان کے حواس بے طرح بھٹک گئے تھے، جیسے دو دوستوں کے بیچ میں ریگستان در آیا ہو اور ایک دوسرے کو پکار بھی نہ سکیں۔ شام تک خاموش رہنے کے بعد شمن نے بڑی مشکل سے اس سے بورڈنگ جانے کی اجازت دبے الفاظ میں طلب کی جو ایسی تیزی سے ملی کہ اس کا منہ اتر گیا، ڈرائیور تو جیسے تلا ہی بیٹھا تھا۔

آن واحد میں وہ خالی ڈھنڈھار بورڈنگ کی چہار دیواری میں تھکے ہوئے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس نے بجلی نہیں جلائی اور جوتوں سمیت لحاف میں سکڑ کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن لوگوں سے آنکھ ملاتے وحشت معلوم ہونے لگی، گو وہ کچھ نہ جانتے تھے پھر بھی جیسے اس

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کے منہ پر لمبی لمبی سطریں کھنچی اس کے گناہ کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں۔ وہ کچھ چھپانا چاہتی ان متجسس نظروں سے جو اس پر اچانک جا پڑتیں۔ اور وہ جھجک کر دور ہو جاتی۔

وہ تو بدمعاش تھی، پرلے درجے کی آوارہ، اس نے ایک مقدس انسان کی پاک دامنی پر سیاہ دھبے ڈالنے چاہے۔ مگر خدا نے اسے بچا لیا، یہ اسے کیا ہو گیا تھا۔۔۔۔ یہ ٹوٹے ہوئے ذرے اب کیسے جڑیں گے؟ اب کیا ہو گا؟

چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی لڑکیاں لوٹنا شروع ہو گئیں۔ اب پریما بھی ایک دن بعد آ جائے گی! پھر کیا ہو گا؟ وہ اس آئینے میں اپنی صورت کیسے دیکھ سکے گی۔ اس کی وحشت بڑھتی گئی۔

دوسرے دن صبح لائبریری میں لڑکیاں سر جوڑے اخبار پر مکھیوں کی طرح جٹی ہوئی تھیں۔ بلند آواز سے پڑھ رہی تھیں جیسے کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو تماش بین لاش کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اسی طرح ایک کے بعد دوسرا گروہ اخبار پر جمع ہو رہا تھا۔ ''چ۔۔۔ہا۔۔۔۔ بے چاری پریما۔۔۔۔'' اس نے کسی کو کہتے سنا، اور اس کے ہاتھ سے لرز کر کتابیں چھوٹ پڑیں۔ مجرم کی طرح نیچی کئے وہ منتظر رہی، مگر پریما نے شاید اسے دیکھا نہیں، اس کی نظریں اخبار کی طرف اٹھیں۔ لڑکیاں اسے چھوڑ کر چلی جا چکی تھیں، آہستہ سے وہ بڑھی، احتیاطاً کرسی پر بیٹھ گئی۔ رات کو رائے صاحب ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ یہ ان کی پرانی بیماری تھی جس کا ایکا یک حملہ ہو گیا۔ وہ خاموش میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھی رہی کسی نے کلاس چلنے کے لئے شانہ ہلایا اور وہ چلنے لگی۔ لڑکیوں کی رو کے ساتھ۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' ایک کلاس فیلو نے اسے اپنی جماعت چھوڑ کر آگے بڑھتے دیکھ کر روکا۔

''ہیں؟'' وہ ٹھٹک گئی۔

''تمہاری کلاس تو پیچھے رہ گئی، یہ اب کہاں جا رہی ہو۔''

''اوہ، میں نقشہ لینے جا رہی ہوں، کل سٹنگ روم میں بھول آئی تھی۔'' اسے عین موقع پر بات سوجھ گئی ورنہ غضب ہو گیا تھا، وہ یقیناً پکڑی جاتی۔ تیز قدم وہ سٹنگ روم کی طرف چلی مگر وہ کافی دور تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، اور وہ جلدی سے پلٹ پڑی، اپنی کلاس میں گھس گئی۔

نہ جانے اس نے اس دن کیا پڑھا اور کیا سنا، آنسو تو اس کی آنکھوں سے جب ہی خشک ہو گئے تھے جب وہ رات متواتر اپنی بدمعاش انا کی یاد میں روئی تھی۔ چہرے پر کوئی آثار لانا کمزوری کی نشانی تھی، مگر پریما کی خالی کرسی دیکھ دیکھ کر اسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ رائے صاحب نہیں پریما مر گئی۔

رائے صاحب مر گئے! اس خیال سے ہی اس پر ایک نامعلوم سی دہشت طاری ہو جاتی۔ ان کو جلا دیا گیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کے وہ بال، وہ سورج سے زیادہ روشن تاج جلایا نہیں جا سکتا۔ وہ پکے سونے جیسی رنگت، اور سچے موتیوں جیسے مصنوعی دانت، ناممکن۔۔۔۔ وہ خود ہی فیصلہ کرتی۔

راتیں بڑی بھیانک ہو گئیں۔ رائے صاحب اس کے دماغ سے کسی طرح نہ نکلتے تھے اور پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ وہ باقاعدہ ان سے ڈرنے لگی۔ رائے صاحب سے جن کے قرب کے خیال سے ہی وہ لرز اٹھتی تھی۔ ایک دن

س نے ایک مہارشی کی ارتھی بڑی دھوم دھام سے نکلتے ہوئے دیکھی۔ مہارشی کو پالکی میں باندھ کر بٹھا دیا گیا تھا۔ دانت کھلے ہوئے اور منہ پر سیندور، ہلدی اور چندن کے داغ۔ جلد باسی بینگن کی طرح جھریوں دار اور سیاہ۔ اس پر ہلکی ہلکی سڑے گوشت کی سی بساند!۔۔۔۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ مارے ڈر کے دن کو اکیلے کمرے میں جاتے دم نکلتا۔ رات کو معلوم ہوتا وہی پالکی والا مردہ اس کے سرہانے بیٹھا ہے۔ وہ ہمت کر کے آنکھیں ٹیڑھی کر کے دیکھتی اور وہ جھپ سے پلنگ کے نیچے چھپ جاتا۔ کبھی پٹی کے نیچے سے ہاتھ پھیلا کر اس کا گلا ٹٹول رہا ہے، کبھی غسل خانے میں اس کے پیچھے پکڑنے لپکتا۔ جاتے جاتے وہ دلیری سے مڑ کر دیکھتی اور ایسا معلوم ہوتا کوئی تیزی سے کھمبے کی آڑ میں ہو گیا، جھاڑیوں میں دبک گیا، گیلری میں سرک گیا۔ پسینے چھوٹ جاتے اور گھٹنے لرز کرتے۔

بعض اوقات رات کو کھانا کھاتے میں ایسا معلوم ہوتا کہ مردہ انگلیاں اس کے ٹخنے میز کے نیچے ٹٹول رہی ہیں۔ وہ ڈر کر پیر کھینچتی تو وہ ہاتھ بھی ساتھ لٹکا چلا آتا۔۔۔۔ چیخ مار کر الگ کرتی تو معلوم ہوتا کہ وہ خود اس کی شلوار کا پائنچہ ہے۔

ایک دن وہ پڑھتے پڑھتے میز پر سر ڈال کر سو گئی۔۔۔۔ دیکھا رائے صاحب کے ساتھ بیٹھی تاش کھیل رہی ہے کہ ایک دم وہ اٹھ کر ناچنے لگے، ان کے بازوؤں کے پٹھے پھول پھول کر اچھلنے لگے اور بال گز گز بھر کے سانپوں کی طرح کھڑے ہو کر جھومنے لگے۔ مصنوعی دانت سر تال میں بجنے لگے۔۔۔ تاشوں کے پتے مشعل کی طرح جل اٹھے اور وہ دشمن کی طرف بڑھے۔۔۔۔ اس نے ایک دل دوز چیخ ماری لیکن انہوں نے اس کی آنکھوں میں آگ ٹھونس دی۔ دشمن متواتر چیخیں مارتی رہی اور دونوں ہاتھوں سے مشعل کے شعلوں کو آنکھوں سے دور ہٹاتی رہی۔

''خن خن'' کچھ کہا اور وہ اٹھ کر بے تحاشہ بھاگی۔ وہ بھاگتی چلی گئی اور شاید ساری رات اسی طرح بھاگتی رہتی اگر ایک دم چوکھٹ اس کے ماتھے پر اچھل کر نہ لگتی، وہ گر پڑی۔ جب آنکھ کھولی تو رائے صاحب اس پر جھکے ہوئے کچھ ناک میں ٹھونس رہے تھے جو دوزخ کی آنچ کی طرح دماغ کو جلائے ڈالتی تھی......اس نے پھر چیخ ماری اور اٹھنا چاہا مگر دو تین سفید سفید لمبوتری شکلوں نے اسے دبوچ لیا۔

''چپ چاپ لیٹی رہو!'' یہ پرنسپل کی آواز تھی۔

''میں نے جیسی ہی ٹارچ ڈالی یہ پاگلوں کی طرح نوچنے لگی، اور پھر بھاگی۔'' میٹرن خود نہایت خوفزدہ ہو رہی تھیں۔

تو یہ میٹرن تھیں جنہیں وہ رائے صاحب کا بھوت سمجھ رہی تھی۔ ان کے بال کاغذ کی بتیوں میں لپٹے ہوئے روپہلی تاج کی طرح چمک رہے تھے۔۔۔ ٹارچ ہاتھ میں تھی اور وہ خود ہسپتال کے کمرے میں پڑی تھی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اسے بجلی بجھ جانے کے بعد بھی میز پر اوندھا پڑا دیکھ کر انہوں نے ٹارچ ڈالی بس وہ پاگلوں کی طرح بھاگی۔۔۔ حسن اتفاق سے اس کا خواب اور میٹرن کا ہیولا ایک ہی کڑی میں الجھ کر دماغی ہلچل کا باعث ہو گئے۔ صبح تک اسے زور کا بخار چڑھ آیا اور اسی حالت میں اسے گھر پہنچا دیا گیا، جہاں تین مہینے اسے ٹائیفائیڈ نے جی بھر کے جھنجھوڑیاں دیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(25)

بیماری طویل تھی اور ساتھ ساتھ غیر دلچسپ! حال ہی میں اس نے ایک کتاب پڑھی تھی، جس کی ہیروئن شروع سے آخر تک بیمار رہتی ہے اور اس بیماری کے وسیلے سے ان کے عاشق صاحب کو اس قدر بہترین موقعے حاصل ہوتے ہیں کہ حد نہیں۔ جب دیکھو جناب مریضہ کو سہارا دیئے دوا پلا رہے ہیں، اس کے نازک ہاتھوں کی نازک ترین نبضیں ٹٹول رہے ہیں، اس کے پیاسے لبوں میں انگور کو رس نچوڑ رہے ہیں۔ اس ناول کو پڑھ کر بے اختیار اس کا دل بیمار پڑنے کو چاہا کرتا۔ وہ ان رنگین لمحوں کا حسین تصور، جس کے خیال ہی سے اس کی نبضیں اچھلنے لگتیں اور حرارت تیز ہو جاتی تھی۔

مگر اب جو وہ بیمار پڑی تو یہ حال کہ تیماردار تو درکنار مزے سے لوگ اس کے سامنے چیخ چیخ کر بولتے، بچے لڑتے اور پٹتے۔ سامنے برآمدے میں اناج پھٹکے جاتے، ہاون دستے میں ہلدی دھنیہ کوٹا جاتا، بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ اس کی آواز نہ نکلتی، سامنے لوگ لڑ لڑ کر تاش پچیسی کھیل رہے ہیں، پانی مانگا تو کون کھیل چھوڑ کر اٹھے۔ نوکر کو آواز دی جا رہی ہے اور وہ بھی ایسے چنگھاڑ کر کہ مردے جی اٹھیں۔۔۔۔ ذرا غنودگی طاری ہو جاتی تو پھر کسی کے ''وہ مارا'' کے نعرے سے آنکھ کھل جاتی۔

سامنے روز لمبا چوڑا دسترخوان بچھتا، ترمال اڑائے جاتے۔ ثمن کی روح بلبلا بلبلا کر کھانوں پر منڈلاتی، آنکھیں خوان کو دیکھ دیکھ رک پتھرا جاتیں، قوت شامہ کھانے کی مہک کے حملے سہتے سہتے سن پڑ جاتی۔ بھائی بہن مزے دار کھانے دکھا دکھا کر کھاتے اور اوپر سے چڑا دیتے۔ سب اسکے ندیدے پن کو اس کی کمزوری اور فطری پستی پر محمول کرتے۔ اس کی بیماری کی وجہ سے گھر والے پریشان نہیں عاجز ضرور تھے۔ جی تو اس کا ایک دن جلا جب خاندان کے دو بڈھوں کو جنازے کی نماز پر بحث کرتے سنا۔ وہ دونوں اس کی طرف منہ کئے ریہرسل سی کر رہے تھے اور اسے یہی معلوم ہوا کہ کنایتاً اسی کی نماز جنازہ پڑھنے کی تاک میں تیاریاں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہر وقت وضو کرتے تھے مگر اس قدر بدبو جسم سے پھوٹتی تھی کہ دم لوٹ جاتا تھا۔ دوسرے

قطعی خبطی تھے۔ ثمن ان دونوں میں سے کسی کی پڑھائی ہوئی نماز سے جنت میں جانے کی متوقع نہ تھی۔ پھر چند لوگ بیٹھ کر کفن کی لمبائی چوڑائی پر بحث کرنے لگے۔ دوران گفتگو میں وہ کاغذ کے نمونے موڑ موڑ کر تشریح کرتے جاتے، پیچھے مڑ کر اس نے سسک سسک کر رونا شروع کیا اور جب وہ سب چلے گئے تو اس نے ڈرتے ڈرتے اس کاغذی کفن کے نمونے کو دیکھا کس قدر نا کافی تھا یہ لباس، خدائے ذوالجلال کے حضور میں جانے کے لئے بھلا اگر ایک سلا ہوا جوڑا خراب ہو جائے گا تو کون سا ایسا ٹوٹا آ جائے گا۔ موت سے اسے اور بھی ہول نظر آنے لگا۔

مگر موت اتنی بھیانک نہ تھی جتنی موت کی آؤ بھگت، معلوم ہوتا سب کو اس کے مرنے کا پُر اشتیاق انتظار ہو رہا ہے۔ اسے نفرت ہو گئی سب سے نفرت ہو گئی۔ زندہ یا مردہ وہ ان کے لئے مر چکی تھی، یا شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کون تھے سب کون تھے سب اس کے؟ مانا کہ سب بھائی بہنوں نے ایک ہی ماں کے شکم میں تکمیل پائی تھی، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ ایک مکان میں ہزاروں کرائے دار آتے ہیں، رہتے ہیں چلے جاتے ہیں۔۔۔۔ سڑک پر کتنے انسان چلتے ہیں، چھکڑے گھسٹتے ہیں، لاریاں دوڑتی ہیں، وہ کون ہیں ایک دوسرے کی؟۔۔۔۔ کوئی نہیں! اس نے جواب دیا اور وہ اسے مل گیا۔

تین مہینے کے بعد بخار تھک گیا، لیکن اسے بھی بری طرح تھکا گیا۔ ایک تو بیماری دوسرے اس قدر غیر دلچسپ، جب وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے چل کر پلنگ سے کرسی تک جانے کے قابل ہوئی تو بجائے خوشی کے اسے رونا آ گیا۔ بال سب جھڑ گئے تھے، ہاتھ پیر جلی لکڑی کی طرح خشک اور صورت ایسی جیسے مردہ کفن پھاڑ کر نکل آیا ہو۔

اسی زمانے میں نوری بھی ایک ہفتے کے لئے آئی۔ وہ سال بھر سے اپنی دھیال رہنے چلی گئی تھی۔ بڑی آپا بھی میکے کی روٹیوں سے تنگ آ کر وہیں ایک اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانے لگی تھی۔ جوانی لہراتے پھنکارتے سانپ کی طرح پلک جھپکتے میں دوڑ گئی، کچھ یونہی سی دھندلی لکیر باقی تھی۔ بوڑھی خرانٹ ساس اس کے منہ پر بار بار حقارت سے اس گزرے ہوئے سانپ کا تسخر اڑاتی۔ وہ خوش تھی کہ بہو جلد از جلد بوڑھی ہو کر خطرے کی حدود سے نکل رہی تھی۔ اسی لئے تو اس نے کٹھن زمانہ گزارنے کے لئے میکے بھیج دیا تھا کہ کچھ تو باپ بھیوں کی لاج پیروں میں بیڑیاں ڈالے رہے گی۔ وہ اب اسے اپنا ہم عمر سمجھنے لگی تھی، بات بات پر اسے گردن توڑ بخار کی طرح چڑھتے ہوئے بڑھاپے کی طرف متوجہ کر کے رہی سہی زندگی بھی نچوڑ لینے کی کوشش کرتی۔ بڑی آپا ایک زندہ شہید کی طرح سر اونچا کئے خاموش رہ جاتی۔ اسے اس ساس سے کافی نفرت تھی، یہی تو وہ ڈائن تھی جس نے شادی شدہ زندگی کے تین مختصر سال طعنوں اور اعتراضات سے حد درجہ مکدر بنا دیئے تھے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ دنیا اتنی مختصر زندگی لے کر آئے گی۔ وہ تو سوچتی تھی کہ آخر ایک دن وہ ہو گی اور اس کا میاں۔ اگر اسے اس دن کی خبر ہوتی تو بڑھیا کے منہ پر خاک ڈال ان تین سالوں کو کلیجے سے لگا رکھتی۔ بڑھیا اکلوتے بیٹے پر دیوانی تھی مگر جب کبھی وہ بیوی کی طرف زیادہ راغب نظر آتا تو جل کر خاک ہو جاتی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''اے بھئی یہ ہر وقت کے چونچلے۔۔۔۔۔'' وہ ناک سکوڑ کر طعنہ دیتی اور بڑی آپا شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ وہ جلدی سے اپنے آپ کو اس کے ترستے ہوئے ہاتھوں سے چھڑا کر بھاگ آتی اور ساگ بینے لگتی۔ دور بیٹھا وہ حسرت سے تکا کرتا، ارمان بھرے اشارے کرتا، ترسی ہوئی نظروں سے گھورتا، جیسے وہ اس کی جائز بیوی نہیں پرائی عورت ہو۔ مگر وہ نہ جاتی۔

جونہی وہ کالج سے آتا بڑھیا اپنے امراض کا پوٹلا بکھیر کر بیٹھ جاتی اور اسے گھیرے رہتی، جونہی وہ اپنی جان چھڑا کر بیوی کے پاس آتا، وہ بہو کو فوراً کسی ضروری کام کے بہانے بلا لیتی۔ بہو صبر کی سل کلیجے پر دھرے بیٹھی رہتی۔ ہاتھ کام میں لگے رہتے مگر دل میاں کی ادھ کہی بات میں۔ ''اے دلہن کام میں جی نہیں لگتا تو جاؤ، اے ہاں نہیں تو۔'' وہ اس کے دل کا حال معلوم کر کے نئے طعنے سے اس کے قدم جکڑ دیتی۔ جب اسے پکا یقین ہو جاتا کہ بہو واقعی ناامید ہو چکی ہے اور بیٹے کا مزاج کافی گرم ہو گیا، چاؤ چونچلے کا خطرہ ختم ہو گیا، تب وہ اسے چھوڑ دیتی۔

میاں کا پارہ اتارنے میں ساری خوشامدیں، سارے لاڈ، جن کے آسرے میں وہ پہاڑ سے دن کاٹتی، مٹی میں مل جاتے۔ دبے چھپے لفظوں میں شکایت بھی کرتی، معافی مانگتی، مگر چڑھا ہوا بھوت یوں آسانی سے تھوڑی اتر جاتا۔ پھر ساس کو خبر ہو جاتی تو وہ اور جلے پر بھوبل جھونکتی۔

''اے ہم نے تو کبھی میاں کی جوتی پر ناک نہیں رگڑی، وہی بے چارے اللہ بخشے ہماری تین سو ساٹھ سنا کرتے تھے۔ پر آج کل لڑکیوں کو تو بس۔۔۔۔ توبہ ہے، مٹی جاتی ہیں خصم پر۔''

وہ خاموشی سے یہ سب کچھ سن لیتی اور یہ سوچ کر صبر کر لیتی کہ کبھی تو یہ طعنے قبر کے کونے میں دفن ہو ہی جائیں گے۔ اسے الٹا بڑھیا پر رحم آنے لگتا، وہ اسے تختہ غسل پر لاچار و بے بس آخری سفر کے لئے تیار دیکھتی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اس کا تیجہ وغیرہ دھوم دھام سے کرے گی تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ تعلیم یافتہ بہو کے ہاتھوں بڑھیا کی عاقبت بھی مٹی میں مل گئی۔ حالانکہ اسے پختہ یقین تھا کہ خواہ کتنے ہی تیجے، چالیسویں کئے جائیں بڑھیا بغیر تاوان دیئے اپنی زیادتیوں کے عذاب سے نہ بچ سکے گی۔ تھوڑا بہت تو عذاب بھگتنا ہی پڑے گا۔ اگر یوں ہی نیاز نذر سے کام چل جاتا تو پھر کیا کہنے تھے، اور پھر تو وہ فراخدلی سے تیجہ کرتے بھی گھبراتی۔

مگر بڑھیا اس کے گلے میں چکی کے پاٹ کی طرح لٹکی رہ گئی۔ اور خود اس کی راتیں سونی ہو گئیں اور دن بھیانک کانٹوں سے بھر گئے۔

نوری اب جوان ہو رہی تھی لہٰذا ساس ہر وقت بہو کو چال چلن سے رہنے کی تلقین کرتی، یا تو وہ خرچے کے ڈر کے مارے کسی سے ملتی جلتی نہ تھی یا اب سارے کنبے کے لڑکوں کی بلائیں لینے پر تل گئی۔ ساس بہو نے مل کر لڑکا گھیرنے پر کمر باندھ لی۔ علاوہ نوری کی ذاتی صفات کے اس کی یتیمی کا سرٹیفکیٹ ہر جگہ کارآمد ثابت ہوا۔ اور جلد ہی ایک نہایت مالدار اور اکلوتے لڑکے کو اس پر عاشق کرا لیا گیا۔ اس کے کنبے والوں نے لاکھ ادھم مچائی مگر ایک نہ چلی۔

نوری جب آئی تو نہایت شرمیلی اور فرمانبردار بن کر آئی۔ بڑی آپا بڑی جانفشانی سے جہیز جمع کرنے لگی۔ اس نے ایک دم سارے خرچے بند کر کے تنگی میں گزر کرنی شروع کر دی۔ نوری بھی پھٹے پرانے کپڑے بڑے شرمیلے فخر کے ساتھ پہن لیتی۔ ہر چیز جہیز کے لئے رکھ دی گئی۔ گولڑکا ابھی میٹرک میں پڑھتا تھا اور انگلینڈ جانے والا تھا، اور اس طرح نوری کو کم از کم سات سال امیدواری میں گزارنے تھے، مگر وہ آنے والی خوشگوار زندگی کے حسیں خوابوں کے نشے میں کچھ بھی تو نہ محسوس کرتی۔ وہ ان چیتھڑوں کو چوتھی کے جوڑے کی امید میں کلیجے سے لگا کر پہنتی۔

اسے اب احساس بزرگی بھی ہو چلا تھا۔ اس نے سارا چلبلا پن چھوڑ دیا تھا اور ایک دم گھر والیوں کی طرح سنجیدگی اختیار کر لی۔ وہ ثمن سے اپنے آپ کو کچھ برتر خیال کرنے لگی تھی۔ اس کا مول اتنی جلدی ہو گیا، اور جس طرح دکان میں رکھی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا مول تول غیر متوقع قیمت پر ہو جائے، کوئی گاہک کا پورا آن پہنچے تو باقی کا مال حقیر پڑا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ثمن بھی کچھ متحیر اور حقیری رہ گئی۔ اسے ایک ہلکا سا احساس کمتری بھی ہونے لگا۔ آخر وہ کیوں زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ جاتی ہے؟ بیماری سے اٹھی ہوئی دم نچی مرغی کی طرح وہ بدہیئت اور حقیر نوری کی رومانی کمسنی کے آگے ایک متعفن پھوڑا معلوم ہوئی۔

اسی عرصے میں کالج سے لوٹتے میں اعجاز دو چار روز کے لئے آیا۔ جب اس کا خط آیا تو کسی کو پڑھ کر سنانے کی مہلت بھی نہ ملی، وہ خود ہی تانگے میں بیٹھ، گھر تلاش کرتا آن پہنچا۔ لیکن جب لوگوں نے اسے دیکھا تو اللہ کی شان یاد آنے لگی۔ وہی سوکھا مارا بدوضع جانور ایک وجیہہ نوجوان بن چکا تھا۔ اس کا گھٹا ہوا سر چمکیلے بالوں سے آراستہ تھا۔ قیمتی سوٹ کیس میں رکھے ہوئے کپڑوں کی تہیں بھی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

اسے دیکھ کر ثمن کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ معلوم ہوا وہ برسوں کی کھوئی ہوئی چپل نہ جانے کس گمنام کونے سے اچھل کر اس کے منہ پر لگی، وہ خود بخود پیچھے سمٹ گئی۔ موتی جھرہ کے مارے ہوئے بال اور بھی بے رونق اور سوکھے ہاتھ زیادہ ڈراؤنے نظر آنے لگے۔ اس نے اسے دیکھتے ہی ایک دم اس کے خلاف ایک مورچہ قائم کر لیا۔ وہ اپنی پرانی نفرت کو اعجاز کے سامنے جھجکتا دیکھ کر اور بھی چڑ گئی۔

اعجاز بالکل نیا چولا بدل کر آیا تھا۔ وہ جھینپ اور چھچھورا پن تو کوئی اس کی موجودہ ذات سے کسی طرح وابستہ نہ کر سکتا تھا۔ نہایت چرب زبان، ہنس مکھ اور دلیر۔ آتے ہی اس نے حیرت سے ثمن کو گھورا، وہی بھوکی آنکھیں کس گستاخی سے اس کے آر پار تیرتی چلی گئیں۔

''ارے یہ شمشاد اتنی دبلی، اور تمہاری چوٹی کیا چوہے کتر گئے، بھئی واہ'' اس نے قہقہے لگانا شروع کئے اور ثمن جھلا کر رہ گئی۔ لوگوں نے اسے باتوں میں لگا لیا۔ کسی نے بھی تو یہ نہ بتایا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہے، یہ نہیں کہ وہ اعجاز کے سامنے اپنی بدصورتی کا کوئی عذر پیش کرنا چاہتی تھی بلکہ یونہی، کیوں وہ غلط فہمی میں مبتلا رہے۔

وہ اس کی جان کو ایک بلا بن کر آیا، دن بھر قہقہے لگاتا، آیا تو دو دن کے لئے تھا، مگر دو ہفتے بعد بھی بہانے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

بنا کر رہے چلا جا رہا تھا۔ لوگ اس میں اس قدر دلچسپی لینے لگے تھے کہ روز وہ کسی نہ کسی بہانے سے روک لیا جاتا۔ نوری تو اس سے خوب گھل مل کر باتیں کرتی۔ وہ بھی اس کے ہونے والے میاں کی باتیں کر کے چھیڑا کرتا۔ وہ سارے کام چھوڑ کر بس اعجاز سے الجھا کرتی۔

شمن کا جی چاہتا کوئی اعجاز کو اس کی پرانی تصویر دکھا کر اسے وہ غلاظتیں بھی تو یاد دلائے جو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ نہ جانے لوگ اپنے ماضی کو کس طرح اس قدر آسانی سے بھول کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اسے ان لوگوں سے نفرت تھی جو پہلے والے غریب، بدوضع اور کم عقل اجو کو بھول کر اس نئے انسان کی آؤ بھگت کرنے لگے تھے۔ وہ اسے کس قدر حقارت بھری ٹھوکریں مار چکے تھے مگر آج اس پر فدا تھے۔ وہی منجھلے بھائی جن کے سامنے وہ ناک پکڑ کر اٹھک بیٹھک کر چکا تھا اسے موٹر میں لئے لئے گھومتے۔ وہی اماں، جو اگر وہ کتوں کا کھانا چرا لیا کرتا تھا تو صبح کا ناشتہ بند کر دیتی تھیں، اب مرغن کھانے اس کے منہ میں ٹھونسے دیتی تھیں۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ ذرا دیر تک سوتا رہتا تو اجو پر پانی کا لوٹا اوندھا کر اس کی چار پائی الٹ دی جاتی تھی۔ آج دن چڑھے تک سوتا رہتا پھر بھی لوگ کہتے۔ ''اللہ رکھے جوانی کی نیند ہے سونے دو۔'' شمن سلگ کر رہ جاتی۔ لوگ سچ بولتے کیوں ڈرتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے روپے کی نیند ہے، اس جائداد کی نیند ہے جو اس کے چچا نے اپنی زندگی ہی میں اس کے نام کر دی تھی۔ بڑا ذلیل تھا اعجاز۔ وہ ان کی ٹھوکریں کیسے بھول گیا؟ نیچ کہیں کا۔ جب لوگوں نے تھوکا جب بھی خاموش اور شاکر رہا اور جب کہ وہی لوگ اپنا تھوک چاٹ رہے تھے وہ نہایت خوش تھا۔ یہ کیوں اور کیسے؟۔۔۔۔ مگر شمن اب بھی وہی شمن تھی۔ وہ اب بھی اعجاز کے وجود پر تھوکنے کو تیار تھی۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ تاش کھیلتا، ہنسی مذاق کرتا مگر شمن ان سب سے دور کسی نہایت غیر دلچسپ کام میں ڈوبی رہتی۔ وہ اعجاز سے بالکل مخالف سمت چلتی، اگر وہ اس سے کبھی کچھ کہنا بھی چاہتا، یونہی کوئی نہایت معمولی سی بات تو وہ سنی ان سنی کر جاتی۔ جب سے وہ آیا تھا لوگ نئے نئے پینتروں سے ہر وقت اس کی شادی کا ذکر کرتے۔ بڑی آپا بے چاری کے تو ہاتھ کٹ چکے تھے۔ وہ نوری کے لئے ہاں کر چکی تھی۔ حالانکہ کئی دفعہ ان کی نیت بہک بھی گئی۔ سال دو سال میں اعجاز نوکر ہو جائے گا اور وہ ہونے والا داماد نہ جانے کب تل جوتنے کے قابل ہو؟۔۔۔۔ اسکے علاوہ اور سارے خاندان کی لڑکیاں اس کے قدموں میں ڈالی گئیں۔ مگر وہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا۔

اتفاق کہئے یا قسمت، انہی دنوں بلقیس اور جلیس اپنی خالہ کے یہاں آئیں، زنانہ کلب میں اچانک شمن سے ملاقات ہوگئی۔ بلقیس بال برابر تو نہ بدلی تھی، وہی چلبلا پن، چیخ چیخ کر بولنا اور اونچے اونچے قہقہے۔ شمن سے اس قدر بھینچ کر گلے ملی کہ شانے دکھنے لگے۔ گھل مل کر دونوں میں باتیں ہوئیں، بلقیس اپنی خالہ کے یہاں زنانے سے عشق لڑانے آئی ہوئی تھی۔ خالہ کا گھر اچھا خاصہ بھرتی کا دفتر بنا ہوا تھا۔ شہر کے تمام شادی کے قابل یا قابل ہونے والے لڑکے ان کے یہاں حاضری دیتے تھے۔ تین چار اپنی لڑکیوں کے علاوہ وہ اپنے عزیزوں کی لڑکیوں کے نصیبے کھولنے میں ملکہ رکھتی تھیں۔ انہیں اس قدر مشق ہوگئی تھی کہ جس لڑکی کا جس لڑکے سے

چاہتیں جوڑ لگا دیتیں۔ فریقین کتنا بھی چاہیں کچھ بس نہیں چلتا۔ نکھٹو اور بدقسمت لڑکے موقع دیکھتے ہی تھوہر کی جڑ کی طرح چمن زار سے نکال کر پھینک دیئے جاتے۔ ان کا آنا یکلخت قابل اعتراض ہو جاتا۔

بلقیس خالہ کی تمام سہولتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ پڑھائی چھوڑ کر اس نے کچھ دن سلیقہ اور فیشن سیکھنے کے لئے انگریزی اسکول میں نام لکھوالیا تھا اور وہاں سے ایسی دھاردار ہو کر آئی تھی کہ حد نہیں۔ عجیب بات اس لڑکی میں یہ تھی کہ وہ ہر اس نسوانی حربے کا جو مرد کو مارنے کے مصرف میں آتا ہے، فخریہ ذکر کرتی۔ چالاکیوں، خودغرضیوں اور مکاریوں کا بڑی معصومیت سے اعتراف کرتی۔

''عیسیٰ مجھے خاک پسند نہیں پر جب میں نے اسے ستار سنایا تو کم بخت مر گیا۔ جلیس نے وائلن بجایا مگر بے چاری شرما گئی۔

''منور حد الو ہے، پتہ ہے کل برنارڈ شا میرے لئے نہ جانے کہاں بے ڈھونڈ کر لایا، بڑا پڑھاکو ہے، کہتا ہے پروفیسر بنوں گا، اب بھلا شمن کتنے سال لگ جائیں گے کم از کم چار سال رکھ لو۔ بھلا کون بیٹھا رہنے دے گا مجھے؟ اختر سپرنٹنڈنٹ پولیس ہے، جان کو آ گیا ہے۔۔۔۔ مگر میں نے ابھی کسی کو جواب نہیں دیا ہے۔ خدا قسم جو اختر میرے لئے پدماجینی انگوٹھی نہ لایا تو کبھی جو کر جاؤں منگنی۔''

خالہ بی کہتی ہیں کہ ''اختر خاصہ ہے، مگر میں کہتی ہوں موئی کی جائداد حد بڑی ہے ۔۔۔۔۔ پتہ ہے تین موٹریں ہیں اور۔۔۔۔''

کلب کے بعد وہ شمن کو اپنی خالہ کے گھر لے گئی اور دوسرے دن دونوں بہنیں بغیر کہے سنے آ دھمکیں شمن کے گھر۔ یوں تو گھر اچھا خاصہ تھا مگر بے سلیقہ پن اور لاپروائی کی وجہ سے یہ حال تھا کہ دو چار ٹوٹی کرسیاں میلی دریوں کے تخت، اور بان کی کھری چار پائیوں کے سوا کچھ اٹھنے بیٹھنے کا انتظام نہ تھا۔

جھینپتی کھسیاتی شمن انہیں اپنے کمرے میں لے آئی، اس کو کمرہ کہنا بالکل بے جا تھا، اسی جگہ کچھ صندوق چینی کے برتنوں کی الماری بھی تھی، ایک طرف چھت میں جڑ لوال کا سامان جھول رہا تھا، کونے میں جالا لینے کا بانس کھڑا تھا، جسے کبھی حرکت نہ دی جاتی۔ مکڑیوں اور چھپکلیوں کا پرسکون راج قائم تھا۔

''اپنے کمرے میں چلو نا۔'' بلقیس نے چپکے سے اس کے کان میں کہا اور شرم کے مارے شمن کا جی مر جانے کو چاہا۔ روپے کی کچھ کمی نہ تھی، پنشن ہی اتنی کافی تھی کہ اگر چاہتے تو ڈھنگ سے رہنا مشکل نہ تھا۔ مگر پنشن سے پہلے کون سے ٹھاٹھ تھے۔ ویسے گھر میں پندرہ بیس نوکر اور مفت خورے موجود، باہر چار چار بھینسیں، گھوڑے، کتے اور مرغیاں وغیرہ بھری پڑی تھیں۔ باہر تو کچھ بیٹھنے کے لئے مونڈھے وغیرہ بھی تھے مگر گھر میں بڑی بڑی بیویاں بھی آتیں تو لشتم پشتم پلنگوں اور تختوں پر چادریں بچھ جاتیں۔ اس نے کبھی کسی کو اپنے گھر کی حالت نہ بتائی تھی، اور بلقیس جلیس سے دو چار دفعہ گپ بھی مار دی تھی۔ وہ تو اس گھر میں پیدا ہو کر پچھتائی تھی، کاش وہ کہیں اور جنم لیتی۔ اتنے بہن بھائیوں کے بجائے دو ایک لائق فائق بھائی اور وہ ایک اکیلی لاڈلی بیٹی ہوتی، کوٹھی بنگلہ ہوتا، صوفے اور کوچیں ہوتیں، چاہنے والے چچا اور قربان ہونے والی خالائیں ہوتیں۔۔۔۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کاش اس کے گھر میں بھی ایک باغ ہوتا اور وہاں نارنگی اور لوکاٹ کے پھول مہکا کرتے، جنہیں توڑنے کے لئے اس کی انگلیاں حسین اور نازک ہو جاتیں۔۔۔۔ یہ تو اسے خواب میں بھی میسر نہ ہوا، اس نے خواب بھی سدا بھیانک اور ڈراؤنے ہی دیکھے، بھوتوں اور چڑیلوں کی دنیا کے۔

وہ بلقیس اور جلیس کو لے کر احاطے کے ایک سنسان کونے میں چلی گئی۔ یہ کونہ بھی کوڑے کرکٹ، ٹوٹی ہوئی اینٹوں، بوسیدہ ڈلیوں اور ٹوٹی ہوئی جھلنگوں سے پٹا پڑا تھا، مگر بلقیس بڑی بے تکلفی سے دہلیز پر اخبار کا کاغذ بچھا کر بیٹھ گئی۔ جلیس نوری کے رومان سننے اور املیاں بیننے چلی گئی۔

گھنٹوں سر جوڑے وہ نہ جانے ایک دوسرے کو کیا باتیں بتاتی رہیں۔ بلقیس نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح تندہی سے شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہے۔ اور وہ تمام تیاریاں یہ تھیں کہ اتنے ڈھیر سے لڑکوں میں سے زندگی کا ایک ساتھی چننا تھا۔ اتنے جنوں میں سے ایک کو چن لینا اور باقیوں کو مونگ پھلی کے چھلکوں کی طرح جھاڑ دینا بلقیس جیسی جذباتی لڑکی کے لئے کتنا مشکل تھا۔

''آخر تمہیں محبت کس سے ہے؟''

''محبت جو سچ پوچھو تو مجھے عباس سے ہے۔ بچپن سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور پھر ہمارے خیالات بھی ایک جیسے ہیں۔''

''چہ۔۔۔۔ جھوٹی! پہلے کہتی تھی میں انصار پر مرتی ہوں، بڑا قوم پرست ہے، یہ ہے، وہ ہے۔'' ثمن نے چڑ کر کہا۔

''ہے تو وہ قوم پرست مگر بہن سچ بتاؤ گزر کیسے ہو سکتی ہے اس کی؟ بھئی بات یہ ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو مجھے سوسائٹی پسند ہے۔''

''بلقیس حد مکار ہو تم بھی، محبت میں تو انسان ان باتوں کو سوچتا بھی نہیں۔''

''مگر اصل میں تو مجھے اختر ہی سے زیادہ محبت ہے۔''

''ہنہ اختر سے یا اس کی نئی موٹر سے۔''

''چہ، بھئی تم تو ہو بے وقوف، موٹر اس کی خاک پسند نہیں، خدا قسم موسیٰ کی موٹر دیکھو تو بس مر جاؤ۔''

''تو پھر محبت؟''

''محبت تو۔۔۔ غریبوں ہی سے زیادہ ہوتی ہے مگر۔۔۔''

''مگر؟''

''مگر شادی تو امیر ہی سے کرنا پڑتی ہے۔۔۔ کیوں ہے نا بھئی؟''

''کیوں؟ یہ تو بالکل رنڈیوں جیسی بات ہوئی۔''

''ہشت، رنڈیوں جیسی کیوں ہوئی، اور اگر ہے بھی تو کیا ہوا، ثمن ایک ہی تو بات ہے۔''

''کیا؟''

ہاں بھئی دیکھو۔۔۔ آپ جیسے۔۔۔۔ انہ بھئی مجھے نہیں معلوم تم تو بحث کرتی ہو، چہ تو بہ ہم کیا باتیں کرنے لگے۔۔۔ ثمن میں نے کل نماز پڑھی تھی۔

''اچھا۔۔۔؟''

''ہاں اختر نے کہا تھا میں شلوار قمیض میں بالکل لیلیٰ معلوم ہوتی ہوں، وہ جو میرا کالا شفاں کا ستاروں والا دوپٹہ ہے میں نے ایرانیوں کی طرح پلیٹ کر اوڑھا تو کہنے لگا۔۔۔'' وہ کچھ رکی۔

''کیا کہنے لگا؟''

''کہنے لگا لاؤ تمہاری تصویر کھینچ کر ویکلی میں بھیجوں گا۔۔۔ میں نے کہا جائے نماز پر کھڑی ہو جاؤں تو زیادہ اچھی رہے گی۔۔۔ مگر ثمن، کھڑے ہو کر تو حد بری لگی تو میں بیٹھ کر دعا مانگنے لگی۔۔۔ تصویر کھینچ کر۔۔۔۔ ہی۔۔۔ ہی'' وہ ہنسی۔

''کیا؟ کیا؟''

''وہی کم بخت پیار کر لیا، بدتمیز کہیں کا۔'' بلقیس بن کر شرمانے لگی۔ دونوں ہنس رہی تھیں کہ اعجاز خاص معشوقانہ انداز سے ریکٹ گھماتا ہوا برآمدے میں آ نکلا۔

''اوہ؟ معاف کیجئے گا'' وہ جلدی سے مڑ کر جانے لگا۔

''حد!!!''

''کیوں تھا یہ؟ ہائے بالکل فریڈرک مارچ کی سی شکل ہے۔'' بلقیس نے زور سے ثمن کا بازو مسل کر پوچھا۔

''ہے ایک، ہمارا رشتے کا بھائی۔''

''اچھا؟ بے ایمان کہیں کی۔''

''واہ!'' ثمن مسکرائی۔

''جان ہے خدا قسم، شرطیہ تم مرتی ہو اس پر۔''

''ہنہ، کبھی بھی نہیں۔''

''ہائے بڑی بد مذاق ہو، خدا قسم وہ۔۔۔ وہ دیکھو ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔ تمہیں گھور رہا ہوگا۔'' وہ پھر اترائی

''چپ گدھی کہیں کی۔'' ثمن نے اس کی خوب چٹکیاں لیں، کوئی غیر مانوس سی چیز دل میں کلبلائی مگر وہ جھلاتی ہی رہی۔

جب بلقیس اور جلیس جانے لگیں تو اعجاز پھر باہر نکل کر کسی نوکر سے فضول باتیں کرنے لگا۔ جب ان کی موٹر چلی گئی تو وہ ثمن کی طرف مڑا، وہ جلدی سے اندر چلی آئی۔

شام کو کھانے کے وقت اعجاز جان بوجھ کر اس کے پاس گھس کر بیٹھا، کہیں بلقیس کی باتیں سن تو نہیں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لیں بدذات نے؟ دو چار میٹھی باتیں بھی کرنے کی کوشش کی مگر شمن نے کسی بہانے سے اٹھ کر جگہ بدل لی۔ وہ پان لگا رہی تھی کہ پاس آ بیٹھا۔

''ایک ہمیں بھی، پر بھئی منہ نہ کاٹ دینا۔'' وہ اترا کر بولا۔ شمن نے جب پان دیا تو اس نے اس کی انگلی پکڑنے کی کوشش کی، شمن نے جل کر پان چھوڑ دیا۔ یہ فرسودہ رومان اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اسے ان گونگے عاشقوں سے سخت نفرت تھی جن کا رواں بولتا ہے پر منہ سے نہیں پھوٹتے۔

''لاؤ میں پڑھا دوں۔'' اسے پڑھتا دیکھ کر وہ پاس آ بیٹھا۔

''پڑھ چکی۔'' شمن نے شرارت سے کتاب بند کر دی اور جوتا پہنتی ہوئی چل دی۔ وہ خوب اس کی چالوں کو پہچان رہی تھی، وہ آج پھر وہی پرانا بھوکا اجو معلوم ہو رہا تھا اور ارد گرد ایسا منڈلا رہا تھا جیسے گوشت پر چیل۔ شمن جان جان کر اسے دھتکار رہی تھی۔ اعجاز کو پیاسا، ہانپتا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں تری محسوس کر رہی تھی۔

دو دن تک وہ ترستا رہا مگر شمن نے اسے بولنے کی مہلت نہ دی۔ مگر رات کو جب سب کچھ کچھ سو چلے تھے وہ باہر سے کسی بہانے سے آیا۔ پہلے تو وہ حسب عادت دکھانے کے لئے کچھ ڈھونڈتا رہا، پھر پانی پینے لگا۔ رک رک کر اس نے پورا گلاس چڑھا لیا۔ شمن ہنسی دبائے خاموش پڑی رہی۔ وہ مڑا تو شمن نے آنکھ کے گوشے سے دیکھا کہ وہ واپس لوٹا۔

''شمن'' اس نے آہستہ سے پکارا۔

''کیا ہے؟''

''یہاں بیٹھ جاؤں۔'' مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دے اعجاز پلنگ کے کونے پر بیٹھ گیا۔

''شمن ایک بات کہوں؟ ۔۔۔کئی دن سے ۔۔۔'' اس کی آواز نک گئی، شمن کے ہاتھ پیر سن ہونے لگے جملہ حواس ایک نقطہ پر جمع ہو کر بھینچنے لگے، اس نے سانس روک لی۔

''تم جانتی ہو، دو سال ٹریننگ اور ہے اور پھر کسی اچھی جگہ پوسٹ ہو جاؤں گا۔ چچا میاں کی جائداد بھی کافی ہے، مگر میں سوچتا ہوں شملہ پر ایک کوٹھی خرید لی جائے تو ۔۔۔''

''کوٹھی اور باغ ۔۔۔ نارنگی کی کلیاں ۔۔۔'' شمن کی انگلیاں اینٹھنے لگیں۔

''میرے خیال میں میری حیثیت کا انسان ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے ناموزوں تو نہیں ۔۔۔ ٹھیک ہے نا۔''

''اعجاز'' اس نے سانس پھیپھڑوں میں گھونٹا۔

''ہاں شمن ۔۔۔ یہ لوگ تو جاہل ہیں ۔۔۔ کچھ نہیں سمجھتے، احساس کمتری ہے اور کچھ نہیں۔ تو بس اب تمھارے ہاتھ میں ہے سب کچھ۔''

''میرے ۔۔۔ میرے ہاتھوں میں ۔۔۔'' شمن نے زور سے مٹھیاں بھینچ لیں تاکہ وہ نا معلوم ہی

دولت کہیں رینگ نہ جائے۔

''وہ تمھاری دوست ہے نا ۔۔۔''

''ایں؟'' شمن نے مضبوطی سے ٹیوب میں ہوا روک دی۔

''ہاں ۔۔۔ بلقیس تمھاری پرانی دوست ہے ۔۔۔ تم چاہو تو شادی کروا سکتی ہو۔''

''مگر ۔۔۔''

''بھئی دیکھو بہانے مت بناؤ، ہماری بھنو کیسی، خدا قسم جو تم کہو گی ۔۔۔ وہ تمھیں ہارڈی کا چمڑے والا پورا سیٹ پسند ہے نا ۔۔۔''

''مگر ۔۔۔'' اس نے اسے روک کر کہا، ''بلقیس کا ٹیسٹ بہت اونچا ہے ۔۔۔ معاف کرنا اجو ۔۔۔'' وہ بضد ہو کر بولی۔ ''وہ ذرا اور قسم کی لڑکی ہے۔''

''مگر شمن ۔۔۔ میں کافی آزاد خیال ہوں ۔۔۔''

''میرا مطلب ہے آج کل لڑکیوں کو آزاد خیالی سے زیادہ کلچر چاہئے ۔۔۔''

''تو ۔۔۔''

''اور وہ خاندان دیکھتی ہیں، معاشرت دیکھتی ہیں، بلقیس کے امیدوار زیادہ تر تو نوابوں ہی کے خاندان سے ہیں، دوسرے تم سوچتے ہو یہ تمھاری جائداد بہت ہی زبردست ریاست ہے کہ ۔۔۔''

''میں یہ تو نہیں کہتا ۔۔۔'' اعجاز کی آنکھوں میں اسے بھوک اور شکست جھلکتی نظر آئی۔

''فضول بکواس ہے۔''

اعجاز سر جھکائے چلا گیا۔ وہ خاموش بے حس و حرکت پڑی رہی ۔۔۔ کچھ نہ سوچا، اسے تو بس ایک احساس تھا کہ اس نے نارنگی کے جھاڑ میں ہاتھ ڈالا اور کسی زہریلے ناگ نے پھن مار دیا۔ زہر کی طرح کوئی چیز سنسناتی لہراتی اس کے دماغ کی طرف چڑھی چلی گئی جسے جھٹکنے کی بھی کوشش نہ کی۔

کیا اسے اجو سے محبت ہو چلی تھی؟ ۔۔۔ چہ، توبہ کیجئے، اس واہمہ کو سوچ کر وہ ہنس پڑی۔ پھر؟ اس نے اس کا جواب پانا ضروری نہ سمجھا۔

اعجاز کے جانے سے پہلے اس کی شادی کا ذکر چھڑا، وہ کچھ دل برداشتہ سا رہا۔ چونکہ شمن کے والد نے اس کی پرورش میں کافی پیسہ خرچ کیا تھا، اس لئے پہلا حق تو انہیں کو پہنچتا تھا۔ اس سے قبل کہ کچھ اعجاز سے کہا جاتا اس نے نوری سے کہہ دیا کہ وہ اعجاز کے علاوہ ہر جانور سے شادی کر سکتی ہے۔ جھگڑے اٹھے، کچھ رونے دھونے کے ڈھونگ رچے مگر کالج جا کر اس نے صاف صاف انکار لکھ دیا، اور اس قدر بے حیائی سے کہ یہ سانحہ خاندان میں تاریخ بن گیا۔ اعجاز کچھ کھسیانا اور متحیر سا رہ گیا۔ بلقیس کا ذکر اس نے کسی سے نہ کیا ۔۔۔ اور شمن؟ زور لگا کر اس نے ہر گرفت سے پھسلنا شروع کیا بغاوت! اس کی رگ رگ غرور سے پھڑک اٹھی۔ اسے خود اپنی طاقتوں پر حیرت ہونے لگی۔ اس نے سب کے منہ پر طمانچہ مار دیا، دل توڑ دیئے، امیدیں خاک میں ملا دیں، اوہ! کتنی ظالم تھی وہ؟

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(27)

ایلما کو دیکھ کر تو وہ اس سے لپٹ ہی گئی۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے رکھے تو وہ دوزخ کی آگ میں سے بھی مسکراتی ہوئی گزر جاتی۔ وہ اس دفعہ ایک تحفہ لائی تھی نا ایلما کیلئے، ایک باغی کی گود میں وہ ایک نیا باغی ڈالنے لائی تھی۔ ایلما نے اپنی جادو بھری آنکھیں اس کی نذر آنکھوں میں ڈال دیں اور مسکرا اٹھی۔

''کیوں''؟ اس نے صرف اتنا پوچھا۔

''میرا دل!'' بجائے لمبی چوڑی تفصیل کے نئے باغی نے پیر جمائے میدان میں "Good" ایلما نے مسرت سے جھوم کر کہا؛ ''ٹھیک کہتی ہو، کسی کو ہم سے ''کیوں'' کہنے کی جرأت ہی نہ ہونا چاہئے۔ آؤ چلو'' گرو نے چیلے کی بانہہ پکڑ لی۔

اسی دن ایلما نے یونیورسٹی کے یونین کے صدر اور سیکرٹری سے ملایا۔ بہت تیزی سے شمن نے دنیا کے اس رخ کو دیکھ لیا جہاں انسان اپنے گھونگے جیسے خول سے باہر نکل کر اپنے وجود کے سوا بھی کچھ دیکھتا ہے۔

وہ ایلما کے کمرے میں گئی تو ذرا دیر کو ٹھٹک کر رہ گئی، اس کے پلنگ پر یونین کا پریذیڈنٹ افتخار لیٹا ہوا تازہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ وہ جھینپ کر لوٹنے ہی والی تھی کہ ایلما سر پر تولیہ کو صافے کی طرح لپیٹے غسل خانہ سے نکلی۔ اس نے شمن کا تعارف کرایا۔ گو وہ افتخار سے اچھی طرح واقف تھی۔ مگر بات چیت کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایلما بال سکھانے لگی اور شمن سے چائے بنانے کو کہا۔

''دودھ بالکل نہیں، شکر ایک چمچہ''، افتخار نے تکیہ پر سر گھما کر حکم دیا۔

''یہ سڑی چائے میں دودھ نہیں لیتا، بلکہ نیبو نچوڑ لیتا ہے۔'' ایلما نے تشریح کی۔

''نیبو''

''جی ہاں، آپ نے کبھی نہیں پی روسی چائے۔'' افتخار نے بات اٹھالی۔

''روسی چائے؟''

''جی ہاں روسی چائے میں نیبو ڈالتے ہیں، آپ بھی آزمایئے، بڑی مزے دار ہوتی ہے۔'' شمن نے ہچکچاتے ہوئے نیبو اٹھا کر پیالی میں نچوڑ لیا۔

''اور لوگ تو ابھی تک آئے نہیں، ستیل سیدھا وہیں پہنچ جائے گا۔'' یونین کے آزاد اور ترقی پسند گروپ کی میٹنگ پکنک کی صورت میں کھلے میدان میں ہونا قرار پائی تھی۔

''کیا مس بوگا بھی چلے گی؟''

''لو! مس بوگا نہ چلے گی تو پھر جا ہی کون سکتا ہے۔ مگر کیوں پوچھا تم نے؟''

''یونہی، ایسے ہی، بات یہ ہے کہ مجھے کم بخت سے نفرت ہے، عورت ہے کہ۔۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے

رک گیا پھر تیزی سے بولا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا جو ہم کسی طرح اسے بھولے سے چھوڑ جاتے۔''

''ارے وہ اپنی موٹر سائیکل پر دندناتی چلی جائے گی، تم نے دیکھی نئی موٹر سائیکل لی ہے اس نے۔''

شمن بڑے انہماک سے چمچہ چلا رہی تھی افتخار نے اسے غور سے دیکھا۔

''یہ اب چینی گھل رہی ہے۔'' وہ ابرو سے اشارہ کر کے بولا۔ ''میرا مطلب ہے پیالی کی چینی، کب تک چلائیں گی، کچھ دیر میں پیندے میں سوراخ ہو جائے گا۔'' ایلما نے دانت چمکا کر اپنی مخصوص ہنسی اگلنا شروع کیا اور شمن نے جھینپ کر بڑا سا گھونٹ چڑھا لیا۔ زور سے ابکائی آئی اور وہ منہ پر رومال رکھ ہچکیاں لینے لگی۔

''یہ۔۔۔۔ یہ چائے؟'' نیبو سے دودھ پھٹ کر گدلے رنگ کے لوتھڑے چائے میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔

''خوب! بھئی دودھ ڈالو تو نیبو نہیں نچوڑنا چاہئے۔'' افتخار نے اس کے لئے نئی چائے بنائی۔ ''روسی چائے پینے کے لئے مذاق ہونا چاہئے۔''

چائے پی کر گروہ کے گروہ شہر کی حدود سے باہر مقررہ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ تانگوں میں اور کچھ سائیکلوں پر لڑکیوں کو بٹھائے چل دیئے۔ راستے میں مس بوگا اپنی نئی موٹر سائیکل پر ستیل سنگھ کالج کے مشہور کھلاڑی کو بٹھائے سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتی نکل گئیں۔

آسمان گہرا لاجوردی اور شفاف تھا، معلوم ہوتا تھا کہ گاڑھی گاڑھی وارنش کی ہوئی ہے۔ خشک ہوا موسم خزاں کی نیم مردہ پتیوں کو ادھر سے اُدھر گھسیٹتے پھر رہی تھی۔ گو ہوا ہلکی پھلکی اور نرم پڑ گئی تھی مگر اس کا ہر طمانچہ جسم میں زندگی دوڑا رہا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے چھوٹے چھوٹے گچھے چھدرے پیڑوں کے نیچے بے تکلفی سے بکھر گئے۔ دو مخالف عناصر کے لطیف اور اچھوتے ملاپ سے فضا میں بہار رچی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مردانہ آوازیں زیادہ بھاری بھرکم اور لڑکیوں کے قہقہے زیادہ سریلے ہو گئے تھے۔

لڑکیوں کی تعداد قدرتی طور پر محدود تھی۔ لہٰذا ایک ایک لڑکی بطور تبرک ہر گروپ میں بانٹ دی گئی۔ یوں ایلما سے جدا ہو کر شمن ایک بالکل نئے اور جھینپو قسم کے غیر دلچسپ گروہ کے ہتے چڑھی۔ قدم پھونک پھونک نہایت عالمانہ اور شستہ گفتگو شروع ہو گئی اور بہت جلد سب کی قابلیتیں جواب دے گئیں۔ بے طرح دم گھٹنے لگے۔ اِدھر اُدھر کے گروہ میں یونیورسٹی کے چنے ہوئے موتی جگمگا رہے تھے انکی آب و تاب دور ہی سے لوگوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ ایک طرف مس بوگا چند بے فکروں کے جماؤ میں اپنی کھردری آواز میں انگریزی کے مزاحیہ گیت گانے کی کوشش کر رہی تھیں، تالیاں بجاتے میں ان کی بانہوں کا پلپلا گوشت تھل تھل ہل رہا تھا۔ ایک جھاڑی میں آدھا گھسا ہوا افتخار سب سے الگ چیونٹیوں کی قطاروں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ آیا ہی اس غیر ضروری کام کیلئے تھا۔ شمن کے ساتھی جن میں اکثر ایلما کے پرستار تھے بے چینی سے اس کے قرب میں پہنچنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر مجبوراً بیٹھے شمن ہی کو بھگت رہے تھے ورنہ ان کے دل میں تو ایلما اور مس بوگا کے قہقہوں کے سر تال پر ناچ رہے تھے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

شمن کو اس گھٹے ہوئے سکون سے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود بھاگ کر ایلما کر قرب میں پہنچ جاتی، یا کم از کم یہی معلوم کرتی کہ افتخار جھاڑی میں الجھا ہوا کون سے معمے سلجھا رہا تھا۔ ساتھیوں کی بے وقوفانہ خاموشی سے وہ جی ہی جی میں سلگ رہی تھی۔ فضا نہ جانے کتنی دیر کند رہتی اگر ستیل اور ایلما میں پر جوش جنگ شروع نہ ہوتی۔ ستیل ایلما کا برابر کی چوٹ کا مقابلہ تھا۔ گو ایلما اسے ہر میدان میں ایک قدم پیچھے چھوڑ جاتی تھی، پھر بھی وہ جب بھی مڑ کر دیکھتی اسے جیتا ہوا پاتی۔ ان دونوں میں قابل رشک نفرت تھی، اگر ایک دن تھا تو تو دوسرا رات،

جتنی ایلما پراسرار تھی اتنا ہی ستیل چٹیل میدان کی طرح بے لذت۔ ایلما انتہا کی تلخ اور تیز ستیل حد درجہ بے فکر اور مسخرہ! کرکٹ کے علاوہ انگریزی شاعری میں بھی ٹانگ اڑی ہوئی اور یہاں اس کے ایلما سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ کہتی تھی کہ ستیل کے بازو گوریلے کے سے اور سینہ گینڈے کا سا لیکن دماغ اونٹ سے بھی بدتر۔ وہ شاعری سے اتنا ہی دور تھا جتنا ٹیگور گلی ڈنڈے سے۔ اس پر ہر موقع پر ہر جگہ دونوں ایک دوسرے کی کاٹ کرتے۔ زبانیں دونوں کی تیز تھیں لہٰذا لوگ بے چینی سے ان دو متضاد عناصر کے ٹکرانے کا انتظار کرتے۔

آج ہندوستان کی آبائی غلامی اور ناداری کا علاج واحد ایک سرے سے عام تباہی اور قتل تجویز کر رہی تھی۔ اس کی رائے تھی کہ اس کی سسکتی ہوئی قوم کو آب حیات نہیں بلکہ زہریلی گیس ملنا چاہئے۔ تاکہ ایک بار بالکل نام و نشان مٹ جائے۔ طاعون کا علاج کیلشیم کے انجکشنوں سے نہیں بلکہ لوہے سے داغنے سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ صدیوں کا سمویا ہوا زہر مرہموں سے نہیں بلکہ زہر ہی سے نچوڑا جاسکتا ہے۔

ستیل نپے تلے مہذب جملوں میں اسے ایک نیم حکیم خطرہ جان سے تشبیہ دے رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر نہیں جو علاج نہ جانے۔

"وہ ڈاکٹر نہیں گدھا ہے جو ایک عضو کے سڑ جانے پر اسے جڑ سے کاٹنے کے بجائے زمبک کی مالش تجویز کرے۔ یہ صدیوں کے بجھتے ہوئے کیڑے عبث ہے۔ ان میں جان ڈالنے کی کوشش کرنا، مٹی کا تیل چاہئے تھوڑا سا۔"

"وہ بے جان تو نہیں، ہاں کمزور ہیں۔"

"تو کرکٹ کھلانی چاہئے ان سب کو۔" ایلما کے حق میں قہقہہ پڑا۔

"ہاں، اور تھوڑی سی شاعری کی خوراک۔۔۔" سوائے مس بوگا کے کسی نے داد نہ دی۔ ان کی ہنسی میں وہ چنگھاڑ تھی کہ سب کے قہقہے ماند پڑ جاتے۔ ایلما اسے مادہ چرخ کہا کرتی تھی۔ وہ زندگی کو ہلکے پھلکے غبارے کی طرح ہوا میں لہراتا دیکھنا چاہتی تھیں۔ اب ایک نئے تیسرے مضمون کو لے کر ایم۔ اے کر رہی تھیں۔ ان کے رویہ سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کے ہر مضمون کو لے کر ایم۔ اے کر ڈالیں گی۔ مگر ایلما کا خیال تھا کہ ہم سے زیادہ انہیں کالج کی زندگی کی ایک عادت سی پڑ گئی تھی۔ یونیورسٹی کی چہار دیواری کے باہر ان کی زندگی صفر کے برابر ہو جاتی تھی۔ سوائے پروفیسروں اور کالج کے لڑکوں کے انہیں کسی سے بات کرنی بھی نہ آتی تھی۔

انہوں نے بہت چاہا کہ نئی زندگی کی عادت ڈالیں، کہیں نوکری کر لیں، مگر گاڑی نہ چلی۔ تانگہ میں جتنے کا عادی ٹٹو کھلے میدان میں کلیلیں کرتے شرماتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ پیدائشی بدشکل تھیں اور سوائے کالج کے ان پر کوئی لٹو نہ ہوا۔ بلکہ وہ خود باوجود کوششوں کے کسی پر لٹو نہ ہو سکیں۔ لیکچر ہال، لائبریری، ریڈنگ روم، بورڈنگ کا کھانا، آئے دن نئے نئے انسانوں کا داخلہ اور اخراج، انہیں اس کی ایک لت پڑ گئی تھی۔ وہ ہر نووارد پر قابض ہو جاتیں، اسے ساتھ لئے لئے تمام اسکول اور یونیورسٹی کے عجائبات سے دوچار کراتیں۔ بالکل ایک محبت کرنے والی ماں کی طرح وہ ان کی چھوٹی موٹی پریشانیوں اور پرانے شریر لڑکوں کی بدمعاشیوں سے بچا لیتیں۔ عباس ایک بالکل تازہ فرسٹ ایئر فول کو تو وہ بالکل پونے تلے چھپائے رکھتیں۔ لیکن ہر نیا شکار کچھ دن بعد الٹا شکاری بن جاتا، ان کے دست شفقت کی گرمیوں سے اکتا جاتا اور الٹا انہیں مشق ستم بنا ڈالتا۔

جنسی اعتبار سے وہ ایک عجیب و غریب معمہ تھیں۔ سنا ہے جب وہ سائنس میں ریسرچ کر رہی تھیں تو پروفیسر رتنم سے اس کی بڑی راہ و رسم تھی، یہاں تک کہ وہ بارہ بارہ بجے تک بیٹھی سائنس کی گتھیاں سلجھایا کرتیں۔ لیکن ایک دن جب مشتاق پروفیسر نے جو انہیں نہایت ہی دقیق گتھی سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے تیزاب سے انہیں اندھا کرتے کرتے چھوڑا۔ اب تک ننھے سے سہمے ہوئے بچے کی طرح اس حادثہ کی تفصیل بیان کرتیں، اور اس بھولپن سے لڑکوں کے ہر سوال کا جواب دیتیں کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے۔ وہ ذرا نہ جھینپتی اور پروفیسر کی دست درازیوں کی تشریح عملی حرکتوں سے کرتی جاتیں۔

ایلما کہتی تھی کہ افتخار بھی کسی زمانہ میں ان کا چہیتا تھا۔ پر اسے ان سے اس دن سے نفرت ہو گئی جس دن انہوں نے عشق و محبت کا کچھ عجیب بھونڈے اور گھناؤنے پن سے ذکر کیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ ورنہ یہی افتخار گھنٹوں ان کے کمرے میں لیٹا رہتا، وہ سوئٹر بنا کرتیں اور افتخار ان کے زانو پر سر رکھے پڑا رہتا۔ وہ اس کی دست درازیوں کو غلطیاں سمجھتیں اور اشارے کنایہ کو بھولپن۔

آج کل وہ بڑے زور و شور سے ستیل پر کرم فرما تھیں۔ دو سوئٹر بن کر دے چکی تھیں اور وہ دن بھر موٹر سائیکل پر لادے پھرتیں۔ اس کی ہر بات پر "ونڈرفل" اور "مارویس" کہتیں، گو ایلما سے اچھے خاصے تعلقات تھے مگر ستیل کی پیٹھ تھپکنا اپنا فرض سمجھتیں۔ جب ستیل نے ایلما کے باغیانہ خیالات کا مذاق اڑایا تو وہ جوش سے بپھر پڑیں۔ اور جب ایلما کوئی چبھتا ہوا جملہ کہہ دیتی تو وہ ستیل کو پٹے ہوئے بچے کی طرح چمکارتیں جس پر اس کا منہ سرخ پڑ جاتا۔ لڑکوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اسے گود لینے والی ہیں اور گجرات میں جو ان کے پاپا کی ملیں ہیں وہ سب اسی کو ملیں گی۔

ستیل نے ہارتے ہوئے پہلوان کی طرح ٹینٹوے پر حملہ کیا۔

"عورت کو سیاست سے کیا تعلق۔۔۔ اس کا تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ۔۔۔" ایلما کی آنکھیں نفرت سے چمک اٹھیں۔ وہ ستیل کے اس حملہ کے آگے کچھ بے دست و پا ہو جاتی۔ مگر قبل اس کے کہ ستیل عورت کے اس ایک مصرف کی تشریح کرتا افتخار نے آ کر محفل درہم برہم کر دی۔ افتخار کے عروج کے ساتھ ہی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ساتھ ستیل کا وجود چاند کی طرح پھیکا پڑ جاتا۔ وہ کبھی افتخار سے نہ الجھتا بلکہ فخریہ ہار مان لیتا۔

افتخار نے فوراً نہایت تندہی سے آنکھ مچولی کا پروگرام بنا ڈالا۔ ایک لڑکے کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور باقی سب گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے، نیا اور شرمیلا لڑکا ذرا سی دیر میں تختۂ مشق بن گیا۔ گھنٹوں چکرا تا رہا کوئی ہاتھ نہ آیا اس عرصہ میں مس بوگا مسرت سے چیختے چیختے بالکل بدحواس ہو چکی تھیں۔ تالیاں بجا کر اور ہنس ہنس کر وہ کھیل کو اور تماشا بنائے دیتی تھیں۔ پسینہ میں شرابور منہ تازہ سِکے ہوئے کیک کی طرح تمتمایا ہوا تھا، ڈھیلے برہنہ بازو جن پر بھورے تل چھاپے کی طرح جمے ہوئے تھے، ہوا میں بات بے بات اچھل رہے تھے۔ باڈی کے بند پھسل کر کندھوں پر سے نیچے آ رہے تھے اور ساڑھی اونچی نیچی ہو گئی تھی۔ جب ان کے بتائے ہوئے داؤ پیچ لگا کر بھی وہ لڑکا کسی کو نہ پکڑ سکا تو وہ لوگوں کو جان بوجھ کر چور بن جانے کی رائے دینے لگیں۔

''او اہمکھار! آ نا آ گے کو، تو کیوں دبکا ہوا ہے۔ تھک گیا بے چارا ارے ستیل سنگھ اب بھی تیری باری ، تو بن جا چور۔''

جب کسی نے نہ سنا تو وہ کھیل کے تمام اصول توڑ کر چور سے بغل گیر ہو گئیں۔ چور نے انہیں فوراً بوجھ لیا ، اور غریب پر اس معنی خیز قہقہہ نے گھڑوں پانی الٹ دیا جو اس کے دوستوں نے اس کے حال زار پر لگایا۔

مس بوگا نے مچل مچل کر پٹی بندھوائی اور تتلا تتلا کر ہر ایک کو پکارنے لگیں لیکن بے چاری کی خوشی نہایت مختصر رہ گئی کیونکہ افتخار نے فوراً آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پکڑوا دیا۔ کھسیانی ہو کر وہ اسے تھپڑوں سے مارنے لگیں اور ہنستی ہوئی پھر تماش بینوں میں آن ملیں۔ کھیل بدمزہ ہو کر مصیبت بن گیا کیونکہ افتخار جب کسی کو پکڑتا جان بوجھ کر اس کا نام نہ بتاتا اور سزا کے طور پر پھر چور بنتا۔ اگر اس کے بجائے کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کیا گت بنتی مگر لوگ نہایت خندہ پیشانی سے ہنس رہے تھے۔

ثمن کھیل سے بے تعلق، نہ جانے کدھر دیکھ رہی تھی اور کیا سوچ رہی تھی۔ کھیل سے ذرا ہٹ کر ایلما کھڑی ستیل کے لمبے چوڑے جسم کو جو سوکھی پتیوں پر لیٹا انگڑائیاں لے رہا تھا، ایک عجیب نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ستیل نے کچھ کہا اور ایلما کے زہریلے دانت بھوکے بھیڑیئے کی دھار دار کچلیوں کی طرح چمکنے لگے۔ ستیل نے اس کی تلخیوں کا جواب ایک طنزیہ مسکراہٹ سے دیا اور اپنے بھاری جسم کو بیلن کی طرح پتیوں پر لڑھکا دیا۔ کراری خشک پتیاں چھوٹی چھوٹی چنگاریوں کی طرح چٹک کر خاموش ہو رہیں۔ ایلما نے اس ہتک آمیز لتاڑ سے کھسیا کر زمین سے ایک مٹی کا ڈلا اٹھایا اور زور سے سامنے پیڑ کے تنے پر کھینچ مارا۔ ستیل نے بروقت قہقہہ لگایا، اور ایسا معلوم ہوا وہ قہقہہ اس ڈھیلے میں چھپا بیٹھا تھا، اور باریک ذروں کی شکل میں فضا میں بکھر گیا۔

ثمن زور لگا کر اپنا بازو چھڑانے لگی۔ بے خیالی میں اس نے دیکھا بھی نہیں اور افتخار نے اسے پکڑ لیا۔ وہ ایسی بری طرح بھڑکی جیسے سچ مچ کے چور نے دبوچ لیا ہو۔ افتخار کی انگلیاں رسی کے پھندوں کی طرح اور مضبوط ہو گئیں۔ وہ چھوڑنے والا آدمی نہ تھا۔ غل مچا کر بے انصافی اور بے ایمانی کی دہائی دینے لگا۔ ساتھ ہی

مس بوگا پر تالیوں اور چیخوں کا دورہ پڑ گیا۔ ثمن کو مجبوراً خاموش کھڑے ہو کر اپنے آپ کو بجھوانا پڑا۔ حالانکہ افتخار اسے فوراً پہچان گیا تھا۔ مگر بن بن کر وہ اسے ٹٹولے چلا گیا۔ ناک کو ہاتھ، ہاتھ کو پیر بتا کر سب کو خوب ہنسایا خصوصاً مس بوگا تو بالکل ہی پاگل ہو گئیں۔

''ارے سچ بتاؤ یہ ہمارے گروپ کا کوئی آدمی ہے یا۔۔۔''

''بلی۔۔۔اہمکھار بلی۔ ہی ہی۔'' مس بوگا اپنی جگہ پر دونوں پیروں پر پھدک رہی تھیں۔

''ارے مونچھیں! نہیں مونچھیں نہیں۔۔۔کون ہو سکتا ہے ؟ ستیل، عباس، قادری۔۔۔؟ دت؟''

وہ اور بنا اور ثمن روہانسی ہو گئی۔ افتخار نے پٹی کھول دی۔

''اوہ آپ؟۔۔۔معاف کیجئے گا۔'' وہ مضحکہ خیز ادب سے جھکا اور مس بوگا نے پھر ہنسی کی چیخیں ماریں۔

افتخار نے اتنا مذاق کیا کہ ثمن کو جیسے گودڑ کی پوٹلی میں سے نکال کر اونچے چبوترے پر کھڑا کر دیا۔ یونین کا صدر معمولی ہستی نہیں، اگر وہ کسی میں دلچسپی لیتا ہے تو کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ واپس لوٹتے وقت دس بیس سائیکلیں پیش کی گئیں۔ یہاں تک کہ مس بوگا نے اسے ستیل کے ساتھ ہی بیٹھ جانے کی دعوت دے دی۔

''ہاں، ہاں تم اس کی گود میں بیٹھ جانا۔'' وہ بڑی معصومیت سے رائے دینے لگیں۔

ستیل نے مسکرا کر شانوں کو ایک استقبالیہ جنبش دی اور ثمن کا جی چاہا مس بوگا کے ایک زور کی چپت لگائے جیسے وہ اپنے بدتمیز چھوکرے کے گندے گلاس میں پانی پلانے پر لگا دیا کرتی تھی۔

رات کو ثمن ایلما کے ساتھ ہی رک گئی۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی، گھوم پھر کر ستیل کا ذکر آ جاتا اور ایلما دانت پیس کر رہ جاتی۔

''مگر جانتی ہو؟'' اس نے بستر پر بیٹھ کر کہا۔

''کیا؟''

''یہ۔۔۔کہ مجھے ستیل سے نفرت کیوں ہے۔؟''

''پتہ نہیں۔''

''دنیا میں متضاد عناصر ایک دوسرے کے قرب سے ہی بھڑک اٹھتے ہیں۔ پانی کو قریب پا کر آگ اور بھڑکتی ہے، سیاہی کو دیکھ کر سفیدی اور زیادہ تندہی سے چمکتی ہے۔''

''ہوں'' ثمن سوچنے لگی۔

''کیا مجھے ستیل سے محبت ہو سکتی ہے۔ ویسے ہی پوچھتی ہوں۔''

''کیا پتہ ہو بھی جائے۔''

''ہاں شاید، مگر جانتی ہو وہ۔۔۔وہ محبت کس قسم کی ہوگی۔''

''جانے!''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''اسے دیکھ کر دل میں بڑے ذلیل جذبات متحرک ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے میں ایک گوشت کا حقیر لوتھڑا ہوں۔ جیسے۔۔۔۔''

''کیا؟''

''کچھ نہیں، تم نہیں سمجھو گی۔'' تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھی اپنے خیالوں میں ڈوبی آنکھیں کھولتی بند کرتی رہی۔

''ثمن۔۔۔ ستیل کو دیکھ کر۔۔۔ بدمعاشی کرنے کو دل چاہتا ہے! ہیں نا؟'' اس نے ہولے سے کہا

''ہٹو۔۔۔ اللہ نہ کرے نفرت ہے مجھے تو۔'' ثمن جھجکی۔

''ہاں ہاں نفرت ہی تو ہے۔۔۔ اونہہ تم نہیں سمجھتیں۔'' وہ کچھ اداس ہو گئی۔

''دیکھو۔۔۔ مگر ہوتا ہے ایسا۔۔۔ دنیا میں کئی طرح کے انسان ہوتے ہیں کچھ تو ایسے جنہیں دیکھ کر سوئی ہوئی مامتا انگڑائیاں لینے لگتی ہے اور کچھ ایسے جن کے ساتھ دو چار باتیں کر کے جی بھر جاتا ہے۔'' وہ ثمن سے زیادہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

''مگر کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ لمبا چوڑا معاہدہ کر کے ان کے ساتھ لمبا چوڑا سفر کرنے کو دل چاہتا تھا۔''

''سفر؟۔۔۔ کیسا سفر؟''

''زندگی کا سفر!''

''مگر ستیل؟''

''ہاں ٹھہرو! اور چند ایسے بھی ہیں جن سے ایک بار تجربہ کے طور پر۔۔۔''

''توبہ ہے ایلما۔''

''اور پھر ان کی صورت سے گھن آنے لگتی ہے۔ ان کے تصور سے جی متلاتا ہے۔ جی چاہتا ہے پھر انہیں اٹھا کر دور پھینک دیں اور بھول جائیں۔''

کمرے کی دھندلی روشنی میں ایلما کا سانولا چہرہ اندھیرے غاروں میں جمی ہوئی کائی کی طرح بے جان ہو رہا تھا، اس کی آنکھیں اور بھی غیر مانوس اور بوڑھی ہو رہی تھیں۔

''عجیب لڑکی ہو۔'' ثمن نے جیسے خود سے کہا۔

''کیا؟ عجیب لڑکی، ممکن ہے عجیب لڑکی ہوں۔۔۔ شاید'' وہ چپ ہو گئی۔

''ثمن'' اس نے پھر کہا'' جب میں اپنے دل کو ٹٹولتی ہوں تو وہاں بڑے وحشیانہ خیالات چھپے نظر آتے ہیں، جنہیں میں جلدی سے وہیں بند کر کے لوٹ آتی ہوں۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ایک دن وہ باہر نکل کر مجھے دبوچ نہ لیں۔ شمشاد، اگر میں ان بھوتوں کو باہر نکل آنے دو تو۔۔۔''

کون سے بھوت؟''

''یہی۔۔۔ یہی جو میرے دل میں اوٹ پٹانگ ناچا کرتے ہیں مگر بہت برا ہوا!۔۔۔ بہت ہی برا۔''

''وہمی ہو تم تو ایلما، پاگل کہیں کی بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔۔۔ کم بخت ستیل۔۔۔''

''نہیں نہیں تم ڈرو نہیں۔ میں جو بات کہہ ڈالتی ہوں کبھی نہیں کرتی، سمجھیں تم۔ جب ایک بار کچھ سوچتی ہوں تو۔۔۔ اچھا سو جاؤ تم تھک گئی ہو؟''

''نہیں نہیں مجھے نیند نہیں آ رہی ہے، کہو تم، دیکھو! ایلما تم اس کم بخت ستیل کے منہ نہ لگا کرو۔۔۔ نہ جانے مجھے کیوں اس سے ڈر لگتا ہے؟''

''ڈر؟ تو تمہیں بھی اس سے ڈر لگتا ہے؟'' ایلما نے اس کے پاس جھک کر پوچھا۔

''اور کیا بھئی، ایسی کمینی آنکھیں ہیں۔''

''ارے پگلی وہ ڈر۔۔۔ وہ ڈر۔۔۔ اب کیسے بتاؤں، انہہ تم سمجھتی کیوں نہیں'' ایلما اس کی کند ذہنی سے عاجز آ گئی۔

''اور وہ کیا کہہ رہا تھا عورت کا ایک ہی مصرف ہے، کیا ہے وہ؟

''اور وہ، یہی مصرف، جو، جو تم نہیں سمجھتیں، وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ عورت مرد کی دلچسپی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔''

''چہ توبہ! منحوس کہیں کا! تو تمہیں غصہ آ گیا تھا۔''

''ایں؟ نہیں تو، مجھے اس بات پر غصہ نہیں آیا تھا، بلکہ۔۔۔ جب وہ لیٹا تھا تو تم نے دیکھا تھا؟''

''کیا؟''

''انہہ، اب تمہیں کیسے بتاؤں ہائے توبہ، اور اوئی ٹوئی کرنے لگو گی، مثلاً ابھی اگر میں تمہیں بتاؤں کہ مردوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جن کا۔۔۔ جو۔۔۔''

''کیا؟'' ثمن نے ڈر کر پوچھا۔

''جنہیں دیکھ کر دل میں ایک عجیب خواہش جاگ اٹھتی ہے، مثلاً جیسے افتخار ہے۔ اب مجھے اس سے محبت نہیں۔ ہے وہ بھی بڑا عجیب مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میرا پہلا بچہ افتخار کا ہو۔۔۔''

''ایلما!'' ثمن بے وقوفوں کی طرح سینے میں سانس لانے کی کوشش کرنے لگی۔

''ہاں پگلی، اور کتنا دل چاہتا ہے میرا کہ وہ۔۔۔ وہ''

''مر جاؤ، خدا کرے۔'' ثمن بگڑ گئی۔

''لیکن میں ایک لمبے سفر میں افتخار کو نہیں بھگت سکتی۔''۔۔۔ آ آ۔۔۔ اس نے لمبی سی جمائی لی اور لحاف میں پھسل گئی۔

''تھک جاؤں، میں تو دو دن میں تھک جاؤں۔'' اس نے سونے سے پہلے بار بار تھکی ہوئی جمائیوں کے درمیان دہرایا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(28)

ایلما کی چیلی بن کر ''کیلاش ہاسٹل'' آنا پڑا۔ پرنسپل اس کی گمراہی پر تنبیہ کر کے ہار گئیں۔ مجبوراً انہیں ڈراپس اخلاق دینے کے لئے اسے نکالنا پڑا۔ آنے سے پہلے کیا کیا منصوبے باندھے تھے، کہ آزادی ملی تو یوں کچھ سے اڑائیں گے۔ مگر جب چڑیا کے پر کتر دیئے جائیں تو وہ پنجرے کے باہر بھی قیدی ہی رہتی ہے۔ اور یہ کانٹے ہوئے پر اس جنم میں تو نکلتے نہیں۔ نکلے بھی تو نیڑھے نیڑھے! دوسرے جب انسان پر خود اپنی نگرانی کا بار پڑتا ہے تو وہ بہت کوتاہ نظر ہو جاتا ہے۔ چھچھورے، جھوٹ اور بہانے خود کو دینے میں کیا لطف؟ لیکچر میں جانے کا بہانہ کر کے سینما اڑ جانا، اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی۔ آزادی سے جلد ہی جی بھر گیا۔ معلوم ہوتا تھا اب کسی کو بھی اس کے چال چلن کی فکر نہیں رہی، وہ بلا سے کچھ کرلے کسی کو کیا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا لوگ اپنے کاندھوں کا بوجھ پھسلا کر آہستہ آہستہ اس کے سر پر ڈالتے جا رہے ہیں۔ اوروں کی قید سے چھوٹ کر خود اپنی ذمہ داری کی زنجیروں میں جکڑتی جا رہی ہے۔ اس کی ہستی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک محافظ اور دوسرے محفوظ۔

لائبریری سے نکلتے میں ستیل سے ٹکر ہو گئی! ''یقیناً اتنا تو غیر مرئی نہیں ہوں کہ دکھائی بھی نہ دوں۔'' اس نے مصنوعی جھلاہٹ سے کہا۔ ثمن نے حال ہی میں عینک لگانا شروع کی تھی۔ جھینپ کر شیشے رومال سے صاف کرنے لگی۔

''جی ہاں، خوب صاف کر کے دیکھئے، ویسے چھ فٹ کی چیز اتنی باریک تو نہیں کہ خوردبین سے دیکھنا پڑے۔''

ثمن کو ہنسنا پڑا، ستیل بھی ہنس دیا۔ وہ پنسل لینے جا رہا تھا، لیکن اب تو اس کے قلم سے کام چل جائے گا۔ ایلما سچ کہتی تھی کہ ستیل کے قرب میں انسان گوشت کا لوتھڑا بن جاتا تھا۔ اس نے نہایت بے تکلفی سے اس کے گریبان سے قلم لپک لیا اور قبل اس کے کہ وہ کچھ برا مانتی وہ تیزی سے معافی مانگتا ہوا نوٹ لینے پرکونے میں چلا گیا۔ ثمن پٹی ہوئی شکل لئے دوسرے کونے کی میز پر بیٹھ گئی۔

باوجود کوشش کے ثمن ستیل کے وجود کو نظر انداز نہ کر سکی، بار بار اس کی نظر اسی گوشے کی طرف بھٹک جاتی جہاں وہ کچھ کتابیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکائے ہوئے موٹی سی ڈکشنری کھولے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ اور سوچ سوچ کر کچھ لکھتا جاتا تھا۔ بار بار وہ قلم کو ہونٹوں پر رگڑ کر کچھ سوچنے لگتا اور کتاب پر جھک جاتا۔ اس کی پھنسی ہوئی سپورٹ شرٹ کھال کی طرح سینے اور شانوں پر منڈھی ہوئی تھی۔ مضبوط گردن و

ورزش کی وجہ سے آہنی سانچے میں ڈھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدلتا، اس کا کسرتی جسم بالکل اڈونس کے مجسمے کی طرح کھنچا ہوا اور سڈول تھا۔ بھوئیں زیادہ گھنی اور سکونی آنکھیں، ازحد پھرتیلی اور گہری ہو رہی تھیں۔ جب وہ اپنے ہونٹ روٹھنے کے انداز میں سکیڑ لیتا تو بالکل ضدی بچے کی سی شکل ہو جاتی۔

ثمن نے جھنجھلا کر کتاب بند کر دی اور نہ جانے کس پر دانت پیسنے لگی۔ ستیل کے خلاف یہ اسے فضول غصہ کیوں آنے لگا؟ دھڑکتے ہوئے دل سے ایلما کے الفاظ یاد آ گئے، تخیل نے اسے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، کیا کیا منظر دکھا دیئے۔۔۔۔ اندھیرے گوشے، سنسان گپھائیں اور دھندلے دھندلے پیڑوں کے گھنے جھنڈ۔۔۔ خزاں رسیدہ پتیوں کی چرمرانے کی آواز۔۔۔ مگر نہیں تو ستیل کے پہلو بدلنے سے میز چرچرائی تھی۔۔۔ ستیل! ستیل! ستیل! کیوں! آخر کیوں وہ اس کے دماغ پر چڑھا چلا آتا تھا؟ بغیر قلم لئے وہ لائبریری سے نکل بھاگی اور کامن روم میں جا کر لیٹ گئی۔

لیکن پھر وہ خود بخود ہنسنے لگی، یہ اس کی کمزوری نہیں ستیل کی طاقت تھی جو اسے تھکائے دے رہی تھی، وہی طاقت جو ایک حسن فروش بیسوا میں پا کر اچھے بھلے انسان جبیں سائی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس نے اس سے پہلے کسی سے سنا بھی نہ تھا کہ جیسے فاحشہ عورتیں سینہ تانے، کمر لچکاتی، ناز و عشوہ کی بجلیاں گراتی لوگوں کے دل مسلتی چلتی ہیں، اسی طرح بعض مرد بھی اپنے جسم کی سستی اور چھچھوری نمائش کیا کرتے ہیں! ستیل کی ہر جنبش سے معلوم ہوتا وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ ''لو دیکھ لو یہ مضبوط پٹھے، یہ رانیں، یہ چوڑا چکلا سینہ، ہے ہمت نظر بھر کر دیکھنے کی؟'' وہ جو بار بار قلم کو ہونٹوں پر رگڑ رہا تھا۔ کیا بھونڈا طریقہ تھا پیغام رسانی کا۔ اسے گھن آنے لگی۔

کمرے میں بھاری پردے پڑے ہوئے تھے اور عجیب پراسرار و نرم اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کوئی پردہ ہوا سے لرزتا، روشنی کی ننھی سی کرن سسکیاں بھرتی پھر اسی خوشگوار تاریکی میں گھل مل جاتی۔ اس کے دماغ کی رگیں سوکھی پتیوں کی طرح خستہ ہو رہی تھیں، ڈر تھا کہ کہیں ذرا بھی دھیان بھٹکا اور ان کا چورا ہو جائے گا۔

''ارے آپ یہاں؟'' ستیل ربڑ کے جوتے پہنے بلی کی طرح چلتا نہ جانے کب کرسی کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ ثمن اچھل پڑی جیسے وہ بے خبر مزے سے نہا رہی تھی اور کسی نے دروازے چوپٹ کھول دیئے، اس نے جلدی سے اپنے حواس سمیٹ لئے اور بیٹھ گئی۔

''یہ آپ کا قلم'' اس نے گال کھجانے کے بہانے اسے گال سے لگایا، اس کی آنکھوں نے بتا دیا کہ کیوں قلم دیتے وقت اس کی انگلی ذرا زیادہ دیر تک دب گئی، ثمن نے گھبرا کر قلم چھوڑ دیا۔

''ارے ہاتھ جل گیا؟'' وہ اپنی پھرتیلی آنکھیں جھپکا کر ہنسنے لگا۔

دور لاپروائی سے مڑ کر اس نے ایک پینٹنگ کو دیکھنا شروع کیا، جیسے وہ جاتے جاتے رک گیا ہو۔ پاس رکھے ہوئے اسٹول کا سہارا لے کر دو چار انگڑائیاں لیں اور پھر ثمن کی طرف مڑا۔

باہر برآمدے میں نوکر چاکر گھوم رہے تھے لائبریری بھی دور نہ تھی، لیکن ثمن کا دل ایسے دھڑکا جیسے وہ سنسان تنہائیوں میں نامعلوم خوف سے بھاگ رہی ہے۔ مگر سب راستے بند ہیں، بڑے بڑے حشرات

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

الارض لمبے چوڑے دہانے کھولے چاروں طرف سے لپک رہے ہیں۔ اگر ستیل ایک لمبی سی چھری لے کر اس کا قیمہ کر ڈالتا تو بھی اس میں جنبش کرنے کی سکت نہ آتی۔۔۔ مگر ستیل الو نہ تھا، اسے کچے پھلوں سے نفرت تھی، وہ نہایت صبر سے پیڑ کے نیچے کھڑا ہونٹوں پر زبان پھیرا کرتا اور پھل کے پک کر رسدار ہو جانے کا انتظار کرتا، یہاں تک کہ خود اس کی آغوش میں رس کی بارش ہو جاتی، مجبوراً وہ اسے چکھ لیتا، بالکل زبردستی کی دعوت سمجھ کر۔

ستیل چلا گیا، مگر بڑی دیر تک اسے وہ ملاجی یاد آیا کئے جو بہت دن ہوئے جب وہ اور نوری کھڑکی میں بیٹھی گلی میں جھانکا کرتی تھیں اور پھر حواس باختہ ہو کر کھڑکی سے گر جایا کرتی تھیں، وہ جلدی سے کامن روم سے بھاگ آئی۔

یونیورسٹی میں دو گروہ تھے، ایک تو پروفیسروں کا چہیتا اور دوسرا ہر دلعزیز، مگر جس کی حرکتوں پر یونیورسٹی کے منتظمین کے علاوہ حکومت کی نظر بھی رہا کرتی تھی۔ اس گروہ کے سردار ایلما اور افتخار تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ افتخار مفسد اور مکار تھا، اس کی زبان اس قدر طرار تھی کہ چند لمحوں میں ساری یونیورسٹی کو بہکا دیتا مگر جونہی دل میں کوئی نیا خیال پیدا ہوتا، بڑے سے بڑے فساد کو ذرا سی دیر میں ختم کر دیتا۔ اسی سے منتظمین کو ہر معاملے میں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے اہم موقعوں پر اسی کی رائے سے مہمان اور صدر چنے جاتے۔ یونیورسٹی کو کوئی بہانہ بھی تو اسے دفع کرنے کا نہ ملتا تھا، ورنہ وہ تو کبھی کا کلرکی کے جوئے میں جتا نظر آتا۔

صورت شکل سے وہ نہایت معمولی درجہ کا انسان نظر آتا تھا۔ عام طور پر اس پر ایک قسم کی ناسمجھی اور بیوقوفی طاری رہتی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اس کا اصلی چہرہ نہ تھا۔ اصلی چہرہ تو بہت تھوڑی دیر کے لئے صرف پرنسپل نے اپنے دفتر کے پرائیویٹ لمحوں میں دیکھا تھا۔ یا کبھی کبھی جب وہ خود کو بھول جاتا تو دیکھنے والے اس کے چہرے سے مکدر خاطر ہو جاتے۔ اس کے ہونٹ حملہ آور بھیڑیئے کی طرح ہونٹوں پر کھنچ جاتے اور آنکھوں میں صدیوں کی دبی ہوئی غلامی کی خاموش بغاوت سلگنے لگتی۔ اس کی صحت عموماً خراب رہتی تھی اور زیادہ تر کھانستا چھینکتا رہتا تھا۔

قدرتی طور پر شمن کی نظر بار بار افتخار کی طرف اٹھتی، گو وہ بہت کم اس سے بات کرتا مگر جب کبھی وہ ملتے ایسا معلوم ہوتا وہ ایک دوسرے کو برسوں سے پہچانتے ہیں۔ وہ اس کی ہر بات پر آنکھ میچ کر صاد کرنا اپنا فرض سمجھ چکی تھی، اب وہ مداحوں کے گروپ سے قدم بڑھا کر ممدوح بنتی جا رہی تھی اور نئے انتخاب پر اسے یونین کا کارکن بھی بنا دیا گیا۔ آہستہ آہستہ خود اعتمادی بڑھ کر کچھ غرور کی حدود کو چھونے لگی تھی، اب ایلما اسے اپنی ہی جیسی مگر زیادہ عقلمند اور ذہین نظر آتی تھی، اب وہ پہلے کی طرح مسحور ہو کر اس کی پراسرار آنکھوں اور زہریلے دانتوں سے اتنی متاثر نہ ہوتی تھی، اسے خود اپنی ہنسی میں ایک غیر مانوس سی جھنکار سنائی دینے لگی تھی، ہاں افتخار اور اس کی کھوئی ہوئی سی جھلاہٹ اسے اب بھی متحیر کر دیتی تھی۔

اسی زمانے میں الہ آباد میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا جلسہ شروع ہو گیا اور پرانے حقداروں کو پیچھے چھوڑ کر نہ جانے کیسے شمن کا انتخاب نمائندہ جماعت میں ہو گیا۔

(29)

گھر کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ نوری کی شادی ہو رہی ہے۔ لہٰذا لوٹتے میں رک گئی۔ نوری اندر کمرے میں مائیوں بیٹھی ملی، شمن کو دیکھ کر وہ اس سے لپٹ گئی۔ نوری اور شمن ہمیشہ ان مصنوعات سے پاک رہی تھیں۔ مگر نہ جانے کیوں دونوں طرف سے پیار ابل پڑا۔ بڑی محبت سے دونوں ہی ایک رضائی میں لپٹ کر سوئیں اور رات گئے تک باتیں کرتی رہیں، عام باتیں جو ایک مائیوں بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی بچپن کی سہیلی سے کرتی ہے، ہونے والے شوہر کے متعلق سنے سنائے افسانے، ساس نند کے ارمان بھرے دکھڑے، ٹیکہ، جھومر اور پازیبوں کا ذکر۔ ماں دادی اور دوسرے رشتہ داروں کی مدد سے اس نے دور ہی دور سے عشق کر لیا تھا، جہیز کی تیاری میں گویا روحانی کورٹ شپ ہو گئی تھی۔ ہر ناکے پر وہ ہونے والے میاں کا خیال ایک لڑی میں پروتی جاتی، ساس نندوں کا رومینٹک برتاؤ اور بری اور چڑھاوے کے ذریعے سے وہ ہونے والے ساتھی کو بخوبی پہچان چکی تھی۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضد اور عادت وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔

''انہیں مہندی سے نفرت ہے، گہرے رنگ سے تو چڑ تے ہیں، بڑی خوشامدوں سے تو سہرا باندھ رہے ہیں۔ وہی عام چھچھورے دولہاؤں کے نخرے۔ مگر نوری انہیں بے انتہا عجیب وغریب بنا کر سنا رہی تھی۔

''کہتے ہیں گھونگھٹ نہیں کاڑھنے دیں گے۔ بھلا میں بھائی میاں کے سامنے کیسے چلوں گی، میرا تو دم نکل جائے گا۔'' اس نے منگنی کے بعد ہی اس کے تمام رشتہ داروں سے ناطے جوڑ لئے تھے اور انہیں ناموں سے پکارتی تھی جن سے وہ ان کا ذکر کرتا تھا۔ ''روز صبح شیو کرتے ہیں ورنہ ایسے کھردرے گال ہو جاتے ہیں کہ حد نہیں۔'' وہ ایسے کہنے لگی گویا وہ برسوں سے ان گالوں کو سہلانے کی عادی ہے تخیل بھی کیا غضب کی چیز ہے جہاں کسی کی رسائی نہ ہو، پرندہ پر بھی نہ مار سکے وہاں مزے سے خیالوں کے ہنڈولے میں جھولتے چلے جاؤ، منگنی سے پہلے ہی نوری کا پردہ کرا دیا گیا تھا اور اب وہ تین سال انگلینڈ رہ کر آ رہا تھا۔ کوئی پوچھے کمبخت یہ سب تجھے کس نے بتا دیا کہ اس کی ڈاڑھی کھردری ہے، مونچھیں چبھنے والی ہیں، اور ہتھیلیاں چکنی ہیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ثمن نے اس سے بالتفصیل نہ پوچھا اور نہ وہ اسے شادی کے بعد کی اپنی پرسکون زندگی، بچوں کے پیار کے نام، روزانہ گوشت ترکاری کا حساب کتاب، سب کچھ بتا دیتی۔ نہ جانے کب سے وہ زندگی کی اس جمع تفریق میں مشغول تھی، اور پھر سب کا خیال تھا کہ نوری ابھی کم سن ہے، بوجھ نہ اٹھا پائے گی۔ یہ بھولی مائیں! اتنا نہیں جانتیں کہ ذرا سی فتنی تھی، جبھی سے بوڑھی دادی بن چکی تھی۔

نوری کو چھوڑ کر وہ دور زندگی کے ہیر پھیر پر غور کرنے لگی۔ یہ لڑکی ذات بھی معمہ ہے۔ چار پانچ سال کی تو پکی نانیوں جیسی جو دیکھے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ ابھی یہ حال ہے تو بڑھ کر آفت کا پرکالہ نکلے گی، جہاں پانچ دس سال اور بیتے ایک دم رنگ پلٹا، وہ بزرگوں جیسی گفتگو اور طور طریق غائب، اس کی جگہ دوپٹہ کہیں ہے تو پاجامہ کہیں، گریبان چاک ہے تو جوتی پیروں سے نکلی بھاگتی ہے، بات کرتے میں سو بار زبان لڑکھڑاتی ہے اور ہزار بار چہرے کا رنگ بدلتا ہے۔ کیا نئے انقلاب اور تازہ مصیبتیں اس شدت سے حملہ آور ہوتی ہیں کہ سدھ بدھ ہی غائب ہو جاتی ہے یا احساس شباب ایک پھنکار بن کر ہوش وحواس کو معطل کر دیتا ہے۔

نوری خواب بیداری سے جی سیر کر کے سو بھی گئی مگر ثمن نے اس کا سر اپنے بازو سے نہ ہٹایا، اس کا نرم گرم جسم، خوابوں سے رنگین چہرہ، ابٹنے میں بسنے ہوئے میلے کپڑے وہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔ عورت! کیا یہی تھی عورت جو حلوے کی مرغن قاب کی طرح سجا بنا کر کل ایک مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی۔ اسے نہلا دھلا کر عطر میں بسایا جائے گا۔ یہ اگر تھوڑی بہت بساند ہو بھی تو معلوم نہ پڑے، ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا تلخی چھپانے کے لئے ڈھیر سا مسالہ چھڑک دیتا ہے، بالکل اسی طرح دلہن کو شیرے میں لتھیڑ کر دولہا کے حلق میں اتار دیا جائے گا اور جب ایک بار نگل گیا تو مہا شیر اپنا ہے۔ یہ وقتی وارنش دو چار گھسوں میں اتر جائے گی اور دلہن صرف بیوی رہ جائے گی! لفظ بیوی کے خیال ہی سے ثمن کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ نوری کے نوجوان جسم سے لپٹے ہوئے درجنوں بچے، اور ہزاروں فکریں جونکوں کی طرح چپکی خون چوستی نظر آنے لگیں۔

''عورت کا صرف ایک مصرف ہے۔۔۔'' اسے ستیل کے الفاظ یاد آ گئے۔

دفعتاً اسے الہ آباد کی میٹنگ بھی یاد آ گئی، خصوصاً آخری اجتماع، جو تاروں کی چھاؤں میں الاؤ لگا کر کیا گیا تھا، چاروں طرف گچھوں کی صورت میں بیٹھ کر کانا پھوسی ہو رہی تھی، دنیا کے اہم مسائل طے کئے جا رہے تھے۔ لڑکوں کی بھاری اور مدھم آوازوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی مہین بولیاں روپہلی گھنگھروں کی طرح بج رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں مونگ پھلیوں کے چھلکوں کی چڑ چڑ، بالکل ساز سنگیت کا لطف آ رہا تھا، الاؤ دھیما ہو گیا تھا۔ صرف کبھی کبھی جب کوئی گروہ مونگ پھلیوں کی مٹھیاں بھر کر پھینکتا تو ایک آدھ شعلہ لپک اٹھتا۔

اس دن کتنی نگاہیں اسے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور اس نے بجائے انکو جھٹک دینے کے سینے سے لگا کر تھپکیاں دی تھیں۔ اسے سردی لگی تھی تو کتنے کوٹ اور مفلر اس پر برس پڑے تھے۔ ہر ایک خود دکھ اٹھا کر اس کے قیمتی جسم کو بچانے کی فکر میں تھا۔ نہ جانے اس قربانی میں کیا لطف آ رہا تھا کہ ہر ماتھا

جھکا جا رہا تھا۔ اتفاق کہئے یا جو کچھ بھی اس کے ہاتھ میں افتخار کا کوٹ آیا تھا، پہلے تو اس کا دم گھٹنے لگا تھا، سگریٹ کے علاوہ اور بھی بہت سی پریشان کن خوشبوئیں ایک دم دماغ پر چڑھ گئی تھیں۔ ثمن نے اوڑھے ہی کون سے ہزاروں کوٹ تھے جو ان خوشبوؤں کو پہچان سکتی۔ اس نے چپکے چوری اس دلچسپ کوٹ کی جیبیں بھی ٹٹول ڈالی تھیں۔ افتخار بڑا لاپرواہ تھا، منوں کوڑا بھرا پڑا تھا۔ تمباکو کا چورا، ٹوٹی ہوئی دیا سلائیاں، دو چار پنسل کی چھیلن کے ٹکڑے، پروگراموں کے تڑے مڑے پرچے، دوسرے جیب میں مونگ پھلیوں کے چھلکوں کے علاوہ ایک خط بھی تھا جو وہ الاؤ کی روشنی میں نہ پڑھ سکی اور نہ جانے کیوں اسے اپنی صدری میں اڑس لیا۔ جلسہ بکھرنے لگا تو وہ افتخار کو ڈھونڈنے لگی۔

''کمال کر دیا آپ نے تو بھئی میں نے تو سب کی حرص میں دے دیا تھا کوٹ اور آپ قبضہ ہی جما بیٹھیں۔ خدا قسم مرا جا رہا ہوں سردی کے مارے، یا مجھے بھی لپیٹ لیجئے اسی میں یا۔۔۔''

افتخار کو ہذیان بکتے دیکھ کر ثمن سہم کر رہ گئی۔

''لیجئے اپنا کوٹ۔'' اس نے ہمت کر کے کہا۔

''ہیں اور آپ؟ مرنے کا شوق ہے؟''

''میں یہ پہنے ہوں، کافی گرم ہے۔''

''اوہو۔۔۔۔جل گیا میرا ہاتھ تو۔۔۔'' اس نے بن کر صدری کا کپڑا چٹکی سے چھوا۔ ''اچھا اب بنئے مت اور جلدی سے کیمپ میں جا کر بستر میں دبک جایئے۔''

''نیند جو نہیں آ رہی ہے، میں جا کر اپنا کوٹ پہن لوں گی۔ لیجئے''

دونوں کیمپ میں آئے اور افتخار نے کوٹ نہ لیا بلکہ اس کی رضائی اوڑھ لی۔ دونوں باہر آ گئے تھے۔

''کاہے کی خوشبو ہے؟'' افتخار نے بنارسی رضائی کو ناک سے رگڑ کر پوچھا تھا۔ ثمن نے نہ جانے کیا جواب دیا تھا، ایک بے تکی خاموشی درمیان میں حائل ہو گئی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے کا وجود بری طرح کھٹکنے لگا۔ افتخار نے سگریٹ سلگایا اور پھر جھنجھلا کر مسل ڈالا۔

''ہنہ!'' وہ طنز سے غرایا۔

''جی؟''

''آپ چاہتی ہیں میں چلا جاؤں، یہ سنبھالئے اپنی رضائی۔''

''ایں؟''

''اس کا مطلب نہیں کہ آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔۔۔ میں۔۔۔ بلکہ میرا مطلب کچھ یونہی۔'' اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھوں کو بے معنی سے جنبش دی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے بہت پسند کرتی ہو۔''

''یہ۔۔۔۔۔میں؟'' وہ چڑ کر ہکلائی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''ہاں، اور جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ میں آج تم سے کھل کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ اسے روک کر بولا۔ ''میں تم سے بہت بڑا ہوں، دنیا بھر کی ٹھوکریں کھائی ہیں، بہت کچھ سمجھنے لگا ہوں، میں تمھیں پسند کرتا ہوں اس لئے..... خیر جانے دو۔۔۔۔ تو میں کیا کہہ رہا تھا'' وہ ایک دم گم ہو گیا۔

''ہاں اسی لئے تم سے کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔''

''کہیے!''

''تم بہت بھولی ہو۔۔۔۔ اس میں کوئی فخر کی بات نہیں۔'' اس نے جلدی سے اپنے الفاظ کی تردید کی۔ ''معصومیت ایسی دولت نہیں جس پر کوئی اس دنیا میں ناز کر سکے۔۔۔ تو میرے خیال میں۔۔۔''

''تم نے کسی سے محبت نہیں کی۔'' وہ تھوڑی دیر بعد بولا، ثمن خاموش رہی نہ جانے کیوں اسے تردید کرنے میں احساس کمتری ہونے لگا۔

''اور میری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ میں نے اتنی بار محبت کی ہے کہ یاد بھی نہیں، ماں کی محبت سے لے کر مجھے رنڈیوں، فقیرنیوں اور ان سے بھی گری ہوئی عورتوں کی محبت نصیب ہو چکی۔۔۔ مگر تم سے جو محبت۔۔۔ لاحول ولا قوۃ'' وہ جھلایا۔ ''کہیں یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم سے زیادہ کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ نہیں بلکہ تمھیں دیکھ کر میرے دل میں عجیب جذبات موجزن ہونے لگتے ہیں۔''

''تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ تم سے لگاؤ پیدا ہوتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔۔۔ جیسے۔۔۔۔ جیسے، یوں سمجھو جیسے میں تمھیں اپنا کوٹ دے دوں اوڑھنے کے لئے، تو مجھے یقین ہے کہ وہ محفوظ رہے گا۔'' ثمن ڈر گئی کہ کہیں اس نے خط نکالتے دیکھ تو نہیں لیا، تم اس میں سے کچھ نہ چرا سکو گی۔ برسوں کے لئے بھی اگر میں اپنی محبت مع تمام رعنائیوں کے سپرد کر دوں تو بھی خیانت نہ کرو گی اور یہ اطمینان بتا نہیں سکتا ایک مرد کے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے میرا مطلب مردوں اور سے نہیں خود اپنی ذات سے ہے۔''

''مگر وہ کیوں؟'' وہ ایک دم سے بولی۔

''یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔''

''میں؟ میں کچھ نہیں بتا سکتا، ہنہ خود ہی نہیں سمجھتا، کہ تم جیسی سیدھی سادی لڑکی مجھے کیا دے سکتی ہے جو مجھے در در کی خاک چھان کر بھی نہ ملا۔ میں تمھارے ساتھ بغیر تھکے بہت دور تک جا سکتا ہوں۔۔۔۔'' ثمن کو ایلما کا لمبا سفر یاد آ گیا۔

''مگر ہمارے راستے جدا جدا ہیں۔۔۔۔''

''کیوں؟'' ثمن نے کسی انہی ہاتھ سے گلا چھڑا کر کہا۔

''اس لئے کہ۔۔۔ تم بالکل چوکور ہو۔۔۔ اور دنیا کے گھسے کھا کر میں بالکل گول ہو چکا ہوں۔''

''مگر تراشے سے ہیرا اور بیش بہا ہو جاتا ہے۔'' ثمن اپنی زبان کی طراری پر جھینپ گئی۔ ''ہیں؟۔۔۔ مگر میں پتھر ہوں۔۔۔ تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں بن رہا ہوں۔'' وہ بگڑا۔

''نہیں تو۔''

''ہنہ۔۔۔۔ جانتی ہو میں نے تمھاری رضائی کیوں اوڑھی؟'' ثمن کا دل دھڑکا۔

''اسے دیکھ کر مجھے گزری ہوئی زندگی کی باتیں یاد آ گئیں۔ تمھیں نہیں معلوم میری ایک بہن بھی تھی، ہم دونوں میں بڑی دوستی تھی، مجھے اب تک یاد ہے، ہم دونوں ایسی قوس وقزح کی طرح رنگیلی رضائی میں گھس کر ریل ریل کھیلا کرتے تھے۔ آج اس رضائی کو دیکھ کر۔۔۔ منسومت! تم ہنسی کیوں ہو، ہاں اسے دیکھ کر میرا دل بے اختیار ریل ریل کھیلنے کو چاہا، تمھیں دیکھ کر میرا دل ہمیشہ چھیڑنے کو چاہتا ہے۔ مگر میں رک جاتا ہوں کہ کہیں تم اسے کچھ اور نہ سمجھنے لگو۔ شمشاد، معشوقاؤں کے تو ہم نے ہزاروں چٹکیاں لی ہیں، مگر ویسی چٹکی جو میری بہن پلنگ کے نیچے گھس کر میری پنڈلی میں بھر لیا کرتی تھی، اس کی یاد آج تک میری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ میری بہن مر گئی اور پھر مجھے ویسی محبت نصیب نہ ہوئی۔'' وہ تھوڑی دیر تک رضائی نکے ہوئے ستارے ناخنوں سے کھرچتا رہا۔ پھر کچھ یاد کر کے بولا۔

''ہم صبح ناشتے پر اُردی کی کھچڑی کھایا کرتے تھے، وہ دبلی پتلی اور بڑی ہلکی سی تھی۔ اور میں پلنگ پر بیٹھ کر کودا کرتا تھا تو وہ لڑھک کر میرے اوپر آن گرتی۔ اسے کھانسی کی وجہ سے گھی کھانے کو منع کر دیا گیا تھا مگر وہ ضد کرتی تو اماں روئی کی گولی بنا کر کھچڑی پر رکھ دیتیں۔ وہ قطعی نہ سمجھتی اور مزے سے کھچڑی کھا لیتی۔ ایک دن میں نے اسے بتا دیا۔ ''سنو یہ گھی تھوڑی ہے، روئی ہے۔''

''روئی؟'' وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گئی اور جب اسے اماں کی چالاکی معلوم ہو گئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا تھا۔ ''تم نے کبھی اُردی کی کھچڑی کھائی ہے؟''

''آہاں!'' ثمن کا گلا بھر آیا۔

''اور۔۔۔ اور۔ ارے یہ میں تم سے کس قدر بے تکی باتیں کر رہا ہوں، لاحول ولا قوۃ! تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں بھی نرا چغد رہوں۔'' وہ کھسیا گیا۔

''ارے میں تو بالکل بھی۔۔۔۔''

''جھوٹ تم مجھے قطعی اُلو سمجھ رہی ہو۔ اور نہیں تو کیا، میں جب تمھیں پسند کرتا ہوں تو بجائے تمھیں آغوش میں لینے کے یہ اُردی کی کھچڑی۔''

''تو کیا ہوا، آپ مجھے بہن کی طرح چاہتے ہیں۔''

''ایں؟ قطعی نہیں، میں ان لوگوں کو پرلے درجے کا مکار سمجھتا ہوں، جو غیر لڑکیوں کو جوان کی معشوقہ بن سکتی ہیں، بہن کہتے ہیں۔ مگر شاید تم کچھ ٹھیک کہتی ہو، میں معشوقائیں بناتے بناتے تھک چکا ہوں، یہی وجہ ہے میں لفظ بیوی سے چڑتا ہوں۔ مگر میں تمھیں بہن تو نہیں بنانا چاہتا، لاحول ولا قوۃ!''

''کیوں؟''

''کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک سرے سے میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا، بہت دفعہ میرے دل میں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

تمھارے طرف سے ایسے خیال آئے ہیں جو ایک بہن کے لئے نہیں آتے، تم ابھی نہیں سمجھو گی۔ ایک دن آئے گا۔ جب ان الفاظ کے معنی تم خود بخود سمجھ جاؤ گی، تم۔۔۔۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم بھائی نہیں بلکہ دوست سمجھو، ایسا دوست جس سے کسی قسم کا تکلف نہ ہو۔''

''کیوں نہیں۔''

''میری بہن زندہ رہتی تو میں اسے کبھی بھی صرف بہن نہ سمجھتا، اس کی شادی ہو جاتی۔ مگر ہم بہترین دوست رہتے۔''

''آپ شادی نہیں کریں گے؟''

''شادی سے تمھارا مطلب کیا ہے؟ کیا سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھنا اور ایک لڑکی پکا کو اسٹامپ لگا کر وصول کرنا یہی شادی ہے، تو میں کنوارہ ہی بھلا، اور ویسے تو۔۔۔۔'' ثمن کچھ جھینپ گئی۔

''تو اس میں کیا ہوا۔'' وہ جلدی سے بولا! ''مرد ہونا کوئی عیب تو نہیں گو ہم کہتے نہیں مگر ہماری ماں بہنیں خوب جانتی ہیں کہ۔۔۔ ہم مرد ہیں۔ میں اسے گناہ نہیں سمجھتا۔''

''آپ شادی کے خلاف ہیں، میرا مطلب ہے نکاح کے۔''

''قطعی، نکاح ایک وعدہ ہے جو صرف اس لئے پختہ کیا جاتا ہے کہ کہیں وعدہ کرنے والا مکر نہ جائے، ذرا سوچئے تو سہی زندگی کے اتنے اہم معاملے کو کاغذی گواہ کس طرح مضبوط بنا سکتے ہیں، شادی ایک فعل ہے قول نہیں۔''

ثمن کچھ نہ سمجھی۔

''تو پھر لوگ نکاح کیوں کرتے ہیں۔''

''گدھا پن کرتے ہیں۔''

''واہ'' ثمن لاجواب ہو کر ہنسی۔

نوری نے کروٹ لی اور اس کا سر بازو سے ڈھلک کر تکیے پر ٹک گیا، ثمن نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا شاید وہ آنے والے کل کے سب سے زیادہ رنگین لمحوں کو سمیٹ کر خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھیں نیم وا تھیں۔ رات کی تنہا خاموشی میں ثمن کا جی چاہا کاش وہ کسی طرح جھانک کر اس کی جگمگاتی دنیا کی ایک جھلک دیکھ سکتی۔ مگر افتخار کے الفاظ گھوم کر پھر اسے اپنی دنیا میں واپس گھسیٹ لے گئے۔

''اور کیا گدھا پن تو ہے ہی۔ اگر مجھے کوئی عورت کہے کہ مجھے تمھارا اعتبار نہیں چار آدمیوں کے سامنے کہو کہ تم مجھے۔۔۔۔ مجھے۔۔۔'' ثمن کی گھبراہٹ دیکھ کر وہ رک گیا تھا، مگر پھر جلدی سے بولا۔

''تو میں اس سے کہوں گا بیگم صاحبہ چلتی پھرتی نظر آؤ، ہمیں چار آدمیوں کی گواہی کے بغیر ہی کوئی چیز مل جائے تو پھر۔۔۔۔''

''مگر یہ تو ناانصافی ہے آپ کی!'' وہ جلدی سے بولی۔

''کیوں؟''

''کیونکہ جن عورتوں کی زندگی اس طرح خراب ہو جاتی ہے وہ کیا کریں۔''

''کیوں صاحب عورتوں کی زندگی خراب ہو جاتی ہے تو مردوں کی نہیں ہوتی؟''

''لوگ عورتوں کی ہی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔''

''مردوں کی نہیں کرتے؟''

''مرد پرواہ نہیں کرتے!''

''تو عورتوں سے کون کہتا ہے کہ وہ پرواہ کریں۔ کہہ دیجئے سماج۔''

''اور کیا؟''

''اور یہ سماج بنایا کس نے؟ خود انڈا پھوٹ کر بچہ نکل آیا؟''

''نہیں تو!''

''جب ہم نے ہی سماج بنایا ہے تو ہم ہی توڑ سکتے ہیں۔''

''مگر مصیبتیں ہیں جو صرف عورتوں کو بھگتنا پڑتی ہیں۔'' ثمن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''یعنی بچہ وغیرہ؟''

''جی ہاں۔''

''بھئی واہ کیا عورت ہیں آپ بھی کہ اپنے عظیم ترین فرض کو مصیبت سمجھتی ہیں۔ جبھی تو لوگ کہتے ہیں عورتوں کو زیادہ نہیں پڑھانا چاہئے۔''

''ارے!'' اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے اور وہ اس کی بدحواسی پر زور زور سے ہنسا۔

''مگر جو بچے ہوں گے وہ۔۔۔''

''حرامی ہوں گے وہ۔۔۔''

''حرامی ہوں گے؟''

''ہاں۔۔۔۔۔''

''حد ہے، بھئی ہمارے اور آپ کے نظریے بہت مختلف ہیں، میں حرام حلال اور جھوٹ سب ایک ہی چیز سمجھتا ہوں، قدرت کے اصول کی پیروی کر کے پیدا ہونے والا جاندار، انسان بننے کا حقدار ہے۔''

''مگر میرا مطلب ہے۔۔۔۔ اقتصادی مشکلات۔''

''تو یوں کہئے میاں نہیں بنک کی کتاب چاہئے۔''

''یونہی سمجھ لیجئے۔''

ثمن کو کچھ لاجواب دیکھ کر افتخار کو دکھ سا ہوا، وہ بولا! ''ٹھیک کہتی ہو، یہی تو وہ سوال ہے جس کا جواب میں برسوں سے تلاش کر رہا ہوں۔ ابھی تو نہیں، شاید ہماری تمھاری زندگی میں وہ وقت آ جائے کہ اس کا جواب

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

مل جائے۔"

دیر ہو گئی تھی اور وہ واپس کیمپ کی طرف چل دیئے۔

"ہاں ایک بات اور، جو تم سے کہنا بھول ہی گیا۔" اس نے رضائی دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا پھر رک گیا۔ "ہاں تم اپنی رضائی مجھ کو دے سکتی ہو؟"

"رضائی؟"

"ہاں اس کوٹ کے بدلے میں نہیں بلکہ مفت۔"

"لے لیجئے۔" وہ الٹی احسان مند تھی۔

"سلام" اس نے مسخرے پن سے ماتھے کو ہاتھ لگائے۔

"ایک بات اور، وہ یہ۔۔۔ کہ میں سینی ٹوریم جا رہا ہوں، ڈاکٹروں نے مجھے ٹی بی بتا دی ہے اور۔۔۔؟ وہ ثمن کی گھبراہٹ پر مسکرایا، جیسے یہ کوئی نئی بات ہے، "پرانی شکایت ہے، دو دفعہ بھوالی رہ آیا ہوں مگر اب کے شاید جلدی نہ نکل سکوں۔"

"لیکن آپ اتنے بیمار تو نہیں نظر آتے۔"

"نظر تو نہیں آتا، مگر تم جیسی نظروں کو، اندیشہ ہے کہ کہیں میرے جراثیم دوسروں کو نہ لگ جائیں، یہ چھوت کی بیماری ہے۔" اس نے معنی خیز قہقہہ لگایا، ہماری مہربان گورنمنٹ نے "بی" کلاس میں میرے لئے پلنگ ڈلوا دیا ہے۔ سارا خرچہ یونیورسٹی اور حکومت کے ذمہ۔" وہ ہنستا رہا۔

"جب شارع عام پر ایک گڑھا ہو کر اس میں غلاظت بھر جائے، جو ہر آنے جانے والے کے منہ پر اچھلنے لگے تو حکومت کا فرض ہے کہ عام صحت کی خاطر اسے دور کر دے۔۔۔ شکر کرو کہ پونا جیل سے بچ گیا۔۔۔ ورنہ۔۔۔ اوہ یہ میں کیا بکنے لگا۔" چلنے سے پہلے اس نے کہا۔

"ہاں ایک وعدہ کرو۔۔۔ یہ رضائی تو میں نے لے لی۔ اب ایک اور بھی قیمتی وعدہ مانگنا چاہتا ہوں۔"

"کہئے" وہ اب بے صبر ہو چکی تھی۔

"کہ جب کبھی میں تمھیں کوئی ہدایت دوں تو تم اس پر عمل کرو گی۔ میرا مطلب ہے کہ میری وہ درخواست جس سے تمھارے اوپر کوئی آنچ نہ آئے۔"

"میں آنچ سے نہیں ڈرتی۔"

"مجھے معلوم ہے، مگر میں تمھیں اپنے تندور میں نہیں گھسیٹنا چاہتا۔ میں پختہ وعدہ نہیں چاہتا، سوچ لو، اگر تم سمجھتی ہو کہ۔۔۔"

"آپ نے میری خاموشی کا غلط اندازہ لگایا۔"

"تو۔۔۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔"

"تو آؤ۔"

قلم اور کاغذ لے کر افتخار نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ جب سارا کیمپ غفلت کی نیند سو رہا تھا، دو سر پھرے انسانوں نے سر جوڑ کر چند سطور لکھیں۔

"آنکھیں بند کرو۔" افتخار نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

"ہائے!" سوئی کی نوک شاید انگلی میں گہری اتر گئی۔

"لکھو"

"شمشاد!" ثمن نے لرزتے ہوئے انگلیوں سے لکھ دیا۔

"خدا حافظ۔" وہ رضائی میں منہ چھپائے تاریکی میں ڈوب گیا۔

ثمن جاگ اٹھی، یہ خواب اس نے لفظ بہ لفظ دہرا لیا؟ بکھرتے ہوئے حواس سمیٹ کر اس نے پھر زنجیر کو پکڑا۔ متحیر آنکھیں پھاڑے جیسے وہ اب بھی کیمپ کے جلتے ہوئے پردے کو دیکھ رہی تھی۔ آج، آج اسے کسی نے خوب جھنجھوڑیاں دے کر زندگی کے نئے موڑ پر دھکا دے دیا تھا۔ دیر تک حواس رسیاں تڑا کر بھاگتے رہے، مگر دور دھندلی روشنی میں اسے بہت ہی لمبا راستہ انتہا کرتا نظر آ رہا تھا۔ آج اس نے اپنے خون سے اپنے دیوتا پر عبودیت کا قشقہ کھینچ دیا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا خون اتنا سرخ ہے، اور یہ نام شمشاد، سرخ پرچم کی طرح شفق بن کر کتنی دور تک پھیلا آ رہا تھا۔

اس نے پھر بن بیاہی دلہن کی طرف دیکھا، کل وہ بھی اپنے دیوتا کے حضور میں ماتھا ٹیک دے گی، نوری دھندلی ہو کر، ایک آدمی کی عورت رہ جائے گی، غرور اور اطمینان کی لہروں نے ہلکورے لے کر اسے سلا دیا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(30)

شادی کے درمیان میں اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے کتنے ہی بزرگوں سے بڑی ہوگئی ہے۔ اس نے بڑھیوں کو خوب چھیڑا یہاں تک کہ وہ مچل مچل گئیں۔ وہی اعتراض جنہیں سن کر وہ رویا کرتی تھی اس نے توڑ مروڑ کرا لٹے انہی کے سر مار دیئے اور اس مسخرے پن سے کہ معترض کھسیا گئے، اور لوگ ہنس دیئے۔ خصوصاً ان بڑھیوں کو تو رلا کر چھوڑا جو ہر بات پر۔۔۔۔

''اے بے نوج جو ہمارے زمانے کی لڑکیاں ایسی بے شرم ہوتیں!''

''توبہ ہے، گریبان تو دیکھو سارا آگا پیچھا کھلا پڑا ہے۔''

''جب دیکھو جب ٹھی ٹھی، جب دیکھو دھا چوکڑی، لڑکیاں ہیں کہ گھوڑے۔''

ان لوگوں کو جلا کر اسے بڑا مزا آیا۔ نہایت ڈھٹائی سے اس نے ان کی ہر بات کی کاٹ شروع کر دی، گویا ساری عمر کی ڈانٹ کا آج پورا پورا بدلہ لے کر چھوڑے گی۔ اسے آج معلوم ہوا کہ بجائے غصہ کے ان بڈھوں پر رحم آنا چاہئے۔ جوانی کہیں ڈانٹ پھٹکار سے دبتی ہے؟ ہار تو ہمیشہ بوڑھاپے کی ہے۔ قدرت کسی کو خزاں کے بے رحم ہاتھوں سے مسلنا شروع کر دیتی ہے، تو وہ دانت کچکچا کر بہار ہی پر جلن اتارتا ہے۔ مسرت بھرے قہقہے، ٹھی ٹھی، عشق بدمعاشی اور جوانی بے حیائی نظر آنے لگتی ہے۔ جوان لڑکیوں کی چکنی نرم باہیں اور سڈول جسم دیکھ دیکھ کر بڑھیوں کو اپنے گھنائی جیسے چرخ جسم پر غصہ آتا ہے، جی پر چھریاں چل جاتی ہیں۔ یہی جی سے دعا نکلتی ہے کہ کوئی ان کی طرح جوانی کو بھی خزاں کی چادر میں لپیٹ کر ان کے ساتھ ساتھ دفن کر دے تا کہ وہ بھی ان کی طرح مردہ اور بے رنگ ہو جائیں۔

محفل میں جتنی لڑکیاں نظر آئیں سب بد مذاق اور جھوٹی۔ دو چار لڑکے دکھائی دیئے وہ ڈرپوک اور دبوے، مگر پھر بھی ان میں گھل مل گئی تاکہ ایک دفعہ وہ بھی پڑھی لکھی لڑکیوں کے اخلاق سے متاثر ہو جائیں۔ چند لڑکیاں پڑھی لکھی بھی تھیں مگر شمن کی طرح لڑکوں سے گھل مل جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ ان کے لئے لڑکے اب بھی رومنٹک، بدمعاش اور بے رحم واہمے بنے ہوئے تھے جن کی آوازیں سن کر وہ اصطبل میں بندھی

گھوڑیوں کی طرح ہنہناتے لگتیں۔ گو زبان سے بیٹھی لڑکوں کو کوس رہی تھیں، مگر جان بوجھ کر ایسی جگہ جا رہی تھیں کہ ان سے ٹکر ہو جائے۔ اور پھر وہاں سے ایسی اترا کر شرماتی لجاتی بھاگتیں گویا کچھ چھن ہی تو گیا۔ پھر گھنٹوں سینے میں ڈوبی دل دھڑکایا کرتیں۔ لڑکے بھی بھاگ دوڑ میں جو کچھ نہ کر جاتے کم تھا۔

''کم بخت کہیں کا۔۔۔ میرا کلیجہ اب تک کانپ رہا ہے۔'' وہ اس پر لذت ٹکر کی گدگدیاں یاد کر کے دوسری ٹکر کی اک آرزو میں لرزا کرتیں۔ اس کے علاوہ کئی لڑکیاں اپنی ہونے والی ساس نندوں سے وہ شاندار عشق چلا رہی تھیں کہ کیا کہنے، وہ ان سے ہونے والے شوہر کا تصور وابستہ کر لیتیں اور ان سے ایسے شرماتیں جیسے نئی دلہن دولہا سے شرماتی ہے۔ بھلا اس رومانی عیاشی سے کون روک سکتا ہے؟

کہاں یہ رنگین فضا اور کہاں کالج کے کھلے میدان میں پروفیسروں کے زیر سایہ ایک دوسرے سے مصنوعی ہنسی طاری کر کے پوچھنا۔ ''آپ کا مزاج کیسا ہے؟'' گویا ایک لڑکی کو ایک لڑکے کے مزاج ہی کی تو پڑی رہتی ہے۔

شمن کو محسوس ہوا کہ یہ آزادی ہی قید ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں یہ بوسیدہ لوگ کہ عورت کو پردہ میں رہنا چاہئے۔ سچ تو یہ ہے کہ کتنے مزے سے پردہ میں آنکھ مچولی کھیلی جا سکتی ہے۔ جی چاہا جس سے چھپ گئے اور جی چاہا جسے دکھا دیا۔ بدصورت تو خاص فائدہ میں رہتی ہوں گی جسے ہلکی سی جھلک دکھا دی وہی حسین سمجھ بیٹھا۔ یہ تھوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں اور ہر عیب سامنے رکھا دل دکھا رہا ہے۔

جب ہی تو پچھلے زمانے کا ادب اٹھا کر دیکھو ہر عورت حسن مجسم رکھتی ہے۔ عورت حسینہ تھی یا دوشیزہ اور اب اسے استانی، ڈاکٹرنی، نرس، فقیرنی، بھنگن یا لڑکی کہا جاتا ہے۔ یہ پردے سے نکل کر حسینہ سے صرف عورت کیوں رہ گئی؟ وہ اس کے سارے قتل و غارت کے حربے کیا ہوئے؟ تیر نظر کند اور ابروؤں کی دھار کھٹل! بات یہ ہے کہ پردہ سے نکل آنے پر غازہ، سرمہ، مسی کا راز کھل گیا۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ ابرو نوچ کر کمانیں بنائی گئی ہیں اور آنکھوں سے بجلیاں مسکارہ کی مدد سے گرائی جا رہی ہیں۔ ہونٹ، ''لپسٹک'' کے صدقے برگ گل بنے ہوئے ہیں اور گالوں پر روژ کی شفق کھیل رہی ہے۔ گو ویسے ہندوستان میں جتنی حسن کی قلت پہلے تھی، اب بھی ہے مگر یہ پردہ ہٹ جانے سے تو نظر کا پردہ ہی اٹھ گیا۔ عورت بڑے نقصان میں رہی۔

دولہا شام کو گھر میں آیا تو صنف نازک بھوکی مکھیوں کی طرح جٹ گئی۔ اچھی بھلی پردہ والیاں پل بھر کو سٹپٹائیں پھر وہ بھی مست ہو گئیں۔ مرد میں خواہ وہ دولہا ہی کیوں نہ بنا ہوا ہو، کتنی جاذبیت ہوتی ہے کہ اچھے بھلے دماغ کھو بیٹھتے ہیں، اس پر ستم یہ کہ ساتھ ساتھ دو چار دولہا کے شہ بالے بھی رینگ آئے۔ پہلے تو دو چار ٹونی پھونی ناکارہ بڑھیوں نے غل مچایا مگر پالا جوان ہی مار لے گئے۔ یہ طے ہوا کہ شہ بالے خیر بیٹھ جائیں بشرطیکہ اپنی رشتہ داروں کے دوپٹوں میں منہ چھپانے کا پختہ وعدہ کریں۔ ان کی دوپٹوں سے جھلکتی شریر آنکھوں کو دیکھ کر شمن کو بے اختیار بلقیس کی سالگرہ یاد آ گئی جب کیرم کھیلنے میں رشید کو رومال کا گھونگھٹ نکال کر کھیل میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''یہ بھی دولہا کے دم چھلے کیوں آئے ہیں؟'' شمن نے مصنوعی غصے سے پوچھا تو ان میں سے ایک کبوتر باز جیسی آنکھوں والے نے کچھ دانتوں ہی دانتوں میں جواب دیا جس پر اس کے ساتھی نے کہنی ماری۔

''پاگل ہے بے چارا'' ایک نے شمن سے سفارش کی۔

''پاگل نہیں دیوانہ کہو'' اس نے پھر کبوتر باز جیسی آنکھیں چلائیں اور پھر کچھ بڑبڑایا۔ جس پر اس کے ساتھی نے چپ رہنے کی رائے دی۔

جتنی دیر دولہا دلہن سے آرسی مصحف کی کشتی لڑتا رہا لڑکے دوسرے لڑکیوں کے چٹکیاں بھرنے کی تاک میں لگے رہے۔ معلوم ہوتا تھا ایک نہیں چھ سات آرسی مصحف ہو رہے تھے۔ لڑکیاں چڑھ کر باتیں سنا رہی تھیں مگر ہنسنے کا نام نہ لیتی تھیں، جمی ہوئی مقابلہ کر رہی تھیں۔

رخصت ہوتے وقت نوری کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر روئی۔ شمن جل گئی۔

''بن کیوں رہی ہو، مری تو جاتی تھیں شادی کے لئے۔'' واہ!

''نوری کھسیا کر نتھ سنبھالنے لگی۔''

''یا اس لئے خوشی کے مارے رو رہی ہو کہ اتنی مشکلوں سے شادی ہوئی۔'' نوری چپ ہو گئی اس کے آنسو بھی نہ جانے کیسے خشک ہو گئے۔

''کوئی زبردستی ہو رہی ہے تمہاری شادی، کیوں کر لی۔ اب طلاق لے لو۔'' شمن نے اسے خاموش دیکھ کر اور جلے کٹے جملے کہے۔

اسے نوری بالکل گائے بیل کی طرح لگ رہی تھی۔ اکیاون ہزار میں وہ جوانی کا سودا کر کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی۔ بے وقوفوں کی طرح نہیں پکا کاغذ لکھا کر کہ اگر وہ بعد میں تڑپے تو، اور پھندا اس کے گلے میں تنگ ہوتا جائے۔ اور وہ چغد بھی ڈھول تاشے سے اسے خرید کر لے جا رہا تھا۔ آخر فرق ہی کیا ہے اس سودے میں اور آئے دن جو چاوڑی میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے۔ وہ چھوٹا موٹا بیوپار ہے۔ جیسے کچالو پکوڑیوں کی چاٹ، اور یہ لمبا ٹھیکہ ہے جب تک ایک فریق خیانت نہ کرے بیوپار چلتا رہتا ہے۔ ورنہ سودا ٹھپ!

مگر جب دولہا نوری کو لے کر جانے لگا تو شمن کے دل کے کسی نامعلوم کونے میں ایک عجیب سا شبہ پیدا ہوا جیسے نوری فروخت نہیں کی گئی۔ بلکہ یہ جوا سے کلیجے سے لگائے جا رہا ہے اپنی زندگی کے پیروں میں زنجیریں ڈالنے لے جا رہا ہے۔ یہی نوری، یہ کم عمر الھڑ لڑکی اس کی ہستی میں ایسے گہرے پنجے گاڑے گی کہ وہ دنیا کو چھوڑ چھاڑ اسی کے ہاتھ میں لگام دے کر اسی کے چلائے راستے پر چلتا چلا جائے گا۔ حیف ہے کہ یہ مرد عورت کو پیر کی جوتی، ناقص العقل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، مگر جب یہ جوتی ان کے سر پر بجتی ہے تو احساس خودی بھی فنا ہو چکتا ہے۔ اسے سارے مرد مظلوم نظر آنے لگے اور ساری سونے روپے سے لدی ہوئی بیویاں ظالم، جو ان کی کمائی پر بالکل اسی طرح قابض تھیں جیسے خون چوسنے والے سرمایہ دار غریبوں کی مشقت پر۔ وہ اپنے جسم

کی قیمت لیتی تھیں۔ بجائے درجنوں کے صرف ایک سے۔

پھر یہ مرد عورت کو کمزور کیوں کہتے ہیں۔ شاید اس طرح خود ان کی کمزوری آڑ میں چھپ جاتی ہے۔ ظالم کبھی پکار پکار کر اپنے ظلم کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا، بزدل ہی شیر کی طرح گرج کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ مگر عورت؟ عورت اس حاکم کی طرح ہے جو ''پرجا کا چاکر'' بن کر انہیں الو بناتی ہے۔ اس کی چالیں کس قدر خطرناک اور پراسرار ہیں! بجائے شرمندگی کے اسے اپنی نسوانیت ایک بلند چیز نظر آنے لگی۔

مراثنیں گا رہی تھیں ان کی آواز میں رقت تھی!

''ہم تو بابل تورے کھونٹے کی گیاں
جدھر ہانکو ہنک جائیں!''

''کیا کہنے ہیں اس معصومیت کے گویا یہ گائیں بیلوں سے زیادہ بھولی ہوتی ہیں۔'' شمن نے پاس بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے کہا۔

''اور کیا بہن گائے بے چاری تو ہوتی ہی سیدھی ہے۔''

''کیا گائے سینگ نہیں مارتی۔ ویسے بیل بے چارا زندگی میں زیادہ الو بنتا ہے۔ یہ کولہو کا بیل غریب کس کے سینے میں سینگ مارنے جاتا ہے۔ ہل کے بیل کو کب فرصت ملتی ہے کہ لوگوں سے مذاق کرنے جائے لیکن یہ گائیں! سوائے گھاس چبانے اور دودھ دینے کے اور کیا کام کرتی ہیں؟ ان کی بلا سے دودھ نچڑے نے نہ پیا آدمی نے کھیر بنا کر کھائی۔ نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پیر اور پھر بھی انسان گائے کی پوجا کرتا ہے اور بیل کو پوچھتا بھی نہیں۔''

اس کا اور بھی جی جل گیا۔ مراثنیں بے چارے دولہا کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ جی چاہا جا کر ان کا منہ مسل دے۔ کم بختوں! بیلوں میں بھی جان ہے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

تیسری منزل

(31)

شادی سے لوٹی ایسا معلوم ہوا کہ دو عزیزوں کو دفن کر آئی۔ ایک تو نوری اور دوسرا افتخار نوری کو تو دوسرے دن سے سوائے دولہا کی شرارتوں کے اور کسی جھگڑے میں دلچسپی نہ رہی۔ سارا دن بیٹھی وہ ہمجولیوں کو سرگوشیوں میں افسانے سنا سنا کر بے حال کرتی رہی۔ پتہ نہیں ان ہمجولیوں کو سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی۔۔۔ کس چیز کی تلاش تھی۔ یا شاید یہ وہی جذبہ تھا جو لوگوں کو قصے کہانیوں میں جنسی ذائقہ کا متلاشی بنا دیتا ہے۔

اور افتخار؟۔۔۔ وہ الہ آباد سے سیدھا بھوالی چلا گیا۔ انچارج پروفیسر نے تذکرے کے طور پر بتا دیا کہ انھیں بڑا افسوس ہے کہ افتخار ان کے ساتھ نہیں جا سکا بلکہ وہ اپنے پرانے مرض کے علاج کے لئے سینی ٹوریم چلا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے چند دعائیہ جملے بھی کہے مگر وہ صاف ڈھکوسلہ معلوم ہوئے۔ وہ خوب جانتی تھی کہ خواہ اللہ کتنا بھی افتخار پر مہربان ہو، اگر دنیا نہ چاہے تو وہ کبھی بھی بھوالی سے صحت یاب کر نہیں نکل سکتا۔ گو لوگ اس کی موت کا سارا الزام ملک الموت اور نوشتہ تقدیر کے سر تھوپ دیں گے۔

افتخار کے بعد سیتل خود بخود یونیورسٹی کی باگ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پشت پر پروفیسروں اور پرنسپل کی شفقت بھی تو تھی۔ نہ جانے کن ہتھکنڈوں کی مدد سے اسے پریذیڈنٹ بنا دیا گیا۔ ایلما کچھ ششدر کچھ جھلائی سی بے تکی باتیں کرنے لگی۔ اس نے سیتل کی مخالفت کی، نہ ہی یونین کے کسی جھگڑے میں دلچسپی لی۔

نہ جانے وہ کس چیز سے کچھ خوفزدہ سی نظر آتی تھی۔ وہ اس کی بزرگی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کسی نامعلوم دھمکی سے خوفزدہ ہو جاتیں تو وہ بالکل معصوم بچے کی طرح معصوم اور بھولی معلوم ہونے لگتیں۔ اس کی ہنسی میں جھینپ آ جاتی اور دانت مصنوعی چینی کے ٹھنڈل ٹکڑے بن جاتے۔

سیتل کے عروج نے بجائے مرعوب کرنے کے اسے ڈرا دیا تھا۔ مگر یونین کی ساری مردنی غائب ہو کر نئی جان پڑ گئی۔ ترقی پسند گروہ میں ممبروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ بڑے جوش و خروش سے میٹنگ پر میٹنگ ہونے لگی۔ نئے قواعد بنے، کئی شاخیں بنائی گئیں۔ ڈرامہ سیکشن، آرٹ سیکشن اور گاؤں سدھار کی اسکیم بنی اور ہنگامے شروع ہو گئے۔

چند روز تو شمن کچھ غیر مطمئن سی رہی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ ایک دم سے افتخار کی جگہ سیتل کو دیکھنے کی کیسے عادت ڈال لے۔ کالج اور یونیورسٹی کی زندگی بھی پانی کا بلبلا ہوتی ہے، جو چند لمحے تیرتا رہتا ہے تو ہزاروں رنگینیاں اس کے خول پر منعکس رہتی ہیں۔ مگر جونہی پھوٹا سب کچھ غائب۔ وہی افتخار جس کا وجود یونیورسٹی میں قطبی ستارے کی سی حیثیت رکھتا تھا، آج آسمان سے ٹوٹ کر نہ جانے گمنامی کے کس غار میں جا گرا تھا اور در و دیوار کو اس کی کمی بھی تو محسوس نہ ہوتی تھی۔ گویا خاک کا ایک حقیر ذرہ تھا۔ جسے آندھی نے اٹھا کر دور پھینک دیا تھا تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ دو چار دن تو غلطی سے لوگوں نے بجائے سیتل کے افتخار کا نام لیا، مگر پھر بہت جلد زبانیں نئے بول کی عادی ہو گئیں۔ اور سیتل کی خوش بیانی، حسین اور لمبے چوڑے جسم نے افتخار کی یاد کو دلوں سے مار بھگایا۔ ایلما سیکرٹری رہی لیکن شمن کو خزانچی کی کرسی سنبھالنی پڑی۔ نئے عہدے کی دہشت نے اسے کچھ ایسا بدحواس کر دیا کہ سوچے سمجھے بغیر وہ ترقی پسند گروپ کی پرجوش رکن بن گئی۔

ہیرا جب تک کان کے گمنام اندھیرے میں رہتا ہے بے کار کنکری بنا پڑا رہتا ہے۔ مشک کو جب تک گھسا نہ جائے تو فاسد مادے کی ایک گولی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ سیتل کے سوا کسی نے بھی نہ پرکھا کہ شمن کی اس پریشان اور ڈری ہوئی شخصیت کی آڑ میں استقلال اور بغاوت کا لاوا دبا پڑا ہے۔ اس خاموش اور چٹیل میدان کے سپاٹ سینے میں آگ کی تپش چھپی سو رہی ہے، صرف جگانے کی دیر ہے، اور پھر وہ ساری اونگھتی ہوئی طاقتیں پورے جوش سے ابل پڑیں گی۔ شمن کو اپنی ہستی کے اس انوکھے ٹکڑے کے وجود کا علم بھی نہ تھا، وہ اس ننی شمشاد کے تخیل کو پہلے تو واہمہ سمجھی مگر پھر اس نے اسے شخصی طور پر دیکھ لیا۔ وہ خود اس کی جگمگاتی ہوئی لپک سے آنکھوں میں چکا چوندی محسوس کرنے لگی۔ دور بہت بلندی پر اس نے اس ننی چیز کو کھڑے دیکھا۔ باد مخالف کے ان ضدی تھپیڑوں کے سامنے دشمنوں کی فوج سے مقابلہ کرتی ہوئی یہ مقدس طاقت اب تک کہاں پوشیدہ تھی۔ وہ پرانی شمن اس کے سامنے کس قدر بودی اور حقیری معلوم ہو رہی تھی۔

''کوئی چیز ہے، جو عام لوگوں کو چھوڑ کر صرف اسے بخشی گئی ہے!'' اور بہت جلد اس نے اپنے آپ میں ایک پراسرار کشش، ایک خاموش دبدبہ اور چھپی ہوئی شان پائی۔ سیتل کی رائے سے اس نے اس نئی شخصیت کو جس کا انکشاف اسے بھونچکا چھوڑ گیا تھا سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کی۔ ادب اور فلسفہ کا مطالعہ کرنا شروع کیا، شاعری سے دلچسپی پیدا کی اور بہت تیزی سے وہ پرانا خول جو کہ چھلکے کی طرح چٹخ گیا اور اندر سے ٹھوس مینگ نکل آئی، اس بھرے چھلکے کو اس نے مسل کر دور پھینک دیا اور مینگ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر جتنا جتنا وہ اسے پہچانتی گئی معمہ اور پیچیدہ اور خمدار ہوتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا نئی شمن اس سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ جونہی وہ اسے چھونا چاہتی، وہ ہوا میں تحلیل ہو کر پرے چلی جاتی، کبھی تو ایسا معلوم ہوتا اس نے اسے پکڑ ہی لیا ہے مگر قبل اس کے کہ وہ ٹھیک سے اس کا ناک نقشہ پہچان سکے وہ ہاتھ چھڑا کر غوطہ مار جاتی، پھر وہ دگنے شوق سے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیتی مگر بعض وقت اس دوڑ میں وہ کسی ایسے بھیانک اور سنسان گوشے میں پہنچ جاتی جہاں وہ خود اکیلی رہ جاتی۔ اور وہ تخیل کی شمن واہمہ بن کر پگھل جاتی۔ اس بنجر اور غیر مانوس فضا سے اس پر

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

خوف طاری ہو جاتا اور وہ الٹے پیروں بھاگ آتی۔ جیسے غلط راستے پر جانے سے انسان پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی وہاں سے کبیدہ خاطر لوٹ آتی۔

شمن ستیل کو کیا سمجھی تھی اور وہ کیا نکلا! گوشت پوست کے شاندار پہاڑ کی تہوں میں ایک فلسفی شاعر پوشیدہ تھا جس کا دل انسانیت سے لبریز اور محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس کی اندرونی زندگی قوم اور ملک کے قدموں میں نچھاور ہونے کے لئے بے قرار تھی۔ ظاہر میں وہ دنیادار اور کھیل کود کا شوقین نظر آتا تھا۔ مگر کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان مسکراہٹوں میں کتنے آنسو جذب تھے۔ ان قہقہوں میں الجھی ہوئی آہیں صرف سننے والے کانوں کو ہی سنائی دے سکتی تھیں۔ وہ خوف جو شمن ہمیشہ اس کے وجود سے محسوس کیا کرتی تھی قطعی بے بنیاد ثابت ہوا۔ وہ صرف دیکھنے میں بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ یوں کو کتنے ہی سانپ دیکھنے میں زہریلے معلوم ہوتے ہیں مگر چوہے سے بھی زیادہ بے ضرر ہوتے ہیں۔

وہ بذاق بھی نہ تھا بعض وقت تو لوگ اس کی باتوں پر ہنستے ہنستے بے تاب ہو جاتے تھے۔ پریذیڈنٹ ہونے کی وجہ سے اسے ہر ایک کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔ مس بوگا جو کھلے بندوں اس پر انوکھے قسم کا عشق برسایا کرتی تھیں، اس کے ساتھ بڑی تندہی سے کام کرتیں۔ ہر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ مجمع میں ان کی موجودگی لازمی تھی۔ جب تک سوکھی اور مشکل باتیں ہوتی رہتیں وہ فرمانبردار بچے کی طرح خاموش بیٹھی سنا کرتیں۔ ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو پریشان ہو کر شی شی کرنے لگتیں۔ اگر سخت ضرورت سے اٹھنا ہوتا تو اپنی ننھی سی گرگابی کے نازک پنجوں پر لنگڑے کوے کی طرح بغیر آواز کئے پھدکنے کی کوشش کرتیں۔ کوئی بات کہنا ہوتی تو بالکل کان کے سوراخ سے منہ چپکا کر سہمی ہوئی گھس پھسا دیتیں۔ لیکن ان کی یہ ساری احتیاطیں حاضرین جلسہ کی توجہ کو اور بھی منتشر کرتیں۔ وہ مقرر کے مزاحیہ جملے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتیں اور جونہی موقع ملتا سب سے پہلے تالیاں اور قہقہہ شروع کر کے سب سے آخر میں بند کرتیں۔ بعض وقت کوئی دلچسپ بات سنائی نہ دیتی یا سمجھ میں نہ آتی تو بچوں کی طرح پریشان ہو کر ''اوہ اوہ'' کر کے پاس بیٹھنے والوں سے اس کا مطلب پوچھنے لگتیں۔ اس طرح ان کا قہقہہ ذرا دیر سے ظہور میں آتا۔ ستیل انہیں بڑے پیار سے جھڑکتا تو کم عمر بچیوں کی طرح زبان نکال کر شرمانے لگتیں۔

یونیورسٹی میں بہت سے مذاقیہ لطیفے انہی کی شخصیت سے ایجاد کئے گئے تھے اور ہر چھوٹا بڑا ان سے بے تکلف تھا۔ کچھ دنوں سے وہ فرسٹ ایئر کے نئے لڑکوں کی چڑ مقرر کر لی گئی تھیں۔ کتنی ہی فاختائیں مس بوگا سے وابستہ کر کے ازائی جاتیں۔ کبھی کبھی وہ برا مان جاتیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ روتے میں وہ بڑی انگریزی میں خود اپنی حالت پر رحم کھاتیں اور دوسروں کو شرمندہ ہونے کی رائے دیتیں۔

کچھ دن سے یعنی افتخار کے زوال سے اور ستیل کے عروج کے بعد سے وہ عوام کی نظروں میں کچھ گر گئی تھیں۔ افتخار کی تو بات اور تھی پر ستیل تو ان کا اپنا آدمی تھا۔ اسے تو ان کی عزت افزائی کرنا لازمی تھا۔ اس کے انتخاب میں سب سے بڑی مدد مس بوگا کی تھی۔ ووٹ جمع کرتے وقت وہ ہر ایک کی جان کو آ گئی تھیں۔ اپنے

خرچ سے پمفلٹ چھپوا کر بانٹے اور جب اسے فتح نصیب ہوئی تو کسی کو خاص حیرت نہ ہوئی، پر وہ خوشی کے مارے پاگل ہو گئیں۔ لوگ چھیڑنے کے لئے مٹھائی مانگنے لگے تو انہوں نے سچ مچ ہی کھلا دی۔

ترقی پسند گروہ اب اور شدت سے اشتراکی رنگ میں رنگتا گیا۔ ممبروں کی تعداد بڑھ گئی۔ مس بوگا نے ایک دم اجرائی اطلس چھوڑ کر کھدر پہننا شروع کر دیا اور بے چاری ہر وقت کھدر اور اپنی پیٹھ پر نکلے ہوئے گرمی دانوں کو انگریزی کی گالیاں دیا کرتیں۔ دیکھنے میں ان کا جسم بے مصرف گوشت کا لوتھڑا تھا مگر ذرا سی تخمیس سے چھل جاتا اور فرصت کے لمحات عموماً ہر ایک کو گھاؤ اور پھنسیاں دکھانے میں صرف کرتیں۔ نیز ہزاروں قسم کے پاؤڈر اور مرہموں کے نام انہیں یاد ہو گئے تھے۔ ان کا جسم تو ایک ہی تھا مگر ہندوستان کے خطوں کی طرح زمین اور آب و ہوا مختلف تھی، اگر ایک مقام کی پھنسی زمبک سے اچھی ہوتی تو دوسرے حصے کی کیوٹی کیورہ سے، اگر پیٹھ کے دانے ڈسٹنگ پاؤڈر سے سوکھتے تو بغلوں میں بورک چھڑکنے سے شفا ہوتی، جتنا وہ دیسی مال کی سرپرستی میں بچا لیتیں اتنا ہی بدیسی دواؤں پر خرچ ہو جاتا۔ بعض لوگوں کی رائے سے انہوں نے نیم کی چھال اور ہندوستانی لیپ وغیرہ استعمال کئے مگر ان سے اور بھی بدحواس ہونا پڑا۔ ان کے برخلاف ششی ایک نئی لڑکی ہر چیز دیسی استعمال کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے برتن خالص گوالیار چینی کے اور کمرے کا پورا فرنیچر کشمیر اور میسور کی صنعت گری کا نمونہ تھا۔ مرشد آباد کی سلک، میسور کی جارجٹ اور مدورا کی ساڑھیاں پہنتی، اس کا سارا خاندان لیڈروں کا خاندان کہلاتا تھا۔ اس کے پتاجی بڑے پکے قوم پرست تھے اور ہر قومی جلسے میں اسے ساتھ لے جاتے تھے۔ جہاں وہ مائیکروفون کے سامنے بندے ماترم گایا کرتی تھی۔ اس کی شادی ہوگئی تھی اور میاں انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ باوجود دیس بھگت ہونے کے فیشن گھر میں کافی تھا۔ انگریزی زبان مادری بنی ہوئی تھی۔ ''ماما'' ''پاپا'' اور ''آنٹی'' کا رواج تھا۔ سب لڑکیاں فراک پہنتی تھیں اور بال کٹے ہوئے تھے مگر ایک تار بھی بدیسی نہیں استعمال ہوتا تھا۔ گو روحیں یورپ زدہ ہو چکی تھیں، مگر خول دیسی تھے۔

اس کے خاندان میں کوئی سرکاری نوکری نہیں کرتا تھا۔ تایا جی نے تو خطاب بھی لوٹا دیا تھا۔ اور کئی بار جیل بھی گئے تھے۔ بمبئی میں روئی کا بیوپار ہوتا تھا جس میں خاندان پھر کھپتا چلا جاتا تھا۔ پھر غلامی کی نوکری کون کرتا۔ دوسرے بیوپار میں بھارت کے مال کی اُنتی بھی ہوتی ہے۔ گو بعض بدذاقوں کا خیال تھا کہ لالہ جی کو بھارت کی اُنتی سے زیادہ اپنے بیوپار کی اُنتی کی فکر تھی۔ کھدر کے پرچار سے بھارت ورش کے بیوپاری بے شک وزنی ہو گئے مگر مزدور ویسے ہی ننگے بھوکے رہے، وہ پہلے بھی موٹا جھوٹا پہنتے تھے اور اب بھی وہی ملتا رہا۔ ہاں ذرا جاپان کے سستے مال نے ریشم پہنوا دیا، غریب بھی اطلس کے لمس سے واقف ہو گئے، بھنگی چمار بھی جاپانی کھلونوں سے کھیل لئے۔ چینی کے سیٹ اور شیشے کے گلاس چپڑاسیوں کی لڑکیوں تک کو جہیز میں ملنے لگے مگر یہ جاپانی مال کب تک؟

ترقی پسند گروہ کی ہر میٹنگ زیادہ دلچسپ ہوتی گئی۔ جتنے ممبر تھے سب ہی ہتھیلی پر جان رکھے ''کام'' کو تیار تھے۔ زیادہ تر ایسے لوگوں کی تعداد تھی جو دل شکستہ اور تقدیر کے ٹھکرائے ہوئے تھے اور زندگی کی تلخیوں سے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

واقف ہو چکے تھے۔ احمد کو ایک عیسائی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا جو انتہائی بے رحمی سے منہ موڑ کر ایک پروفیسر کی ہو رہی۔ رحمان اپنی چچازاد بہن کے عشق میں گرفتار تھا جس کے لالچی باپ نے اسے صرف اس لئے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری نہ حاصل کر سکا تھا اور وطن پرستی کا عزم کر چکا تھا، تین سال وہ متواتر مختلف مقابلوں میں شریک ہوا لیکن صرف خاندان والوں کی زبردستی سے، قوم کی خدمت سے اسے اتنی فرصت نہ ملی جو ان لغویات کی طرف توجہ دیتا۔

انور زنانہ کالج کی ایک توبہ شکن لڑکی سے محبت کرتا تھا جس کی خمیدہ زلفوں اور لچکتی کمر نے اسے شاعر بنا دیا تھا۔ امید کی جاتی تھی کہ بہت جلد وہ اپنے زمانے کا سب سے زیادہ ترقی پسند شاعر ہو جائے گا۔ اس کی شاعری بالکل انوکھی تھی، وہ پرانی روش سے ہٹ کر نئے راستوں پر گامزن تھی۔ اسکی رومانی ہیروئن زہر عشق، گل بکاؤلی وغیرہ کی فرسودہ محبوبہ سے بالکل مختلف ایک کالج کی روشن خیال حسینہ تھی جو بجائے ظلم وستم ڈھانے کے خود اس پر پروانہ وار فدا تھی۔ مگر ظالم سماج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک آئی۔ سی۔ ایس کے پلے بندھ چکی تھی۔ لیکن انور کی شاعری پیش گوئی کرتی تھی کہ انقلاب آئے گا، جب یہ ساری پابندیاں ٹوٹ جائیں گی، سماج کو میٹ کر رکھ دیا جائے گا، شفق خون برسائے گی اور زمین وآسمان سرخ ہو جائیں گے اور سرخ آندھیاں چلیں گی پھر اس سرخی کے شعلوں میں ساری بلائیں بھسم ہو جائیں گی۔۔۔۔ آزادی کا قرمزی جھنڈا لہرائے گا، مزدور کا راج ہوگا۔۔۔ اس وقت وہ اس لڑکی سے جی کھول کر محبت کرے گا اور اس کی مشکیں چوٹی کو حسین راتوں کی خاموشیوں میں کھول کر فضا میں خوشبو پھیلا دے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر پتہ نہیں کیا ہوگا۔

اس کے علاوہ آنند تھا جس پر شہر کی کل طوائفیں عاشق تھیں وہ ان کے یہاں مفت جاتا تھا۔ شراب ہر فنکار کے لئے ضروری ہوتی ہے اور وہ ایک سچا فنکار تھا۔ اس نے روسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کچھ سال تراجم چھپوانے کے بعد وہ اور طبع زاد کہانیاں لکھنے لگا تھا اور آثار کہتے تھے کہ بہت جلد وہ بلند مرتبہ مصنفوں کی صف میں آگے آگے نظر آئے گا۔

برکت عجب جنونی تھا۔ وہ تاریخ میں ایم اے کر رہا تھا مگر اس کا زیادہ وقت جنسیات کے متعلق مواد فراہم کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ جیمس، جوائس اور ڈی ایچ لارنس تو اس کے روحانی دیوتا تھے، جن کا وہ ہر قدم پر حوالہ دیتا اور جنسی آزادی کو سوارج سے بھی زیادہ اہم سمجھنے لگا تھا۔ اس کی زبان میں بڑی روانی تھی۔ اور عام طور پر لوگ قائل ہو جایا کرتے تھے۔ ثمن کو اس سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا اور اس کے اصولوں کی بھی کچھ شدت سے مخالف نہ تھی پھر بھی پتہ نہیں کیوں جب اکیلے میں وہ مختلف نفسیاتی نکات کی تشریح کرتا تو پسینے چھوٹ جاتے۔

''انسان جانور سے بھی گیا گزرا ہو گیا کہ جب تک اسے مذہبا، رسماً اور قانوناً سرٹیفکیٹ نہ دیا جائے محبت ہی نہ کرے۔'' لفظ محبت وہ بہت ہی پر معنی طور پر استعمال کرتا تھا۔ وہ ایسے پھسپھسے عشق کا قائل نہ تھا جس میں ٹھنڈی سانسیں اور شب بیداری شامل ہوتی ہے۔ اسے تو بس خالص عشق پسند تھا۔ اسے طوائفوں سے بڑی

شدت کی ہمدردی تھی۔ ان کی زندگی اور رہن سہن، ان کی مالی مشکلات، گندے مکانات مختلف انواع واقسام کی بیماریوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سناتا تھا کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی تو ثمن کو اس سے گھن آنے لگتی کہ کم بخت نہ جانے کن غلاظتوں میں غوطے مار کر آتا ہے اور کبھی اسے طوائفوں پر غصہ آتا کہ مردویاں کیوں اتنی گندی ہوتی ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتیں۔ ارے بھئی چکی پیسیں، کپڑے سییں اور عزت سے رہیں۔۔۔ مگر اسے خوب معلوم تھا کہ یہ طوائفیں اتنی الو نہیں۔ اگر چولھا چکی اتنا آسان کام ہوتا تو وہ کبھی کا شروع کر دیتیں۔

''اس کا علاج؟'' وہ کبھی برکت سے پوچھتی۔

''سرمایہ داری کا خاتمہ۔''

''وہ کس طرح!''

''جس طرح روس میں ہوا!'' اور وہ دونوں گھنٹوں روس کے انقلاب کی پرچھائیاں ناپا کرتے۔ غرض جو کوئی بھی اس ترقی پسند گروہ میں تھا پہنچا ہوا تھا۔ عشق ومحبت، بے وفائی اور جفا کاری، مفلسی اور بے کاری نے سب کو مجذوب بنا دیا تھا۔

ثمن ایک دن جو کالج سے لوٹی تو ایلما کو پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھے پایا۔

''ارے تم دیر سے بیٹھی ہو؟'' اس نے کچھ خجل ہو کر پوچھا اور پاس بیٹھ گئی۔ اس کا ضمیر ایلما کو خاموش دیکھ کر ملامت کرنے لگا۔ افتخار کے جانے کے بعد کیسے کیسے دونوں میں عہد وپیمان ہوئے تھے مگر اس نئے انتخاب کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ یہ سڑک کے اس کنارے تو وہ دوسرے پر، کبھی بھولے بھٹکے نگاہیں ملیں بھی تو جلدی سے بچالیں۔ گویا دیکھا ہی نہیں یونہی وہم ہوا تھا۔ مگر آج نہ جانے کیوں ثمن نے اس کے گرد باہیں لپیٹ کر چمٹالیا اور دیر تک اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

یہ ایلما کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ ایلما ہی نہ تھی آنکھیں اور زیادہ بوڑھی ہو گئیں تھیں۔ جیسے ان پر سیلولائیڈ کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو۔ گالوں کی ہڈیاں زیادہ ابھر آئی تھیں، اور بال پہلے سے زیادہ گھنیرے معلوم ہو رہے تھے۔ بجائے جھنجھناتے ہوئے قہقہہ لگانے کے وہ خاموش تلخی سے مسکرائے جا رہی تھی۔ جو بجائے دلی حالات کی آئینہ داری کے بالکل ایک مصنوعی خول کی طرح منڈھی ہوئی تھی۔ اس مسکراہٹ میں نہ کڑواہٹ تھی، نہ مٹھاس اور نہ ہی کوئی طنز پوشیدہ تھا۔

پھر وہ باتیں کرنے لگیں۔ دیر تک ایک دوسرے کے قریب لیٹی وہ وقت سے غافل بکواس کرتی رہیں۔ افتخار کی باتیں جلسوں کی باتیں اور نہ جانے کیا کیا؟

''بعض وقت ہمارا ہر پانسہ الٹا ہی پڑتا ہے۔'' ایلما ایک دم سے بولی۔

''کیا کہا تم نے؟'' ثمن نے اس کے قریب جھک کر پوچھا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''میں نے کہا۔۔۔ہم کیا سوچتے ہیں اور کیا کرتے ہیں!''

''کیا مطلب ہے؟''

''شمن؟''

''ہاں!''

''کیا میں بدل گئی ہوں؟''

''کیوں؟ نہیں تو!'' شمن نے ایلما کو سر سے پیر تک دیکھا، ایک دھوکا سا ہوا مگر مٹ گیا۔

''مگر ڈاکٹروں کا خیال ہے میں امتحان میں شریک نہیں ہو سکتی۔'' وہ اور پھیل گئی۔

''تم۔۔۔تم۔۔۔ایلما؟'' وہ ہکلا گئی۔

''ڈرو مت۔۔۔میری بیماری چھوت دار نہیں، وہ تمہیں نہیں لگ سکتی۔'' ایلما نے طنز بھرا قہقہہ لگایا۔ وہ اس عرصہ میں صرف ایک بار ہنسی اور یہ قہقہہ ایسا کھڑکھڑاتا ہوا شمن کے کانوں میں گونجا جیسے کسی نے بہت سے پتھر ٹین کے خالی ڈبے میں ڈال کر جھکول دیئے۔ اس کے دانت بالکل زہر میں بجھے ہوئے کیلوں کی طرح چمکے اور آنکھوں میں سے گھٹا ہوا دھواں اٹھنے لگا۔ اب شمن کو معلوم ہوا کہ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کیوں ابھر آئی تھیں اور بال چہرے کی مناسبت سے زیادہ گھنے ار معلوم ہو رہے تھے۔

''تم مجھے کچھ نہ بتاؤ گی؟'' اس نے بہت کچھ جان کر پوچھا۔

''بتانے کو ہے ہی کیا۔ میرے پیٹ میں بچہ ہے۔'' شمن ایسی بری طرح جھجکی جیسے اس کے سر پر چھت آن پڑی۔ مگر فوراً ہی کھسیانی ہو کر سنبھل گئی۔ نہ جانے کیوں سماجی اصولوں کے آگے قدرت کے بنائے ہوئے اصول کمزور اور ناقص ہو جاتے ہیں۔ اگر بنظر غور دیکھا جاتا تو قدرت کی طرف سے ماں بننے کی مکمل آزادی تھی، مگر سماج اس سے پروانہ راہداری مانگتا تھا۔ شمن کو خود اپنی روشن خیالی پر ناز تھا۔ مگر روشن خیال بننے سے پہلے ہمیں عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ شمن جلد ہی سنبھل گئی، اس کے خیالات جنگلی ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے لگے۔ اب سے بہت پہلے جب پکنک سے واپس آ کر دونوں سہیلیوں نے باتیں کی تھیں اس وقت شمن اور بھی بے وقوف تھی۔ مگر اب تو وہ ان الفاظ کے معنی خوب سمجھتی تھی۔ پھر اسے کیمپ کی وہ رات یاد آ گئی جب اس نے ایک نئے موڑ کی طرف قدم اٹھائے تھے۔ افتخار کے کوٹ کی خوشبو کوشش کرنے سے وہ دوبارہ دماغ میں کھینچ لا سکتی تھی۔ اور پھر اسے اپنی وہ رضائی یاد آئی جو افتخار نے اس سے مانگ لی تھی۔

''مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو۔'' ایلما نے ہولے سے کہا۔

''میں؟''

''ہاں تم سوچ رہی ہو کہ۔۔۔میں بڑی بدنصیب ہوں۔ میں نے پاپ کیا ہے۔ یہ بات نہیں میں اسے پاپ نہیں سمجھتی مگر۔۔۔'' اسکے چہرے پر پھر وہی بے معنی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ ''تم نہیں سمجھ سکتیں...... میں نے واقعی پاپ کیا ہے۔''

''ایلما!''

''میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔۔۔میں نے اپنی روح کو دھوکہ دے کر جسم کا پیٹ بھر دیا ہے۔''

''کیا بک رہی ہو ایلما۔ کیا مطلب؟''

''ہیں؟ نہیں میں بہک گئی تھی۔۔۔'' وہ تھوڑی دیر کو چپ ہو گئی پھر بولی ''تم نہیں سمجھتیں۔۔۔تم بھول گئیں۔۔۔میں نے تم سے کہا تھا نا کہ۔۔۔'' ''ہاں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم افتخار کا۔۔۔''

''ہاں ہاں۔۔۔یہی تو مصیبت ہے اگر ایسا ہوتا تو۔'' پھر وہ کچھ سوچنے لگی ''اگر ایسا ہوتا تو میں اس کی امانت اپنے سینے سے لگا کر رکھتی۔۔۔'' وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اونچی آواز سے بکنے لگی۔

''اس وقت جو شیطان میرے جسم میں سانس بھرنا سیکھ رہا ہے وہ ستیل کا تحفہ ہے۔۔۔اور میں نے اپنے جسم کی آرزو پوری کر دی مگر میری روح ابھی بھوکی ہے۔ میں اسی ہفتے بنگلور جا رہی ہوں وہاں آپریشن کرا دوں گی۔''

آنکھیں پھاڑے، سانس روکے شمن سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ ''کیوں؟''

''تم ان باتوں کو شاید عجیب سمجھ رہی ہو مگر میں کہتی ہوں کیونکہ مجھے ستیل سے نفرت ہے اور اسے مجھ سے۔ ہم کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے۔ بھلا تم ہی سوچو میں اس کا یہ گناہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔ آپریشن کے ذریعے سے میں اپنی انتہائی نفرت کا ثبوت دے سکتی ہوں کہ اس کا یہ قیمتی تحفہ ٹھکرا دوں۔''

''بھلا اس کم بخت کو کیا رنج ہوگا۔''

''اوہ۔۔۔یہی تو تم نہیں جانتیں۔ فرض کرو تم نے میری دعوت کی۔ میرے منہ میں تر بتر نوالہ دیا۔ اب اگر میں اسے تمہارے منہ پر تھوک دوں تو کیا حال ہوگا تمہارا؟''

''اوہ ایلما۔''

مگر ایلما نے وہی زور زور کے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

''مگر۔۔۔تمہارا بھی تو کچھ حصہ ہے اس میں۔''

''ہاں ہاں۔ مگر جب کوئی چیز زمین پر گر کر مٹی میں لتھڑ جائے تو اسے پونچھ کر کھانے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے نقصان پر صبر کر کے اسے پھینک دینے میں ہی مصلحت ہے۔''

''ستیل کو معلوم ہے۔'' تھوڑی دیر خاموش رہ کر شمن نے پوچھا۔

''ہاں۔'' جب اسے معلوم ہوا تو ناول کے ہیرو کی طرح دوزانو سینہ چوڑا کر کے۔ کہنے لگا مجھ سے شادی کر لو۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

میں نے کہا، میں تم سے چار پیسے کا سودا کرنے کو تیار نہیں پھر بھلا زندگی بھر کا پٹا کیسے لکھ دوں۔ پھر وہ اور ضد کرنے لگا تو میں نے کہا میں بنگلور آپریشن کے لئے جا رہی ہوں۔ بے چارے کا منہ اتر گیا۔'' وہ دل

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کھول کر ہنسی۔

ایلما چلی گئی۔ شمن دیر تک بیٹھی سوچتی رہی ستیل کا مزاج کچھ دن سے بگڑا ہوا تھا، کچھ جھنجھلایا سا رہتا۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ جا کر اس کے دل کی باتیں پوچھے۔ ستیل جیسا لاپرواہ اور بے رحم انسان کیا واقعی ایلما کے رویہ سے کچھ ہتک محسوس کر رہا تھا۔ شادی بیاہ کو چھوڑ کر تخلیق انسان کا پہلا فرض ہے۔ خدا نے انسان کو یونیورسٹی میں ڈگریاں لے کر دفتروں میں جھک مارنے کیلئے تو یقیناً نہیں پیدا کیا ہوگا۔ تخلیق، خواہ وہ کسی صورت میں ہو انسان کی بہترین کمائی ہے۔ تو شاید اپنی کمائی کو ضائع جاتا دیکھ کر اسے کچھ دکھ ہو رہا تھا! عیش وعشرت اور آوارہ گردی کا زبردست حامی ہوتے ہوئے بھی وہ خصلت انسانی کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ شاید اگر ایلما عام عورتوں کی طرح روتی پیٹتی تو اس کے احساسات کچھ مختلف ہوتے۔ تھوڑا سا قانون اور سماج کا بھی ڈر ہوتا اور پھر وہ خود ہی یہ تجویز ایلما کے سامنے پیش کرتا۔ مگر اب تو وہ اس کی حقارت بھری بے رحمی پر بھنا رہا تھا۔ ویسے اسے اپنے حصے کے ضائع جانے کی پرواہ نہ ہوتی مگر یوں ایک بد دماغ لڑکی کو اسے ذلیل کرنے کا کیا حق تھا؟ یہ نہیں کہ اس نامکمل شے سے اسے کچھ اُنس ہو گیا تھا یا اس کی آئندہ نسل کا انحصار اسی کی ذات سے وابستہ تھا، پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ شاید ایلما کی جگہ مس بوگا ہوتیں تو اس کی اس قدر بے قدری نہ ہوتی، اور پھر شاید وہ اس قدر حساس بھی نہ ہوتا۔

دو تین دن بعد ایلما جنوبی ہند روانہ ہو گئی۔ شمن کو اس کی جدائی کا بڑا رنج ہوا۔ واپسی کے متعلق اس نے نہایت مبہم سے جملے کہے نہ ہاں نہ نا۔ وہ عجیب فلسفیانہ جواب دے گئی۔ چلتے وقت اسٹیشن پر اس نے شمن کو بھینچ کر بڑے جوش سے پیار کیا۔

''میں اب افتخار سے تو مل نہ سکوں گی۔ اگر اتفاق ہو ملنے کا تو یہ پیار تم میری طرف سے اسے پہنچا دینا۔ نہ جانے کیوں، مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے میں اب زندہ نہیں رہوں گی۔''

''کیا بکتی ہو!''

''پگلی میرا مطلب یہ نہیں۔۔۔ جسمانی طور پر تو میں واقعی ابھی بہت دن زندہ رہونگی۔ مگر میری روح مر چکی ہے۔''

''تمہارے خیالات اور اتنے تاریک!''

''میں جانتی ہوں تم اسے بکواس کہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانی ایک مقررہ حد سے آگے بڑھتے تو ہیں مگر فوراً دھکا کھا کر لوٹ آتے ہیں، یہ تاریکی ہمارے خون میں رچی ہوئی ہے۔ جہاں تک تخیل کی دوڑ کا سوال ہے کوئی ہماری گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا، خوابوں میں تو ہم بڑی آسانی سے پاتال تک کو فتح کر لیتے ہیں لیکن جہاں عمل کا سوال آیا، ہم پیچھے گرے۔ یہی دیکھو افتخار کتنا جوشیلا، کتنا سچا ہے مگر صرف وہاں تک جہاں تک تھیوری کا سوال ہے۔ وہ جو کچھ سوچ سکتا ہے کاش اس کا تہائی بھی عمل کی صورت میں ظاہر کر سکتا تو وہ ہندوستان کا سچا رہنما ثابت ہوتا۔ نہ جانے کیا ہو جاتا۔ لیکن اگر اسے معلوم ہو کہ میں نے۔۔۔''

''افتخار روشن دماغ ہے!'' شمن نے کیمپ کی آخری ملاقات کو یاد کر کے کہا۔

''کتنا بھی روشن دماغ ہو، یہ سیاہی ایک دفعہ تو وہاں بھی اندھیرا کر دے گی۔ میری زندگی میں رہ بھی کیا گیا ہے۔ صرف اپنے ضمیر کی ملامتیں۔''

''قوم کی خدمت جس کا تم بیڑا اٹھا چکی ہو۔''

''اس بیڑے سے بھی منہ جل گیا۔۔۔ کچھ نہیں دنیا میں ہر چیز ذلیل ہے۔ ہم لوگ ایک چیز بڑی شان سے شروع کرتے ہیں، مگر جلد ہی آپس کی پھوٹ، خود غرضیاں، پست خواہشات اور چھچھورے خیالات درمیان میں آ کر سب کچھ میٹ دیتے ہیں۔ سوائے زبانی بکواس اور تالیاں پیٹنے کے ہمیں اور کچھ بھی تو نہیں کرنا آتا۔''

''لیکن اس کی کوئی تو وجہ ہے؟''

''وجہ؟ ہماری آبائی توہم پرستی۔۔۔ ہم خواہ کہیں چلے جائیں، کچھ سیکھ جائیں، اپنے خون سے اس پست مادے کو دور نہیں کر سکتے جو جنم جنم سے ہماری تمام تباہیوں کا باعث بنتا چلا آ رہا ہے، ہم پیدا ہی غلامی اور دوسروں کو سجدہ کرنے کیلئے ہوئے ہیں۔ گاندھی نے ہمیں غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش کی ہم نے الٹا اسے مہاتما بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ سارا قومی جذبہ ایک دیوتا کی مہمل پرستش بن کر رہ گیا۔''

پلیٹ فارم پر ٹہلتے ٹہلتے ایلما فلاسفر بن گئی۔ شمن حیرت سے جز بز خاموش رہی۔

''جب ہم ایک دیوتا کو پوجتے پوجتے اکتا جاتے ہیں تو دوسرا بنا لیتے ہیں۔ ہماری بلا سے اس کا رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر کوئی ہم سے دنیا میں بغیر دیوتا کے رہنے کو کہے تو ہم کبھی تیار نہ ہوں۔ میں نے تمہارے مذہب کے بارے میں بھی پڑھا ہے، مگر مشرقی اور مغربی مذہب میں بھی فرق ہے، اتنا ہی جتنا دیسی اور فرانسیسی شراب میں۔ ایک سلجھی ہوئی فلاسفی کا خمار ہے تو دوسرا ٹھرے کا جنگلی نشہ، ایک میں عقل ہے تو دوسرے میں سانڈ کا جوش، یہاں ہندوستان میں کوئی مذہب سلامت نہیں رہ سکتا اس پر فوراً بھوانی میا اور راکھشوں کی حکومت شروع ہو جاتی ہے۔''

''مگر تم لوگ تو۔۔۔ عیسائی؟''

''سب واہیات۔ ہم تم، وہ سب ایک ہی ناؤ میں جھولتے چلے جا رہے ہیں۔ بڑے جوش سے میلے کپڑے اتار کر نیا چولا پہنتے ہیں مگر دم بھر میں کیچڑ میں مچل جاتے ہیں۔ ہم ہر نئی چیز پر جھپٹتے ہیں، خود نیا بننے کے لئے نہیں بلکہ اسے بوسیدہ بنانے کے لئے۔ ہم بالکل مکڑی کی طرح ہیں، جو حسین سے حسین پروانے کو اپنے جالے میں لتھیڑ کر فنا دیتی ہے، ایسے کہ پہچانا بھی نہیں جا سکتا۔ نمک کی کان میں جو کچھ گر جائے نمک بن جاتا ہے۔''

''تو تمہارے خیال میں ہندوستان کا مرض لا علاج ہے؟''

''مرض تو کوئی لا علاج نہیں۔'' وہ تھوڑی دیر سوچ کر بولی۔ ''مگر ہمارے طبیب ابھی تک مریض کے سرہانے کھڑے مرض کی تشخیص کر رہے ہیں۔ کسی نے گھنٹیا تجویز کی ہے، کوئی کہتا ہے صرف فساد خون ہے، ہاں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

یہ سچ بھی ہے، یہ خون، ہندوستانی خون بہت ہی سیاہ ہوگیا ہے!'' وہ اپنی سادھوؤں جیسی آنکھوں سے نہ جانے کس سمت گھورنے لگی۔ گو ایلما کی صحت گر رہی تھی مگر جسم پر پھل دار درخت کی سی بھاری بھرکم لطافت چھائی ہوئی تھی۔ شمن اسے خاموش پا کر غور سے دیکھنے لگی، نہ جانے کیوں اس کا گلا بھر آیا۔ اگر ایک درخت قدرت سے جنگ شروع کر دے تو وہ کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے۔ آم بور نکلتے ہی کچل جائے اور پھل پیدا کرنے سے انکار کر دے تو؟ مگر ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بغاوت کا حق تو صرف اشرف المخلوقات ہی کو حاصل ہے کہ اگر وہ قدرت کی ضدیں پوری کرنے کو تیار نہ ہو تو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بغاوت اس نے سیکھی کہاں سے؟

ایلما کی ٹرین روانہ ہوگئی تو ہزاروں سوال اس کے دماغ میں گورکھ دھندوں کی طرح الجھتے سلجھتے رہ گئے۔ دل ایک بھاری سے بوجھ کی شدت سے دھنسنے لگا۔ وہ پرحسرت بوسہ جو ایلما افتخار کے لئے اس کے ہونٹوں پر چھوڑ گئی تھی انگارے کی طرح دہکنے لگا۔ اس کی امانت محفوظ رہے گی؟ کاش انسان اتنا بزدل نہ ہوتا!

واپسی پر اس نے لان کی بینچ پر ستیل کو بیٹھے پایا۔ وہ گھاس کے درمیان جھلکتی ہوئی خشک زمین پر کسی گزرے ہوئے نقش کے نقش پا ڈھونڈ رہا تھا۔

''گھاس کی جڑ تک کو کھا جاتے ہیں یہ کیڑے!'' اس نے زنجیر نما لہریے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''کیا بوٹنی کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔'' شمن نے آواز میں طنز کی جھنکار پیدا کر کے جواب دی۔

''نہیں، نہیں، ابھی میں نے مالی سے پوچھا یہ ٹینس کورٹ کیوں گنجا ہوتا چلا جاتا ہے۔۔۔۔

تو۔۔۔'' مگر شمن کے چہرے پر روہانسی مسکراہٹ دیکھ کر وہ چپ ہوگیا۔ ''اسے پہنچا کر آرہی ہیں، یہاں بیٹھ جایئے۔'' اس نے ایسے لجاجت سے کہا کہ شمن کو ہنسی آگئی۔ یہ مرد بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں آگ کو ہمیشہ بھوبل میں دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہنسی ہنسی میں جیسے کانچ کا گلاس توڑ کر بیٹھا منہ بسور رہا ہو۔ شمن اس کے پاس بیٹھ گئی۔

ظالم اور مظلوم کا فرق بھی بالکل وہم کی سی نوعیت رکھتا ہے۔ اگر ایلما بھی ستیل کو مقررہ سزا دے دیتی تو وہ یوں خود اپنے ضمیر کی جوتیاں نہ کھاتا۔ اس کی بے نیازی نے تو خاموش شمن کو اور بھی بڑھا دیا۔ کاش سزا پر طمانچہ مار دیا جائے تاکہ احساس تو ٹھوکریں کھانے سے بچے!

''میں نے اس سے کہا بھی کہ میں پتاجی کی دھمکیوں کی پرواہ نہیں کرتا میری ماتا کی جائداد کافی ہے۔'' وہ شکایتاً بولا اور شمن کو اس پر ترس آگیا۔ لوگ ابھی تک جائدادوں اور والدین کی دھمکیوں کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں، گویا پیشہ ہی تو ضمیر کا مول ہے۔ مگر ستیل یہ عذر شمن کے سامنے کیوں پیش کر رہا تھا، شاید خودداری مظلومیت کی پناہ میں شکست خوردہ ریزوں کو دوبارہ جوڑنا چاہتی تھی۔

''ٹینس نہیں کھیلیں گی؟'' اس نے شمن کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر روکا جیسے اسے تنہائی سے خوف آرہا ہو۔

''میرا ریکٹ تو کمرے پر ہے۔۔۔۔'' گو وہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ ستیل کی جی بھر کے درگت بنائے

گی مگر نہ جانے ماستا کی کونسی رگ پھڑک اٹھی کہ وہ بالکل ہی پگھل گئی۔ روتے کو اور کیا چھیڑنا۔

ٹینس کے تین سیٹ ختم کر کے جب وہ ہلکی پھلکی کمرے پر پہنچی تو اس کا ضمیر اس پر پھنکار برسانے لگا۔ حیف ہے کہ وہ اپنی سب سے پیاری سہیلی کے دشمن کی دلجوئی کر رہی تھی! وہ مرجھا کر بیٹھ گئی جیسے ایلما کی چتا پر ناچ کر آرہی ہو۔ خوفزدہ ہو کر اس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے خوب چھینٹے دیئے۔ آئندہ سے وہ ستیل سے بات بھی نہ کرے گی۔

لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یونین کی اتنی اہم عہدہ دار ہوتے ہوئے اسے ستیل سے نجات ملنا مشکل تھی۔ وہ جب چاہتا اس سے ضروری معاملات کے متعلق مشورہ کرنے آن دھمکتا۔ کلاس میں، کلاس سے باہر، لائبریری میں، ٹینس لان پر، کھانے کے کمرے میں اور یونیورسٹی کے ہر کونے سے ستیل نے اس پر بادلوں کی طرح امڈنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ایک ننھے سے نکتے میں بھینچتی چلی آرہی ہے۔ یہ گہراؤ اس کا دم کیوں گھونٹے دیتا ہے؟ قوت مقابلہ اتنی سست اور بدمست کیوں ہوتی جارہی ہے۔ ستیل نے تین گھنٹے لائبریری میں اسے لغو شاعری سنائی وہ سنتی رہی۔

وہ پیر سکیڑے آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھی بڑھتی ہوئی تاریکی کو آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ ڈوبے ہوئے سورج کی آخری جھلک کمرے کو مسحور کن رنگ میں ڈبوئے ہوئے تھی کہ اچانک اس کے دماغ میں گھس کر پینسلیں اور لونڈر میں ملی جلی ایک شیریں بساند کے چھپاکے نے چونکا دیا۔ وہ اس نشیلی لپٹ سے دماغ کو چھڑا کر پیچھے مڑی۔ ستیل ورزش کے بعد پسینہ میں نہایا ہوا اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال، بھرے بازو عریاں تھے اور پنڈلیاں پسینے سے چمک رہی تھیں۔ نہ جانے کیا ہوا کہ شمن کا دم گھٹنے لگا۔ معلوم ہوا کسی نے اسے گوشت و پوست کے انبار میں لپیٹ کر چکرا دیا۔ لمبی لمبی سانسیں بھر کے وہ سنبھلی اور بدحواسوں کی طرح بھاگی۔

غسل خانے کے نل سے اس نے گٹ گٹا کر پانی پیا اور دیوار سے لگ کر بکھرے ہوئے ذروں کو سمیٹنے لگی۔ دیر تک ایک ابکائی کا سا احساس اس کے دماغ میں پھنسا رہا اور وہ نڈھال پلنگ پر پڑی رہی۔

کھانے کی میز پر باوجود ستیل کے شدید اصرار کے وہ وہاں سے اپنے بھاگنے کی کوئی معقول وجہ نہ بتا سکی، نہ ہی اسے کچھ معلوم تھا۔ اس کے باوجود اس نے بھاگنا چاہا اور بغیر کہے سنے بھاگ نکلا۔ کہتے ہیں بہت سے حیوان طوفان کی آمد سے پہلے پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں۔

اور افتخار؟ اس کے خیال ہی کے غرور سے اس کا سر بھاری ہو جاتا۔ کیا بات تھی جو افتخار میں ستیل سے مختلف تھی۔ جس سے اس کے وجود میں اس بلا کی کشش پیدا کر دی تھی؟ جہاں تک صورت، شکل اور دولت کا سوال تھا، وہ ستیل سے میلوں ہارا تھا۔ پھر بھی سوائے مس بوگا کے اس سے سب لڑکیاں چڑتی تھیں۔ کیا عجب جو ایلما نے بھی ستیل کے جسم میں افتخار ہی کی جستجو کی ہو اور ناامید ہو کر لوٹ پڑی۔ امتحان سر پر آگئے اور ستیل کی ساری نفرت، خوف اور کشش کو بھول کر اس نے کتابیں سنبھال لیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(32)

امتحان کا نتیجہ آنے سے پہلے سستی اور بے کاری کے لمبے چوڑے دن گپ بازی میں کاٹنے دشوار ہو گئے۔ بورڈنگ میں رہتے رہتے اسے گھر سرائے معلوم ہونے لگا تھا۔ بی۔ اے کے بعد ایک طرح تعلیمی جنکشن پر اتر کر ذرا ادھر اُدھر نگاہ ڈالنے کی فرصت ملی۔ گھر میں بچوں کی تعداد چوگنی ہوگئی تھی۔ بھائی کمانے میں جٹے ہوئے تھے اور بھاوجیں پودبڑھانے میں مشغول۔ معلوم ہوتا تھا زندگی کو ٹوٹے ہوئے چھکڑے کی طرح ہر ایک آگے گھسیٹنے میں مشغول ہے، کوئی بھی تو مرمت کے لئے دم نہیں لیتا، چولیں ڈھیلی، پہئے بھاگ نکلنے کو تیار، چھت غائب، چندے میں چھلنی جیسے چھید، مگر بیل کی گردن پر جوا مضبوط اور لاٹھیوں کے ٹھوکے جاری۔ جو کسی سے روک کر پوچھنا چاہو کہ ''بھئی کہاں کا قصد ہے؟'' تو ہکا بکا ہو کر جواب ملتا ہے۔ ''کہیں کا نہیں!'' اس دنیا میں ایک دفعہ آنے کے بعد سوائے قبر کے اور کہاں جایا جا سکتا ہے۔ گرتے پڑتے سب ایک ہی نشان کی طرف دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اس امید میں کہ وہاں جنت ملے گی۔ دفتر سے بے فکر مزے سے گزرے گی، حوریں ملیں گی اور جواہرات کے محل۔ جو کچھ سمیٹا جا سکے وہیں کے لئے اٹھالو۔ ٹھوس ٹھاس ایک بار وہاں پہنچ جائیں تو پھر وارے نیارے ہیں۔ اگر جنت کی تاک میں دنیا دوزخ بنتی ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔

چھٹیوں میں انور، برکت، عباس اور ستیل کے خط آئے، افتخار اور ایلما خاموش رہے۔ ششی کا میاں انگلینڈ سے مغربی بنیا بن کر آ گیا۔ مس بوگا نے فلسفہ میں ریسرچ شروع کر دی۔ اور ثمن؟ نتیجہ سننے کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس ثمن کا کیا کرے؟ زندگی کی گاڑی گھسنوانے کے لئے کئی وضعدار پٹھے ساتھ دینے کو موجود تھے۔ مگر کسی کا دھرا کمزور، کسی کا ہال ڈھیلا، ڈپٹی کلکٹریاں محدود، پولیس کا دائرہ مقرر، جنگلات میں پیالہ لبریز۔ زمانے کی افراتفری کو دیکھتے ہوئے مس شمشاد نے ایک قومی اسکول کی سرپرستی قبول فرمالی۔

اسکول کی عمارت ایک دریادل رئیس کی بے کار کوٹھی تھی۔ جو انھوں نے بدزبان لوگوں کی بکواس سے بچنے کے لئے اپنی منہ چڑھی طوائف کے لئے آبادی سے ہٹ کر بنوائی تھی اور جہاں سے ہر کرایہ دار چھپکلیوں

اور مچھروں سے تنگ آ کر بھاگ چکا تھا۔ اسکول کا باقی سامان کسی اور بگڑے دل رئیس کی ٹانک کی بینچوں اور نیلام کی میزوں پر مشتمل تھا۔ ایک اور رئیس جن کے باپ دادا کو ادب سے لگاؤ تھا لائبریری مہیا کرنے پر تل گئے تھے۔ چونکہ کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لئے کوئی کنواں میونسپلٹی کی زیادتی سے دستیاب نہ ہو سکا، اس لئے دنیا بھر کی واہیات اور لغو کتابیں جنہیں مصنف کے بعد شاید کاتب ہی نے پڑھا ہوا اپنی تمام بھیانک ضعیفی کے ساتھ آن موجود ہوئیں۔ لڑکیاں رجسٹر میں درج تھیں اس کی نصف تو شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ چار اسسٹنٹ معلمات تھیں جنہیں بیس روپیہ مہینہ دے کر تیس روپیہ کی رسید لی جاتی تھی۔ بے چاریاں غربت اور بیوگی کی لعنت میں گرفتار تھیں ورنہ محکمہ تعلیم سے ان دکھیاریوں کا تو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دو چپراسنیں تھیں جو خوشحال دنوں میں تانگہ کی لطیف خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے چکی تھیں۔ ایک چپڑاسی تھا جو منیجر صاحب کا باورچی، بیرا، فراش اور بچوں کی گورنس کی خدمات کے علاوہ انسپکٹرس کے آنے پر بھورا کوٹ اور سفید صافہ باندھ کر مؤدب کھڑے ہونے کے کام بھی آتا تھا۔ اسکول کی تمام کارآمد کرسیاں اور میزیں خالی اوقات میں منیجر صاحب کے ڈرائنگ روم کو زینت بخشتی تھیں۔ چاروں استانیاں زیادہ تر ان کے بچوں کی مرزیاں، لحاف اور ململ کے کرتے سیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ انھیں کشیدے کے کام سے بہت لگاؤ تھا اور یہ استانیاں پچرنگے ڈوروں سے ان کے غلافوں پر ''سویٹ ڈریم'' اور ''فورگٹ می نوٹ'' بہت صفائی سے کاڑھا کرتی تھیں۔

ان میں سے ایک استانی رضیہ بیگم کو تیس روپیہ کی رسید پر پچیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ ہر ماہ منیجر صاحب یہ زائد پانچ روپے اپنی جیب سے ادا کرنے کی دھمکی دیتے مگر پوری نہ کرتے۔ ان کی آمد پر مسز منیجر نے فینائل اور ٹنکچر آیوڈین وغیرہ پینے کی عملی دھمکیاں دی تھیں۔ رضیہ بیگم بھاری جسم کی ادھیڑ عمر بیوہ تھیں۔ قرآن شریف کے علاوہ اردو اور رسمی فارسی سے بھی واقفیت رکھتی تھیں۔ کبھی خاصی قبول صورت ہوگی مگر برص کے سفید داغوں کے ذرا بد ہیئت کر دیا تھا لوگوں کا کہنا تھا کہ داغ پرانے تھے مگر مسز منیجر کا خیال تھا کہ یہ ان کے وظیفوں اور ان کے پیر کی دعاؤں کا ہلکا سا عکس تھا جو رضیہ بیگم پر پھنکار بن کر برس رہا تھا۔

رضیہ بیگم سے سوائے خرانٹ چپراسنوں کے سب ہی مرعوب تھے۔ یہ چپراسنیں ان کی گزشتہ زندگی کی بہترین راز دار تھیں۔ ان سے بہت بے تکلفی تھی اور بڑی والی بڑھیا تو انھیں رجو بی ہی کہا کرتی تھی۔ رجو بی کا زیادہ وقت مونگ پھلیاں ٹونگنے اور منیجر صاحب کے سویٹر بننے میں صرف ہوتا تھا۔ یہ سویٹر وہ اس قدر پیچیدہ نمونوں کے بنا کرتی تھیں کہ دماغ الجھ کر رہ جاتا۔ پڑھاتی خاک تھیں، لڑکیاں بیٹھی یا تو اون سلجھایا کرتیں یا ان کے سر میں چنگیاں بھرا کرتیں اور چپڑاسنیں بیٹھی انھیں محلے ٹولے کی عاشقیوں کے قصے سنایا کرتیں یا بڑی استانی جی یعنی ثمن کی بدحواسیوں پر مباحثہ کیا کرتیں۔ ثمن سے پہلے بھی دو ہیڈ مسٹریس میٹرک پاس آئیں مگر تین مہینے بعد بھاگ نکلیں۔ ثمن کی آمد پر نہ جانے کیوں مسلم گھرانوں کی توجہ تعلیم کی طرف تیزی سے مبذول ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو عیسائی عورتوں کا اضافہ ہو گیا۔ داخلے بھی تیزی سے ہونے لگے۔ ایک گریجویٹ ہیڈ مسٹرس

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کالا سہ لگا کر منیجر صاحب اعلیٰ خاندان کی لڑکیاں بھی پھانس لائے۔ مگر یہ اعلیٰ خاندان کی صاحبزادیاں دواؤں ،اناؤں اور ایسی ہی گھنی گھنائی بڑھیوں کی نگرانی میں کانچ کے گلاس بن کر آتیں، چاروں طرف انھلاتی پھرتیں اور پھر ان کی موٹریں، بگھیاں آجاتیں اور وہ چل دیتیں۔

ثمن کی آمد سے پورا انقلاب آ گیا۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے منیجر صاحب۔ اسے عجوبہ روزگار بنائے لئے پھرتے۔

''صاحب مسلمانوں میں ہیں کہاں تعلیم یافتہ لڑکیاں۔'' اور لوگ بھی اسے ایسے گھورتے گویا اس کے منہ پر سونڈ لٹک رہی ہے۔ کام کی بات یہ ہوئی کہ انسپکٹرس ثمن کے کالج کی پرانی طالبہ نکلیں اور یہ رشتہ اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ گورنمنٹ کی گرانٹ بڑھ گئی اور منیجر صاحب گھنٹوں برآمدے میں سوکھنے کے بجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے لگے۔ مگر وہاں بے چارے حد درجہ بدحواس رہتے اور انسپکٹرس یا ان کا کتا آجاتا تو ہڑبڑا کر کھڑے ہو جاتے۔ ویسے بھی اس کی قوم پرستی کی دھاک بیٹھ گئی۔ آن واحد میں دنیا بدل گئی۔ اسکول میں نیا فرنیچر، نقشے اور تصویریں نظر آنے لگیں۔ ٹاٹ پر بیٹھنے کی عادی لڑکیاں بنچوں پر اکڑوں بیٹھنے کی مشق کرنے لگیں اور ثمن نے بڑی شدومد سے عمارت کو پیوند پارے لگا کر درست کرنا شروع کر دیا۔ چھپکلیوں کے خلاف جہاد بول دیا۔ مس ٹامس اور مس الیگزینڈر نیلی اور سرخ روشنائی سے سچ مچ کے ٹائم ٹیبل بنانے لگیں۔ لائبریری کی بھربھری بوسیدہ کتابوں کی سنبھال سنبھال کر ٹانکہ زنی کی گئی۔ دو چار دن تو بہ جبر سینے پر پتھر رکھ کر چپراسنیں بھی مقررہ بنچوں پر بڈھے طوطوں کی طرح جمی رہیں۔ رضیہ بیگم نے بھی مونگ پھلیاں ڈیسک میں چھپادیں اور چپراسی نے دفعتاً دروازے کے بیچ میں لٹکے ہوئے گھنٹے کو پیٹ دیا۔ گھنٹہ بجاتے وقت شدت احساس سے اس کے کان سرخ ہو جاتے اور گاڑی والے اپنی گپ بازی اور چلمیں چھوڑ کر ٹوٹے ہوئے موٹر خانے سے اسے بغور دیکھ کر مسکرانے لگتے۔

مگر کچھ دن بعد ہی ان بندشوں کا جادو فنا ہو گیا۔ رضیہ بیگم کرسی پر ہی پالتی مار کر منیجر صاحب کے پیچیدہ سوئٹر بننے لگیں۔ چپراسنیں حسب معمول دہلیز پر پھسکڑا مار کر پناری لگا بیٹھیں۔ گھنٹہ بجانے کی موگری نقشے کی کیل ٹھونکنے کے لئے لے جائی گئی اور پھر قرآن والی استانی جی کے کمرے میں ان کی چھالیا کی ڈلیاں توڑنے کے لئے محفوظ ملی۔ ثمن نے مغربی بردباری اور سنجیدگی سے بکھرتے ہوئے شیرازے کو سمیٹنے کی کوشش کی مگر وہاں تو جیسے نمک ستیہ گرہ شروع ہو گئی۔ ہر چیز اس کی آنکھ بچتے ہی پھسل پڑتی اور مچل کر قابو سے باہر ہو جاتی۔ کرسیاں اور میزیں اور گملے منیجر صاحب کے یہاں دعوت میں مستعار گئے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ چپراسی پھر باقاعدہ اپنے پرانے عہدے پر واپس چلا گیا اور دونوں عیسائی استانیاں پڑوس کے قومی اسکول کے ناسٹروں سے روز بروز زیادہ مانوس ہوتی گئیں۔ لائبریری کی کل جاندار کتابیں مسز منیجر اور ان کی سہیلیاں پڑھنے کو لے گئیں جو پھر اگر واپس آئیں تو چیتھڑے اور دال سالن میں لتھڑی ہوئی۔

رضیہ بیگم نے تو ایک مستقل محاذ قائم کر لیا جس میں دونوں چپراسنیں بڑے جوش و خروش سے شریک

ہو گئیں۔ لڑکیاں دن بھر آم اور بیر کے درختوں کے نیچے کشتیاں لڑتیں اور ثمن کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی غیبی ہاتھ اس کے بنائے ہوئے گھروندوں کو ڈھانے پر مصر ہے۔ جتنی جتنی اس نے سختی برتی عملہ بپھرتا ہی گیا۔

رضیہ بیگم اور اتحادیوں کی کوشش نے اسے بدحواس کر ہی رکھا تھا کہ مسز منیجر مع اپنے غلیظ اور نامعقول بچوں کی فوج کے اسکول کے معائنہ کو آن دھمکیں۔ پتہ نہیں انھیں یہ عبدہ کب اور کیوں دیا گیا تھا۔ اصل وجہ کچھ اور ہی تھی۔ انھیں بڑے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا کہ لڑکیاں کچی امیاں بڑی بے رحمی سے کھانے میں مشغول تھیں۔ یہ قیمتی امیاں علاوہ اچار چٹنی کے ان کے گھر کا سال بھر کا کھٹائی کا اسٹور مہیا کرتی تھیں۔ اور خود منیجر صاحب کو ان کی حفاظت کی فکر گھن بن کر کھائے جاتی تھی۔

''یہ تو ہونے سے رہا کہ میں لمبا سا بانس لے کر نگرانی شروع کر دوں''۔ اس نے ان کا دکھڑا سن کر رکھائی سے کہا۔ ''بچیوں کو تو میں نے منع کر دیا ہے۔ مگر استانیوں کو کیا کہوں جو سکھانے کے لئے توڑتی ہیں۔''

''ہاں بہن یہی تو مصیبت ہے۔ میں نے کتنی دفعہ کہا ان کم بختوں سے مگر نہیں مانتیں۔ یہ رضیہ بیگم تو سب سے پیش پیش ہیں۔ بھلا تم ہی بتاؤ بہن، بھلا ان کی عمر اب کچی آموں کی ہے۔ بڈھی گھوڑی!''

''میں نے منع کیا تو انھوں نے کہا وہ آپ کے لئے اچار بنا رہی ہیں۔''

''خاک میرے لئے اچار بنا رہی ہے۔ اس کا بس چلے تو میرا ہی اچار بنا دے۔۔۔۔ آپ کو نہیں معلوم ۔۔۔'' وہ رازدارانہ انداز میں پاس سرک آئیں۔

''بہن کیا بتاؤں۔۔۔۔'' بڑی حسرت سے بولیں ''یہ اسکول کا تو اللہ مارا بہانہ ہے، چھ بچوں کے باپ مگر گھن دیکھو تو اللہ توبہ، اس رضیہ کے پیچھے دنیا زمانے کے غنڈے لگے پھرتے ہیں اور اللہ کے بندے نے اس کے سپرد شریف بچیوں کو رکھا ہے۔ میں نے تو کہہ دیا ایک دفعہ کہ پڑھنا وڑھنا تو خاک نہیں ہاں دو چار آنکھ لڑانے کے گر بے شک سکھا دیں گی۔'' ثمن ہنسی دبائے ان کی باتیں سنتی رہی۔ امیوں کی رکھوالی کا پختہ وعدہ لے کر مسز منیجر چلی گئیں تو دیر تک ثمن رضیہ بیگم ہی کے متعلق سوچتی رہی۔ ان کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ پھر ان میں ایسی کون سی خطرناک ادا باقی رہ گئی تھی جس نے مسز منیجر کو بدحواس کر رکھا تھا۔ اگر کوئی جوان لڑکی ہوتی تو خیر ایک بات بھی تھی مگر اپنی ہم عمر اور نسبتاً بدصورت عورت میں انہیں کہاں سے خطرہ نظر آ رہا تھا۔

''اچار میں بھی خاصہ ڈالتی ہوں مگر انہیں تو اسی مردار کے ہاتھ کا پسند ہے۔ اسی کی چٹنی پہ دم جاتا ہے۔ دیکھ لینا ایک دن ان کی چٹنی نہ بنا کر رکھ دے تو نام پلٹ کے رکھ دینا۔'' وہ کس وثوق سے کہہ گئی تھیں۔ تو کیا منیجر صاحب رضیہ کی چٹنی پر عاشق تھے۔ ثمن کو ہنسی آ گئی۔ یقیناً عشق نرالا تھا اور چٹ پٹا بھی۔ یعنی اچار چٹنیوں کے ذریعے بھی عاشق پھنسائے جا سکتے ہیں۔ چٹنی کھاتے وقت اسے کبھی شبہ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا اتنا رومان انگیز مصرف بھی ہو سکتا ہے۔

ثمن کا کمرہ اسکول سے ملحق ذرا جاندار حصے میں تھا۔ سامنے اس نے چھوٹا سا باغیچہ بھی بنا لیا تھا جہاں وہ شام کو آرام کرسی پر لیٹ کر سامنے میدان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھا کرتی تھی۔ بازو کے برآمدے سے گزر کر ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جو رضیہ بیگم کو دے دی گئی تھی۔ ایک چپراسن دوسرا ہٹ کے لئے ان کے ساتھ رہتی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

تھی۔ اسکول کے بعد وہ کوٹھڑی کے سامنے پنگڑی پر بیٹھ کر منیجر صاحب کے تکیوں کے غلاف کاڑھا کرتیں۔ نہ جانے انہیں اتنے غلافوں کی کیوں ضرورت پڑتی تھی۔ ضرور بیوی پار کر دیتی ہوں گی۔ رضیہ بی کے کاڑھے ہوئے ''سویٹ ڈریم'' سے اُن کی بے چاری کی اپنی نینداڑ جاتی ہوگی۔ اب جیسے آموں کا موسم شروع ہوا تھا وہ امیاں چھیل کر چٹنیاں پکایا کرتی تھیں۔ کتاب اور اخبار کو بھول کر ثمن ان کے افسانے کو پڑھنے کی کوشش کرتی۔ رضیہ بیگم صورت سے کافی ہوشیار اور پکی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی زندگی کچھ معصوم نہ گزری ہوگی۔ کاش کوئی ان کی کتاب زندگی کے دو چار ورق الٹ دیتا۔ منیجر صاحب کو وہ بھائی جان کہتی تھیں مگر اس لفظ سے کہ لفظ ''جان'' پر بے چاری مسز منیجر کی تو جان ہی نکل جاتی۔ کہتے ہیں عورت عورت کو پہچان لیتی ہے مگر پھر یہ کیا چیز تھی جو انہیں ڈرائے ہوئے تھی۔ اور ثمن کو وہم معلوم ہوتا تھا۔

داخلے اور روزانہ حاضری کے رجسٹر بنانے کے لئے اسے کسی مددگار کی ضرورت ہوئی تو منیجر صاحب نے اپنے جان پہچان والے دو ماسٹروں کو بھیج دیا۔ جو روز شام کو آکر اسے اور دونوں نئی عیسائی استانیوں کو جمع تفریق کی مشقیں از سر نو کرانے لگتے۔ ضرورت سے زیادہ بے کار خانوں کو نکتوں سے بھرنا، مہینہ بھر کی حاضری جوڑ کر اسے سال بھر کی حاضری میں سے گھٹانا اور پھر دنیا بھر کی الا بلا کو گڈمڈ کر دینا۔ کتنی لڑکیاں ڈرائنگ لیتی ہیں اور کتنی فارسی۔ چونکہ یہ دونوں مضمون اسکول میں سکھائے جاتے تھے اس لئے یہ خانے نکتوں سے پر کرنا۔

کبھی تو حبیب اور اکرم دونوں آتے اور کبھی حبیب اکیلے اور جب رجسٹروں کا جھگڑا ختم ہو گیا تب بھی کسی نہ کسی بہانے سے پھیرا لگاتے رہے۔ کچھ کتابوں وغیرہ کا لین دین شروع کر دیا۔ ان کی ضرورت کی کتاب ساری لائبریریوں کو چھوڑ کر صرف ثمن کی لائبریری ہی میں ملتی۔ حد یہ کہ حبیب کی توجہ ناقابل برداشت حد کو پہنچ گئی۔ لہٰذا آہستہ آہستہ ان کے پنجے ڈھیلے کرنے شروع کئے ایسے کہ وہ محسوس نہ کریں۔ مگر انھوں نے تو ہزار پایہ کی صفت اختیار کر لی اور جتنا اکھاڑ جتنے ہی چپکے گئے۔ وہ آتے اور ہکلائے ہوئے بدحواس سے بیٹھے رہتے۔ ان کی اس قابل رحم گھبراہٹوں پر ثمن مسکرایا کرتی۔ ضرورت سے زیادہ منگلے سنگھار کر کے آنا شروع کیا اور ثمن کی رکھائی پر مکمل مریض عشق بن گئے۔ مگر خاموش اور مسکین ایسے کہ مجسم سوال ہیں مگر زبان بند۔ یہ بوکھلاہٹ بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہ تھی۔

اس میں بے چارے کا کیا قصور تھا جاہل خاندان کا تعلیم یافتہ۔ عمر میں شاید پہلی مرتبہ ایک غیر اور شریف عورت سے آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ ویسے تو لڑکیاں بہت دیکھی تھیں مگر تاک جھانک کر۔ اب جو یہ جیتی جاگتی بولتی چالتی مورت دیکھی تو سوائے عاشق ہونے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ سیدھے سادے آدمیوں کو چلتا پھرتا دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی لیکن نٹ کو بانس کی نوک پر قلانچیں لگاتے دیکھ کر ششدر ہونا ہی پڑتا ہے۔ تو ثمن نے بے چارے کو بازی گری طرح مسحور کر کے گنگ کر دیا تھا۔ اس الجھے ہوئے جذبے کو وہ عشق سمجھ رہا تھا اور اس بغیر معقول وجہ کے عاشق ہو جانے سے ثمن کو جلن، جنس مخالف ہونا معشوقہ بننے پر تو مجبور نہیں کر سکتا اور نہ ہی ہر مرد کو ہر عورت پر عاشق ہونے کا حق ہے۔

ثمن کو اس پر ترس بھی آتا اور غصہ بھی۔ اس نے تخیل ہی میں اس کی آئندہ زندگی، ایک مختصر مکان میں معمولی سی بیوی اور غیر معمولی تعداد میں بچے غربت کی گود میں پلتے دیکھ لئے۔ یہ لوگ بس زندگی میں ایک بار اپنے طبقے کو چھوڑ کر عشق رچا لیتے ہیں خواہ وہ یک طرفہ چیز ہو مگر ناکامی لازمی نتیجہ ہے۔ اور شاید ایسا عشق کر کے ناکام ہونا ہی اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ یہ درمیانہ طبقہ کا کم حیثیت لڑکا چھانٹ کر اپنے آسودہ حال پروفیسروں کی لڑکیوں یا جس سیٹھ کے دفتر میں وہ چالیس روپیہ کا نوکر ہو اس کی اکلوتی لڑکی پر عاشق ہو بیٹھتا ہے۔ اگر اچانک کبھی ایسے عشق میں کامیاب ہو جائے تو بھونچکا سا رہ جاتا ہے۔ اسے بھگا کر لے جانے سے بھی خواب چورا چورا ہو جاتا ہے، دریا میں ڈوب کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے۔ وہ تو عشق صرف نام رہنے کے لئے کرتا ہے تاکہ اس کے قصے اپنی نئی دلہن کو ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر سنایا کرے۔ رنڈی کو اپنی بیوی کا رقیب بنانے میں وہ ہتک محسوس کرتا ہے۔ نچلے طبقے کا ہوتے ہوئے بھی وہ عشق جیسے بلند جذبے کو بلندی ہی پر رکھنا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی سے کبھی محبت نہیں کرتا مگر اس کے جنے ہوئے کیڑوں کی پرورش میں انسان سے چرخا بن جاتا ہے۔ اس کی بیماری پر ہاتھ پیر پھلا لیتا ہے اور ذرا روٹھ جاتی ہے تو ہاتھ جوڑ کر منا لیتا ہے۔ اپنی محبوبہ کا رتبہ بہت بلند سمجھتا ہے مگر اسے اپنی بیوی سے کم معصوم اور پارسا جانتا ہے۔

اس محبوبہ کو وہ روحانی تمازت کے لئے اپنی شخصیت میں چھپا لیتا ہے۔ اگر اصلی نہیں تو خیالی ہی سہی وہ ہر طرح اس سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔ جب بیوی حاملہ ہوتی ہے یا میکے چلی جاتی ہے تو اسے بڑی احتیاط سے نکال کر عشق حقیقی سے جی بہلاتا ہے۔ اور یہی خیال رقیب دور بچھڑی ہوئی بیوی کے سینے میں رشک کی آگ بھڑکا کر اس کی محبت کو اور بھی پختہ کر دیتا ہے۔

جی گھبرا اٹھا تو وہ ٹہلتی ہوئی آم کے پیڑوں کی طرف نکل گئی۔ رضیہ بیگم بان کے پلنگ پر کھڑی چھڑی سے آم جھاڑنے میں مصروف نظر آئیں۔ نہ جانے کیوں وہ اس ادھیڑ عمر عورت کو بوالہوس لومڑی کی طرح کچی امیوں کی تاک میں پھدکتا دیکھ کر چڑ گئی۔ سچ کہتی تھیں مسز منیجر کہ کچی امیاں کھانے کی بھی ایک بالپن کی عمر ہوتی ہے۔ واقعی بوڑھی گھوڑیوں کو ایسے بلک کر آموں پر ٹوٹ پڑنا زیب نہیں دیتا۔ لیکن فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ وہ تو منیجر صاحب کی چٹنی بنانے کے لئے توڑ رہی تھیں۔

ثمن کو دیکھ کر وہ سوئے ادب پلنگ سے اتر آئیں اور کنواری لڑکیوں کی طرح جھینپ کر سر ڈھانکنے لگیں۔ ان کی یہ چہرے پر کے آثار پیدا کرنے والی ادا کا مطلب اب تک اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ اتنی بڑی تھیں مگر بہت کم عمر اور چھوٹی سی بن کر ''دیکھئے دیکھئے'' کر کے اٹھلانے لگتیں اور گھبرا گھبرا کر بار بار سر ڈھانکتیں اور نیچی نظروں سے شرما کر مسکرانے لگتیں۔ ان کی اس ادا کو آگ لگ اٹھتی مگر شاید ان کی یہی ادا منیجر صاحب کے کلیجے پر چھری چلا گئی ہو۔

بڑے پیار سے انھوں نے گری ہوئی کیریاں جمع کیں اور اپنی کوٹھڑی کی طرف چلی گئیں۔ رضیہ بیگم بڑی سگھڑ تھیں۔ یہ مختصری کوٹھڑی ان کی صفائی اور خوش مذاقی کا نمونہ بنی رہتی۔ سامنے در کے اوپر گلابی پھولوں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کی بیل چڑھا رکھی تھی، کیاریوں میں ساگ اور دھنیا پودینہ بولیا تھا۔ دو چار گملے بھی رکھے تھے۔ شام کو چھڑکاؤ کر کے ہلکی پلنگڑی پر بیگم کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن کر بیٹھتیں اور چپڑاسن سے محلے کی خبریں سنا کرتیں۔ گو وہ فیشن ایبل نہ تھیں پھر بھی اپنی حیثیت بھر تازہ ترین تراش کے جمپر پہنتیں۔ پجامہ تنگ ہی رہتا مگر کرتے کے بجائے قمیض یا جمپر پہنتیں۔ تندرستی اچھی تھی کپڑا خوب کھلتا تھا۔ عموماً ہلکے خوشگوار عطر میں بسی رہتیں۔ ان کے برخلاف مسز منیجر بے چاری حد درجہ کی پھوہڑ اور ہمیشہ بدحواس رہتیں۔ ایک بچہ کسی نہ کسی صورت میں ان پر چھایا رہتا۔ نہ تو انہیں کرتوں کے بجائے جمپر پہننے کی مہلت اور نہ اچار چٹنیاں بنانا جانیں۔ شادی کے بعد سے وہ خود ایک مستقل اچار بن کر رہ گئیں تھیں جیسے گودڑ کی پوٹلی جس میں صرف چیتھڑے اور الجھے ہوئے تاگے تھے۔ منیجر صاحب نہایت اجڈ قسم کے بدوضع انسان تھے۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی گھبرا اٹھتے اور اسکول کی عمارت کے معائنہ کا بہانہ بنا کر رضیہ بیگم کی صاف ستھری پلنگڑی پر آ بیٹھتے اور اپنے حسابوں کسی شاندار کلب کا لطف اٹھا لیتے۔ رضیہ بیگم ان سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ مگر عجب معشوقانہ انداز سے ہمیشہ کسی چیز کی آڑ سے ایسے کھڑی ہو کر باتیں کرتیں کہ صاف نظر آتیں۔ نیز کپڑوں کی بھینی خوشبو بھی تھوڑی بہت پہنچ سکتی۔ منیجر صاحب نہایت کھرے اور اپنی صاف گوئی کی بدولت بڑے غیر مقبول تھے مگر انہیں دیکھتے ہی مذاقیہ چھینٹے کسنے شروع کر دیتے۔

''کہئے کیا حال ہے آپ کی بدمزاجی کا؟'' وہ ہمیشہ اسی طرح ان کی مزاج پرسی کرتے۔

''کوئی تازہ جھڑپ ہوئی مہترانی سے؟''

''میری کیوں جھڑپ ہوتی، وہ ہے ہی آپ کی منہ چڑھی، میری تو بات بھی نہیں سنتی۔''

اسکول کی عام صفائی رضیہ بیگم کے سپرد تھی۔ منیجر صاحب کہتے تھے کہ جب اسکول بڑھ جائے گا تو بورڈنگ کی منتظمہ رضیہ بیگم ہی بنائی جائیں گی۔

''وہ آپ کے کرتے تیار رکھے ہیں چپراسی کو دے دوں یا آپ خود لیتے جائیں گے۔'' وہ اٹھلا کر پوچھتیں۔

''نہیں میں خود ہی لے جاؤں گا۔'' وہ نہ جانے کیوں سٹپٹا جاتے۔

''وہ اچار دانی آپ کے گھر میں توڑ ڈالی گئی اب اگر اچار کھانا ہو تو گھر سے برتن بھجوائیے۔''

''ہاں وہ بچوں نے توڑ ڈالی، میں دوسری بھجوا دوں گا۔''

''پرانا سوئٹر بھیج دیجئے گا ادھیڑ کر نیا نمونہ ڈال دوں گی۔''

''ہیں بُنا بنایا ادھیڑ دو گی۔'' وہ حیرت سے مسکراتے۔

''تو کیا ہوا، کام ہی کیا ہے اور مجھے؟'' وہ ٹھنڈے سانس کھینچ کر کہتیں۔ حالانکہ چند روز پہلے ثمن نے ان سے لائبریری کی کتابوں پر نمبر لگانے کو کہا تھا تو کام کی زیادتی کی شکایت شروع کر دی تھی اور آج کس مزے سے سوئٹروں کی ادھیڑ بن کو تیار تھیں۔

ادھر حبیب کا رویہ صبر آزما ہوتا گیا۔ اب اگر وہ ٹال دیتی اور مل نہ سکتا تو پرچہ ہی دے جاتا۔ آہستہ آہستہ اس پرچہ کی صورت چند لائنوں سے صفحوں میں تبدیل ہو گئی اور علاوہ دستی آنے کے ڈاک سے بھی آنے لگے۔ کئی بار کی شدید کوششوں کے بعد اگر کبھی ملنے کا موقع بھی ملتا تو غریب بدحواس اور مبہوت سا بیٹھا رہتا۔ ثمن کو اس سے کوفت ہونے لگی۔ نہ جانے دل کے کس کونے کی خوشنودی کے لئے اسے لئکا رکھا تھا۔ اس سے کسی قسم کا لین دین کرنے کا قصد نہ تھا مگر اس کے وجود سے ایک طرح کی قلبی طمانیت ضرور حاصل تھی۔ جب وہ آتا تو نہ ہی اس کا دل الٹا سیدھا دھڑکتا اور نہ خون میں سنسنیاں پیدا ہوتیں پھر بھی بعض وقت تو اسے ملاقات سے محروم کرنے کے لئے ہی اس کا انتظار کرتی۔

''کہہ دو آرام کر رہی ہیں۔'' وہ آتا تو کہلوا دیا جاتا۔ اگر وہ پھر بھی انتظار میں ٹھہرنے کی دھمکی دیتا تو وہ جل کر خاک ہو جاتی۔ اسے یہ ربڑ کی گیند کی طرح ہر بار چوٹ کھا کر لوٹ آنے والی خاصیت سے اور بھی نفرت تھی۔ اسے چاہئے تھا کہ فرمانبرداری سے سر جھکا دے۔ خیر اس کی حماقت کی سزا وہ یوں دیتی کہ اسے بٹھا کر دوسرے دروازے سے سینما یا خرید و فروخت کو چل دیتی۔ وہاں سے آتے ہی وہ سب سے پہلے یہ معلوم کرتی کہ حبیب کتنی دیر تک انتظار میں بیٹھا رہا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں، ہاتھ پیر سن ہو گئے تھے تو وہ اطمینان سے مسکرا کر دو چار پیار بھری ملامتیں اپنے آپ کو سنا لیتی، ورنہ بات ہی ٹل جاتی۔

ایک دن چپڑاسی نے آ کر کہا کہ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں وہ حسب معمول کہنے ہی والی تھی کہ کہہ دو نہیں مل سکتیں کہ چق بنی اور ہاتھ میں تہہ کیا ہوا کمبل لئے افتخار کھڑا تھا۔ نہ تو وہ چونکی اور نہ ہی حیرت کے بے پناہ طوفان کو اپنے کسی انداز سے ظاہر ہونے دیا۔ اس زبردست بھونچال کے جھٹکے کو اس نے ایک معمولی ''ارے'' کے ساتھ سہہ لیا۔

افتخار پہلے سے زیادہ دبلا اور بدصورت ہو گیا تھا اور اس کے بال روکھے اور بے تکے پن سے بکھرے ہوئے تھے۔ جسم پر کھسی گھسائی قمیض اور روئی کی مرزئی تھی، گلے میں ایک میلا سا مفلر لپٹا ہوا تھا۔ بہت بدل چکا تھا، مگر اس جاننے والوں کے لئے پہچاننا اور بھی آسان ہو گیا تھا۔ اس نے اب وہ چھلکا اپنے چہرے پر سے اتار پھینکا تھا جو یونیورسٹی میں مجبوراً چڑھائے رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے نقش و نگار دلی جذبات کا عکس بن کر رہ گئے تھے۔ وہ باغی آنکھیں اب کھلے بندوں تمنائیں بکھیرتی تھیں اور ہونٹ مستقل طنزیہ مسکراہٹ میں ڈوب چکے تھے۔ نسبتاً زیادہ بیمار اور چڑچڑا معلوم ہوتا تھا، ہنسی میں کڑواہٹ کے ساتھ ساتھ دیوانگی بھی برسنے لگی تھی جسے وہ قطعی چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔

''تم اب بھی ویسے ہی ڈرپوک اور دبو ہو۔'' اس نے بزرگانہ انداز سے پوچھا۔ ''میرے کپڑوں میں بدبو آ رہی ہے اور شاید جوئیں بھی ہوں۔ تمہارے پلنگ پر بیٹھ جاؤں۔'' مگر وہ بغیر اجازت ہی بیٹھ گیا۔

''آپ کب آئے پہاڑ سے؟''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"ایں؟ پہاڑ سے؟ اوہ۔۔۔ ہاں بھولا میں پہاڑ پر ہی اپنی صحت درست کرنے گیا ہوا تھا نا۔ ہاں ۔۔۔" وہ ہنسا۔ "تو تمھیں کچھ نہیں معلوم؟"

"نہیں!"

"مگر مجھے تمہاری ہر بات معلوم ہوتی رہی۔" وہ کچھ جزبز ہو کر بولا۔ "میں نے اخبار میں تمھارے یہاں آنے کی خبر بھی سن لی، سوچا چلو تم سے ہی مل آؤں۔ تمھیں نہیں معلوم کہ اب ہمارا پہاڑ پونا میں قائم ہو گیا ہے جہاں دن میں چھ گھنٹے چکی چار گھنٹے۔۔۔"

"ہیں؟ آپ جیل میں تھے؟"

"اور کیا ہوتا؟ خان بہادری کا خطاب ملتا؟"

"اور سب کا کیا ہوا؟"

"سارا گروہ پکڑا گیا۔"

شمن حیرت سے منہ پھاڑے رہ گئی۔ کیسا گروہ؟ یہ اسے ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ مگر خودداری نے اسے پوچھنے بھی نہ دیا۔ اتنا وہ جانتی تھی کہ افتخار اشتراکی تھا اور مشتبہ مگر یہ اسے آج معلوم ہوا کہ وہ دہشت پسند بھی ہو گیا تھا۔

ایک دفعہ کو اس کی بزدل فطرت دہشت پسندی کے تخیل سے جھک گئی۔ مگر پھر فوراً اس کی بھاگتی ہوئی ہمت لوٹ آئی۔ افتخار اپنی قوم اور ملک کی خاطر مٹ رہا تھا۔ اس نے اپنی جوانی اور زندگی کی بازی لگا کر آزادی چھین لینے کا عہد کیا تھا۔ اس کے ہم خیالوں کا حلقہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ اور یہ مختصر حلقہ سارے ہندوستان کو اپنی آغوش میں لینے کو تیزی سے پھیل رہا تھا۔ بیداری بڑھتی جا رہی تھی، کسان اور زمیندار کا پرانا رشتہ نیا چولا بدل رہا ہے، اس کے سارے خواب عملی جامہ پہنتے جا رہے تھے مگر اس قدر سست رفتاری سے جیسے جوں کی چال۔ یہ ہندوستان کی ہر چیز رینگنے کی کیوں عادی ہے، صدیاں چاہئیں ایک طرف سے دوسری طرف گردن پھیرنے کے لئے!

کھانے پر افتخار نے بڑی تیزی سے سونگھ کر نگلنے اور پہچاننے کی کوشش کی مگر اس کی بھوک مر چکی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"شلجم گوشت"

"شلجم؟ اور مجھے یاد ہے کہ کبھی یہ میری مرغوب ترین غذا تھی۔ میری اماں تانبے کی رکابی میں موٹی تلی روٹی کے ساتھ دیا کرتی تھیں۔ ہم چولہے کے پاس ہی بیٹھ کر کھایا کرتے تھے، اور جب گھی جلنے لگتا تھا تو چولہے میں سے سلگتے ہوئے اپلے کا ٹکڑا نکال کر اس پر رکابی رکھ لیا کرتے تھے۔ میری بہن کو نیبو بہت پسند تھے۔" وہ گزرے ہوئے زمانے کی سوئی ہوئی یادوں کو جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"نیبو منگواؤں؟"

"نہیں نہیں مجھے نہیں میری بہن بنو کو پسند تھے۔" پھر وہ خاموش ہو کر بڑے بڑے نوالے نگلنے لگا گویا کہہ رہا ہو کہ نیبو منگوانے سے روٹھا ہوا زمانہ تو واپس نہیں لایا جا سکتا۔ بنو قبر کی مٹی سے ہم آغوش ہو گئی، اب شلجم اور نیبو کیا کر سکتے ہیں؟

"ایلما نے کوئی خط لکھا؟"

"نہیں تو۔"

"وہ ایک اسکول میں کچھ الا بلا پڑھانے پر نوکر ہو گئی ہے۔ پہلے تو ایک اسکول سے کچھ الٹی سیدھی تعلیم دینے کی وجہ سے نکال دی گئی تھی۔" وہ مسکرایا۔ "پیٹ کی پکار ہاتھ پیر کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی تو جکڑ دیتی ہے۔ جب تک کالج میں رہے والدین کے پیسے یا تعلیمی وظیفوں سے عیش اڑا لئے پھر، یا تو کلرکی کر و یا بھوکے مرو۔ ساری ہیکڑی ختم! جانتی ہو دلیپ کہاں گیا؟ پکڑا گیا اور اب اسی وائسرائے کے دفتر میں نوکر ہے جس کی موٹر پر بم پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ جب وائسرائے کی موٹر گزر جاتی ہے تو وہ پہیوں کے نشانوں اور دھول کو سلامی دیتا رہ جاتا۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ خاک اس کی بغاوت کو دفن کر سکے گی۔ نہیں، یہ جذبہ اندر ہی اندر پلتا رہے گا۔ جب وہ مر جائے گا تو یہ نامکمل آرزو اس کی اولاد میں خصلت بن کر باقی رہ جائے گی۔ محبوب کو اس کے باپ نے نہ جانے کیسے بچا لیا اور اسے سرکاری وظیفے سے بیرونجات بھیج دیا گیا۔ وہاں سے وہ پروفیسر بن آیا ہے اور کسی کالج میں پروفیسر ہے۔"

"کچھ مس بوگا کا حال معلوم ہے؟"

"اور، ہاں بھول گیا، انہوں نے نرسنگ کا کورس کنگ جارج ہاسپٹل میں لے رکھا ہے۔ جیل کے ایک حسین تحفے کے سلسلہ میں مجھے بھی پندرہ دن ہسپتال میں رہنا پڑا، ذرا بھی نہیں بدلی ہیں۔ بڑی تندہی سے کورس پورا کرنے میں لگی ہیں۔"

"سنا تھا شادی کر رہی ہیں۔"

"ایں؟ شادی، ارے وہ شادی نہیں کرے گی جب تک۔۔۔"

"کیا؟"

"کچھ نہیں۔ یہی کہ جب تک کوئی رحم دل ان کا کنوارہ پن نہ ختم کر دے۔"

"توبہ؟" شمن جھینپ گئی۔

"ہاں ہاں تم نہیں سمجھتیں، وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ عجیب چیز ہے وہ۔ ان عورتوں میں سے ہے جو پیدا ہوتے ہی ماں بن جاتی ہیں مگر شادی سے کانپتی ہیں۔"

"ارے! یہ کیسے؟" شمن کچھ نہ سمجھی۔

"ماں بننے سے میرا مطلب ہے کہ جذبۂ مادری ان میں شدت سے موجود ہوتا ہے۔ مگر شادی کو ایک

گھناؤنا فعل سمجھتی ہیں، جب کہ۔۔۔"

"اچھا چھوڑیئے، نہ جانے کیا لے کر بیٹھ گئے، یہ بتایئے کیا پروگرام ہے"۔

"شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ جب تک کے لئے تم ہی بنا دو پروگرام!"

"سینما چلیے گا؟"

"کہہ تو دیا کہ جیسی تمھاری مرضی، مگر سینما سے ذرا کم دلچسپی ہے، سوائے جذبات کو بھڑکانے کے اور تو کوئی مصرف نہیں ان کا۔ میں ویسے ہی گرم مزاج ہوں۔"

"چہ آج نہ جانے کیا ٹھان کر آئے ہیں جی میں۔"

"بھئی ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔۔۔ بھلا خود ہی سوچو کسی کو عشق لڑاتے دیکھ کر مجھے کیا طمانیت قلب حاصل ہو سکتی ہے۔ سچ پوچھو تو کامیڈی دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ وہ سالا ہیرو کوڑی کا کام کا نہیں مگر عیش اڑا رہا ہے اور ہم ہیں کہ۔۔۔"

"خیر چلئے ٹریجڈی ہی دیکھ لیں۔۔۔ دیوداس پسند ہے۔"

"واہیات، ٹریجڈی پر تو اور بھی جھنجھلاہٹ آتی ہے اور دیوداس کو تو ٹھوکنے کو دل چاہتا ہے۔"

"یا اللہ یہ کیوں؟"

"لیچڑ کم بخت، بھاگ جا تا لڑکی کو لے کر۔"

"اونہہ تو نہ جایئے، یہ کیوں نہیں کہتے۔"

"یہاں ایک پارک بھی تو ہے۔"

"ہاں"

"اگر تمھارے ساتھ میرے جانے سے تمھیں اسکول سے نکال نہ دیا جائے تو چلو ذرا کھلی ہوا ملے گی۔ نہ جانے کب سے مقبروں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔"

"مگر ایک فائدہ تو ہے ان فلموں سے!"

"شکر ہے کچھ تو ملا آپ کو۔"

"ہاں ہمارے پوشیدہ امراض کی دواؤں کی تو خوب ترقی ہو رہی ہے۔ یہ دیکھو کہ ہر فلم کے اشتہار کے ساتھ اس کی دوا موجود ہے۔۔۔ نہیں سمجھیں؟" ثمن کے اکتائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنسا۔ "تم لوگ بنتی ہو یا واقعی بے وقوف ہو۔"

"جو کچھ بھی سمجھ لیجئے!"

"ارے بھائی فلم کا آخری شو دیکھ کر چوٹی کا ٹھرا چڑھانے کے بعد سڑک کے کنارے نالیوں میں کیا ہوتا ہے۔ مزے سے لیٹ کر فلمی ڈرامہ دہرایا جاتا ہے۔"

ثمن چپ رہی۔ "بعض خوش نصیب تو بازار حسن میں اپنی سلوچنا اور مادھوری ڈھونڈ نکالتے ہیں اور

بعض۔۔۔"

"کیا؟"

"کچھ نہیں، تمہیں کراہت آئے گی، جانے دو ان باتوں کو، دوسرے یہ باتیں یا تو ضرورت سے زیادہ مقدس ہیں یا فحش کہ ان کا ذکر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نہ جانے کم اپنے عیوب کا ذکر کرن کراس قدر چراغ پا کیوں ہو جاتے ہیں۔ اونہہ جانے دو۔۔۔ ہاں بتاؤ کچھ اپنے اسکول کا حال، استانیوں پر بزار عب گانٹھتی ہو گی۔"

"نہیں تو، بے کار اترانے کی عادت نہیں مجھے۔"

دھیمی دھیمی چاندنی پھیلی ہوئی خاموشی کو اور بھی پراسرار بنا رہی تھی۔ پارک میں چاروں طرف زندگی کا احساس موجود تھا۔ مگر خاموش اور دھندلا سا معلوم ہوتا تھا۔ نیم خفتہ روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ چاندنی اور خاموشی نے مل کر آوازوں کو بھاری اور دھیما کر دیا تھا۔

"تمھیں تعجب ہوگا؟" فضا سے مسحور ہو کر افتخار نے کہا۔

"کس بات پر؟"

"اگر میں کہوں کہ مجھے تم بہت پسند ہو۔"

"نہیں!" ثمن نے قلابازیاں کھاتے ہوئے دل کو دبوچ کر کہا۔

"اور کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں تمھیں بتاؤں کہ تم پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے اس حد تک متاثر کیا ہے؟"

"لیکن یہ سب کیوں؟"

"پتہ نہیں!" وہ متحیر سا تھا۔ "پتہ نہیں میں یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا ہوں۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں نے ایک بار نہیں ہزار بار محبت کی ہے، کم از کم یقین تو یہی کیا ہے اور یقین دلانے کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر تمھیں۔۔۔؟ تمھیں میں کچھ یقین نہیں دلانا چاہتا۔"

"اور نہ ہی مجھے کچھ یقین کرانے کا حق ہے؟" ثمن کو خاموش دیکھ کر بولا۔

"شاید"

"اور یہ بھی ایک وہم ہی ہو۔"

"ہو سکتا ہے!"

"تو پھر میں جیل سے چھوٹ کر سیدھا تمھاری طرف کیوں بھاگا۔ جیسے میرے برسوں کے سڑے بسے زخموں کا مرہم تمھارے پاس ہی ہے، تم سے ملتے ہی شفا ہو جائے گی۔"

"شاید یہ بھی وہم ہو!"

"اونہہ، مجھے جلاؤ مت۔۔۔ ثمن خدا کے لئے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو اور اگر کچھ سمجھ میں آ جائے تو مجھے بھی سمجھا دو میں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟" وہ بھولے بچوں کی طرح التجا بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ ثمن کا دل

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

بھر آیا۔ وہ کیا دے سکتی ہے اسے، اس کے پاس افتخار کے دکھوں کا علاج کہاں ہے؟ وہ اس سے کچھ مانگ بھی تو نہیں رہا۔ اس کی حالت اس لاوارث بچے کی سی ہے جو گھر سے بھٹک آیا ہو اور والدین کا نام و نشان بھی نہ دے سکے۔ کون کر سکتا ہے ان گم شدہ لوگوں کی رہنمائی!

''شمن جانے کیوں میری آرزو ہے کہ میں کسی سے محبت کروں۔ جی بھر کے محبت کروں۔ مگر میرے دل سے ہر چیز کا اعتبار اٹھ گیا ہے، مجھے کسی چیز پر یقین نہیں رہا اور خدا کے وجود پر ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ محبت سے مجھے گھن آتی ہے اور خدا پر غصہ کہ وہ کیوں ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ مانا کہ یہ دنیا اس نے بنائی، تو ہم پر کیا احسان کیا، اسے سجدے کرانے کا کیوں اتنا شوق ہے، اور جو نہ کرو تو دوزخ میں جلانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ سچ بتاؤ یہ کبڑی بھینگی دنیا تمھیں پسند ہے؟ کہیں اونچائی ہے تو ضرورت سے زیادہ، پستی ہے تو انتہا سے زیادہ، پانی ہے تو پانی ہی چلا گیا ہے اور پھر خشکی ہے تو وہ کم بخت بے تکی۔ جی چاہتا ہے اس دنیا کے گولے کو دونوں ہاتھوں سے گوندھ ڈالوں اور پھر اتنی سبک اور نفیس دنیا بناؤں کہ لوگ پیدا ہو کر بھی خوش ہو جائیں۔'' شمن کو اس کے بچپن پر ہنسی آئی۔

''مگر آپ تو کہتے تھے ہر مرض کا علاج ہو سکتا ہے، آپ اشتراکی ہو کر ہمت ہار جاتے ہیں۔''

''میں اشتراکی تو ہوں مگر میری روح تو فاشزم کی عادی ہو چکی ہے۔ اشتراکیت ابھی ہم سے اتنی دور ہے جتنا یہ آسمان زمین سے۔''

''کیا یہ فاصلہ کبھی کم نہ ہوگا؟''

''ممکن ہے کسی دن ہو جائے مگر میں یہاں زندہ رہوں گا۔''

''ارے تو وہ آپ کی اسکیم؟''

''دو چار ہم پھٹے، تین چار ریلیں لڑیں، وائسرائے کی موٹر میں پنکچر ہوتے ہوتے بچ گیا۔'' وہ زور سے ہنسا۔ ''نصف سے زیادہ کام کرنے والے جیل میں چکیوں پر جٹ گئے اور کسی کے کان پر جوں تک رینگی۔ یہ گئے دیکھو۔'' اس نے ہاتھ پھیلائے۔

''چہ۔ اے ہے نہ جانے کیوں جاتے ہیں جیل میں۔''

''کہتے ہیں بغیر جیل میں گئے عوام کو قوم پرستی کا یقین نہیں آتا۔ جیسے یونیورسٹی کی مہر کے بغیر سرکاری نوکری نہیں مل سکتی، اسی طرح جب تک جیل کا سرٹیفکیٹ نہ ہو قومی اسٹیج پر نہیں ناچا جا سکتا۔ اس لئے بعض وقت تو بڑی کوششوں سے جیل جانا پڑتا ہے۔''

''چہ بے کار میں!''

''جی ہاں بے کار کا ڈھکوسلہ، بات یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں کے پاس سوائے جیل جانے کے کوئی عملی ثبوت ہے بھی تو نہیں قوم پرستی کا۔ اب یہ لکھ پتی دو چار مہینے کی جیل نہ کاٹ آئیں تو عوام الو کیسے بنیں اور ان پر پھول بارکی بارش کیسے ہو۔''

''مگر سب تو لکھ پتی نہیں۔''

''ہاں اور ان کے پاس کوئی حربہ بھی تو نہیں جسے استعمال کریں۔ سوائے سڑک پر مچل جانے کے اور اس کی سزا میں ''اماں جان'' کوٹھڑی میں بند کر دیتی ہیں۔ ارے یہ باتیں زبانی نہیں سمجھی جاتیں، سمجھنا ہے تو آجاؤ میدان میں۔ پر کھدر پہننا ہوگا۔ یہ ململ نہیں چلے گی۔'' وہ اس کی ساڑھی کے آنچل کو جھٹکنے لگا۔ ''آبلے پڑ جائیں گے۔''

آبلوں کے ذکر سے اسے مس بوگا یاد آ گئیں۔

''یہ مس بوگا نرس کیوں بن رہی ہیں؟''

''دل کی بھڑاس نکالنے کو، میاں اور بچے نہ سہی مریض ہی سہی۔''

''ہنہ، وہ تو پاک محبت کی ہمیشہ سے قائل ہیں۔''

''پاک محبت سے تمھارا کیا مطلب؟ ماں اور بیٹے کی محبت۔'' آج افتخار لیکچر بازی پر تلا ہوا تھا۔

''نہیں بلکہ دوستی، ایک دوسرے سے ہمدردی!''

''دوستی کوئی چیز نہیں۔ ایک عورت اور مرد کی صرف ایک مقصد کیلئے دوستی ہو سکتی ہے اور وہ۔۔۔''

''اونہہ جانے بھی دیجئے دنیا میں ہر عورت کو بیوی نہیں بنایا جا سکتا!''

''تم سچ کہتی ہو۔۔۔۔ ہر عورت کو۔۔۔ بیوی تو نہیں بنایا جا سکتا۔۔۔ مگر۔۔۔۔'' وہ الفاظ ڈھونڈنے کے لئے بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے لگا۔ ''مگر مس بوگا کی محبت ہی نہیں، نہ تو اس میں ماں کا سا معصوم پیار ہے اور نہ محبوبہ کی پر جوش گرمی، وہ تو ایک بجھے ہوئے شعلے کی بے حقیقت گرمی بھی نہیں، برف کی طرح ٹھنڈی اور مٹی کی طرح بے جان ہے، کچھ بوسیدہ اور گھسی ہوئی سی وحشت ہے۔'' وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

''اور میری۔۔۔۔ میری محبت کس قسم کی ہے؟'' اس نے سرگوشی میں خود سے پوچھا۔ ''یہ میں کس قسم کی محبت کرتا ہوں؟ یہاں کس قدر حسین اندھیرا ہے، تم ہو اور میری صدیوں کی پیاسی روح، مگر ایک لمحہ کو بھی میں یہ گوارا نہ کر سکوں گا کہ تم کو اس بلندی پر سے گھسیٹ کر نیچے لے آؤں جہاں میرے تخیل نے تمھیں بٹھا رکھا ہے۔ کیا میں اتنا شریف ہوں؟ ہنہ۔'' اس نے لفظ شریف کو حقارت سے تھوکا۔

''یہ آپ اپنی ہر خوبی کو کمزوری اور طاقتوں کو غلطیاں کہہ کر گویا بڑا بھاری انصاف کرتے ہیں۔''

''لاحول ولا قوۃ، مگر میں شرافت کو اپنے لئے نہیں سمجھتا ہوں۔ کیا سمجھتی ہو، میں تم سے اپنی پارسائی کا سرٹیفکیٹ لینا چاہتا ہوں۔'' وہ واقعی جھلا اٹھا۔ ''ابھی یہاں اس سنسان کونے میں اگر میں چاہوں تو۔۔۔''

''آپ کچھ نہیں کر سکتے۔''

''کیوں؟'' افتخار کا منہ اتر گیا۔

''اس لئے کہ آپ اتنے برے نہیں جتنا آپ کے وہم نے بنا رکھا ہے۔''

''کیوں؟''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''اطمینان قلب کے لئے آپ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں خود پر پھٹکار بھیج کر یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس طرح ان کے گناہ دھل گئے۔''

''گناہ؟ مگر کون بے وقوف گناہ و ثواب کا قائل ہے؟''

''آپ کا ضمیر!''

''ہشت غلط۔ ضمیر ایک غلط فہمی ہے اور کچھ نہیں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں۔۔۔''

''برا سمجھ کر کرتے ہیں اور اچھا ہوتا ہے۔''

''ایں؟'' وہ چونکا۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں مگر آپ دل کے برے نہیں۔''

''یعنی زبردستی۔''

''جی ہاں، اگر مجھے اس کا یقین نہ ہوتا تو اس وقت میں آپ کے ساتھ کبھی نہ بیٹھتی۔''

''بڑی تنگ خیال ہو!''

''جو کچھ بھی سمجھ لیجئے! چلئے اب خنکی بڑھ رہی ہے آپ کو کچھ ہو گیا تو۔۔۔۔۔''

''تمھاری بلا سے!''

''جی نہیں۔ آپ کی زندگی میری نظروں میں اتنی سستی نہیں جتنی آپ نے بنا رکھی ہے۔ ابھی آپ کو دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے، اور دنیا کے لئے مجھے آپ کو زندہ رکھنا ہے۔''

''ہوں، دنیا کے لئے؟ اور کسی کے لئے نہیں۔'' وہ مردہ دل ہو گیا۔ ''دنیا کے لئے جیتے جیتے تو اب دل اچاٹ ہو چکا ہے۔ تمھیں کیا غرض مجھے دنیا کے لئے جلانے کی؟''

''میں بھی تو دنیا میں ہی ہوں۔'' ثمن کو اپنی ہمت پر سخت حیرت ہوئی۔

''اوہ! وہ دیر تک خاموش سر جھکائے کچھ سوچنے اور یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

افتخار چلا گیا تو وہ دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ اس نے امتحان کے دو پلڑوں میں افتخار اور ستیل کو تولنا شروع کیا۔ ایک کے خیال ہی سے پہلے کو دھکا لگتا تھا اور دوسرا ایک مست کن غبار کی طرح چاروں طرف سے اسے محسور کرتا جا رہا تھا۔ اتنی دیر ساتھ بیٹھی مگر ایک مرتبہ بھی تو اسے وہ نیم وحشیانہ احساس نہ ہوا جو آخری مرتبہ ستیل سے مل کر ہوا تھا۔ یہ کیا؟ جس نے اس کی زندگی میں اتنی خاموش ہلچل مچا رکھی تھی۔ یہ نامعلوم سی بے چین کسک جو بیک وقت شیریں بھی تھی اور تلخ بھی۔ وہ اس کے ہر اشارے پر سب کچھ دے ڈالنے کی زبردست آرزو، اس کا ہر لفظ بھوکے کی پکار بن کر دماغ میں پنجے گڑا لیتا۔ ہر سانس فقیر کی صدا بن کر گونج اٹھتی۔ یہ سب کیوں؟ کیوں؟ وہ کوئی جواب نہ پا سکی۔

(33)

اسکول کے بکھرے ہوئے شیرازے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش میں وہ بالکل پاگل ہو گئی۔ دوپہر کو جو لڑکیوں کے گھروں سے کھانا آتا اس میں سے ایک آدھا آلو یا بوٹی چپڑاسنیں نکال کر اڑا جاتیں باقی میں استانیاں حصہ لگاتیں۔ بے چاری بچیاں بھوکی مرتیں۔ پہلے تو چپڑاسنوں نے سنی ان سنی کر دی پھر جو سختی کی گئی تو ایک اور چال چلی۔ لڑکیوں سے کہہ دیا۔ ''خبردار جو پورا کھانا کھایا، ہمارا حصہ ضرور چھوڑنا ہے۔'' لیکن یہ بات بھی زیادہ نہ چھپ سکی اور ایک دن چپڑاسنوں کے مظالم کی شکایت کے بعد باز پرس پر چپڑاسنوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''کیا کریں مس صاحبہ، چھ روپیہ اور تین بچے، ایک اپاہج ماں اور نکھٹو بھائی کیسے گزر ہو۔ یہ اللہ مارا پیٹ بھی نہیں مارا جاتا۔''

''جیسے تیسے تو ہم پڑھا رہے ہیں اپنی بچیوں کو اپنے ہی پیٹ کو نہیں تو ان چپڑاسنوں کا کہاں سے کلہ گرم کریں۔'' لڑکیوں کے والدین نے دہائی مچائی۔

''بیس روپے میں مکان کا کرایہ اور اپنا اور چار بندوں کا کھانا کپڑا کیسے پورا کریں۔'' استانیاں چیخیں۔

ثمن کو ایسا معلوم ہوا اسکول میں نہیں کسی لنگر خانے میں کھڑی ہے۔ دنیا نہیں بھوکے ننگوں کا ایک مستقل یتیم خانہ ہے جہاں اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک نڈھال ہے۔ اس نے دونوں چپڑاسنوں کو اپنے پاس سے دو روپیہ دینا شروع کئے۔ جب کبھی ممکن ہوتا استانیوں کی دعوت کر دیتی۔ ہر ماہ دو چار غریب لڑکیوں کی فیس بھی ادا کر دیتی مگر اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جتنا زیادہ پیٹ بھرنے کی کوشش کرتی بھوک بڑھتی جاتی۔ ایک فقیر کو پیسہ دے دو تو دس اور ٹوٹ پڑتے ہیں، جو نہ دو تو بعض شوقین مزاج گالیوں پر بھی اتر آتے ہیں۔ غرض اس دریا دلی کے بدلے میں بجائے سرخروئی کے جوتیاں ملیں۔ ہر جمعرات کو چپراسنیں محلے ٹولے میں بھیک ہی مانگ لاتیں۔ استانیاں نہ بے چاری بھیک مانگنے کی ہمت اور نہ عمر رنڈی کے پیشے کے لائق۔ گھر نہ بار سوائے اسکولوں کی خیرات کے اور کیا وسیلہ زندگی گزارنے کا ہوتا ہے، ہر وقت ایسے لرزتیں جیسے قصائی سے گائے۔

مگر رضیہ بیگم بائبل چنگیزی پالیسی کی قائل تھیں۔ باوجود کوششوں کے انھوں نے لڑکیوں کو ایک لفظ بھی پڑھا کر نہ دیا۔ بس ہر وقت بیٹھی منیجر صاحب کے لئے کشیدہ کاری کا جال تیار کیا کرتیں۔ ثمن نے ان کی رپورٹ میں شکایت کی مگر وہ رپورٹ انسپکٹرس کے پاس بھیجنے سے پہلے منیجر صاحب نظر ثانی کو لے گئے۔ اور ان کی شکایت ہی گول مول کر دی۔ رضیہ بیگم شدت سے حاوی ہوتی گئیں۔ ثمن کا پلہ انتہا دیکھ کر وہ استانیوں پر

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

قابو جما بیٹھیں۔ بحالی اور ترقی کی کامیاب سفارشیں ہونے لگیں۔ آموں کی چٹنی کے ساتھ انہوں نے اسکول کی بھی چٹنی بنانی شروع کر دی۔ ثمن کو معلوم بھی نہ ہوا اور وہ منیجر کی آڑ لے کر اس کی پیٹھ میں ڈنک مارنے لگیں۔ اس کی ملنے جلنے والوں کی رپورٹ پہنچائی اور منیجر صاحب قوم پرستی پر تل گئے۔ اس کے لباس اور طرز رہائش سے انہیں شریف خاندانوں کی لڑکیوں کے اسکول سے ہٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ وہ ذرا ذرا سی بات کی خبر پا جاتے، کے بجے اٹھتی ہے، کب سوتی ہے، کیا کھاتی ہے اور کیوں کھاتی ہے؟

''کس نے کہا ہے آپ سے'' وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھتی۔

''مجھے ہر بات کی خبر رکھنا پڑتی ہے صاحب'' وہ نہایت پراسرار مسکراہٹ چہرے پر طاری کر کے کہتے۔ گویا اسکول کے منیجر کو سی آئی ڈی کا کام بھی کرنا پڑتا۔ ''مجھے عوام کے قومی جذبے کو ابھار کر چندہ جمع کرنا ہے۔ لہٰذا استانیوں کا چال چلن۔۔۔۔''

''لفظ چال چلن پر ثمن جل کر رہ گئی۔ پتہ نہیں لوگ چال چلن کو کیا سمجھتے ہیں۔ چال چلن بھی کوئی مقدس مقبرہ ہے کہ اس کے آگے ماتھا ٹیک کر نجات کی امیدیں لگا بیٹھیں۔ اگر ایک استانی زمانے بھر کی آوارہ ہے مگر کام ٹھیک کرتی ہے تو اس مقدس مٹی کی بنی ہوئی معلمہ سے ہزار درجہ غنیمت ہے جو خود تو مجبوراً نیک چلن ہیں مگر لڑکیوں کا حال اور مستقبل تباہ کرنے میں مصروف ہے۔

''دیکھئے صاحب سنا ہے لڑکیوں کے پاس چٹھیاں آتی ہیں۔''

''کیسی چٹھیاں؟'' ثمن نے ضبط سے کام لیا۔

''اجی یہی خرافات پرچے، غنڈے بھیجتے ہیں۔ آپ ایک کام کیجئے ایسی سب لڑکیاں جن کے پاس خطوط آتے ہیں جمع کر کے انہیں ڈانٹئے۔''

''مگر یہ کیسے معلوم ہو کہ چٹھیاں کس کے پاس آتی ہیں۔ پکڑی جائے تب نا۔''

''تو صاحب پکڑیئے'' گویا چٹھیاں بھی کبوتر ہیں کہ چھاپہ مار کر پکڑ لی جائیں۔ دوسرے یہ چڑی ماری تجربے سے آتی ہے۔ ایسے خط ڈاک سے نہیں آتے بلکہ لڑکیاں ہی ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ اپنے بھائی بندوں کی پرچہ بازیاں جاری کرنا ایک عام بات ہے۔ بیس روپیہ پانے والی استانیاں اور چھ روپیہ میں گزر کرنے پر مجبور چپڑاسنیں اگر پان تمباکو کا خرچہ اس پرچہ بازی سے نہ نکالیں تو اور کیا کریں۔ اگر لڑکیوں کو ڈانٹو تو والدین چڑھ دوڑتے ہیں۔ بھلا ان کی معصوم بچیاں یہ ہتھ کنڈے کیا جانیں اور ان معصوم بچیوں کا پکڑنا بھی معمولی کام نہیں۔ ہزاروں چالیں چل کر خط لائے جاتے ہیں، عموماً تو لڑکی کی طرف سے لڑکے کے نام ہوتے ہیں جن پر باز پرس کرنے کے لئے غیب داں بلانا ہوتا ہے۔

ساتھ ہی امتحان آ گئے۔ نگہبیں لگوانا اس چالاکی سے کہ لڑکیاں ایک دوسرے کی نقل نہ کر سکیں۔ کاپیاں بانٹنا اور پھر سارے دن چوکیداری کرنا۔ انسپکشن کا زمانہ بھی آ گیا، اب یہ دیکھنا کہ سارے رجسٹر جھوٹی سچی کیسی بھی فضول معلومات سے پُر ہیں یا نہیں۔ لائبریری کی کتابوں اور کشیدہ کاری کے نام سے روپیہ نکال کر منیجر

صاحب نے اپنی ساس کا قرضہ اتار دیا اور اس رقم کی لیپا پوتی میں کون سے گُر استعمال کئے جائیں، منیجر صاحب بھی کچھ مکدر سے رہ گئے۔

''اچھا صاحب یہ کیجئے کہ لکھ دیجئے رجسٹر میں۔۔۔ کہ گملے اور پھولوں کے بیج خرید لئے گئے، چلئے چھٹی ہوئی۔'' رائے دینے لگے۔

''مگر ہیں کہاں گملے اور بیج۔ انسپکٹرس نے معائنہ کیا تو؟''

''کہہ دیجئے گا کچھ بچیوں نے توڑ ڈالے اور کچھ میں چنگی کے افسر سے کہہ کر خالی ٹوٹے گملے منگوا لوں گا۔ باغ عام میں بہت بے کار پڑے ہیں۔ کچھ میرے یہاں ہیں وہ بھیج دوں گا اور آپ۔۔۔ آپ نے بھی تو کچھ لگا رکھے ہیں۔''

''اپنے تو میں نے تقسیم کر دیئے۔ کون چھٹیوں میں رکھوالی کرتا۔''

''اے لیجئے غضب کر دیا آپ نے تو۔۔۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔''

''اور بیج؟''

''اوہ لکھ دیجئے اُگے نہیں، خراب تھے اور یہ کم بخت ہوتے بھی ہیں گھنے گھنائے واہیات۔ کہئے تو میں کچھ پنساری کے یہاں سے منگوا دوں۔''

''مگر یہ پورے روپئے کا تو حساب نہ ہوا۔''

''کچھ بننے کاڑھنے کا سامان میں مکان سے بھجوا دوں گا۔''

''بہت اچھا۔''

''اور کچھ کتابیں بک اسٹال سے منگوائے دیتا ہوں۔ خراب نہ ہونے پائیں۔ نہایت احتیاط سے واپس کرنا ہوں گی۔ کچھ چائے پانی کا انتظام؟''

''وہ تو خیر ہو جائے گا مگر وہ بورڈنگ، اس کا کیا ہوگا، اس کے لئے باقاعدہ رقم ملتی ہے۔''

''آپ فکر نہ کیجئے ایسا ہے کہ اس کا تو میں نے پہلے سے انتظام کر لیا ہے، وہ جو مشرقی بازو کے تین کمرے ہیں اس میں پندرہ بیس چارپائیاں ڈلوا دوں گا۔۔۔ بستروں کا بھی انتظام گھر میں سے کر دیں گے۔ کچھ فاضل چادریں اور تکیے ہوں تو آپ دے دیجئے گا۔''

''مگر یہ تو سراسر دھوکا دینا ہے۔ اس طرح فریب دے کر انسپکٹرس کی نظروں میں کیا وقعت رہ جائے گی، اگر اسے کسی طرح پتہ چل گیا؟''

''اب صاحب پتہ چلنے کی کوئی راہ تو ہے نہیں سوائے۔۔۔ خیر۔۔۔ آپ اسکول کی مائی باپ ہیں، مجھے امید ہے کہ اسکول کی بہتری کے لئے آپ کو خود فکر لگی رہتی ہے۔ کیا کیا جائے صاحب مجبوری ہے۔ یہ دیکھئے آپ کو اگر گورنمنٹ سے گرانٹ لینی ہے تو سبھی کچھ کرنا پڑے گا، آپ پریشان نہ ہوں میں سب کچھ بھگت لوں گا۔ بس جس وقت آئیں تو آپ۔۔۔۔ ارے ہاں وہ نظم؟''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''نظم؟''

''جی ہاں نظم۔۔۔تیار کی آپ نے؟''

''میں نے؟ کیوں؟''

''لیجئے صاحب اجی وہی انسپکٹرس کی شان میں۔۔۔بخدا بھول گیا۔ دیکھئے جب وہ آ کر بیٹھ جائیں تو کسی پیاری سی بچی سے گلے میں ہار ڈلوا دیجئے گا۔ عمدہ صاف کپڑے ہوں، سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسی ٹھیک رہے گی، میں اسے صبح سے ہی بلوا لوں گا۔''

''مگر وہ تو یہاں پڑھتی نہیں۔''

''اجی سب چلتا ہے، کوئی نام بنام تھوڑی ایک ایک لڑکی دیکھی جاتی ہے، آپ یہ کیجئے گا کہ صبح سے بلوا لیجئے گا۔۔۔ہاں۔''

''جیسی آپ کی مرضی!''

''اور ہاں پھر ہار وغیرہ پہنا کر لڑکیوں سے نظم۔۔۔چہ لاحول ولاقوۃ آپ نے نظم تو تیار نہیں فرمائی۔''

''میں نے عرض کیا نا کہ مجھے نظم لکھنی نہیں آتی۔''

''چہ تو بہ ایسی مشکل ہی کیا ہے پچھلی مرتبہ رضیہ بیگم نے بنا دی تھی اگر مل جائے تو وہی چلا دیجئے۔ دو چار لفظوں کا ہیر پھیر کرنا ہوگا۔۔۔ورنہ ٹھہریئے میں ہی کچھ سوچوں گا۔'' اور وہ چہرے پر شاعرانہ جذبات طاری کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ''ایں؟'' انہیں سوجھ ہی گئی۔ ''وہ دیکھئے پاس جو قومی ہائی اسکول ہے اس میں جو جلسے ہوتے رہے ہیں وہاں ہزاروں نظمیں پڑی ہیں منگواتا ہوں میں۔۔۔۔ابے ننھے۔۔۔او۔۔۔سالے۔۔۔اوہ معاف کیجئے گا۔۔۔دیکھ بے ذرا مسعود صاحب کے پاس تو جا لپک کر کہنا منیجر صاحب نے سلام کہا ہے اور نظمیں مانگی ہیں۔''

''نجمیں؟''

''ابے ہاں گدھے۔۔۔کہیو۔۔۔چہ الو ہے الو۔۔۔معاف کیجئے گا۔۔۔۔خیر میں خود ہی لے آؤں گا۔۔۔۔اور کل تک پہنچ جائے گی۔ آپ اس میں ردوبدل کروا لیجئے گا۔ اسکول میں ایک دن پہلے سے بجوا دوں گا۔ اور امتحان پیر سے شروع کر دیجئے گا۔ اردو کا پرچہ رکھ دیجئے گا۔'' انسپکٹرس کو اردو نہیں آتی تھی۔ تعلیمی انسپکشن سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی۔

انسپکٹرس کی آمد کی خوشی میں پاس پڑوس کے جتنے گملے تھے آ گئے۔ کسی میں پودینہ تو کسی میں ہری مرچیں مگر برآمدہ ہرا بھرا ہو گیا۔ کتب فروش نے دس روپیہ کرایہ لے کر پانچ سو کتابیں بھیج دیں۔ اتنا دیکھنے کی کسے فرصت یا فکر تھی کہ اس میں زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو لڑکیاں چھوڑ کسی کے بھی پڑھنے کے قابل نہ تھیں۔ زیادہ تر سستے بازاری ناول۔ ''میاں بیوی''، ''شادی کی راتیں'' اور مستند کوک شاستر تھے جنہیں بڑی شان سے الماری میں چن دیا گیا۔ ساتھ ساتھ اور ادھر اُدھر کا کوڑا جمع کر دیا گیا۔ پہلے پرانے میگزین، جنتریاں، ٹیلی فون

ڈائریاں اور پرانی فہرستیں نہایت صفائی سے کاغذ چڑھا کر ایسے مقام پر رکھ دی گئی تھی جہاں سے دیکھنے والا کتاب کی ضخامت سے تھرا کر رہ جائے۔ نیز اس کاغذ چڑھانے والی چال کو سلیقہ سمجھے، کواڑوں اور کھرچی ہوئی بنچوں پر تیل اور پانی چپڑا گیا۔ جگہ جگہ تصویریں اور کیلنڈر وغیرہ چپکا کر دیواروں کی مفلسی پر پیوند لگائے گئے۔ لڑکیوں سے کہہ دیا تھا کہ صاف اور ثابت کپڑے پہن کر آنا تو وہ بری کے جوڑے نکال کر پہن آئیں، جھانجن اور چوڑیوں کی جھنکار سے اسکول اندر سبھا کا اکھاڑا بن گیا۔

ایک اور ہوشیاری کی گئی وہ یہ کہ امتحان کی کاپیوں پر آدھا آدھا پرچہ استانیوں نے بورڈ پر لکھ کر پہلے سے کروا دیا تھا کہ اگر انسپکٹرس لڑکیوں کی قابلیت کا اندازہ لگانے پر بضد ہوں اور کسی کو ساتھ لے آئیں تو ان میں ادیب فاضل کی لیاقت کے جوابات حل کئے ہوئے پائیں۔ ان انسپکٹرسوں کے سارے ہتھکنڈوں سے اسکول والوں کو واقف رہنا پڑتا ہے۔ کوئی چال ان کی نہیں چل سکتی۔

اس کے علاوہ میزوں اور الماریوں میں ''لڑکیوں کی کشیدہ کاری'' کا نام سے کچھ بازار سے خریدی ہوئی چیزیں اور کچھ مانگتے تانگتے کے جہیزوں کے میز پوش، پاندانوں کے کور، سلمہ کا بنا ہوا تاج محل اور قریب قریب سارے نمونے رضیہ بیگم کے کاڑھے ہوئے۔ ''سویٹ ڈریم'' اور ''گڈ نائٹ'' سجا دیئے گئے۔ ان میں سے تو بعض چیزیں مشین کی بنی ہوئی اور بیرونجات کی صنعت گری کا نمونہ تھیں، مگر ایسے پینتروں سے یہ سب سامان رکھا گیا کہ صرف چیزوں کی تعداد بڑھا رہا تھا مگر پہنچ سے دور تھا۔ یہی نہیں کچھ نامکمل چیزیں بھی تھیں جو پاس کے اسکول سے منگا کر سجا دی گئی تھیں۔

بورڈنگ بھی لیس تھا۔ چارپائیوں پر خالی غلافوں میں الابلا ٹھونس کر تکیے لگا دیئے گئے اوپر سے چادریں اور پلنگ پوش ڈال دیئے گئے۔ پاس دو چار میزوں پر لتائیں سجا دی گئیں۔ لیجئے کمرے سج گئے۔ رہیں لڑکیاں تو وہ تین چار کلاسوں سے چن کر مقرر کر دیں کہ جب انہیں بلایا جائے تو حاضر ہو کر انسپکٹرس کو سلام کریں۔

خدا خدا کر کے برات کی طرح زور و شور سے انسپکٹرس اتریں۔ گیٹ کے پاس جہاں لمبا چوڑا خوش آمدید اور جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ منیجر، ہیڈ مسٹرس نے مع چپڑاسی اور دو عیسائی استانیوں کے خوش آمدید کہا۔ یہ انسپکٹرس بھی دنیائے تعلیم میں خدا کا سا درجہ رکھتی ہیں۔ جو شان لاٹ صاحب کی سوان۔ ان کا کام صرف دھوم دھڑکے سے آنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا ہے۔

''یہ جالا کیوں؟۔۔۔یہ اینٹ کیسی؟ یہ گڑیا کس لئے؟'' اب ان سے کوئی پوچھے سال میں دو مرتبہ اگر آئیں اور جالے اور گڑھوں میں پھنس گئیں تو کون سی قیامت آ گئی۔ سیدھی طرح آؤ، ہار پھول پہنو، تعریفی نظمیں سنو، تازہ تازہ پھل اور مٹھائیاں بھینٹ کے لئے منگا رکھی ہیں وہ چکھو کچھ تمہارے ساتھ چپکے سے باندھ کر گھر پہنچا دیں گے وہاں اطمینان سے چکھنا۔ بس اس سے زیادہ دخل در معقولات کی فہرست میں داخل! کیا فائدہ بری رپورٹ سے۔ چیف انسپکٹرس کب کب آتی ہیں اور کتنی دیر کے لئے آتی ہیں۔ اس سرسری

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

معائنے کی سرسری ہی رپورٹ ہو، ورنہ خواہ مخواہ تمھارا ہی حلقہ بدنام ہوگا۔ اول تو ہم ہندوستانی ہیں۔ بدانتظامی، دھوکا، جعلسازی، ہمارا پیدائشی حق، دوسرے ہمارا شمار پست اقوام میں ہے۔ اب تو چیڑی اور دودو! تم بے کار مغز پاشی کررہی ہو۔ تمھاری بلا سے جو رسیدوں پر جھوٹے دستخط ہیں جو نیجر صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے کر لئے ہیں اور فرضی انگوٹھے تنخواہ کے رجسٹر میں لڑکیوں اور چپڑاسنوں سے لگوائے ہیں۔ تم کیوں پڑتی ہوں ان جھگڑوں میں۔

اس پر بھی جو تم نہ مانیں تو مقامی قومی اخبار کے ذریعے تمھارے چال چلن، خفیہ رشتوں اور سیروں کا پول کھول کر رکھ دیا جائے گا۔ تم فرقہ پرست الگ مشہور کردی جاؤ گی۔ زیادہ نہیں چار پانچ روپے کا خرچ ہے، سحرالبیاں ایڈیٹر تمھاری سات پشتوں تک کی دھجیاں بکھیر کر پھینک دیں گے، ہم جو جھانسے تم کو دے رہے ہیں بس عین مین یہی لے کر اپنے افسروں کے سامنے رکھ دو۔ اس معائنے کے اچھے شکریہ کے انعام میں جو ہم یہ چاندی کا بکس علاوہ مٹھائی کے دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ اپنے افسر کے بکس میں پہنچادو۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسی کے ہاتھوں ہار پھول پہن کر انسپکٹرس نے ذرا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔

''کیا نام ہے تمھارا؟'' پیار سے پوچھا۔

''اوں، ہٹ!'' لاڈلی نواسی نے جواب دیا اور نیجر صاحب کی روح قبض ''اوہو ہو۔۔۔۔۔شرماتی ہے۔۔۔۔بولو۔۔۔۔بٹی نام بتاؤ۔۔۔بولو'' بے چارے مدد کو دوڑے اصل میں وہ خود بچی کا نام بھول گئے تھے۔

''وحیدہ!'' کسی نے سہارا دیا۔

''کس کلاس میں پڑتی ہو وحیدہ!''

''بولو۔۔۔بولو بٹی وحیدہ۔۔۔۔پچ۔۔۔ہاں ذرومت۔۔۔ڈرتی کیوں ہو۔''

حالانکہ بچی نہایت گستاخی سے انسپکٹرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی اور ادھر مارے خوف کے دراصل نیجر صاحب پیلے ہوئے جارہے تھے مگر بچی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''ابھی یونہی آتی ہے۔ کلاس ولاس میں تو کچھ نہیں..... بڑے آدمی کی لڑکی ہے۔ یہ اسکول آتی ہے تو عوام کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔'' نیجر کو تمام گر یاد تھے۔

چائے اور ناشتے سے صاف انکار! یا خدا! ضرور کسی نے کان بھر دیئے ہیں۔ گذشتہ سال جو انسپکٹرس آئی تھی بے چاری کتنی اچھی تھی۔ مزے سے میٹھی نظم سن سن کر گائے کی طرح چارہ سانی کرتی رہی۔ پر یہ تو پوری دہ تھی۔

''ہیں۔ ہیں۔ ہیں۔ آپ کو پسند ہوں تو بنگلے پر پہنچوادوں۔۔۔۔جی۔۔۔۔'' نیجر اپنے سوکھے ہوئے ہاتھوں کو دھونے کی نقل میں ایک دوسرے کے گرد لپیٹنے لگے۔

''یہ چنگی کے گملے ہیں!'' صاف تاڑ گئی۔

''نہیں چنگی! چنگی واللہ۔۔۔۔'' نیجر صاحب مصنوعی حیرت اور خوف کے ملے جلے حملے سے اور بھی زرد اور نڈھال ہوگئے اور بوکھلاہٹ چھپانے کو گملے کے پیندے میں لگے ہوئے نمبر کو بغور پڑھنے لگے۔ کم بخت چپڑاسی نمبر مٹانا بھول گیا!

''اوہ! جی ہاں چنگی کے تو ہیں ہی'' وہ اطمینان کا سانس بھر کر بولے۔ ''سکتر صاحب نے امداد کے طور پر عطا فرمائے ہیں۔'' لیجئے ایک مد اور رجسٹر سے کم ہوگئی دردسری مفت کی رہی۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ جانے کس پراسرار طریقے سے رجسٹر میں گملوں کی مد کے آگے لکھا تھا۔ ابھی آئے نہیں ادائیگی پیشگی ہوگئی۔ مگر انسپکٹرس تو آج خون پینے کے منصوبے گانٹھ کر آئی تھی۔

''یہ گملے کافی سے زیادہ ہیں، اور ضرورت نہیں۔۔۔۔روپیہ واپس لے لیا جائے۔'' اس نے گملوں کی باڑ پر چھڑی پھیردی۔

یہ ہوتا ہے کہ اگر پہلے ہی وار میں انسپکٹرس کو گھیر کر بدحواس کرلو بھیگی بلی کی طرح ہر بات پر میاؤں کروالو۔ اگر ہاتھ اوچھا پڑا اور نکل گئی پھنگی سے، تو بس مست ہاتھی کی طرح گرجتی برستی سب چیزوں کو روند کر کھلیان کردے گی۔ اور یہ نئی انسپکٹرس تو بالکل تازی گھوڑے کی طرح چاروں طرف ٹاپیں ڈالنے لگی۔ مگر نیجر صاحب بڑے بڑے جن کھلا چکے تھے۔ نہ جانے کدھر سے کتابیں اڑادیں، کچھ وہ گئیں وہ ایسی کہ وہ قیمت کا اندازہ ہی نہ کر سکی۔ دستکاری نے اس باوجود شدت سے التجا کرنے کے نہ دیکھی۔ امتحان کا وار بھی کچھ اوچھا پڑا۔ پہلے تو دو چار کاپیاں دیکھیں۔ منشی سے کھسر پھسر کی پھر کہہ دیا کہ چونکہ امتحان ہو رہا ہے تعلیمی معائنہ پھر ہوگا۔ کس دن؟ یہ مقرر نہیں، بے کہے گولہ آن گرے گا۔ اس کے بعد اس نے قطعی ہلاکو خان والی پالیسی اختیار کی۔ بجائے لڑکیوں کے فی الحال استانیوں کا امتحان لے لیا جائے تو خوب رہے گا۔ نیجر صاحب کے پیروں تلے کی زمین کھسک گئی اور سر پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ مارے بوکھلاہٹ کے بدکے ہوئے اونٹ کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگے۔ اس گھبراہٹ میں کئی گملے جو سجاوٹ کے خیال سے نہایت خطرناک جگہوں پہ ٹک سے سہارے سے نکادیے تھے پھسل پڑے اور ''ویل کم'' مع تمام بانسوں اور تختوں کے ان پر نچھاور ہوگیا۔ رضیہ بیگم کا پیٹ کی خرابی کا پرانا مرض ابھر آیا اور وہ نڈھال ہوکر اپنی پلنگڑی پر جا پڑیں۔ دوسری استانیاں بھی از سر نو رانڈ ہوگئیں صرف عیسائی استانیاں پھنسیں مگر وہ تھیں بھی غنیمت۔

اسی عرصے میں گھیر گھار کے نیجر صاحب نظم خوانی کے لئے لڑکیاں بلا لائے۔ شاید ڈھول تاشے سے معاملے کی ٹریجڈی کچھ کم ہو جائے۔ کہتے ہیں سنگیت میں بلا کی طاقت اور جادو ہے، بجھی ہوئی شمعیں جل اٹھتی ہیں، بدمست ہاتھی ماتھا ٹیک دیتے ہیں۔ مگر غضب ہوگیا نظم کے بند بغیر تبدیلی کئے لڑکیوں کے سپرد کردیئے گئے اور تعلیمی جلوس کا ہاتھی اپنے بدلے صوبے کے کمشنر کی شان میں نظم سن کر اور بھی بدمست ہوگیا مگر بجائے غصہ ہونے کے وہ بڑے زور شور سے قہقہہ لگانے لگی۔ نیجر صاحب جواب تک بے قابو ٹانگوں کو صرف قوتِ متخیلہ کے ذریعے روکے ہوئے تھے بے طرح لرزنے لگے اور خود بھی بدحواس ہوکر ہنسنے لگے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''کوئی دوسری چیز گاؤ''۔ رسانیت سے حکم ملا۔

''ہاں ہاں کوئی دوسری چیز سناؤ۔۔۔۔ وہ گاؤ لب پر آتی ہے۔۔۔۔ چلو کم بختو منہ کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔ شروع کرو۔'' منیجر صاحب لڑکیوں کی صف کے آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر ہدایات دینے لگے۔ ''گاؤ۔۔۔ ہاں لب پہ؟'' مگر لڑکیاں مبہوت اور شرمائی ایک دوسری کی پیٹھ میں گھسنے کی کوشش کرتی رہیں۔

''یہ۔۔۔ یہ دیکھیے مس صاحب میں تو ہار گیا ان سے، آپ کو نہیں معلوم، آپ نہیں جانتیں ہماری قوم کس قدر پستی میں گری ہوئی ہے۔ یہ سب غریب اور نچلے طبقے کی بچیاں ہیں جن کے گھروں میں کوئی الف کے نام بے نہیں جانتا۔ میں تو تھک گیا سمجھاتے سمجھاتے۔ اوہ۔۔۔ ارے خدا کے واسطے۔۔۔۔'' لڑکیوں نے ان کی رقت آمیز آواز سے ڈر کر۔ ''لب پہ آتی ہے'' شروع کی مگر باوجود کوششوں کے کچھ بھی لب پہ نہ لا سکیں۔

''اچھا وہی گا دو، سارے جہاں سے اچھا۔۔۔۔ چلو شروع کرو۔''

بڑے جوش سے ایک لڑکی نے پنجم سر کو گھسیٹ کر تار سر کے رے پر گلے کی آخری جھنجناہٹ ختم کر دی۔ سر بہت اونچا تھا ایسا معلوم ہوا چیل انڈا چھوڑ کر اڑی اور منڈلا کر واپس گر پڑی۔ پھر لاکھ خوشامدوں کے بعد ایک دوسرے کے کہنیاں مار کر دوپٹوں میں ناکیں چھپا کر ایک لڑکی نے از سرِ نو تان کھینچی اور کھرج سروں میں ہندوستان کے سارے جہاں سے اچھے ہونے کا عملی ثبوت دینا شروع کیا۔ دم بولا اٹھا۔

''بس کرو'' انسپکٹرس اٹھ کر چلنے لگی۔ دل شکستہ اور شرمندہ لڑکیاں چوٹ کھائی ہرنیوں کی طرح الجھتی گرتی بھاگیں۔

''ہم جانتے ہیں آپ کا یہ اسکول کیا ہے اور کیوں قائم ہے لیکن ہمیں جان بوجھ کر پست اقوام کے ساتھ رعایت کرنی پڑتی ہے۔ سرکار کی یہی پالیسی ہے ورنہ یہ اسکول دو دن بھی قائم رہنے کا حقدار نہیں۔'' رپورٹ پر اس نے ''اطمینان بخش'' لکھ کر حقارت سے کہا۔ اور منیجر صاحب نے کھل کر سانس لی۔ خیر سے بلا ٹلی اور بری نہیں ٹلی۔ جلدی سے انھوں نے گلاب جامنوں کی پوٹلی سنبھال لی جو انسپکٹرس نے چھوئی بھی نہ تھی۔

''اجی یہ اجڈ کیا جانیں ان لقموں کا مزہ!'' انہوں نے پیار بھری نظروں سے مٹھائی کو دیکھا اور چل دیئے۔

شمن سارا دن کچھ مردہ دل رہی۔ رعایت؟ آخر کیوں؟ ان نیچے لوگوں کے ساتھ ہر ایک کو دیا ہی سوجھتی ہے۔ کمزور ہیں، جاہل ہیں، ناکارہ ہیں اس لئے خیرات کے حقدار ہیں تو پھر ان پست قوموں کو دنیا پر سیاہی اور عفونت پھیلائے رکھنے کا حق ہی کیا تھا۔ کیوں نہیں انہیں بھی ملک کے پیڑ کی جڑ میں لگے ہوئے خطرناک کیڑے کی طرح اسپرٹ ڈال کر جلا دیتے۔ یوں نیچا رکھ کر اور پستی میں گراتے جانا تو سراسر حیوانیت ہے۔ کہتے ہیں اگر بھاری طوفان اور آندھیاں آئیں تو وہ سارے کوڑے کرکٹ کا خاتمہ کر جاتی ہیں۔ یا خدا تو پھر وہ طوفان کب اٹھے گا جو ساری پستیوں کو کچے رنگ کی طرح دھو کر کیچڑ کے ساتھ بہا لے جائے گا۔ پھر لوگ یوں پستی کو اور پستی کی طرف دھکیلنا تو چھوڑ دیں گے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(23)

انسپکٹرس نے رپورٹ تو نہایت معصوم دے دی مگر کچھ زبانی گفتگو ہوگئی کہ گرانٹ ملنے میں مہینوں لگ گئے۔ نئے معائنوں کے آئے دن دھمکیاں آنے لگیں۔ منیجر صاحب کا دوڑتے دوڑتے برا حال ہو گیا۔ اس سال جڑ دال بھی بچوں کی نہ بنی، بیوی نے لاکھ خوشامد کی کہ چولہے میں ڈالو یہ قومی خدمت اور وہی اپنی پرانی وکالت سنبھالو جو کچھ آئے گا تنگی ترشی سے گزر تو ہو جائے گی یہ تو نہیں کہ اپنے بچے ویران، سو الگ۔ دوسرے لوگ چاروں طرف سے بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔ استانیوں کی چار ماہ کی تنخواہ چڑھ گئی۔ چپڑاسی نے ایک دم بغاوت کر دی۔ استعفیٰ دے دیا اور پیشہ ہی بدل کر اینٹیں ڈھونے پر نوکر ہو گیا۔ چوکیدار، مہتر اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے والا نوکر بھاگ ہی نہیں گیا بلکہ کچھ فرنیچر بھی غائب کر گیا۔ وہ لے دے بچی کہ تو بہ بھلی۔ منیجر صاحب بے چارے ہکا بکا چاروں طرف منہ پھاڑ پھاڑ کر لپکنے لگے۔ جیسے جنگلی کبوتروں کی پھنگی یا یک کھل جائے تو چڑی مار کبھی ادھر اور کبھی ادھر جھپٹتا ہے اور جب ایک بھی چڑیا ہاتھ نہیں آتی تو تھک کر نہایت اطمینان سے پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور مزے سے ان کی پرواز دیکھتا ہے۔ ''اڑو، میری بلا سے جہاں جی چاہے اڑ جاؤ اور مجھے بھی اڑا لے جاؤ۔'' منیجر صاحب بھی تھک کر رضیہ بیگم کی پلنگڑی پر لیٹ گئے اور مزے سے اسکول کی بربادی دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر تو شمن اس طوفان کی بدحواسی پر بھونچکی کھڑی سمت ٹٹولتی رہی، تو اس کے لئے اس سے بہتر اسکول بہتر مشاعرہ لئے موجود تھا مگر جہاں ایک ہی بار سرائے کی طرح تھوڑی دیر کو قدم رکھا، وہاں سے آگ لگتے ہی بھاگ نکلنا انتہائی بزدلی معلوم ہوئی۔ اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ کیا کرنا چاہئے اور کیونکر کرنا چاہئے۔ بغیر سوچے سمجھے وہ الہ آباد ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ چل دی۔

محکمہ تعلیم کی عظیم الشان عمارت سے ذرا سی بھی علم کی ضوپاشی نظر نہ آئی۔ تعلیمی کا ہے کو کوئی کاروباری ڈیپارٹمنٹ ہے۔ ایک حصہ پر ہسپتال کا شبہ ہوتا تھا، گیلری میں ایک قطار سہمی ہوئی عورتوں کی بیٹھی تھی جو کسی نوکری یا وظیفے کی امیدواری میں آئی تھیں۔ سب کی سب نہایت لاغر، بیمار، دکھیا اور نادار نظر آ رہی تھیں۔ معلوم

ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر شعبہ میں ناکام ہونے کے بعد پیٹ پالنے کا آخری سہارا محکمہ تعلیم ہی میں ملتا ہے یا تو بد صورتی اور غربت کی وجہ سے میاں نہ ملا یا بیوہ ہو گئیں اور جن پر جا کے پڑیں انھوں نے نکال دیا۔ بال بچوں کی خاطر یہ پیشہ کر رہی ہیں۔ چاہے تعلیم کا رتی بھر شوق نہیں، دماغ گودڑ ہے، پڑھانا تو درکنار پڑھنے ہی کی طاقت نہیں مگر چلی آرہی ہیں۔ ادھر محکمہ تعلیم کو بھی کسی نہ کسی طرح تعلیم نسواں کو ترقی دینا ہے، پہلے کھان میں یہ انسانی میل کچیل اور کوڑا کرکٹ ہی سہی اچھا مال بھی آنے لگے گا۔

ان میں سے ایک بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھیں اور اونچی آواز میں اپنے سسرال والوں کے دکھڑے سناتی جا رہی تھیں جنہوں نے انہیں کچوکے دے دے کر اس کام پر مجبور کیا۔ دوسری بیٹھی اپنے بچے کی اصلاح کر رہی تھیں اور پاس بیٹھی ہوئی تیسری عورت سے زمانے کی تنگیوں کا دکھڑا رو رہی تھی۔ تین چار اونچی آواز میں ملنے والی نوکری میں مین میخ نکال رہی تھیں۔ اور یہ سب استانیاں بننے آئی تھیں۔ اور دوسرے معنوں میں آنے والی نسلوں کا نقشہ کھنچا ہوا تھا۔ کچھ ہو جائے کیسی بھی تعلیم دی جائے، برسوں ٹریننگ دی جائے یہ گھٹی میں پڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں نسلاً بعد نسلاً چلتی جائیں گی۔ شمن کا جی چاہا ایسی تعلیم کے لئے کوشش کرنے سے تو بہتر ہے لوٹ چلے، گھر جائے اور شادی کر کے ننگوں بھوکوں کی تعداد بڑھانے لگے جو اس کا قومی ورثہ ہے۔ کیا حاصل اس مغز پاشی سے؟ جب بیج ہی گھنا ہوا ہے تو پودے کے اگنے اور پھل دینے کی آس لگانا فضول ہے۔۔۔ مگر۔۔۔۔

وہ اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ چپڑاسی نے آکر اس سے چلنے کو کہا۔ کئی گھنٹے کی مغز ماری کے بعد یہ طے ہوا کہ اسکول کو گورنمنٹ اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے۔ ہیڈ مسٹرس وہی رہے باقی اسٹاف بدل دیا جائے۔ سوال یہ تھا کہ منیجر صاحب جو اپنا روپیہ قومی اسکول کی ترقی کے لئے لگا چکے تھے اس کا کیا کیا جائے۔ رسیدوں سے تو ان کا کافی روپیہ نکلتا تھا۔ خیر یہ سوال بعد کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ اسکول پر سے قومی ٹھپا ہٹا کر گورنمنٹ کا بنا دیا گیا۔

اسکول نیا چولا پہن کر جو اٹھا تو تھوڑی ہی دیر میں لوگوں کی توجہ بھی اس کی طرف مبذول ہوئی۔ داخلہ بڑھا، منیجر صاحب عرصہ تک اپنا روپیہ وصول کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ عجیب کشمکش میں پڑ گئے۔ معلوم ہوتا تھا ان سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ بیوی نے اور زندگی تلخ کرنا شروع کی۔ اسی مدوجزر کی رو میں گڑبڑا کر انہوں نے رضیہ بیگم سے نکاح کر کے دو مستقل محاذ قائم کر لئے جہاں انہیں آم کی چٹنی سے بھی زیادہ چٹپٹی زندگی سے دست و گریبان ہونا پڑتا۔ پھر سنا ان پر مالیخولیا کے مرض کے خفیف سے حملے ہونے شروع ہو گئے۔

اسکول میں ہندو اور عیسائی لڑکیوں کی تعداد بڑھی مگر مسلمان لڑکیاں اور کم ہو گئیں۔ اسکول جب تک اسلامی نہ ہوا اسلامی پانی کی طرح اس کی طہارت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

استانیوں کا نیا گروہ کچھ اس شان سے وارد ہوا کہ پہلے تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کاہل ہیں یا چست، اچھا

پڑھاتی ہیں یا برا کیونکہ یہ استانیاں گرگ باراں دیدہ تھیں۔ ایک ایک محکمہ میں بیس بیس سال سے جمی ہوئی تھیں۔ ایک چھٹی ہوئی، جن کا بیس سال کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کسی اسکول میں گزارہ نہ ہو سکا، چونکہ گورنمنٹ کا معاملہ دلچسپ ہی ہوتا ہے بس ایک اسکول سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں اور جو وہاں بھی بہت جو تم بیزار ہوئی تو چوتھے اور پانچویں میں۔ ایک جگہ جم کر رہنے کی نہ تو عادت اور نہ شوق باقی رہ گیا تھا۔ جب ایک اسکول میں ہیڈ مسٹرس سے لے کر چپڑاسن تک سے مار کٹائی تک نوبت پہنچ جاتی اور مفت سودا دینے والے مارے تقاضوں کے جینا دوبھر کر دیتے تو یہ روتی پیٹتی انسپکٹرس کے پاس جاتیں اور تبادلہ کروا لیتیں۔ بھلا وہ شمن کو کس گنتی میں شمار کرتیں۔

ان میں سے ایک باقری بیگم تو بس معلوم ہوتا تھا کہ چھوا اور بکھریں۔ عمر کی پکی تھیں اور کئی انسپکٹرسیں بھگت چکی تھیں۔ کسی کا کہا ماننا ہتک سمجھتی تھیں اور پابندیوں کو بے کار کی زیادتیاں۔ بہت جلد انہوں نے کنایوں اور اشاروں سے جتا دیا کہ اگر ذرا بھی چوں چرا کی تو انسپکٹرس سے جڑ دیں گی۔ انہیں اپنی قسم پر بڑا ناز تھا اور جس کو تہس نہس کرنے کی قسم کھائی پوری ہو گئی۔

دوسری مسز سارکس عجیب پٹی ہوئی روئی سے ادھیڑ عمر عورت تھیں۔ ذرا سی بات پر پھوٹ کر رو پڑتیں اور پھر گھنٹوں مناؤنے کرواتیں۔ ایک دوست مسز شرما ہر اسکول میں ان کے ساتھ رہنے کی خدمت انجام دیتیں تھیں۔ مسز شرما اتری ہوئی عمر کی مریضہ شکل غصہ ور عورت تھیں۔ یہ دونوں ہمیشہ انگریزی میں ایک دوسرے سے پیار محبت کی باتیں کرتیں اور لڑتیں بھی انگریزی میں۔ جونہی لڑائی شروع ہوتی مسز شرما مفت رہنے کا طعنہ دے کر فوراً کھانے پینے کا خرچہ دینے کی دھمکیاں دیتیں اور مسز سارکس روتیں۔ دنیا میں معلوم ہوتا تھا ان دونوں کا کوئی اور نہ تھا۔ ساری محبت اور غصہ ایک دوسرے پر اتارتیں۔ ان کی لڑائیوں کے چرچے دور دور پھیلے ہوئے تھے۔ اور محبت بھی کچھ کم مشہور نہ تھی۔ باوجود ان باتوں کے اسکول کا رہٹ رواں رواں ایک لطیف نغمہ کی روانی سے چل رہا تھا۔ داخلہ اطمینان بخش، نتیجہ اطمینان بخش، تعلیم اطمینان بخش۔ اس اطمینان بخش فضا نے دل میں ایک ناقابل اطمینان تکان، سستی اور مردہ پن پیدا کر دیا۔ معلوم ہوتا جیسے پرشور ندی دوڑتے دوڑتے سیدھے اور سپاٹ میدان میں رینگنے لگی۔ اس گھسٹتی ہوئی دنیا میں سب آنکھیں بند کئے عمر کی لکیر پر خاموش چلتے جا رہے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکر ہو گئی تو بھی کاندھا بچا کر آگے گھسٹ گئے۔ زندگی دھیرے دھیرے کھسک رہی ہے۔ وہی نیم خفتہ ٹن ٹن، گھنٹہ وقت مقررہ پر جاگ کر انگڑائی لیتا ہے اور پھر اونگھ جاتا ہے۔ اس کی ہر کروٹ دو قدم آگے یا دو قدم پیچھے گھسیٹ لاتی ہے۔ وہ اداس سویا ہوا فرنیچر جس پر جمائیاں لیتی ہوئی استانیاں جن کا بس نہیں چلتا کہ اس سست رفتار گھنٹے کو جھنجھوڑ کر جلدی جلدی دوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ منٹ کی سوئی اتنی بوجھل کیوں ہے، کیا عاقبت کا توشہ ساتھ لے جانا ہے اور اگر یہ سیکنڈ کی سوئی ذرا لپک کر چلے تو شاید دنیا اس کے ہلکوروں سے جاگ اٹھے۔ یہ وقت اس قدر ہولے ہولے چوری چھپے نہ چلتا تو انسان اتنا کاہل کبھی نہ ہوتا۔ ٹک ٹک وہ بھی جلدی جلدی مشین کے پرزوں کی طرح چلتا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اور فضا بھی تو بھاری بھاری ہے! جیسے کوئی خوفناک طوفان تلا کھڑا ہے۔ حبس لگی اور بند ٹوٹا، پھر کوئی نہیں جانتا کہ امرت برسے گا یا شعلے۔ مگر ایک خاموش بے اختیار سے انتظار نے ہر ایک کو تھکا رکھا ہے۔ ایک نامعلوم بوجھ سے کندھے ٹوٹے جا رہے ہیں کیا ہوگا؟ اور کیوں ہوگا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم! مگر ہوگا ضرور کچھ نہ کچھ، کپڑا سستا، اناج کوڑیوں کے مول مگر کوڑیاں خون کے مول بھی نہیں! یہ آخر دنیا میں پیسہ اتنا کم کیوں بنایا جاتا ہے۔ یہ جو گھروں میں تانبے کی پتلیاں ہیں انہیں گلا کر پیسہ بنایا جا سکتا ہے۔

دنیا سستی، انسانیت سستی، حیوانیت سستی پھر بھی یہ کنگالوں کی تعداد میں کمی کیوں نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے اناج کے ہر دانے کے ساتھ دس بھوکے لپٹے ہوئے زمین ہی سے اگتے ہیں اور ان کی ساری عمر اسی ایک دانے کی چھین جھپٹ میں گزر جاتی ہے۔ اتنا وقت کہاں جو کسی اور چیز کے لئے بھی ہاتھ پیر ہلائیں۔ کہتے ہیں اور لوگ لوٹ کھسوٹ، زر و جواہر اور عزت کی خاطر خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں۔ مگر یہاں تو عزت چھوڑ اپنی کیچڑ بھی نہیں جس کے لئے یہ بھوکے بھی کسی سے لڑ پڑیں۔

فضا کی گھٹن اور بڑھ گئی لوگ ہوا کو سونگھ سونگھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگے۔ جیسے طوفان کی بو پا کر کیڑے مکوڑے پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں اسی طرح بازار میں بھگدڑ سی پڑ گئی۔ بنیوں نے سونا چاندی سمیٹ کر دھرتی ماتا کی چھاتی میں چھپانا شروع کر دیا۔ طوفان کا دھماکا اتنا گہرا نہیں ہوگا کہ ماتا ان کی امانت بھی اگل دے۔ آسمان پر سرخ ستارہ یکایک تازہ زخم کی طرح پھوٹ نکلا اور لوگوں نے اس میں سے لہو ٹپکتا دیکھا۔ چاروں طرف سے غیر مرئی گھٹائیں امڈنے لگیں اور خاموش گرج نے دل و دماغ ہلا دیئے۔

پکا پھوڑا پھوٹا اور مواد کا ریلا بہہ نکلا۔ دیکھنا ہے اپنی رو میں کس کس کو گھسیٹتا ہے اور کون بچ نکلتا ہے۔

جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا، بنیوں نے جلدی جلدی رنگ اور سونا سمیٹنا شروع کر دیا۔ کچھ کہا نہ سنا یہ بیٹھے بٹھائے جرمنی کے دانتوں میں کیوں کھجلی اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرانس اور انگلینڈ، کمزوریوں کے طرفدار، صلح کے پرچم کے گرد دوڑ پڑے۔

''آج سے ہماری تمہاری کٹی''۔ جرمنی کو صاف بتا دیا مگر وہ مچلے ہوئے بچے کی طرح بکھرتا ہی چلا گیا۔ ادھر روس کی بھی پسلی پھڑکی اور خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گیا۔ میاں ہٹلر کو منچلی دنیا نے دبوچ کر رکھ دیا۔ دیکھتے دیکھتے دوندیدے بچوں نے پولینڈ کو میٹھی ٹکیا کی طرح بانٹ کھایا، چلئے چھٹی ہوئی۔

جرمنی نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا، اوہو یہ تو بڑی بری بات کی دنیا بھر کا نقصان ہو گیا۔ یہ لوگ قبضہ کرنے کے اتنے شوقین کیوں ہیں، حالانکہ یہ بالکل اچھی بات نہیں گلوب پر کتنا حصہ گلابی ہے جیسے تازہ تازہ کوڑھ! پر اب یہ جرمنی کو اتار کا ذبہ لے کر چلا ہے نہ جانے یہ لوگ لیپ پوت کر اس گول مول نارنگی کا کیا حال کریں گے۔

اور پھر کیا ہوگا؟ پولینڈ بھی غلام بن جائے گا۔ ہندوستانی تو خیر صدیوں سے غلامی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ بھوکے رہنے سے روح بڑھتی ہے اور موسم کے اثرات جسم کو توانائی بخشتے ہیں۔ یہ پھٹی پھٹی آنکھوں والے سڑک کے کتے جنہیں ہر راہگیر کی ٹھوکروں اور فاقہ کشی کی چنگیوں نے گیانی بنا دیا ہے۔ یہ تو اسی میں مگن ہیں۔

گوشت پوست تو بے کار کا فضلہ ہے اصل چیز ہے ہڈی اور اسے سمیٹے رہنے کے لئے اوپر سے کھال کا غلاف، یہ انسانی پنجر، سیاہ اور ٹیڑھے بیتلے کھجلی اور پھڑیوں سے لدے ہوئے مرقعے جنہیں قدرت نے اپنے دست خاص سے گھڑا ہے اور پھر جلتی دھوپ اور لو تھپیڑوں سے دہکا کر خاک اور دھول میں لتھیڑ کر پکی کھرنجا اینٹ کی طرح مضبوط کر دیا ہے۔ ان پر غلامی بھی اثر نہیں کر سکتی مگر یورپ کے وہ کول بدن جو تیز نگاہ سے بھی کمہلا جاتے ہیں، وہ کیسے تاب لائیں گے ان مظالم کی۔

دفتر کے بے کار کاموں سے سر مارتے وقت شمن کے خیالات دور دور بھٹک جاتے۔ کھڑکی میں نیلی زین کا پردہ لٹکا ہوا، سڑک پر چلنے والوں کی نظر بازیوں سے پناہ میں لئے ہوئے تھا۔ مگر اس سے نچلے حصے سے چلنے والوں کی ٹانگیں نظر آتیں اور وہ گھٹنوں بیٹھی ان ٹانگوں کی رفتار دیکھا کرتی۔ کالی پیلی ٹیڑھی اور خشک ٹانگیں کچھ میلی پھٹی دھوتیوں میں الجھی ہوئی مرگھلی ٹانگیں، کیچڑ اور میل میں لتھڑی ہوئی کمزور ٹانگیں اور کبھی بھاری توند کے وزن سے کراہتی ہوئی مجروح ٹانگیں، اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزرا کرتیں۔ کبھی کبھی چکنے پتلون اور اجلے موزوں میں لپٹی ہوئی ٹانگوں کی ایک آدھ جوڑی بھی گزر جاتی مگر بہت کم، بیٹھے بیٹھے وہ اکتا جاتی دنیا مجسم ٹانگیں بن کر اسی کھڑکی کے نیچے چلتی رہتی۔ اسے ان پر ترس آتا۔ تھک نہیں جاتیں یہ؟ کب سے چل رہی ہیں اور نہ جانے کتنے دن اور چلیں گی۔ انہیں ٹھنڈ میں بھی کوئی نہیں ڈھکتا، پالے سے کوئی نہیں بچاتا، دھوپ کی آنچ سے کوئی نہیں ہٹاتا۔۔۔ یورپ میں تو شوقین مزاجوں نے ننگے کلب نکالے ہیں اور یہاں تین چوتھائی مخلوق جنم سے ہی برہنہ رہنے کا بندوبست کر کے آتی ہے۔ ایسے بھی ملک ہیں جہاں مفید خوراک مہیا کرنے والے محکمے قائم ہیں۔ پنیر، مکھن، دودھ اور گھی نے جو انسانوں کو چربی کو پوٹلیوں میں تبدیل کر دیا ہے اس کا کچھ تو علاج ہونا چاہئے۔ دولت کا جتنا حصہ گوشت اور چربی تھوپنے میں صرف ہوتا ہے کم از کم اس کا نصف تو ایسی مشینیں ایجاد کرنے میں صرف ہونا چاہئے جو موٹاپے سے عاجز بے چاروں کو ذرا ہلکا کر دیں۔ کتنے مزے کی بات ہے جب کہ دنیا کے ایک حصے میں گوشت اور پوست کی اس قدر قلت ہے، دوسرے حصوں میں انہی عناصر کی زیادتیوں کو کل پرزوں سے چھیل چھیل کر دور کیا جاتا ہے۔ کاش ان خوش نصیب انسانوں کے جسم کی چھیلن ہی ان انسانی ڈھانچوں پر منڈھ دی جائے جو یہاں گھوم رہے ہیں تو ترازو کے دو پلڑوں میں کچھ تو توازن پیدا ہو جائے۔

روز دوپہر کے بعد ٹانگوں کا نیا طوفان بہنا شروع ہو جاتا۔ یہ طوفان پاس کی مل سے اٹھا کرتا تھا اور شہر کی طرف برس جاتا۔ یہ بدبودار شیرے اور سڑی ہوئی راب میں سنی ہوئی ٹانگوں کا تھکا ہوا ریلا اپنی انتھک نڈھال روانی سے روز بہا کرتا۔ چھٹی ہونے سے ذرا پہلے ایک یک و تنہا ٹانگ ایک لکڑی کی ہمراہی میں رکتی، تھمتی، کانپتی، تھرتھراتی گزر جاتی۔ شمن کا معمول تھا کہ وہ اس ٹانگ کی ہمدم لکڑی کی مسلسل ٹھک ٹھک کو قریب آتا سن کر ایک پیسہ کھڑکی سے نیچے ٹپکا دیتی اور منتظر رہتی کہ ایک سوکھے ہوئے مردے جیسا سیاہ ہاتھ اسے کس صفائی سے غلاظت کی نالی میں سے نکال لیتا ہے جیسے اسے نالیاں ہی ٹٹولتے بیتی ہو۔ اور پھر وہ سست اور مکدر اس

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ٹانگ کو دور جاتا دیکھتی رہ جاتی۔ کیوں؟ آخر کیوں پیدا ہوئی ہیں یہ بھیانک ٹانگیں اور کالے سیاہ ڈھانچے۔ پھر اسے خیال آتا اگر یہ ڈھانچے اتنے سوکھے نہ ہوتے تو تاج محل دنیا کا آٹھواں عجوبہ کیسے نظر آتا۔ اگر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اتنے فقیر اور کھیاں نہ بھنبھناتیں تو شاہان مغلیہ کی شان وشوکت کا ثبوت کیسے ملے؟

اگر خدانخواستہ جرمنوں کا دماغ چل نکلے اور وہ پولینڈ کی طرح ہندوستان پر بھی ناخن تیز کرنے لگیں تو شاندار عمارتیں، یہ نادرالوقت مقبرے اور یہ مقدس مٹی جہاں ہم صرف بونے کے شوق کو پورا کرنے کے لئے ہری بھری کھیتیاں سجاتے ہیں۔ یہ لمبی لمبی سڑکیں جنہیں ہم موٹروں کی دھول پھانکنے کے لئے خون پسینے کی نمی پہنچا کر کوٹتے ہیں کہاں جائیں گے۔ کارخانہ سے نکل کر گرما گرم کباب اڑانے کے لئے یہ جامع مسجد کی سیڑھیاں کہاں نصیب ہوں گی اور جب بادل امڈ گھمڈ کر آئیں گے ابر رحمت رم جھم برسنے لگے گا، کوئلیں پکار اٹھیں گی اور پپیہے ٹھنڈے سانسیں بھرنے لگیں گے تو نر ناری پریم کی پیاس بجھانے انہیں عظیم الشان مقبروں کی آغوش میں چھپ جائیں گے۔ لیکن یہ فاشسٹ ہماری ان جشن گاہوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔ ہمارے باپ دادا کی مقدس ہڈیاں اکھاڑ کر لے جائیں گے، وہ ہڈیاں جن کی خاطر ہم جنم جنم سے خون کی ندیاں بہاتے آئے ہیں، وہ مانک موتی سے بھی زیادہ انمول ہڈیاں جن پر ہند کو ناز ہے، ہر ہندی کا فرض ہے کہ ان کی حفاظت میں دن اور پانی ایک کر دے۔ یہ ہڈیوں کا پجاری خود بھی ہڈیوں کی ایک مالا ہے اور ورثہ میں یہی مالا اپنے بچوں کو بخش جاتا ہے۔ جیتے جی تو کچھ نہیں مگر مرنے کے بعد اس میں اتنی شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ بانجھ کو بیٹا اور مردے کو زندگی بانٹنے لگتا ہے۔ گو زندگی بھر جسم کا کوئی کونہ مستور نہ رہ سکا مگر مرنے کے بعد اطلس وکم خواب کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں اور صندل مل کر عرق گلاب اور کیوڑہ سے غسل کرتا ہے۔ زندگی بھر جو میل کی پیڑیاں اور جوئیں اس پر چھائی رہیں ان کا کچھ تو بدلہ مل ہی جاتا ہے۔ زندگی میں جسم کو نہ سہی مرنے کے بعد ہڈیوں کو ہی سہی!

یہ ہڈیاں! کیا مرنے کے بعد ان ہڈیوں میں دل نہیں رہتا۔ کاش دل بھی ہڈی کا مضبوط ٹکڑا ہوتا جو صدیوں زندہ رہ سکتا تو اگر ہندوستان کی زمین پر جنم لینا ہے تو روحوں کو چاہئے ہڈیاں بن کر جنم لیں اور اگر جینے کی خواہش ہو، تو جتنی جلدی ہو سکے مر جاؤ۔ اس قبرستان میں زندگی کا کوئی مصرف نہیں۔

پولینڈ کا لقمہ تر اُونٹ کی داڑھ میں زیرہ ہو کر رہ گیا اور فرانس کی حسینہ بھی جھپٹ میں آ گئی۔ شرم نہیں آتی ان حیوانوں کو عورت ذات پر ہاتھ اٹھاتے۔ رانی جھانسی بھی تو عورت تھی، کس قدر نسوانیت تھی اس جی دار حسینہ میں، بجھی ہوئی چتا کی آخری چنگاری۔۔۔ مگر ابر رحمت نے ایک بار ہی برس کر اسے بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اس ہڈیوں کے دیش میں ان چنگاریوں کا کیا کام ہے۔

گھٹائیں برسیں اور خوب برسیں۔ بند کھل گئے، سوتے جاری ہو گئے۔ لیکن یہ ہندوستان کیوں خشک پڑا ہے۔ کیا ہندوستانی خون کی بو ابھی تک اژدہے کی ناک میں نہیں پہنچی؟ یہ سیاہ خون ہے بھی بہت بسا ندہ۔ گو سفید ذرات نے مل کر کچھ خاکی حسن پیدا تو کر دیا ہے، مگر ابھی اسے بہت سے انجکشنوں کی ضرورت ہے۔ یہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا کے چکر سے کیوں بچا ہوا ہے۔ ہر قوم کو اس پر پیار آ چکا ہے۔ سب ہی کو اس کے سدھار کی فکر نے ستایا۔ سیاہ دراوڑوں کو انسانیت سکھانے آریہ آئے، سکندر تک کی پسلی پھڑکی، یران وافغانستان کو محبت چڑھ آئی، تاتاریوں نے دانت کچکچا کر بوسے لئے، مغلوں نے عشق ومحبت کے میدان گرم کئے اور پھر یورپ کے بنیوں کی ترازو کے پلڑے جھولنے لگے۔ ہندوستان کی مہمان نوازی ہر ایک کی خدمت میں خوان نعمت بچھا کر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی "یہ سب حاضر ہے۔ کھاؤ پیو اور بھوزے کا حصہ باندھ کر لے جاؤ۔ ہم بھوکے سور ہیں گے، پر تمہاری کھتی بھر جائے! ہمیں تو بس اتنی اجازت دے دو کہ تمہارے بیرے اور آیا کا عہدہ پا کر تمہاری سفیدی کے آگے اپنی سیاہی کا ماتھا ٹیک دیں۔"

موسم بدلنے لگا شمن کے جی پر خفقان سا اٹھنے لگا۔ یہ ابھی ابھی فضا جس نے دم گھونٹ رکھا تھا کچھ اور بھی غلیظ ہوتی جا رہی تھی۔ جی بری طرح گھبراتا، غصہ آتا کس پر؟ یہ اسے نہ معلوم تھا۔ استانیوں کی سستی پریشانی میں بدل گئی تھی، کون جانے کیسی ہوا چلے، کدھر سے چلے اور کس کس کو اڑا لے جائے۔ بے چین بھاگم بھاگ شروع ہو گئی تھی، جنگ کو سوں دور تھی مگر خطرہ دلوں میں چھپا ہوا تھا۔

گھبرا کر اس نے پندرہ دن کی چھٹی لی اور کہیں دور جانے کا ارادہ کر لیا۔ کہاں؟ یہ اس نے اسٹیشن پر پہنچ کر بھی فیصلہ نہ کیا۔ سب سے پہلی ٹرین مدراس کلکتہ تھی، اس نے وہی پکڑ لی۔ کہاں جا رہی ہے؟ کس کے پاس؟ یہ اس نے سوچنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ کیا ضرورت تھی کسی منزل کی جب جانا ہی ٹھہرا تو پھر کیا حاجت ہے کسی مقررہ لکیر پر چلنے کی۔ اس کے پاس تیسرے درجے کا ٹکٹ تھا۔ ایک ہندوستانی کے نقطۂ نظر سے سفر کو مکمل کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ کافی سامان ہے۔ ریل میں افراتفری نے تھوڑی ہی دیر میں سفر آخرت کا مزا چکھا دیا۔ بیمار ٹوٹے پھوٹے بے ہنگم انسان۔ میلے اور بدبودار چیتھڑوں میں الجھے ہوئے پتہ نہیں کہاں اور کیوں جا رہے تھے؟ شاید انہیں بھی اپنی منزل کا پتہ نہ تھا اسے غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی، کیا حماقت ہے سفر کرنا اور وہ بھی تھرڈ کلاس میں! کبھی تو اکتا کر جی چاہتا کہ لوٹ پڑے یا اتر کر ریل کی پٹری پر لیٹ جائے تاکہ ایک بار ہی لمبا چوڑا تھکا دینے والا سفر ختم ہو جائے۔۔۔ مگر پھر سوچتی اس میں بات ہی کیا ہے؟ آواگون کا کیا ٹھیک عجیب اوٹ پٹانگ سا سلسلہ ہے دنیا میں، بار بار تھوڑی ریل کے دھکے، یہ بھیڑ، یہ سڑے بسے کھانے اور بدبو سونگھنے کو آنا نصیب ہوگا۔ جو کچھ بھی ہے، جیسا بھی ہے، اسی زندگی میں دونوں ہاتھوں سے لپک لو۔

گاڑی بدلنے میں بھی ایک دنیا سے دوسری دنیا میں جانے کا لطف آ گیا۔ کیونکہ تھرڈ کلاس والوں کے لئے بیلوں کے باڑے سے بھی بدتر جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ اسے پیٹ فارم پر بستر سے لگ کر چار لمبے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے گھنٹے گزارنے پڑے۔ سیکنڈ کلاس کے مسافر خانے میں تالہ پڑا ہوا تھا اور فرسٹ میں کوئی انگریز ٹھہرا ہوا تھا۔ سوائے اس ایک سفید انسان کے باقی سارے کالے پیلے نیلے جانور تلے اوپر پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ پلیٹ فارم بھی ایک قسم کی گورنمنٹ ہوتی ہے جہاں چند فرسٹ کلاس انسانوں کے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

علاوہ ساری رعایا گودڑ ہی نظر آتی ہے۔ حالانکہ آمدنی اسی تیسری درجہ والے سے ہوتی ہے۔ مگر آرام کبھی کبھی مجبوراً سفر کرنے والا اول نمبر ہی لے جاتا ہے۔

ہر سودے والا سارا سودا اسی کے ہاتھ بیچنے پر تل گیا۔ منع کرتے کرتے بھی تو تھک گئی۔ نتیزوں کے علاوہ یتیم خانوں، بیوہ آشرموں اور گئور کھشا کا پوتر کام کرنے والوں نے بھی بلہ بول دیا۔ وہ جل اٹھی۔ یتیم خانوں میں جاؤ تو یتیم آنکھ میں لگانے کو کرائے پر بھی نہیں ملتے اور بیوہ آشرم اتنے مردوں کی موجودگی میں حد فاضل سے زیادہ نہیں۔ اور ان پناہ گاہوں کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جب تک یتیموں کے لئے سڑک اور عورتوں کے لئے کوٹھے موجود ہیں ان بے کار جھگڑوں میں پڑنا ہی حماقت ہے، رہیں یہ گائیں تو جب بچوں کے لئے مائیں اور مٹھائی میں ڈالنے کے لئے گھاس کا گھی اور سنگھاڑے کا آٹا موجود ہے تو پھر یہ گائیں کس کی چربی بڑھانے کے لئے پالی جائیں۔

بار بار اس کی نظر ایک بچے کی طرف بہک جاتی جو بڑے غور سے کبھی ان کیلوں کو تک رہا تھا جو اس کی ٹوکری سے دلکش بیسواؤں کی طرح جھانک کر لبھا رہے تھے اور کبھی ان کتوں کو جو چہار طرف نہایت ضروری کام سے دوڑتے پھر رہے تھے۔ بچہ نہایت چلبلا تھا۔ اس کی بوڑھی آیا قابو میں کرنے کے لئے برابر اس سے کشتی لڑ رہی تھی۔ بار بار اس کی ممی سے ڈرا رہی تھی جو نہ جانے کس کام کو گئی ہوئی تھی۔ مگر بچے میں بلا کی پرواز تھی۔ بیٹھے بیٹھے اچھل کر لوٹ لگاتا اور پاس رکھی ہوئی ہر چیز کو جھنجھوڑ ڈالتا۔

''بری بات بابا'' آیا کہتی اور وہ تھوڑی دیر کیلئے ٹھہر جاتا۔ مگر پھر اس کے جسم میں روانی کی لہریں اٹھتیں۔ پہلے ٹانگوں کو بستر سے ٹکراتا پھر ہتھیلیاں تسموں سے جھولنے لگتیں، سر کوک بھرے کھلونے کی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں مٹکنے لگتا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ ننھا سا جیتا جاگتا بھونچال بن جاتا۔

کیلوں کو وہ پیار بھری حسرت سے تکتا۔ ''بری بات'' کی مہر نے انہیں اور بھی دلکش اور جاذب نظر بنا دیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے شیریں اور لذیذ کیلوں کی پاک خواہش میں ''بری بات'' جیسی نحس کہاں سے آسکتی ہے۔ وہ جانتا تھا آیا سدا کی جھوٹی ہے اور ہمیشہ اسے اسی ناگوار قسم کے جھانسے دیا کرتی ہے۔ کتنی ہی بار وہ دوڑ دوڑ کر انجن کی طرف گیا۔ یہ کوکرتا دیو ہیکل بھوت اتنی بہت سی گاڑیوں کو گھسیٹ لے جاتا۔ اسے وہ نیا بیاہتا جوڑا بھی بہت جاذب نظر معلوم ہو رہا تھا۔ آگے آگے دولہا اور اس کے پیچھے دوپٹے کے کونے سے بندھی ہوئی عورت۔ اگر آیا اجازت دیتی تو وہ ایک بار ذرا اس دوپٹے کے جھولے میں دو ایک پینگیں لے کر دیکھتا۔ آیا نے اسے وزن کرنے کی مشین پر بھی نہیں کودنے دیا اور صندوقوں کی قطار پر لیفٹ رائٹ کرنے پر بھی معترض ہوئی۔ ہار تھک کر کبھی وہ ساکت ہو کر آنے جانے والوں کے منہ تکنے لگتا اور بے خبری میں اس کا منہ اس کی نقل میں نئی نئی شکلیں بناتا۔

''کیلا لو گے؟'' شمن نے تنہائی سے اکتا کر بچے سے پوچھا۔

''نہیں!'' اس نے چپکے سے آیا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''پرائی چیز بری ہوتی ہے۔ ہیں نہ آیا۔'' وہ جوش سے بولا اور کیلوں کی طرف اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر فوراً اپنی توجہ پاس رکھے ہوئے سامان کو بکھیرنے میں لگا دی۔

کتنی ہی دیر سے کئی دق مارے نوجوان گنگناتے، لطیف اشارے کرتے شمن کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ دبی کچلی خواہشات ننگی ہو ہو کر ان کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے وہ ایک دوسرے کو قطعی ناممکن العمل گالیاں دے رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر کئی برقعہ پوش گٹھڑیاں بیٹھی ان کے مفلوج دماغوں سے فٹ بال کھیل رہی تھی۔ پاس ہی ایک قبول صورت چنچل سی دلہن گھونگھٹ کاڑھے ان پر بم باری میں مصروف تھی۔ ایک مجروح شکل لڑکا ایک انگریزی کاکوک شاستر اس رخ سے لئے بیٹھا تھا کہ شمن کی نظر ہر بار اس کے باتصویر عنوان پر پڑتی۔ گھنٹہ بھر سے وہ اسی ایک تصویر کو حفظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کو وہ یہ تصویر نہایت انجان طریقہ پر دکھاتا اور جونہی کسی سے نظر مل جاتی عجیب برہنہ سی مسکراہٹ آنکھوں میں پیدا کر کے نہال ہو جاتا۔ اسی خاموشی لاسلکی پیغام کے ذریعے وہ ساری گٹھڑیوں سے بھی راز و نیاز میں مشغول تھا، جواب بھی مل رہے تھے۔ کچھ پریشان، کچھ نفرت میں ڈوبے اور کچھ حد درجہ متحیر! اس چلبلی دلہن کا منہ تو چھپا ہوا تھا مگر تھکن سے نڈھال انگڑائیاں توڑ رہی تھی۔ بچے کی معصوم آنکھیں جو کیلوں سے عشق لڑانے میں مشغول تھیں۔ ان نوجوانوں جیسی نحس اور گستاخ ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پیر پٹخ رہا تھا اور غصے سے زمین پر تھوک رہا تھا۔ کئی بار اس نے آیا پر بھی تھوکا اور پھر اسے جلانے کے لئے خوب ناک میں انگلیاں گھنگھولیں۔ سوٹ کے بٹن چوسے اور جوتے کے بند کھول ڈالے۔

منچلے نوجوانوں میں کسی بات پر کشتم کشتا شروع ہو گئی۔ گالیوں کی جدت میں ترقی ہو گئی۔ کیلوں کی ٹوکری اور کئی صراحیاں لپیٹ میں آگئیں اور بدحواس ٹانگیں مختلف زاویوں سے پھسلنے لگیں۔ بچہ یہ حالت دیکھ کر پہلے تو ششدر رہ گیا پھر اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں، گال سرخ ہو گئے اور چیخ چیخ کر ہنسنے لگا۔

''کیلے کیلے۔۔۔آیا کیلے۔۔۔!'' وہ کچلے ہوئے کیلے دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور کشتی میں حصہ لینے دوڑا مگر آیا نے اسے پکڑ کر بستر پر بٹھا دیا۔

جب ذرا سکون ہوا اور بچہ بستر پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا تو پلیٹ فارم بھی سونا ہو گیا۔ شمن نے ڈبہ کھول کر کچھ چاکلیٹ اور بسکٹ نکالے۔

''بری بات!'' بچہ بغیر بلائے ہی چلایا۔

''آیا بچے کو میرے پاس لے آؤ۔'' شمن نے حکم دیا۔

''میم صاحب بڑا ناٹی ہے۔ اس کا ممی شاپنگ گیا۔ بولا دو کلاک سے آئے گا۔ پن کون جانے کب آئے گا۔'' جبراً آیا نے بچے کو آنے دیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' شمن نے بہت سے چاکلیٹ اس کے دونوں ہاتھوں میں بھر دیئے۔

''میم صاحب اکھا دن مستی کرتا۔۔۔۔ پڑھتا کچھ نہیں۔۔۔۔ ٹانی۔۔۔ ویری ٹانی''

بچے نے چاکلیٹ کھائے نہیں بلکہ انہیں صندوق پر قطاریں پر جما کر تالیاں بجانے لگا۔ آیا اس کی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

شرارتی کا رونا روتی رہی۔ ثمن بغور بچے کو دیکھتی رہی۔ چاکلیٹ کی برجیاں بنا کر زور سے ایک تھپڑ مار کر بکھیر دیتا اور اپنی اس فاتحانہ تخریب پر قہقہے لگانے لگتا۔

''جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو کیا بنو گے؟'' ثمن نے ایک نیچر کا مرغوب ترین سوال بچے سے پوچھ ہی لیا۔

''ہم۔۔۔ہم سپاہی بنیں گے!'' اس نے کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر کہا جو تھوڑی دیر ہوئی فساد فرو کر کے مزے سے کھمبے سے پیٹھ لگائے دوسرے فساد کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اگر یہ فساد نہ ہوں تو دنیا کتنی سونی ہو جائے پھر کانسٹیبل سوائے کھمبوں سے پیٹھ لگا کر اونگھنے کے کیا کریں گے۔ اگر بچہ چاکلیٹ کی برجیاں بنا کر نہ ڈھائے تو سوائے اسباب کی توڑ پھوڑ اور آیا پر تھوکنے کے اور کیا کرے۔ کاش ان کانسٹیبلوں اور بچوں کو بھی کچھ کام ہوتا!

''تمھیں ممی مارتی تو نہیں۔'' نہ جانے اسے کیوں خیال آیا کہ بچے کو پٹنے کی اشد ضرورت ہوتی ہوگی۔ کئی بار اس کا خود جی چاہا کہ اس کے پیارے پیارے سرخ گالوں میں چٹکی بھر لے اور بے اختیار اسے بھینچ ڈالے۔ یقیناً وہ بڑا گدگدا اور گرم ہوگا۔ اس کی آغوش میں اسے جکڑنے کی ناقابل بیان تھکی ہوئی سی خواہش جاگ اٹھی۔ بچے نے ممی کے نام پر فکرمند ہو کر تیوریاں چڑھالیں۔

''وہ بڑی نانی ہے۔۔۔ممی!'' بچے نے جھلا کر کہا تو اسے ایسا معلوم ہوا وہ اس بچے کو بہت دن سے جانتی ہے۔ اس نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس کے ہونٹ کتنے شگفتہ تھے۔ بعض انسان پھلوں اور مٹھائیوں سے کتنے مشابہ ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی بھنے ہوئے چنوں جیسی سوندھی سوندھی خوشبو نتھنوں میں آنے لگتی ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو تازہ انگوروں اور انناس کی قاشوں کی طرح مہک دیتے ہیں۔ یہ دلکش گوشت کا لطیف کھلونا جسے دیکھ کر بے اختیار نارنگی کی پھانک کی طرح چکھنے کو جی چاہنے لگا۔

''ہمارے پاس بندوق ہے، بستر میں لپیٹ دی آیا نے۔ دیکھو گی؟'' بچے نے مستعدی سے بستر پر حملہ کیا۔

''نائیں۔ نائیں بابا بیڈنگ کیسے کر کے کھولنے کا۔'' انگشت نما لگی ہوئی آیا نے بغاوت کی۔

''ہم پھاڑ ڈالیں گے۔'' بچے نے آنکھیں نکالیں۔

''کیسا پھاڑے گا؟۔۔۔ممی تم کو اتنا کر کے مارے گا کہ بس!''

''ہم ممی کو گولی سے مار دیں گے۔۔۔نھائیں۔'' شکست خوردہ سپاہی نے سرخ گالوں کو پھلا کر کہا۔

''چہ۔۔۔بری بات!'' ثمن نے چمکارا۔ بچے نے اس پر بھی ایک بے اختیاری کی نگاہ ڈالی۔

''تم بھی نانی ہو۔۔۔ممی اور آیا سب نانی۔۔۔ہم سب کو نھائیں مار دیں گے۔'' بچے کے غصہ پر ثمن کو پیار آ گیا۔ اتنا سا بچہ اور اتنے دشمن۔۔۔چہ بے چارا۔۔۔

کاش یہ نھائیں نھائیں مارنے کی دھمکی میں کچھ اصلیت رہے اور یہ جذبہ پروان چڑھ سکے۔

''آئی ایم سوری!'' بچے کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ آنے والی خاتون کو اس نے ڈانٹ کر کہا اور غصہ اور بغاوت کا ننھا منا دیو بستر پر سر بلند ہو کر ڈٹ گیا۔

''ہیں! تم!'' بھرے پلیٹ فارم پر دو بدحواس سہیلیاں شفٹ کرتے ہوئے ریل کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔

''ایلما۔۔۔!تم!''

''تم کہاں جا رہی ہو۔'' دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

''چھٹی گزارنے، اور تم؟'' ثمن نے پوچھا۔

''گھر جا رہی ہوں۔۔۔تو چلو میرے ساتھ۔۔۔''

''میرے خطوں کا جواب۔۔۔'' اتنے میں ریل آ گئی اور شتم پشتم دوڑنا پڑا۔ ایک گارڈ سے کہہ کر ثمن ایلما کے ساتھ انٹر میں بیٹھ گئی۔

بچھڑی ہوئی سہیلیوں نے بالکل ننھی بچیوں کی طرح بہت سا وقت ایک دوسرے سے سوال پر سوال کرنے میں صرف کر دیا۔ جواب سننے کی کسے مہلت تھی۔ ایلما بانکی پور جا رہی تھی۔ ثمن نے چھٹیاں وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریل میں نہ اتنی فرصت اور نہ کہانیاں اتنی مختصر کہ سنانے والا سنانے اور سننے والا جی بھر کر سنے۔

چناخ سے ایلما نے بچے کے گال پر تھپڑ لگایا، وہ کپڑے بدلنے میں پیر ٹیڑھے کر رہا تھا۔ ایک بار زور سے اس نے منہ پھاڑ کر دھاڑ نکالی اور چپ ہو گیا۔ ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ سرخ انگاروں جیسی دھکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے ایک بار نہایت گستاخ آنکھوں سے کچھ کہا۔ شدت ضبط سے نتھنے پھڑکے، کان سرخ ہو گئے مگر دودھ ابلتے ابلتے تھم گیا۔ خاموشی سے اس نے کپڑے اتروا لئے۔

گویا کوئی کھال اتار رہا ہو۔ شاید کھال اتارتے میں بھی اتنی شدت سے جذبات نہ دکھتے ہوں گے۔

''ہمیں بھوک لگی ہے۔'' بچے نے ڈانٹ بتائی۔

''آیا بسکٹ دے دو۔''

''ہم بسکٹ پھینک دیں گے، چاول کھائیں گے۔'' دانت کچکچا کر ایلما نے پھر تھپڑ اٹھایا مگر ثمن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کیوں مارتی ہو؟''

''تم۔۔۔تم نہیں جانتیں۔۔۔یہ۔۔۔یہ۔۔۔'' ایلما کا گلا گھٹ گیا اور وہ پٹے ہوئے بچے کی طرح بسور دی۔ ثمن نے کچھ نہ کہا۔ خاموش سر موڑے کچھ سوچتی رہی اور ریل فرانے بھرتی رہی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(35)

''تم کہتی ہو میں اسے کیوں مارتی ہوں؟'' ایلما نے سونے سے پہلے اپنے مختصر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ بچہ آیا کے پاس سوتا تھا۔ گھر صاف ستھرا تھا مگر نہ جانے کیوں قید خانے کا سا حبس تھا۔ کمرے کچھ پرانے اور برسوں سے بند پڑے تھے۔

''میں اسے مار ڈالنا چاہتی ہوں۔۔۔۔ جانتی ہو میں نے اسے ختم کر دینے کی پوری کوشش کی۔ اسے پھینکنے کی کوشش میں اپنے آپ کو کئی بار موت کے کنوئیں میں دھکیل دیا مگر میری تندرستی سخت جانی بن کر آڑے آ گئی۔ میں نے ایک گھناؤنے مرض کی طرح اسے شکم میں برداشت کیا۔ ہر لحظہ میں نے اس کے وجود پر پھنکار دی اور بدہضمی کی قے سمجھ کر جنم دیا۔'' وہ بڑے جوش سے بکتی رہی اس کی آنکھیں اب بھی اتنی دہکتی ہوئی اور سیاہ تھیں مگر ان پر ہلکا سا تکان کا پردہ پڑا تھا۔ جو بہت غور سے کبھی کبھی ایک جھلک سی دکھا جاتا تھا۔ جسم ذرا بھاری ہو گیا تھا اور چیتے جیسی کھنچی ہوئی کمر بھدی پڑ گئی تھی۔ وہ سبک شاخ گل اب پھل اتری ڈالی ہو گئی تھی۔ وہ بے رونقی کے دھندلے نقوش جو مٹ کر بھی لکیریں چھوڑ جاتے ہیں۔۔۔۔ پھر بھی اس کا دماغ ابھی کنوارہ تھا۔ اور کنوارہ رہنا چاہتا تھا، گو جسم ماں بن چکا تھا۔

''میں نے اس تھوہر کے پودے کو سینچنے سے انکار کر دیا مگر دودھ کی زیادتی سے اندیشہ پیدا ہو گیا اور جبرا۔۔۔ اوہ۔۔۔'' وہ سہم کر شمن کے بالکل قریب بیٹھ گئی جیسے اس کی آغوش میں پناہ لینا چاہتی ہو۔ ''یقین مانو شمن میں نے نرگ کے دکھ بھوگ لئے جیسے سانپ کو چھاتی سے لگایا۔ کہتے ہیں کہ جب بچہ کے پوتر ہونٹ ماں کے جسم کو چھوتے ہیں تو سورگ کی اپسرائیں رشک کی آگ میں جل مرتی ہیں کہ وہ ماں نہیں بن سکتیں۔۔۔ مگر شمن! لوگ بڑے جھوٹے ہیں۔ جیسے اس سنپولئے کے پیٹ کی آگ میں نے بجھائی میں ہی جانتی ہوں۔ جتنے دن یہ میرا خون چوستا رہا میری آتما جنم میں تھوکتی رہی۔''

''اتنی پریشان نہ ہو پگلی!'' شمن نے پیار سے اسے پاس گھسیٹ لیا۔

''تم نہیں جانتیں۔۔۔ او تم نہیں جانتیں!''

''ایلما تم اتنی پریشان ہو۔۔۔۔ کیا یہ سب کچھ اس لئے کہ وہ ناجائز ہے؟''

''ہشت پگلی! اگر ستیل کا بچہ دیوتاؤں کے اپنے ہردے کی جلائی ہوئی آنچ سے بھی پوتر ہو کر آتا تب بھی مجھے سوئی جیسا دکھ دیتا۔۔۔ کوئی منتر کوئی پوجا اسے پاک نہیں کر سکتی۔۔۔ جب میرا ضمیر ایک حیوان کے جسم سے چوٹ کھا گیا تو۔۔۔۔''

''مگر اس میں اس معصوم کا کیا قصور ہے۔''

''قصور؟۔۔۔۔ ہنہ تم نے دیکھا نہیں یہ وہی ہے!'' وہ اور خوفزدہ ہو گئی۔ ''وہی بالکل وہی سانپ!'' اور شمن کو یاد آیا کہ بچے کو دیکھ کر جو اسے دھوکا ہوا تھا کہ وہ اسے کہیں دیکھ چکی ہے وہ وہم نہیں تھا۔ بچہ بالکل چھوٹا سا ستیل تھا۔ وہی تومند جسم اور مستانہ چال۔ وہی زندہ دلی اور جوش! تو پھر ایلما حق بجانب تھی، قدرت اسے چڑا رہی تھی، اگر بچہ ایلما سے مشابہ ہوتا تو شاید خود پرستی آڑے آ جاتی۔ مگر وہی شخص جو ہمیشہ اس کی نفرت کی آماجگاہ بنا رہا غیر اختیاری طور پر ایسا چھایا کہ اس کے خون میں بھی رچ گیا۔ محبت اور نفرت اپنی بلندی پر پہنچ کر ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ انہیں پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ دیوتا اور شیطان دونوں کی پرستش ایک نکتے پر جا کر ٹک جاتی ہے۔ کتنا باریک ہے یہ نکتہ کہ تخیل کی نگاہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

''لیکن ایلما تم تو بڑی ترقی پسند ہو اور اگر سماج ایک ایسے بچے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے تو تم اسے ظالم کہو گی۔''

''سماج ایسے بچے کو صرف اس لئے برا سمجھتا ہے کہ وہ بیاہ کے منتروں کے چھینٹوں میں نہائے بغیر دنیا میں آ جاتا ہے۔ اور میں۔۔۔۔''

''نہیں۔۔۔ سوسائٹی کی اجازت کے بغیر دنیا میں آ جاتا ہے۔۔۔ تمھیں روبی سے اس لئے نفرت ہے کہ وہ تمھارے حکم کے بغیر دنیا میں آیا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کو بھی۔۔۔''

''مگر کیوں؟ سوسائٹی کو کیا مطلب؟''

''اس لئے کہ ایسے انسانوں کی تعداد دنیا میں نہ بڑھے جو بن وارث کے ہوں۔۔۔۔ تم جانتی ہو عورت ہی تنہا ذمہ دار رہ جاتی ہے۔ باپ کے منہ پر کوئی مہر نہیں پڑتی۔۔۔ اب ذرا سوچو اگر شادی کا اسٹامپ نہ لگایا جائے تو عورت جس کی اقتصادی حیثیت صفر کے برابر ہے کیا کرے۔۔۔۔''

''ہوں تو تمھاری رائے میں ناجائز بے صرف مالی مشکلات کی وجہ سے دوبھر معلوم ہوتے ہیں؟''

''اور کیا خود سوچو ایک ماں قدرت کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق آنے والے بچے سے یوں نہ محبت کرے؟ کیا وہ اس کے جسم کا ایک ٹکڑا نہیں۔ دینے والے نے نعمت دی۔ لینے والے نے پائی۔ پھر باپ کیوں ڈرے اور ماں کیوں گھبرائے؟ صرف اس لئے کہ اس کا پالنا پوسنا دوبھر ہے۔''

''اور شادی کے بعد؟''

''تب مرد اپنا فرض سمجھ کر برداشت کر لیتا ہے۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"سوسائٹی کا باندھا ہوا فرض۔"

"ہاں۔۔۔مگر اس کا اب وہ اس درجے تک عادی ہو چکا ہے کہ اس بار کو اپنا سمجھتا ہے۔ لفظ "اپنا" اس کی خود پرستی کے جذبے کو تسکین دینے کے لئے کافی ہے"

"اور ناجائز کو اپنا نہیں سمجھتا؟"

"مجبور نہیں۔۔۔قانوناً بھی تو وہ اس کا نہیں۔۔۔قانون کے بغیر اس کی ماں بھی غیر ہوئی۔۔۔"

"اس طرح ماں؟ ماں کیوں نفرت کرے۔"

"کیونکہ وہ کوئی کمانے والا ساتھ نہیں لاتا۔ اس کی پرورش کا بار اس کی زندگی کے پیروں میں بیڑی بن کر الجھ جاتا ہے۔"

"بشت یہ سب واہیات ہے۔ مائیں ایسے بچوں کو صرف ایک وجہ سے فنا کر دینا چاہتی ہیں کہ وہ اس کے لانے والے سے نفرت کرتی ہیں۔ اس نفرت کا انتقام وہ اس کی گردن مروڑ کر لیتی ہیں۔"

"تو یہ تو۔ میں تو ایسی عورتوں کو حیوان سمجھتی ہوں!"

"تم بے وقوف ہو۔۔۔حیوان اتنے بے رحم نہیں ہوتے اور نہ ہی بے وقوف۔ ان کے یہاں نہ بھاوریں پڑیں اور نہ بیاہ رچے۔۔۔ سنا ہے تم نے کسی گدھے کو سہرا باندھے۔۔۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور سیاہ بادل چھٹ گئے۔

"ایلما تم بھی [illegible] ہی ہو۔۔۔وہ کسی کا ہو، ہے تو اتنا پیارا!"

"خاک! دماغ تو ہے ہی نہیں۔" بس جیسے گوشت کا ڈھیر۔ میں تو اس کی [illegible] کی طرف بھی نہیں دیکھتی۔ نہ جانے کیا جھک مارا کرتا ہے۔"

"کیا ارادہ ہے تمہارا اس کے مستقبل کے بارے میں؟"

"میرا ارادہ۔۔۔" اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

ایک فلک شگاف چیخ بچے کے کمرے سے آئی اور پھر پے در پے آوازوں سے سنسان گھر گونج اٹھا۔

دونوں لپکیں، ایلما آگے اور ثمن پیچھے!

"نہیں۔۔۔نامیں۔۔۔" بچہ مسہری پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ تیزی سے ایلما نے اسے اٹھایا۔ تھوڑی دیر کو ثمن کو شبہ ہوا کہ اس کی آنکھیں نرم نرم روشنی سے چمکیں لیکن فوراً ہی ایک دردناک چیخ مار کر اس کے بازوؤں سے پھسل پڑا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔۔سوری۔۔۔" وہ ہیبت زدہ ہو کر چلانے لگا۔ ایک ہلکی سی پریشانی ایلما کے چہرے پر آئی اور غائب ہو گئی۔

"چپ۔۔۔خاموش۔۔۔چپ" اس نے تھپڑوں کی بارش کر دی اور اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا اگر ثمن اور آیا اسے گھسیٹ کر کمرے سے باہر نہ لے جاتیں۔ شدت جذبات سے وہ دیر تک لرزا کی، معلوم ہوتا تھا ایک

بچے سے نہیں کسی دیو سے کشتی لڑ کر آ رہی ہے۔

"میں ایک دن اسے ختم کر دوں گی۔۔۔ میں موت سے نہیں ڈرتی مگر یہ عمر قید۔۔۔۔ میری زندگی۔۔۔" جھلائی ہوئی شیرنی کی طرح وہ بل کھا کھا کر مختصر سے کمرے میں ڈگ بھرنے لگی۔ بڑبڑ کر وہ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں جکڑ لیتی اور پھر خود ہی اس گرفت سے زور آزمائی شروع کر دیتی۔ معلوم ہوتا اس کے دماغ کے گرد بھی کسی نے جال بن دیا ہے۔ ایسے کہ جتنا جتنا وہ زور لگاتی ہے بندش کستی ہی جاتی ہے۔

"مگر اس بچے کا۔۔۔۔"

"یہ بچہ نہیں ہے۔۔۔" اس نے بلند آواز سے کہا۔۔۔ "یہ وہ خود ہے۔۔۔ مجھے آزار پہنچانے، تباہ کرنے کے لئے وہ خود جنم لے کر آیا ہے۔ اس نے اسی ذلت کو کافی نہ سمجھا اور مجھے ایڑی تلے مسلنے۔۔۔۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو تم اس کی ماں ہو۔"

"نہیں، میں اس کی ماں نہیں۔ اگر جنم دینے سے ماں ہو جاتی ہے تو۔۔۔تو۔۔۔ ہرگز نہیں اگر چنبیلی کی بیل سے تھوہر کا پودا لپٹ جائے تو تم اسے بھی تھوہر کہنے لگو گی؟۔۔۔۔ اگر اس گلدان میں کہیں سے سانپ گھس آئے تو وہ بابی بن جائے گا؟۔۔۔"

اس نے آتش دان پر رکھے ہوئے گلدان کو دونوں ہتھیلیوں سے بھینچا۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں میرے دکھ کو۔" وہ زور سے مڑی اور گلدان ایک غمگین چھناکے سے زمین پر آ رہا۔ ایلما وحشت زدہ ہو کر ان پریشان کیڑوں کو دیکھنے لگی جو اس میں سے نکل کر چاروں طرف کونوں میں پناہ لینے بھاگ گئے۔

نہیں نہیں یہ نہ ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا..... یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔" اس کی حالت بالکل دیوانوں جیسی ہو گئی اور گھبرا گھبرا کر گلدان کے بکھیرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے لگی۔ ثمن کو اس سے ڈر معلوم ہونے لگا، اس نے چاہا اسے گھسیٹ کر پلنگ پر بٹھائے مگر وہ بگڑ گئی۔

"اس طرح ریزہ ریزہ ہونے سے پہلے میں اسے خاک میں روند کر پھینک دوں گی۔" آہستہ آہستہ دانت پیس کر اس نے کہا۔ اس کی شکل بالکل مکار چڑیلوں جیسی ہو گئی۔ ثمن کو اس سے کراہت آنے لگی۔

"تم بن رہی ہو ایلما!" اس نے حقارت سے کہا۔

"ایں؟ وہ غصہ سے مڑی۔

"ہاں، تمہیں ایکٹنگ میں مزا آ رہا ہے، تم جھوٹ بولتی ہو۔"

"ثمن"

"بس اتراؤ مت، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم اور میرے سامنے اتنی عجیب باتیں کرو گی، تمہیں اپنے بچے سے محبت ہے اور مجھے الو بنا رہی ہو۔"

"کیا؟۔۔۔محبت؟" ایلما پھر بپھری۔

"مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ اتنی سی دیر میں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ تمہیں رولف سے شدید محبت ہے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

مگر اسے جھوٹی نفرت کے بھیانک روپ میں لپیٹ کر دکھانا چاہتی ہو۔''

''تم''

''چپ رہو، میں تمھیں اتنا کم ہمت نہ سمجھتی تھی، افسوس تم نے میرے سارے حسین خوابوں کو آج اس گلدان کے ریزوں کے ساتھ چکنا چور کر دیا۔ تم بزدل اور دھوکے باز بڑی روشن خیال ہو، ناجائز کو جائز کہہ تو دیا لیکن تخیل کے بنائے ہوئے ڈھکوسلے کی آڑ لینے لگیں۔ مجھ سے جھوٹ بول بول کر اپنی عزت اور کم نہ کرو۔ سچ بتاؤ تم نے اپنی ماما کو ہوا نہیں بنا ڈالا۔ بڑی آئیڈیل والی بنتی ہو مگر یہ تمھارا آئیڈیل۔۔۔ تمھارا تمھارا ضمیر، تمھاری ذہانت، تمھاری ماما کے آگے مات کھا رہے ہیں، یہ جھوٹ ہے کہ تمھیں کبھی بھی ستیل سے نفرت تھی۔''

''شمشاد۔۔''

''بکومت۔ تم اس کی پرستار تھی۔۔۔ مگر تمھاری خود پرستی نے کبھی تمھیں اقبال نہ کرنے دیا۔ تمھارا یہ فلسفہ بالکل بے بنیاد اور پوچ ہے کہ جسم اور روح جدا جدا۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ستیل کو تمھارے جسم نے چاہا اور روح نے نفرت کی۔ پگلی دل و دماغ دھوکہ کھا سکتے ہیں۔ مگر جسم دھوکے میں نہیں رہتا۔ وہ وقت آنے پر سچ بول دیتا ہے۔ لیکن تم نہیں مانتی کہ تم ستیل سے محبت کرتی تھیں۔ اور اب بھی تمھاری آتما اس کی خواہش میں تمھیں یہ سزا دے رہی ہے۔ کیونکہ وہ تمھیں نہیں ملتا اس لئے فراق کی جلن تم اس کے بچے سے انتقام لے کر بجھانا چاہتی ہو۔ اور یہ بھولنا چاہتی ہو کہ یہ تمھارا بھی ہے۔ اری دیوانی ذرا غور تو کر اس طاقت کے مظاہرے میں کتنی کمزوریاں پوشیدہ ہیں۔''

مجھے کسی کا ڈر تھا جو محبت کو چھپاتی؟'' ایلما کی آواز شکست خوردہ ہو کر بھرا گئی۔

''خود اپنا، ایلما جتنا تم اپنے آپ سے ڈرتی ہو کسی سے نہیں ڈرتیں۔ تم کو خود اپنے سامنے سچ بولنے کی ہمت نہیں۔ اس کے علاوہ تمھاری ایک اور زبردست کمزوری ہے جسے تم کبھی تسلیم نہ کرو گی۔۔ تم ویسے بڑی مضبوط بنتی ہو۔۔۔ مگر تم سماج سے ڈرتی ہو!''

''ہنہ تم کہو اور دنیا مان لے۔'' ایلما نے وثوق سے کہا۔

''تم جھوٹ بہت بولنے لگی ہو۔ زندگی کو جنتر منتر بنا رکھا ہے۔ سچ بتاؤ تم نے بچے کا کیا نام لکھایا ہے اسکول میں؟''

''رولف۔۔۔ کیوں پوچھا تم نے؟''

''نہیں پورا نام بتاؤ۔''

''کیا کرو گی؟'' ایلما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''دیکھا باپ کے نام پر کھسیا گئیں۔''

''مطلب کیا ہے؟ یہ میری نجی باتیں ہیں۔''

''بالکل، اور مجھے دخل دینے کا کیا حق؟۔۔۔ معافی چاہتی ہوں اب کچھ نہ کہوں گی۔''

''اس کا باپ اس لائق نہ تھا۔۔۔ دوسرے۔۔۔''

''دوسرے تمھارے پاس اس کے نام کا سرٹیفکیٹ بھی تو نہیں تھا۔''

''ہاں!'' ایلما کچھ خوفزدہ سی خاموش ہو گئی۔

''بس اسی کا سارا غصہ ہے، آ گئیں نا اپنی اصلیت پر۔ دیکھا اپنے آئیڈیل کا حشر؟''

تھوڑی دیر بے تکی خاموشی چھائی رہی جس میں دو بے چین سہیلیوں کی تھکی ہوئی سانسیں گونجا کیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا دونوں تھک گئی ہیں۔ باہر دریچے میں سے چاند ایک بادل کے نیچے سے گھسٹ گھسٹ کر نکل رہا تھا۔ اور ہوا ٹہنیوں میں سرسرا رہی تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ صرف دور بہت دور جنگلی سیار خواب آلود قہقہے لگا رہے تھے۔

''تم ہمیشہ سے بزدل تھیں۔ جبھی تو ہر ایک پر غرا کر جھپٹ پڑتی تھیں۔ اور یہ بچے کے متعلق جو تمھارے خیالات ہیں یہ کچھ نہیں سوائے تمھاری مفلوج ماما کے انتقام کے۔ تم اس جذبے سے زور آزمائی نہ کرو، بری طرح شکست کھا جاؤ گی۔''

پلنگ پر خاموش بیٹھی ایلما اپنے ہاتھوں سے کشتی لڑتی رہی، اس کے تھکے ہوئے چہرے پر کرب اور لاچاری طاری ہو گئی۔ سادھوؤں جیسی گیانی آنکھیں بسورتے ہوئے بچوں کی طرح رو پڑیں۔ سیاہ ستے ہوئے گالوں پر سے لمبے لمبے خاموش آنسو جھلملاتی ندیوں کی طرح رسنے لگے۔ عضلات کی کھینچ تان سے اس کی بالائی ہونٹ دانتوں پر سے سرک گیا۔ وہ اب بھی اتنے ہی دھاردار تھے مگر زہریلے نہیں!

''اس وہم کو دماغ سے نکال دو۔'' ایلما کا سر تکیہ سے اٹھا کر اس نے کہنا شروع کیا۔۔۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ رولف کتنا پیارا بچہ ہے۔ میں تو کبھی سوچتی بھی نہیں کہ اس کی تخلیق میں کچھ ستیل کا بھی حصہ ہے، مجھے تو وہ میری پیاری ایلما کا ننھا منا کھلونا معلوم ہوتا ہے۔ سنو ایلما۔''

مگر ایلما سننے والی دنیا سے بہت دور گہری نیند میں غرق تھی۔ ثمن کی لوری نے اس کی برسوں کی اچاٹ نیند کو بلا لیا اور وہ معصوم بچے کی طرح ایک ہی جھپکی میں غافل ہو گئی۔ مگر ثمن کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ آہستہ سے اس نے ایلما کے پیر سیدھے کئے اور خود بھی جا کر دیوان پر لیٹ گئی، خیالات کے گھوڑے لگا کر تڑا کر بھاگ نکلے۔

ایک ہی بچے نے ایلما کو بوڑھا کر دیا تھا۔ ایک ہی پودے کی سینچائی میں وہ سب کچھ لٹا بیٹھی تھی۔ کمر کے وہ خم، جسم کا وہ بٹھوس پن مرجھا چکا تھا۔ ثمن نے اپنے جسم پر نظر ڈالی مہکتے ہوئے تیار انگوروں کی تیز خوشبو اس کے نتھنوں میں بھر گئی اور اسے وہ انگور یاد آ گیا جو بہت دن ہوئے ایلما نے اس کے گال پر کھینچ مارا تھا تو اس کا سارا منہ نہا گیا تھا۔ اور ایلما؟ اس نے گردن گھما کر دیکھا، جیسے چوسی ہوئی گٹھلی! اس نے اپنی کیا گت بنائی تھی! دو چار انگڑائیاں لے کر اس نے سونے کی کوشش کی مگر پکے انگوروں کی خوشبو نے اسے بے چین رکھا۔

اسے ستیل کا خیال آیا جب وہ پلنگ میں سوکھی ہوئی پتیوں پر اینڈ رہا تھا اور پھر اس نے ایلما کے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

مرجھائے ہوئے گالوں کو دیکھا۔ اس کا جی دکھ گیا۔ چاہا چپکے سے اٹھ کر ان شبنم میں ڈوبے اداس گالوں کو چوم لے۔ سوتے میں وہ ایلما جس پر جاگتی ہوئی ایلما ہر وقت بھٹنی کی طرح پنجے لئے تیار رہتی تھی کتنی معصوم لگ رہی تھی۔ ابروؤں کا طنز آمیز کھنچاؤ ڈھیلا پڑ گیا تھا اور بجائے الورا کی دیوداسی کے وہ بالکل معمولی عورت لگ رہی تھی۔ اس کا سیدھا سینہ معصوم ماتا سے دھڑک رہا تھا۔ شاید وہ خواب میں اس بچے کو چوم رہی تھی جس پر بیداری میں خود اس نے اپنے وہم کا پاسبان بٹھا رکھا تھا۔

صبح اٹھ کر شمن نے رولف سے دوستی شروع کر دی۔ بچہ بلا کا ذہین تھا اور شاید ایلما کو جلانے کے لئے اس نے ستیل کی ذہانت چرالی تھی۔ بات کرنے میں وہ بالکل اسی کی طرح بھویں چڑھا کر گہری آنکھوں سے دیکھنے لگتا۔ ماں کا ٹھکرایا ہوا بچہ شمن سے پورے جوش سے لپٹ پڑا۔ ایلما کی طرح وہ جھجکی تھی اور جس بات کے پیچھے پڑ جاتا عاجز کر دیتا۔ ایلما خاموش کن اکھیوں سے اسے دیکھتی مگر محبت جتاتے ایسی شرماتی جیسے بھرے بازار میں ننگی ہوگئی ہو۔ چار سال کی دبی ہوئی کونپل زرد اور بے جان ہو چکی تھی۔

آہستہ آہستہ شرم بھی ٹوٹی۔ بچہ پہلے بے اعتباری سے بھڑکا اور غصہ ہوا پھر متحیر ہو کر مانوس ہو گیا۔ ندی کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ امڈے ہوئے طوفان کو جسے برسوں کی روک نے اور بھی شہزور بنا دیا ہو، روکنا آسان کام نہیں۔ دن بھر ایلما کی آنکھیں چوری چھپے رولف کے پیچھے بھاگتیں اور ذرا دور جاتا تو اس کی تلاش میں بھٹکنے لگتیں۔

جب شمن دو دن چھٹیوں کے علاوہ رہ کر چلنے لگی تو ایلما اس سے لپٹ کر رو دی۔ وہ بڑی نرم دل ہو چکی تھی۔ ندی کا دھارا جب خشک زمین پر پورے زور سے گرتا ہے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دیتا ہے۔ ایلما کی پیاسی ماتا پر بھی یہ محبت کا دھارا اس شان سے گرا کہ کنواں بن گیا اور وہ اس کی گہرائیوں میں ڈبکیاں لینے لگی۔ ماں بیٹا اسٹیشن تک اسے الوداع کہنے آئے۔ جب ریل چل دی تو شمن نے اطمینان سے سانس بھری، وہ خوش تھی اس نے دو روٹھے ہوئے بچوں کا میل کرا دیا تھا۔

(36)

گرمی شباب پر تھی۔ معلوم ہوتا تھا سورج گھومتے گھومتے راستہ بھول کر قریب آتا جا رہا تھا۔ دنیا چکرائی جا رہی ہے۔ جرمنی نے فرانس کو بھون کر رکھ دیا۔۔۔ صدیوں سے آزادی کا جھنڈا لے کر بڑھنے والی حسینہ کان میں کان کوڑی ڈال کر جھک گئی۔ ادب اور فن کی دیوی زہرہ پر نازی عقاب پنکھ پھیلا کر ٹوٹ پڑا۔ یہ کیسی مجنونانہ تھی کہ انہی اپنے پیروں میں بیڑی بن کر الجھ گئی۔ وہ تکیہ جس سے پیٹھ لگائے مزے سے لیٹے تھے، الٹا دم گھونٹنے لگا۔ غلام فرانس کو نازی چنگل میں سسکتا چھوڑ کر آزاد فرانس انگلستان میں جا بیٹھا۔ جتنے ملک نازیوں کے پنجے کے نیچے دبتے گئے۔ فرانس کے آزاد دامے انگلستان میں جمع ہوتے گئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو یہ فرزند دولت انگلشیہ ہندوستان بھی ایک بار اس جان چھڑکنے والی ماں کی گود سے چھوٹ کر آزادی کی انگڑائی لے سکے۔ اور اس کے کسی کونے میں آزاد ہندوستان پیدا ہو جائے۔

اسکول کے رہٹ سے عاجز آ کر اس نے کلب جانا شروع کر دیا۔ مگر وہاں بھی جی کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہتا۔ سکون قلب نہ جانے کہاں جا کر سو رہا تھا۔ عمر اونگھتی، نخیلتی چلی جا رہی تھی۔ اسی زمانے میں اس کی ملاقات منصور صاحب سے ہو گئی۔ منصور کھاتے پیتے رئیس تھے مگر دل میں قوم کا درد بھرا تھا۔ کھدر پہنتے تھے اور شہر میں کئی کھدر کی دکانیں تھیں۔ ان کے ساتھ کچھ گاؤں سدھار کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ پرلطف پکنک کا مزہ آ گیا۔ زمیندار صاحب خود ترقی پسند تھے اور منصور کے پکے دوست۔ گوشکار کی دھت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ گاؤں والے متحیر آنکھیں پھاڑے اپنے مکتی دلانے والوں کو جوق در جوق دیکھنے آنے لگے۔ مارے عقیدت کے بدحواس ہو گئے تھے جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو کہ سدھار بھی کوئی چیز ہے۔ اس کی ضرورت انہیں کی طرح محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ جبیں سائی کی کچھ ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ احساس بھی سن ہو گیا تھا۔ یہ کسان جن کی دولت ہل ہے اور بیل، جو دھرتی کا سینہ چیر کر اناج نکال لاتے ہیں اپنے پیٹوں کے لئے نہیں بلکہ غاروں میں جھونکنے کے لئے۔ یہ تو بس ہون کے قائل ہیں اور دیوتاؤں کو خوش رکھنے ہی میں مکتی ہے۔

لیکن بھولے بھالے گنوار بھی عجیب خصلت رکھتے ہیں۔ یہ بہت جلد ایک مالک سے اکتا جاتے ہیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اور جب ایک رخ سے ناک رگڑتے رگڑتے گھس جاتی ہے تو سانس لینے کو دوسرے دیوتا کے آگے دوسرے رخ سے ناک گھسنے لگتے ہیں۔ جبھی تو ان کی ناکوں میں اتنی کھڑی دھار ہے۔ انہیں رتی بھر بھی تو احساس نہیں کہ جرمن پھپنے کا چکہ گھوما تو کیا ہوگا۔ پٹتے رہنے کی عادت نے انہیں بالکل نڈر بنا دیا ہے۔ انہیں ذرا بھی تو معلوم نہیں کہ جرمنوں نے انگلستان پر بمباری شروع کر دی ہے۔ سکھ چین کی عادی نازک طبع کیسے جھیلیں گے اس آگ کی بارش کو؟ کیا حال ہوگا ان کا جب انہیں معلوم ہوگا کہ دنیا میں آرام دہ کمرے ہی نہیں سورج کی تپش، برف کی ٹھنڈک اور ہوا کے بگولے بھی رہتے ہیں۔

مگر یہ ننگے بھوکے فقیر کسی کے نہیں، ہندوستان کی دولت اور دولت مند فتح کئے جا سکتے ہیں مگر اس کے سسکتے ہوئے گداگر اور ان کے خاموش منتظر دل کوئی نہیں جیت سکتا۔

شام کو سرکار کی طرف سے سارے گاؤں کو سرکار کی جیت کی دعائیں مانگنے کا حکم ملا۔ مندروں میں گھڑیال جھنجھنا اٹھے اور مسجدوں میں اذانیں گونجیں۔ مگر ان مردہ دل کسانوں کے دل خاموش رہے۔ وہ کیا کسی کے دشمن کو کوسیں جو خود اپنے دشمنوں کی درازی عمر کی دعائیں مانگتے آئے ہوں۔ رات کا کھانا پُرلطف رہا۔ زمیندار صاحب نے شکار بھنوا لیا تھا اور تازہ گھی لگی روٹیاں موجود تھیں۔ رات گئے تک گراموفون بجتا رہا اور صبح ہوتے ہی واپس لوٹ آئے۔ پہلی قسط قوم سدھار کی بری نہ رہی۔

تنہائی نے اخبار کو رفیق بنا دیا۔ ویسے اخبار ہو بھی تو گئے تھے دلچسپ۔ یورپ میں جو اکھاڑا جمتا رہا تھا اس کے بارے میں چھوٹی سی خبر بھی ہلچل مچا دیتی۔ جرمنی کے لمبے چوڑے دہانے میں ملک پر ملک پھسلتے جا رہے تھے۔ سرکار کی گلابی افشاں پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ ہٹلر کی ہوس بڑھتی جا رہی تھی۔ دنیا کی بہی خواہ سرکار گھبرا چلی تھی۔ اتنے برسوں میں جو کچھ کیا دھرا تھا اس پر پانی پھرتا نظر آ رہا تھا۔ کسی کا بھروسہ نہیں۔ یہی جرمنی جس سے بیس بائیس سال پہلے حق پرستوں نے ناک رگڑوائی تھی آج مست ہاتھی کی طرح روندتا چلا آ رہا تھا۔

سہ ماہی امتحان سر پر آ گئے۔ نہ جانے یہ امتحانوں کا سلسلہ کس نے شروع کیا۔ طالب علم اور ممتحن دونوں کو بندھی بنا دینے کا آسان طریقہ اور کچھ نہیں بس پندرہ بیس دن کی پڑھائی اور کاغذ کی ڈھیریوں کا ستیاناس لگ جاتا ہے۔ کیل بلو نچے کچھ نہ کچھ لکھنا ان کا فرض اور اس پر نمبر دینا ممتحن کا کام۔ نہ جانے ان نمبروں کی لین دین کا مقصد کیا ہے۔ امتحان کے کمرے میں چکر لگاتے لگاتے پیر سوج گئے۔ اسے پانی پلاؤ تو اسے سیاہی لا کر دو۔ ایک قلم بھول آئی تو دوسری کا نب ٹیڑھا ہو گیا۔ سارے وقت مسطر، چاقو، جاذب ادھر سے اُدھر پہنچاؤ۔ یہ رعایا مانگنے کی عادت بھی خوب ہے۔ تعجب ہے لوگ، قلم، دوات، کاغذ، پنسل کے ساتھ ساتھ آنکھ، کان، ناک ادھار نہیں مانگ لیتے۔

دسمبر کی چھٹیوں میں گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو اپنا سامان درست کر کے آرام کرسی پر جمائیاں لیتے لیٹ گئی کہ کب شام ہو اور کب چڑیا بسیرا لینے اڑ جائے۔ اس دفعہ گھر کی یاد بہت زیادہ ستا رہی تھی۔ پورا سال گزر

گیا تھا نہ جانے گھر کا کیا حال ہوگا، اماں کے کتنے دانت اور ٹوٹ گئے ہوں گے؟ مصنوعی لگ جائیں تو چھٹی ہو۔ منجھو بی کے کتنے بچے ہوں گے کوئی؟ چھٹا تو شاید لڑکا تھا یا لڑکی۔۔۔۔ چار سال کی بات ہے کسے یاد۔ اور نہ جانے اتنے دن میں تعداد کہاں سے کہاں پہنچی ہو۔ منجھو بی تھی بھی تو بلا کی زرخیز۔ منجھلی نے کتنے جتن کر ڈالے چوہے کا بچہ بھی نہ جن سکی۔ اب تو اس کا میاں بھی سوکھ کر ہڑ بن گیا ہے۔ بھاوجیں بھی کسی سے کم نہیں۔ میاں سے گھڑی بھی کو نہیں بنتی پر بچوں کا سلسلہ ذرا دیر کو نہیں رکتا! خیر آج کل تو بچوں کی ضرورت بھی ہے جنگ کا زمانہ ہے لڑکے سپاہی بن کر گھائل تیار کریں گے اور لڑکیاں ان گھائلوں کی مرہم پٹی کریں گی۔ نہ جانے اس توڑ پھوڑ اور مرمت میں کیا لطف آتا ہے انسان کو۔

چپڑاسی نے ایک تار لا کر دیا اور شمن کے خیالات منتشر ہو گئے۔

''آن ملو''

''افتخار''

بے اختیار دل دھڑکا دو لفظوں نے دفتر کے دفتر کھول کر بکھیر دیے۔ کئی بار پڑھا کہ کوئی تکیہ، کوئی نقطہ نظر انداز تو نہیں کر دیا۔ جی جل گیا، پیاسے کے منہ پر چھینٹا اور وہ بھی اس بخل کے ساتھ کہ اور پیاس بھڑک اٹھی۔ اسی شام کو وہ جھوالی روانہ ہو گئی۔

وہ کہاں جا رہی ہے؟ یہ وہ بہت جلد بھول گئی۔ پتنگ کی ڈور کھنچ رہی ہے اور قدرت کے اس دھمکیوں دھراتی وہ چرخی سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ چھپی ہوئی آرزوئیں اور بندھے ہوئے خواب رسیاں تڑا کر طرارے بھرنے لگے۔ ان چند سالوں کی خشک زندگی نے اس کے جذبات پر کاروباری سیمنٹ کی ایک تہہ چڑھا دی تھی۔ سوائے سادہ بھدی ساری اور بدوضع جمپر کے اس نے لباس بھی تو کوئی نہیں رکھا تھا۔ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو برقرار رکھنے کے لئے وہ فیشن سے پرہیز کرنے لگی تھی۔ اس کی زندگی مسلسل اداسی اور خشکی میں ڈوب گئی تھی۔ مگر آج اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سیمنٹ کی تہہ کو توڑ کر ایک دبا دبایا کلہ سر اٹھا رہا تھا۔ مرجھائی ہوئی زرد رو کونپل ایک نئی حرارت کے احساس سے چونک رہی تھی۔

گزشتہ چند ماہ میں اس نے افتخار کو کچھ رقم اور گرم کپڑے بھیجے تھے۔ کچھ طاقت کی دوائیں جن کا ذکر اس کے خط میں بے خیالی سے کر دیا گیا تھا، اور اپنے ہاتھ کا بنا ہوا سوئٹر تو حال ہی میں بھیجا تھا، اسے وہ وقت یاد تھا جب افتخار کی کھانسی کے دھماکے اس کے دماغ میں گونج اٹھتے تھے۔ اس کے مرجھائے ہوئے جسم کو گرم کرنے کے لئے اگر ممکن ہوتا تو وہ اپنی کھال اتار کر دے دیتی۔ اب تو ایک جسم کا خون دوسرے جسم میں آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس نے طے کر لیا کہ اس مرتبہ وہ پوری کوشش کرے گی کہ تھوڑا سا اپنا خون اس کے جسم میں پہنچا دے۔ اور آنکھیں بند کر کے تخیل میں افتخار کی نسوں میں خون بن کر بہا کئے گی۔ شرمائی ہوئی سرخ پوش دلہن! وہاں کس آزادی سے وہ یک جان ہو سکتی تھی۔ یہ خونی جوڑا پہنے دلہن دبے پیر اس کے دل میں رینگ جاتی۔ اور پھر اس طرح پھیل جاتی اور گالوں کو چومتی ہوئی ہونٹوں پر ناچ اٹھتی! افتخار کتنا مہذب تھا کہ اس نے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کبھی اس کا ہاتھ بھی تو نہ چھوا۔ ایک مقناطیسی کشش سے وہ اپنی طرف کھینچتا ضرور تھا مگر صرف اتنے قریب کہ دھیمی دھیمی مدہوش کن آنچ لگے پر داغ نہ پڑے۔۔۔ اور پھر ڈھیل دے دیتا ایسے کہ کھینچنے والا دھکا کھا کر پرے جا گرتا۔ اگر وہ بھی دست دراز ہوتا اور سٹیل کی طرح اس کا جسم بھی طاعون بن کر چھا جاتا تو وہ گردن پھیر کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتی۔ یہ مدھ بھرا امرت کا گھڑا اس کے اوپر الٹ دیا جاتا تو پھر یہ خمار کہاں سے آتا!

کتنا مقدس تھا ان دونوں کا ناطہ۔ اس دن الہ آباد کے کیمپ میں جب اپنی ریشمی رضائی افتخار کو سونپی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے خوابوں کی دنیا کو بھی لپیٹ دیا تھا۔ تنہائی کی انتھک لمبی راتوں میں چاروں طرف سے مہیب آوازیں پکار پکار کر قہقہہ لگاتیں اور کہتیں۔۔۔ ''اکیلی۔۔۔۔ اکیلی'' تو وہ ٹھٹھرتی ہوئی لاوارث روح کو چپکے سے دور اس رضائی میں سرکا دیتی۔

اس کے پاس افتخار کی ایک پرانی تصویر تھی جس میں وہ دور کہیں غیر فانی بلندیوں کی طرف گھور رہا تھا۔ بالائی نصف حصہ روشن تھا اور داہنا رخ تاریکی میں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر استقلال ناچ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا تاریکی کا تھپڑ اس کا منہ موڑنا چاہتا ہے۔ مگر وہ استقلال سے دھارے کے بہاؤ سے مقابلہ کر رہا تھا۔ یہ تصویر ہمیشہ اس کے بہت قریب ہوتی۔

ابھی حال ہی میں افتخار نے اسے چند اشعار بھیجے۔ جلتے جلتے باغیانہ اشعار کے ساتھ اس کا دل محبت کی شیریں نغمے بھی گا اٹھتا تھا۔ ان رنگین اشعار میں اس نے شمن کی اس بسنتی ساری کو لہراتا دیکھا تھا جو اس کے دل و دماغ پر ایک رنگین خواب بن کر چھا گئی تھی۔ جس میں مصور نے قوس قزح کو بکھیر کر واپس ایک نقطے پر سمیٹ دیا تھا اور اس دن سے سونی سونی راتوں میں وہ اپنے غمگین دل سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس کے خوابوں میں نور برساتی آ چکی تھی۔ یہ گیت اس نے اتنی مرتبہ گنگنائے تھے کہ لوح دماغ پر گہری گہری لکیروں کی طرح کھنچ گئے تھے۔ کاغذ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے کی نمی سے بھر بھرے ہو گئے تھے، اسکول کی اس خشک اور چٹیل فضا میں یہ آب حیات کے چند چھینٹے اس کونپل کو تازہ دم بناتے رہے جو ناقدری سے مرجھا چلی تھی۔ افتخار کے خطوں نے اس کی نسوانیت کو جلا ئے رکھا۔ ورنہ وہ تو کبھی کی ایک کامیاب معلمہ بن چکی ہوتی۔ جس کے رعب سے دوسری استانیاں لرزتیں اور لڑکیاں کانپ اٹھتیں۔ کامیاب معلمہ وہی ہے جو مؤنث اور مذکر کے سوال بھول کر نکیریں کرنے کا مسطر بن جائے۔ اقلیدس کے اس غیر شاعرانہ آلہ کو دیکھ کر ہنسی لڑ کھڑا جائے۔ چہرے مؤدب ہو جائیں اور کندھے نہ جھکیں، قلم دوڑنے لگیں اور کاپیاں سیدھی ہو جائیں۔ ہر چہار طرف فوجی نظام قائم ہو جائے اور قواعد حکمران ہو جائیں مگر ان گیتوں کی دھیمی دھیمی پھوار نے پودے کو سوکھنے سے بچا لیا۔

کسی تیوہار یا میلے کی وجہ سے ریل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی تیسرے درجہ میں قیامت جیسی بھیڑ اور غل تھا لوگ مکھیوں کی طرح چپٹے کے چپٹے بنا کر لٹکے ہوئے تھے۔ ریل ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھی اور بالکل گھریلو حساب کتاب سے چل رہی تھی۔

سینی ٹوریم کے روشن برآمدے میں افتخار اس کی دی ہوئی رضائی پیروں پر ڈالے اور اس کا ہی بنا ہوا سوئٹر پہنے بیٹھا تھا۔ اور بہت سے کاغذ اس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ نہایت تکلف سے اس نے شمن سے ہاتھ ملایا۔ یہ پہلی گستاخی تھی جو نہ جانے آج کس رو میں اس نے جائز سمجھی۔ جلدی سے اس سے ہاتھ چھڑا کر وہ پاس ہی بیٹھ گئی اور کاغذ دیکھنے لگی۔

''تمھارے کام کے نہیں۔'' شمن نے دیکھا وہ ہسپتال کے بل اور نسخے ہیں۔

''کیوں؟''

''کہتے ہیں عورتیں چوہوں تک سے ڈر جاتی ہیں۔''

''مگر میں ان عورتوں میں سے نہیں۔''

''مگر اس میں چوہیاں نہیں اژدہے ہیں۔'' مگر شمن نے نہ سنا۔

''ہاں بھئی وہ نیا پل اوور تو آ چکا۔ ہم اسی بے چارے پرانے دوست کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔'' افتخار نے پیار سے پل اوور کو سہلایا۔ یہ وہی تو سوئٹر تھا جس کے ایک ایک پھندے کے ساتھ شمن نے اپنے ہزاروں سپنوں کو بن دیا تھا۔ کس شان سے اس کے سینے سے چسپاں تھا۔ وہی سوکھا مارا نحیف سینہ، پیار اور لطیف جذبات کا لبالب خزانہ جس کے قرب کے وہم سے ہی اس پر کپکپاہٹ طاری ہو جاتی تھی۔

''تھوڑا اون کم ہو گیا ہے۔۔۔۔ یہاں سے جا کر پارسل کر دوں گی۔''

''دق کے مریض کی چھوئی ہوئی چیزیں کھانا نہیں چاہئیں مگر یہ پھل بالکل تازہ ہیں۔ تم خود اٹھا لو۔۔۔ مجھے بھی دو۔ چاقو دراز میں ہو گا۔''

''میں اس قدر وہمی نہیں اگر آپ کو مہمانوں کی خاطر کرنی نہیں آتی تو رہنے دیجئے۔''

''اچھا، تو آپ مہمان ہیں!''

''جی۔''

''ہنہ!'' اس نے اٹھ کر میز سے چاقو نکالا اور نہایت دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ ''جو ہر لحہ دل و دماغ پر سوار رہیں، خوابوں میں بھی پیچھا نہ چھوڑیں، نیندیں اڑا دیں، موقع ملے تو کیا مزے سے مہمان بن بیٹھتے ہیں۔۔۔ نفرت ہے مجھے ایسے مہمانوں سے!'' افتخار نے مصنوعی غصہ سے کہا اور شمن کا دل اچھل پڑا۔

''میں نے ایک کہانی میں پڑھا تھا کہ تازہ پھل کھانے کا مزہ تو جب ہے کہ انہیں دانتوں سے بھنبھوڑا جائے اور دو کے بجائے چار ہونٹ ایک ساتھ رس چوسیں۔'' افتخار آج شاعری پر تلا ہوا تھا۔

''سنا کچھ۔''

''کیا۔''

''ہٹلر نے کتنے ملک لپیٹ لئے، اب ان کی باری آنے والی ہے۔''

''توبہ ہے، انسان انسان کو چبائے ڈالتا ہے۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"یہی ہوگا۔ اگر شیر کو بھوکا رکھا جائے گا تو موقع پاتے ہی پہلے اپنے سدھانے والے کو چبائے گا۔ یہ نازی شیر ہٹلر نے ڈھیلا پڑنے کے انتظار میں تھا۔ اب موقع آگیا ہے!"

"مگر بےچارا پولینڈ۔"

"گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی ساتھ پسنا پڑتا ہے۔ مگر اب ان کا وقت آگیا ہے۔ انھوں نے دنیا مٹی کا تودہ نہ بنادے تو بات نہیں۔ بہت پیس لیا بےگناہوں کو۔ اب ذرا چکی کے دو پاٹ سے خود بھی آزمائیں۔ وہ بھونچال جو سالہا سال سے یہ اوروں پر برساتے آئے تھے۔ قدرت نے جمع کر کے آتشیں گولوں کی صورت میں انہیں کو لوٹا دینے کا فیصلہ کر لیا تو بزدل گیدڑوں کی طرح بلوں میں گھسے جارہے ہیں۔ اور پھر چاہتے ہیں کہ ہمیں دکھ ہو، ان سے ہمدردی ہو۔ ان کے دشمنوں کو کوسیں کے مارے ہم اپنے ہی دشمنوں کی درازیٔ عمر کی دعا میں۔ نکتے آئے ہیں تمھارے دشمنوں کو کیا کوسیں گے مگر نہیں ہمیں کوئی نہیں جانتا۔۔۔ ہم بہت جلدی ایک۔ لک سے حبرا جاتے ہیں اور اب ہسٹری نئے فرمان بنارہی ہے، نئے سرے سے نقشے بانٹے جائیں گے جو بویا ہے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ اوروں کے خون کی ہولی کھیلنے والے ذرا خود اپنے خون کی سرخی بھی تو دیکھیں۔ اس مغرور سر کو بھی تھوڑی سی نکسیر بہانی پڑے گی۔"

"مگر یہ کم بخت بڑے طاقتور ہیں!"

"خاک نہیں شیخی خورے خالی ڈینگیں مارتے ہیں، ننگے ہیں سر پیر سے، جبھی تو چاروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں دیکھ لینا کہیں کے نہ رہیں گے ایک ایک ڈالر پر۔ اور چچا بھی معصوم نہیں۔ چچا بھتیجے کی ملی بھگت سے تو یہ راج قائم ہیں، اور جب تک یہ زندہ ہیں بھوکے اور لکھ پتی رہیں گے۔"

"اب کے یہ مدد نہیں کریں گے۔"

"ارے کریں گے کیسے نہیں آخر کو بنئے ہیں۔ روئی کا بیوپار نہیں لاشوں کا ہی سہی۔ دوسرے چھینے کے خوف سے خود ان کی سٹی گم ہے۔"

"سنئے کیا رکھا ہے جاپان میں، کم بخت کوئی چیز بھی تو ڈھنگ کی نہیں بناتے۔"

"ارے تو تم اس جاپانی مال سے ان کی طاقت کا اندازہ لگا رہی ہو۔ دیوانی یہ تو ہندوستانیوں کے لئے ہے اور بہت سے ان بےچاروں کے لئے تم نہیں جانتیں۔ کیا حال ہے۔" وہ چاقو سے سیب کے چھلکے کا قیمہ کرنے لگا۔

"اور تم دیکھنا آخر میں مزدور کا پھاوڑا ہی جیتے گا اور یہ پھاوڑا اس جھوٹے نظام کو چکنا چور کر دے گا۔ بےگناہوں کا خون ضائع نہیں ہوا۔ اس خون سے اگی ہوئی روئی چبا کر سرخ قوم پیدا ہوگی۔ سکون کا دامن چاک ہو جائے گا۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگا۔ سینۂ گیتی شق ہو جائے گا! پھر کیا ہوگا؟ پھر کیا ہوگا؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں لیکن شاید کبھی میں اس کا جواب دے سکوں۔" جوش کی شدت سے افتخار کا زرد چہرہ دہک اٹھا۔

"ظلم کے علمبردار آج تہذیب اور انصاف کی حفاظت کو چلے ہیں۔ یہی جذبہ ۱۸۵۷ء میں کسی حسینہ کی گود میں سو رہا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے!۔۔۔۔ اور ہٹلر فولاد ہے۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ان کی طاقت۔۔۔۔"

"شیر کے آگے گیدڑ کی بھبکیاں، صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے یہ تم خود دیکھ لوگی۔"

"مگر ہندوستان کو کیا واسطہ ان باتوں سے۔ یورپ والے تو ہمیشہ ہی بات بے بات جوتی پیزار میں مشغول رہتے ہیں۔ ہمیں کیا ہم تو ویسے ہی غلام کے غلام۔"

"ٹھیک کہتی ہو ہمیں کیا، ہم کیوں پھٹے میں پیر اڑائیں، لیکن تم بھول رہی ہو ہم غلام ہیں اور آقا کے ساتھ بلکہ آقا سے پہلے ہمیں اپنے خون کی بھینٹ چڑھانی ہوگی۔۔۔ لیکن وہ دن جلد آنے والا ہے جب لفظ غلامی تمھیں لغت میں بھی نہ ملے گا۔ میں نے تمھیں کس لئے بلایا ہے۔ یاد ہے وہ کیمپ والا معاہدہ یا بھول گئیں!"

"اتنی کند ذہن نہیں ہوں۔"

"معلوم ہے مجھے جبھی میں نے سب سے پہلے تمھیں کو چنا تھا۔ تم نہیں جانتیں کہ تمھاری قربانی کی ملک کو کتنی ضرورت ہے۔ اور تم میں ہمت بھی ہے اور ذہانت بھی۔ تم مضبوط دل و دماغ کی مالک ہو۔ بولو کیا دے سکتی ہو۔"

"میرے پاس ہے کیا؟"

"جو کچھ بھی ہے ایک پیسہ، ایک پھوٹی کوڑی، سنو ہماری جماعت کو فنڈ کی ضرورت ہے، چاروں طرف سے نرغے میں ہے، کام جو تیزی سے جاری تھا بکھرتا جارہا ہے مگر ڈر ہے رک نہ جائے۔ کانپور سینٹر سخت مصیبت میں ہے۔ تمام کاغذات ضبط کر لئے گئے ہیں، ہمارے بہت سے کام کرنے والے جیل میں سڑ رہے ہیں۔ مگر پھر بھی جو آزاد ہیں چمگادڑوں کی طرح کھنڈروں، کونوں، کھدروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جانتی ہو سب سے بہتر پناہ گاہیں کہاں قائم ہیں؟"

"نہیں!"

"رنڈیوں کے کوٹھوں پر، تم بڑی متحیر ہو رہی ہو۔ کسی شریف عورت میں نہ ایسے ملزموں کو چھپانے کا سلیقہ اور نہ ہمت، رنڈی کے کوٹھے پر شراب میں دھت انسان کو کون پہچان سکتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں غنڈہ ہے پرلے درجے کا۔"

"لیکن نقشہ کیا ہوگا۔ آپ کے کام کا؟"

"یہ ایک شدید راز ہے میں جو یہاں چھپا بیٹھا ہوں کس لئے؟ یہاں کسی کی نگاہ نہیں پڑتی۔ میری خیریت پوچھنے میرے ساتھی بآسانی آتے ہیں میرے رشتہ دار۔۔۔ معاف کرنا میں نے تمھارا نام بھی رشتہ داروں میں لکھ دیا ہے۔ شکایت تو نہیں ہوئی؟"

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''بس بننے مت۔''

''شکریہ، اور فنڈ کی قلت کی وجہ سے یہ بل۔۔۔۔'' وہ ایک دم چپ ہو کر کاغذات چھپانے لگا۔

''آپ میری ہتک کر رہے ہیں۔''

''کون، میں؟''

''جی!''

''توبہ ہے، چہ۔۔۔ ارے بابا کھال ادھیڑ دو مگر ایسی ٹیڑھی نظروں سے نہ دیکھو۔'' ثمن ہنس پڑی۔

''تو لائیے وہ کاغذات۔''

''تمھارے کام کے نہیں۔'' افتخار نے ٹالنا چاہا مگر ثمن نے چھین لئے۔ پورے دو سو پچھتر روپے کا بل اگر ادا نہ ہوا تو چوبیس گھنٹے کا نوٹس۔

''اب پتہ چلا آپ مجھے کیسا رشتہ دار سمجھتے ہیں۔''

''تو بھئی۔۔۔۔''

''رہنے دیجئے، مجھے آپ کے اوپر اعتبار نہیں۔''

''کیا یہ آخری فیصلہ ہے؟''

''جی۔'' ثمن نے اس کی دھیمی آواز کی تپش سے پگھل کر زبردستی کہا۔

''کچھ جرمانہ نہیں ادا کیا جا سکتا، کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک۔''

''جی نہیں۔''

''تو پھر ہم نے بھی فیصلہ کر لیا۔ پوچھو کیا؟''

''نہیں پوچھتی۔''

''چہ۔۔۔۔ جی چاہتا ہے مالش کی دوا پی کر اس جھگڑے کو ہی ختم کر دیں۔''

''بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں بچہ بننے!''

''تم مذاق سمجھ رہی ہو مجھ سے دنیا خفا ہو چکی ہے اور اب۔۔۔ اب اس نئی دنیا کی خفگی نہیں، تمھیں بتاؤ ایک بے کار انسان لوگوں کی نفرت کی آماج گاہ بن کر کیوں ٹھوس ٹھاس بنے جائے۔''

''تو۔۔۔ پھر آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا۔''

''غلطی ہوئی۔۔۔ بس۔'' کان کی لو اینٹھ کر کہا۔ ''معاف کر دو۔''

''ایک شرط پر۔''

''او ہو کوئی شرط ایسی بھی رہ گئی ہے تمھاری جسے ماننے نہ ماننے کا اختیار میں نے غصب کر رکھا ہے!''

''جی ہاں ورنہ یہ کاغذ میرے تجسس سے چھپائے نہ جاتے بلکہ اگر آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں تو آپ کو چاہیئے تھا مجھے بل پکڑا کر حکم دیتے کہ انہیں ادا کرو۔''

''اوہ!'' افتخار نے رندھے ہوئے گلے سے کہا اس کا سر جھک گیا اور باوجود ضبط کے آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی۔ ''لیکن''۔۔۔

''پر ائیچت؟''

''سنو تو۔''

''جی نہیں۔۔۔ آداب عرض۔'' ثمن جل کر اٹھی اور جانے کو مڑی۔

''بیٹھو۔۔۔ بخدا اس تیکھے پن پر کہیں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔۔۔۔'' افتخار نے بہکی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ''تم آگ سے کھیلنے کی کیوں اتنی شوقین ہو کہیں خود ایک آدھ چرکا نہ کھا جاؤ۔'' افتخار نے جلدی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ ثمن بے سہارا ہو کر واپس کرسی پر گر پڑی۔ ایک دم بے تکی خاموشی چھا گئی جسے دو دلوں کی دھڑکن توڑتی رہی۔

سو سو کے چند نوٹ ثمن نے لفافے میں ڈال کر میز پر سرکا دیئے

''میرا قرض رہا۔۔۔ مع سود واپس کر دیجئے گا۔''

''اچھا تو یہ سلسلہ بھی چلتا ہے؟''

''کیوں نہیں، آپ جیسوں کو کیوں چھوڑا جائے۔''

''جوابا نہ کر سکا تو؟''

''تو حشر کے دن ایک کے ستر وصول کر لوگی۔''

''مذاق نہ کرو۔۔۔ میرا کام اور پھر یہ بیماری۔''

''للہ کم بخت بے چاری کو چھوڑیئے۔''

''میں اسے بہت چھوڑنا چاہتا ہوں پر یہ بھی مجھے چھوڑے۔۔۔ ہوٹلوں کے کھانوں اور فٹ پاتھ پر سونے کا اس سے زیادہ حسین تحفہ اور کیا مل سکتا ہے۔'' اس کی مرجھائی آنکھوں میں پھر وہ پرانی سلگتی ہوئی بغاوت چھا گئی۔ ''انتقام انتقام'' اس کے چہرے کی کرخت سلوٹیں پکار اٹھیں سنبھل کر اس نے دوا پی اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''یہ کم بخت جراثیم، قدم قدم پر بیڑیاں۔۔۔'' اس نے حسرت سے ثمن کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اب کب آؤ گی۔ ویسے تو مجھے کوئی ضرورت نہیں تمھاری عنایت کا محتاج نہیں۔۔۔۔'' ثمن کا منہ اتر گیا کیونکہ جب چاہوں تخیل کے زور سے گھسیٹ لاتا ہوں۔ اور اس وقت نہ تم اتنا جھجکتی ہو اور نہ مجھے جراثیم کا خطرہ رہتا ہے۔''

وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(37)

واپسی پر اسے ایک تار ملا۔ ''فوراً آؤ۔'' ایلما نے لکھا تھا کیونکہ وہ اپنی ڈاک کے متعلق کوئی ہدایت نہیں دے گئی تھی۔ ارادہ تھا بھوالی سے لوٹ کر سامان لیتی ہوئی گھر روانہ ہو جائے گی۔ تار کئی دن دیر سے ملا۔ پھر بھی وہ فوراً روانہ ہوگئی۔ رولف کے لئے اس نے ایک بندوق، رنگین گولیوں کا ڈبہ اور تھوڑے سے چاکلیٹ لے لئے۔

وہ برآمدے ہی میں تھی کہ بوڑھی آیا نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر روک لیا۔

''اندر جانے کا نہیں! ابھی کر کے سویا ہے۔''

''سویا ہے تو سونے دو میں اسے جگاؤں گی نہیں میم صاحب کہاں ہیں؟''

''او ہی سوتا۔۔۔ اکھا دن ایسا ایسا کرتا۔'' آیا غم کا مجسمہ بن گئی۔ یقیناً سٹھیا گئی تھی۔ ایلما سے کہہ کر نئی آیا کا انتظام ہونا چاہئے۔ وہ آگے بڑھی۔

''بولتا کہ بائی نہیں جانے کا۔''

''کیوں؟''

''کیوں؟ اوہ کیوں؟'' اندر سے مردہ آہوں کی ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ کیوں؟ یہ سب آخر کیوں؟ پردہ ہٹا کر ایلما باہر آگئی۔ عجیب وحشیوں کی سی حالت، آنکھیں پھٹی ہوئی، بال بکھیرے، مردے سے بدتر! بخار میں جل رہی تھی۔

''ایلما کیا ہوا؟'' پہلے تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ لیکن شاید اب بھی دماغ کی کوئی رگ سلامت تھی۔

تم!۔۔۔ تم آگئیں؟ اسے بھی لے آئیں۔۔۔ میں نے اس کے لئے دودھ ابال دیا ہے اور۔۔۔''

''کیا ہے ایلما۔''

''چہ چہ۔۔۔ بولا تھا رے کو۔۔۔ کیسا فر پھرینڈ ہے۔۔۔ ڈاکٹر آوے تی بولے گا۔ ہم اس کو۔۔۔''

آیا نے پھر ڈانٹنا شروع کیا۔ ''بائی کو شوک لگ گیا۔۔۔'' اس نے کان میں چپکے سے کہا۔

''تم کیوں لے گئیں میرے رولی کو۔۔۔ چلو ادھر لاؤ۔۔۔ بڑی شریر ہو تم۔'' ایلما شرما کر مسکرائی۔

''ایں؟'' شمن چکرائی۔

''او ہو۔۔۔ بندوق بھی لے آئیں اس کی۔۔۔ اچھا کیا۔۔۔ بے چارا روتا۔۔۔''

''ڈیتھ ہو گیا بے بی کا۔۔۔'' آیا نے روہانسی آواز سے کہا اور سر ہلانے لگی۔

''کیا رولف!''

''جھوٹ۔۔۔ بالکل جھوٹ۔۔۔ یہ سب جھوٹے ہیں۔۔۔ دھوکا دیتے ہیں مجھے۔۔۔ میں ان

سب پر کیس چلا دوں گی۔۔۔ ٹھائیں ٹھائیں۔۔۔ وہ مارا۔'' ہوائی بندوق داغ کے وہ کلکاریاں مارنے لگی۔

''لمونیا ہوئے۔۔۔ تین روج میں۔۔۔ کھلاس!'' چندھی بجو جیسی آنکھوں والی بڑھیا اپنی سکڑی ہوئی ناک چڑھا کر بسورری۔ ''او ہنگ! میم صاحب ایک دم پاگل سری کا ہو گیا۔ ہم بولا کوئی کا جبردستی نہیں یسوسی کا بھیڑ۔۔۔ او لنے بلا لیا پن ہم کو تو دھکا مارتے! بولتے جاؤ نہیں مانگتا تمہارے کو۔۔۔ ہم بولا کہاں بی جائے۔۔۔ پن مانتا بی نہیں۔۔۔ ایں؟۔۔۔ بولو کون دوسرا ہے اپنا۔۔۔ صاب بھی مر گیا۔۔۔''

''او جو با جو میں صاب رہتا۔۔۔ بولا مسیح پال ان لگی۔۔۔ ایک دم کر کے ان لگی۔۔۔''

''او نہہ۔۔۔ ذرا جا کر اسباب اتر واؤ۔۔۔ آیا۔'' شمن نے آیا کی بکواس سے بوکھلا کر کہا اور ایلما کو گھسیٹ کر اندر لے گئی۔

''لاؤ نا۔۔۔ کہاں چھپا دیا ہے اسے۔'' اس نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔

''ایلما۔۔۔'' شمن کا جی چاہا اسے کلیجے سے لگا کر جی بھر کر روئے۔

''تم بولتی کیوں نہیں۔۔۔ دیکھو مجھ سے کوئی چال مت چلنا۔۔۔ ورنہ یاد رکھو میں نے وکیل کر لیا ہے اور سب کے اوپر کیس چلانا۔۔۔ اوہ۔۔۔'' وہ کچھ سوچ کر رک گئی اور منہ پر ہاتھوں کا کٹورا ڈھک کر پکارا۔۔

''آ۔۔۔ یو۔۔۔ آ۔ یو۔''

''آتا میم صاب!''

''آیا۔۔۔ ہوٹ واٹر مانگتا بے بی کے واسطے ایک دم اچھا ہونا۔۔۔ گسل ہونا۔''

''کیا میم صاب بولتا! بے بی پکا گسل کر لیا! اب۔۔۔'' اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا ''اس کو اینجل ہولی واٹر کا گسل دیتا۔ یسوسی۔۔۔''

''غارت ہو کم بخت۔۔۔ چلو یہاں سے۔'' ایلما نے ڈانٹا اور چھٹی اس پر مگر آیا نہایت لاپروائی سے کھڑی بکتی رہی۔ ''ایسا ایسا کیا چلاتا میم صاب۔۔۔ ہم ڈاکٹر کو بولنے مانگتا۔''

چپ رہو آیا۔۔۔ ایلما صبر کرو یہ کیا حال بنا لیا ہے۔'' وہ پیار سے اس کے بال سنوارنے لگی۔

''تو پھر لاؤ اس کو۔'' ایلما نے بچہ کی طرح آس بھری آواز میں التجا کی۔

''کون مانتا۔۔۔ ہم کتنا کتنا بولتا پن۔۔۔ جب بے بی مر گیا تو کیا ہونا۔ پن اکھا دن مارا ماری کرتا۔۔۔''

''جھوٹ جھوٹ۔''

''اب یسوسی کی بات کو جھونا بولتا۔۔۔ کیا ہونا ایسے!''

''آیا۔۔۔''

''یسو کا کسم۔۔۔''

''باہر چلو۔۔۔ نکلو۔۔۔'' شمن نے اسے زبردستی باہر گھسیٹا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''جاتا بابا جاتا۔۔۔۔ پن یہ دیکھنے کا کہ اپنے کو یسو بلاوے تو۔۔۔۔ اور میم صاب کھاتا پیتا کو چھ نئیں۔۔۔۔ کھدا باپ کسہ ہوتا؟'' ثمن نے دروازہ بند کرلیا۔

''یہ تمھیں اور بوکھلائے دیتی ہے، یہ کیا حال بنالیا ہے تم نے۔۔۔''

''سب کہتے ہیں وہ چلا گیا۔۔۔ تم لے گئی ہو؟''

''نہیں۔''

''ایمان سے!'' ایلما سہم گئی۔

''یہ دوائی بے بی پینے کا۔۔۔ پن ہم بولتا ڈیتھ کو کوئی دوائی بی نئیں۔'' آیا دوا کی شیشی کے بہانے پھر اندر آگئی۔ بڑھیا کو دہشت ہو رہی تھی اور تنہائی سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

''کیسی دوا ہے؟''

''ڈاکٹر دیتا۔۔۔ فرسٹ کلاس ڈاکٹر۔۔۔۔ ہم مڈوائف کا کام کیا اس کے انڈر میں پیچھے آنکھی بگڑا۔ ہم بولا ہمارے کو دیکھتا بی نئیں۔۔۔۔۔ بولا آیا اب تم کوئی اور کام کرو۔ ہم بولا ڈاکٹر کیسا کام کرتا۔۔۔ بولا نرس کا کام ہوتا۔۔۔ بے بی کا نرس۔۔۔ ہم بولا کوئی بات نئیں جرور سے کرتا۔ بولا لیو یہ بے بی۔۔۔ جوڈیتھ ہوا تا۔۔۔ ہسپتال میں دو روج لیبر ہوا۔۔۔ ایسا۔۔۔ ایسا بالکل لکڑی کے مافک ٹیڑھا ہے بی۔'' آیا اپنے چپکے ہوئے پیٹ پر آڑے بچے کا نقشہ کھینچنے لگی۔ ''اکھا واٹر کھلاس۔ ایک دم ڈسچارج!''

''اے ہے چپ رہ کم بخت بڑھیا۔۔۔ چلو باہر بیٹھو میں دوا پلا دوں گی۔'' دوا پلا کر ثمن نے ایلما کو کمبل اڑھا دیا اور وہ بخار سے بے ہوش ہو کر سو گئی۔

آٹھ دن ایلما موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار رہی۔ نویں روز بخار ٹوٹا، کمزوری دیر تک قابض رہی۔ دونوں نے بیتے ہوئے حادثے کا جان بوجھ کر ذکر نہ کیا حالانکہ سارے وقت انہیں احساس رہتا کہ وہ دونوں ایک ہی چیز کے متعلق سوچ رہی ہیں۔ ایلما نے اسے وجود میں لا کر پالا پوسا تھا، مگر ثمن کو بھی اس سے کچھ کم محبت نہ تھی۔ گزشتہ دسہرے کی چھٹیوں میں دونوں نے بڑے جوش و خروش سے مل کر اس کے لئے تعلیمی کھلونے خریدے تھے۔

''ہوں۔۔۔ آنٹی کہو۔'' ایلما اسے ڈانٹتی۔

''نہیں۔۔۔۔ چمن!'' وہ شرارت سے آنکھیں چمکاتا اور دور بھاگ جاتا۔ اس کے ہونٹوں سے ''چمن'' سن کر اسے رائے صاحب یاد آجاتے۔۔۔ وہ بھی تو ایسے ہی وجیہہ تھے اور شریر بھی۔۔۔ یہ چلبلے انسانوں سے خدا کو کیوں اتنا بیر ہے!

جب سے ماں بیٹے میں ملاپ ہوا تھا ایلما نے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ بیچ کی غلاظت کو بھول کر پودے کی سیوا میں مست تھی۔ اس کی ہزاروں تصویریں خود کھینچی اور کھنچوائی تھیں۔ جن کی اک کاپی ثمن کو ملی تھی۔۔۔ رہ رہ کر بھی وہ اس کی پرورش میں حصہ لے رہی تھی۔ جہاں کوئی مفید کتاب یا کھلونا نظر آجاتا فوراً خرید کر پارسل کر دیتی۔ خاص اس کی خاطر بچوں کی نفسیات پر کتابیں پڑھیں۔ دونوں گھنٹوں بیٹھی اسے دلچسپ پہیلی کی

طرح بوجھنے کی کوشش کر کے لطف اندوز ہوتیں۔ اور جب تک اس کھلونے کو مٹا دینے کی کوشش کی، بال بھی بیکا نہ ہوا۔ لیکن جونہی اس نے چاہنا شروع کیا اس کی مامتا کا خون کرنے کے لئے وہ روٹھ گیا۔ بخار اترا تو ایلما کی وحشت بھی کچھ دب گئی۔ رولف کی زندگی سے ناامید ہو کر اس نے ثمن کو پکارا تھا۔ اسی نے تو رولف سے ملایا تھا۔ سمجھی تھی کہ وہ اسے موت کے چنگل سے بھی چھین لے گی۔ کہتے ہیں ناجائز بچے بڑے سخت جان ہوتے ہیں تو رولف کیوں ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور گم ہو گیا۔ کوئی دوسری ماں ہوتی تو تسلی دی جاتی کہ صبر کرو خدا اور دے گا مگر ناجائز بچے کی ماں کے لئے تو گالی ہوئی۔

''ایلما شادی کر ڈالو۔'' ثمن نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہنہ، نئے رولف پیدا کرنے کے لئے۔۔۔ تم کیا جانو۔۔۔ اپنے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر یوں پھینک دینا مذاق نہیں۔ اوہ ثمن وہ دکھ جو اسے جنم دینے میں میں نے سہا آج اس کی موت سے دس گنا ہو گیا۔ اف وہ موت سے بڑھ کر دم گھونٹنے والا دکھ۔''

''شاید تمھارا دکھ اس لئے بہت معلوم ہوا کہ تمھاری پوزیشن اور ماؤں سے مختلف تھی۔ اگر کسی کا بچہ محبت بھری نگرانی میں جنم لے تو شاید اتنا دشوار نہ ہو۔''

''ہو سکتا ہے، ممکن ہے ایسا وقت آوے اور میں اتنا نہ ڈروں۔ یہاں ایک پروفیسر میرے پیچھے بہت دن سے پڑے ہیں۔ انہیں رولف کا حال معلوم ہے، بے چارے اسے بہت پیار کرتے تھے اور بڑے روشن خیال ہیں ویسے میں ایسی بزدل نہیں جو طعنہ نہ سہار سکوں اور نہ ہی اب مجھے رولف کی ماں بننے میں شرم آتی تھی۔۔۔'' وہ پھر خاموش ہو گئی۔

''تو پھر کیوں شادی نہیں کرتیں۔''

''اس لئے کہ مجھے ڈر تھا کہ میں رولف کے ساتھ پھر ناانصافی نہ کرنے لگوں۔ ماں بن کر میں نے ڈائن کے سے سلوک کئے، مگر بقول تمھارے اپنے کو بھول کر، اب دوبارہ میں یہ بھول نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ میں نے پھر بھی اسے اتنا دیا جتنا اس کا حق تھا۔''

ایلما سے رخصت ہو کر وہ سیدھی گھر روانہ ہو گئی۔ اتنے دن دور رہنے کی وجہ سے وہ بالکل غیر ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی آنے والے مہمانوں کی طرح اس کی بھی آؤ بھگت کی جاتی مگر کوئی خاص جگہ اس کی مقرر نہ تھی۔ یہ دو مہینے کی چھٹیاں وہ اٹھنے بیٹھنے کے کمرے میں گزار دیتی۔ وہ جو گھر کی سہولتیں ہوتی ہیں وہ نہ مل سکتیں۔ اپنے حسابوں تو وہ بیاہی جا چکی تھی۔

یہ کمرہ بھی بالکل ڈینگ روم معلوم ہوتا۔ اس کی چیزیں عجائب روزگار سمجھ کر دیکھی جاتیں اور بالکل شارع عام پر رہنے کا لطف آجاتا۔ ہزار بندشوں کے بعد بھی وہ خلوت نہ نصیب ہوتی جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ لوگ بھی اسے عارضی رکاوٹ سمجھ کر اپنے دلوں پر جبر کرتے اور اپنی عادتوں کی لگامیں روکنے کی کوشش کرتے۔ اس کا وجود بار بھی گزرتا تو بالکل مہمان سمجھ کر برداشت کر لیتے۔ قدرتی طور پر اس کا کمرہ گھر بھر میں سب سے غنیمت ہوتا لہٰذا بچوں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کی ساری دلچسپی اسی طرف مبذول رہتی۔ کوئی مہمان آتا تو اسی کے کمرے میں مہمان نوازی کی جاتی، اسی کے پیڈ لفافوں اور قلم سے گھر بھر کی حاجتیں پوری کی جاتیں۔ دنیا اتنی ترقی کر گئی تھی مگر اس کے گھر میں وہی افرا تفری مچی تھی۔ قسمت سے سب بھاوجیں بھی ایسے ہی گھرانوں کی تھیں جہاں کھانے کی میز پر بچوں کے پوتڑے سکھائے جاتے ہیں اور کھانا باورچی خانے میں اکڑوں بیٹھ کر کھایا جاتا ہے۔ غسل خانوں میں اناج کے مٹکے رکھے جاتے ہیں اور الگنی پر پردہ ڈال کر غسل کئے جاتے ہیں۔ نشست و برخاست کا کمرہ اس کی غیر موجودگی میں ٹوٹی چارپائیوں، ردی کرسیوں، بے کار مونڈھوں اور ڈگمگاتے اسٹول رکھنے کے کام آتا۔ الماریوں میں چینی کے برتن اور چاندنیاں وغیرہ بھی یہیں رکھی جاتیں۔ جب وہ آتی تو جھاڑ پونچھ کر دو چار تخت کرسیاں بیٹھنے کے قابل بنا لیتی۔

جب سے باوا کی پنشن ہو گئی تھی گھر کی ہر چیز صرف استعمال کے لئے رہ گئی تھی۔ جونہی بے کار ہو جاتی کوئی مرمت نہ کراتا اور لاوارث بنا کر کوڑے میں جمع کر دی جاتی۔ ان پنشن یافتہ چیزوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ ساجھے کا گھر کوڑا خانہ بنا ہوا تھا، ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اسے ہندوستان کی عام حالت کا اندازہ ہونے لگا۔ جیسے سرکاری راج میں دفتروں میں چارپائیاں ڈالے افسر گپیں مارا کرتے ہیں۔ میزوں پر دہی بڑے کی چاٹ، پکوڑیاں اور چائے کے خوان لگتے ہیں، سالن اور گھی کے دھبے لگے اوٹ پٹانگ رجسٹر، سوکھی ہوئی دواتیں، الٹے نب، مڑے ہوئے ہولڈر جن سے لکھنے سے زیادہ ازار بند ڈالنے کی خدمت لی جاتی ہے۔

ادھر جرمنی نے دنیا کو خون سے نہلا کر پوتر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پولینڈ کا بٹوارہ تو ہو گیا۔ رہ گئی باقی کی دنیا تو کتنے دن کی ہے۔ یہ مثلث بھی پرکار کے ایک چکر میں سواستکا بنا جاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ ملاقاتیں کرتے رہ جائیں گے۔ ہندوستان ٹوٹے یا سالم رہے، بات ہی کیا ہے۔ اس سالم دنیا میں کیا کم پھوٹ ہے، کبھی تو جی چاہتا کوئی بڑی سی موگری لے کر اس کے ٹکوں کے پرخچے اڑا دے اور اس کے بھی ایسے ہی ذرے بکھر جائیں جیسے برطانی جزائر اور جاپان کے۔

خود اس کے گھر کو ایک زبردست چوٹ کی ضرورت تھی۔ یہ ایک انوکھا خاندان تھا جہاں کھانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی اور کمانے والے تھک کر بوڑھے ہوتے جا رہے تھے۔ سامان روز بروز ڈھیلا اور بے کار ہوتا جا رہا تھا۔ سیڑھیاں خطرناک حد تک ٹوٹ چکی تھیں اور سیمنٹ جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ کاش اس کھنڈر کے کاہل باسیوں کو کوئی سانحہ گھسیٹ کر لق و دق صحرا میں لے جا پٹختا جہاں اس گھر کی اندھیری پناہ سے آزاد ہو کر وہ اپنے ہاتھوں سے نئی پناہ گاہیں بنانے پر مجبور ہو جاتے۔ ہر چیز کو تخریب کی ضرورت تھی۔

جرمنی نے لندن پر آگ برسانی شروع کر دی۔ جن بھوکوں کا خون نچوڑ کر یہ شاندار شہر سجایا گیا تھا ان کے جلے ہوئے دلوں میں مسرت کی لہر آگ کے شعلوں کی طرح دوڑ گئی۔ آہا کیا مزہ آ رہا ہوگا۔ یہ جو پربت جیسی اونچی اور جنت جیسی حسین عمارتیں نظر آتی ہیں، بھوسے کی گٹھڑیوں کی طرح بکھر جائیں گی، نازک اندام میمیں اور پھول جیسے بابا لوگ قصائی کی دکان سے پھینکا ہوا ملغوبہ بن جائیں گے، جنہیں کتے بھنبھوڑیں گے اور گدھ نوچیں گے، آسمان سے خدا کا قہر برسے گا اور زمین لاوا اگلے گی۔ بڑی بڑی سڑکیں ریگستان اور ہوٹل

کھنڈر بن جائیں گے۔ ۱۸۵۷ء کا خون چھلکے گا اور یہ سیاہ خون اندھیرا بن کر چھا جائے گا۔

ہٹلر بھی تو آرین ہے! وہی آرین جنہوں نے ہندوستان بنایا۔ اب پھر وہی آرین یہاں آئیں گے۔ جیسے ہنومان جی دم میں آگ لگا کر لنکا کو پھونکنے گئے تھے، اسی طرح یہاں بھی آگ برسے گی جس میں سارے راکشس بھسم ہو جائیں گے، اور دیوتا سونے کی مورتیوں کی طرح تپائے ہوئے نکل آئیں گے۔ پھر ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالیں گے، ہندو مسجدوں کو پوجیں گے اور مسلمان مندروں کو سجدہ کریں گے۔ دو بھائی گلے مل کر جی کا غبار نکالیں گے۔

اس بمباری سے گھبرانا کیسا؟ قحط اور بیماریوں کے ساتھ مفلسی اور لاچاری کی مار سہے ہوئے کیڑوں کے سامنے ان بلاؤں کی کیا حقیقت ہے۔ آئے دن موذیوں ہی سے اتنے کچل کر خاک راہ میں گم ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ راکھ مردہ نہیں بگولے بن بن کر ایک بے قرار روح کی طرح برسوں رقصاں رہے گی اور دنیا کی آنکھ میں کھٹکے جائے گی۔ کتنی بار ہندوستان کا مثلث فتح ہوا لیکن اس کے دکھے ہوئے مفلس دل کسی کے نہ ہو سکے۔ یہ دل ان جی حضوریوں کے سینے میں نہیں جو حاکموں کے دربار میں ان کی اترن پہنے بجا نب روزگار بنے بیٹھے ہیں، یہ دل ان سڑی بسی جھونپڑیوں میں ہیں جو آریوں کے راج میں بلکتی رہیں، مغلوں کی حکومت میں بھی رویا کیں اور اب بھی ان میں ان گنت سوراخ ہیں۔ ان چھلنیوں میں کوئی جھال نہیں لگا سکا۔ یہ دل کیا متاثر ہوں گے کسی چوٹ سے جنہیں صدیوں کی "ٹھوکر خوری" نے بے حس چٹان بنا دیا ہے۔ اب تو انہیں یہ بھی فکر نہیں کہ ٹھوکر سلیم شاہی جوتی سے زیادہ لگتی ہے یا فرنگی بوٹ سے۔ دکھ کا اثر زائل ہو چکا ہے۔

سیاسی الجھنیں زندگی پر خاموش جنگ بن کر چھا گئیں مگر اس شدت سے نہیں کہ برسوں کی رچی ہوئی عصبی غنودگی سے جگا سکیں۔ جب مغرب ٹینکوں کی جھنکار اور توپوں کی گرج سے گونج اٹھا، ہندوستان نے اہنسا کا نرا نہ چھیل دیا۔ جی جانے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ کوئی گلہ پھاڑ پھاڑ کر جگائے اور سونے والے افیم کا انٹا نگل کر کروٹ بدل لیں!

اسکول کا میدان بھی سیاسی اکھاڑہ بن گیا۔ آپس میں بحث مباحثے ہوتے، پھر بیٹھ کر ایک دوسرے کو کوسا جاتا اور آنسو بہائے جاتے۔ ہندو لڑکیاں دل و جان سے اہنسا کی قائل، عیسائی الگ پریشان گویا اسلام اور ہندو دھرم کے ساتھ ساتھ اب ان کی صلیب کو بھی خطرے میں پڑنا آ گیا۔ اگر سرکار نے ساتھ نہ دیا اور یہ سفید راج اڑ گیا تو کیا ہوگا، صرف رنگ ہی کا تو فرق ہے، ورنہ یہ کالی پیلی سسٹر کتنی شستہ زبان میں بول لیتے ہیں۔ ہندوستانی کسی کو آتی کب ہے، خواہ تھیلیوں کی شکل کی ہوں مگر ہیں تو فراکیں، کالی بکری جیسی ٹانگوں میں پھنسے ہوئے نیلام کے جوتے ہیں، اونچی ایڑی موجود ہے۔ مانگیں ٹیڑھی اور ننگے ہوئے گھنگر مین میں مغربی فرق یہی ہے کہ اگر صاحب لوگ کو ہندوستان سے جانا پڑا تو پھر یہ بیرا لوگ اور آیا لوگ کیا کریں گی۔ بھلا کالا آدمی اتنی اونچی تنخواہ دے سکتا ہے؟ وہ تو باورچی خانے میں ہی پچھتر امار مرغ اور ڈنر نگل لیتا ہے اور بچے نانیاں دادیاں پال لیتی ہیں۔ دو چار رئیس ہیں سو وہ بھی ایسا اچھا ماحول کر نہیں دیتے۔ دوسرے جب یہ چلے جائیں گے تو نہ جانے کون آئے۔ پھر بیرے اور آیا کا فیشن

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

رہے نہ رہے، یہ چرخے کی بات اور بھی نیزھی کھیر ہے۔ کہتے ہیں گاندھی جی سب کو ایک ایک بکری اور چرخہ پکڑا کر کہہ دیں گے جاؤ سوت کاتو اور دودھ پیو۔ نہ ٹی، نہ چاکلیٹ اور نہ بسکٹ!

مسلمان لڑکیوں کو نہ بکری سے دلچسپی اور نہ چرخہ کاتنے کا شوق، ان کا تو پاکستان الگ بننے والا تھا۔ مع تاج محل، موتی مسجد اور لال قلعے کے ساری پاک دینار و پہلے چاند کے سائے میں مزے سے روزہ نماز میں غرق جنت کی طرف کھسکتی چلی جائے گی۔ کوئی دم میں حصہ بخرہ ہونے ہی والا تھا۔ پیتل کی ''پی'' تو ہر پان والے کی دکان پر بکنے ہی لگی تھی، بس خاموش بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔

مگر یہ کانگریس حصہ دینے میں بخل کر رہے ہیں۔ اگر پاکستان کی حرص میں سکھستان، مہاسکھستان بھی بن گئے تو چٹاخ سے بھارت ورش کے ٹکڑے ہو جائیں گے اور یہ ہمالیہ کے ماتھے پر لٹکا ہوا انکو نا جھومر موتی موتی ہو کر بکھر جائے گا اور پھر کہیں پاکستانی ادھر سے خان بھائیوں کے دعوت کر کے پھر محمود غزنوی جیسی چھیڑ خانیاں نہ شروع کر دیں۔

زمانہ تیزی سے ترقی کا پرچم لے کر آگے دوڑنے لگا۔ جلسوں میں نیا جوش پیدا ہو گیا۔ پروگرام بنے، پر جوش نظمیں پڑھی گئیں، کھانے اور شرابیں اڑیں۔ ترقی پسند اخبار، ترقی پسند انجمنیں، ترقی پسند مضمون نگار اور شاعر پیدا ہوئے اور پورے زور شور سے انقلاب ہونے لگا۔ آزاد زندگی اور آزاد محبت، آزاد موت اور آزادانہ پیدائش کے حقوق کی حمایت ہونے لگی۔ پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہیں اور نئے زاویے کھینچے گئے۔ ہر وہ انسان ترقی پسند بن گیا جس کے بال بے تکے اور آنکھیں وحشت انگیز ہوں، لباس ذرا انوکھا اور ملگجا ہو، ہاتھ میں اٹیچی کیس جس میں پھڑکتی ہوئی نظمیں اور سلگتے ہوئے افسانے، دہکتے ہوئے مضامین اور لطیف فوٹو، کچھ معصوم یادگاریں اور شیریں خطوط ہوں۔ بات کرتے میں کچھ کھو سا جائے، لڑکیوں سے انتہائی بے تکلفی، قدرے لاپروائی اور سختی سے بات کرے، چھوٹتے ہی پیار کا نام لینے لگے، بھولے سے زنانہ کپڑوں پر ہاتھ ڈال دے۔ پھر ان کو ایسے دیکھے گویا عمر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے، پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جھینپ جائے۔ ان کی ساخت اور اہمیت پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کرے۔ اس کے علاوہ ہر قابل ذکر لڑکی کا ذکر کرتے وقت اس کی جنسی کشش اور جسمانی ساخت پر روشنی ڈالے، اس کی لطیف جنبشوں پر نچھاور ہو چکا ہو، اس کے تمام گزشتہ سے پیوستہ عاشقوں کی تعداد، اس کے جائز و ناجائز تعلقات اور اس کے ادھورے اور سالم بچوں کی تفصیل جانتا ہو۔ تمام انقلابی روسی، فرانسیسی، امریکی ادیبوں کے نام اور ان کے تراجم ازبر ہوں۔ ان کے تراجم پیش کر کے ادب کی خدمت بھی کر چکا ہو۔ لازم ہے کہ وہ خود بھی فنکار ہو یعنی شاعر یا مضمون نگار ہو۔ نام کو جوڑ توڑ سے گھما پھرا کر لکھتا ہو۔ احساس کمتری جس نے نپولین اور ہٹلر جیسے مدبر پیدا کئے، بخوبی رکھتا ہو۔ ساتھ ساتھ لازمی طور پر دکھی ہو، بھوکا اور حساس ہو، دوستوں کے خرچ سے پیٹ بھر شراب اور نفیس کپڑے پہنتا ہو۔ ڈھٹائی سے میزبانی پر مجبور کرتا ہو اور ان حسابوں اشتراکی ہو کہ ''جو کچھ تمھارا وہ میرا اور جو کچھ میرا وہ تمھارا۔۔۔ نہیں!''

یہی نہیں بلکہ گاؤں کی لڑکیوں کے بھولپن اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مکاری کا بھی تجربہ رکھتا ہو۔ منی ہوئی عورت، جو توں میں مسلی ہوئی رنڈی کا طرف دار ہو، دولت مند شریف زادیوں کے جسم پر تھوکے مگر انہی رئیس زادیوں کے عشق میں ناکام رہ کر مجذوبیت کا درجہ پا چکا ہو، والدین کی ناسمجھی اور غلط طریقہ تعلیم کی وجہ سے کوئی ڈگری نہ حاصل کر سکا ہو۔ زندگی کی تلخیوں سے تنگ آ کر مفت کی پینے اور نالیوں میں گرنے کا عادی ہو چکا ہو۔

ایک اور شاخ بھی ترقی پسندوں کی ہو سکتی ہے۔ وہ بیچارے جو مجبوراً لمبی چوڑی جائدادوں کے مالک بنا دیئے گئے ہوں۔ تمام مقابلوں اور انتخابوں میں باوجود پکی سفارش کے ناکام رہ گئے ہوں، سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کریں، کیسے وقت کاٹیں، باپ دادا کے بنائے ہوئے محلوں میں جبراً رہنا پڑے، اعلیٰ قسم کا فرنیچر استعمال کرنا پڑے، بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری جلسوں میں شرکت لازمی ہو، جس کے لئے دیش کے لباس کو چھوڑ کر مغربی درزیوں کے ہاتھ کا سلا ہوا سوٹ پہننا پڑے۔ وقتاً فوقتاً عالیشان ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اٹلی کی چائے کے سیٹ میں چائے پی کر انتہائی انقلابی ادب سے ادیبوں اور شعراء کی پرورش کرتا ہو، ان کی ضیافت کر کے ان کی بدحواسیوں سے لطف اٹھائے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں حسین لڑکیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے اور انقلاب کے برسنے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔

زندگی کی دوسری گاڑیوں کی طرح یہ انقلاب کا چھکڑا بھی اکیلے بیل سے نہیں گھستا۔ صنف نازک کا وجود لازمی ہے۔ کوئی آزاد خود مختار خاتون جو دنیا کی بکواس کا خیال نہ کرے۔ یہی وجہ تھی کہ ثمن پر ہر چہار طرف سے ترقی پسند برس پڑے۔ گو اس نے اب تک کوئی کارہائے نمایاں نہیں کئے تھے۔ پر نہ جانے کیوں اس کی قوم پرستی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے چیونٹیاں مٹھاس کی خوشبو سونگھ کر پہنچ جاتی ہیں، اسی طرح قومی جذبے کی مہک چھپائے نہیں چھپتی اور لوگ ڈھونڈ ہی لاتے ہیں۔ پہلے روز نواب زادہ صمد مع چند جوشیلے کارکنوں کے تشریف لائے۔ دیر تک لائے چائے کا بے تکلف دور چلا اور پر جوش مباحثے ہوئے۔ پھر چند روز بعد ہونے والے جلسے میں شرکت کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئے۔ نواب زادہ صمد نہایت جوشیلے اور سجیلے جوان تھے۔ بے چارے کو مجبوراً یہ غیر انقلابی لفظ اپنے نام کے ساتھ لگانا پڑتا تھا۔ ورنہ اپنے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں تو کامریڈ صمد ہی کہلاتے تھے۔ دوسرے کوئی انقلابی شاعر تھے جنہوں نے فرسودہ روش کو چھوڑ کر لیلیٰ مجنوں کے بجائے نرس، ڈاکٹرنی اور اسکول مسٹرس سے ناکام محبتیں کی تھیں اور بجائے گھوڑے اور شمشیر کے ریل اور موٹر کی شان میں قصیدہ خوانی کی تھی۔

تیسرے ایک پروفیسر تھے، جن کی تحریریں حکومت نے مخرب اخلاق قرار دی تھیں۔ وہ نہایت فخریہ بتاتے تھے کہ ان کے مضامین پڑھ کر لوگ لرز اٹھتے ہیں۔ عریانی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ عورت پر نظر ڈالتے ہی ان کے تخیل میں اس کے کپڑے دھواں بن کر غائب ہو جاتے ہیں اور نگاہیں سات پردوں کو چیر کر آر پار تیر جاتی ہیں۔ ثمن کو بھی یہ سن کر پھریری آ گئی اور اس کا جی چاہا کاش اس کے کپڑے ذرا موٹے اور مضبوط تاروں سے بنے ہوئے ہوتے۔

ایک انجینئر تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے بے چارے چھپ کر انقلاب لاتے تھے۔ جدی گاؤں کی آمدنی سے عاجز تھے۔ جب تک انگلستان میں رہے برابر وہاں کے قومی مظاہروں میں کھدر پہن کر

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اور جھنڈا لے کر نکلتے رہے۔ خاص طور پر وہ ہندوستان سے کھدر کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ لے گئے تھے جوان پر بے طرح جچتا تھا۔ گو جلوس لمبے ہوتے اور ان کی روح تک سردی کے مارے گنگ ہو جاتی مگر اس دن وہ بدیسی چمڑہ نہ پہنتے۔ واپسی پر ان کی لینڈ لیڈی گرم پانی کی بوتلیں اور چائے تیار رکھتی۔ وہ خود بے چاری ان انگریزوں کو گالیاں دیتی تھی جو بے چارے ہندوستانیوں کو ذرا سے سوراج کے لئے اتنی تکلیفیں دے رہے تھے۔ اسے ان لڑکوں سے خاص ہمدردی تھی جن کی بدولت اس کی تین لڑکیاں ماہ گیری سے نجات پا کر ہندوستانی رانیاں بن گئی تھیں۔ اسے کتنا ارمان تھا کہ ان کالے دامادوں کے کالے ملک میں جا کر ہاتھیوں پر سوار ہو کر اژدہوں اور ببر شیروں کا شکار کھیلے، سونے چاندی کی رکابیوں میں پلاؤ اور کباب کھائے اور کوٹھریوں میں بھرے ہوئے ہیرے جواہرات اپنے ہاتھوں سے چھوئے۔

جلسے کے دن کامریڈ صمد مع چند چیلوں کے آ کر اپنی موٹر میں اسے لے گئے۔ مجمع خاصہ تھا اور روداد دلچسپ، انقلابی عشق کی پرزور نظمیں پڑھی گئیں۔ ترقی پسند انقلابی شاعر نشے میں دھت ذہانت اور ذہکاری کا مجسمہ بنا چہک رہا تھا۔ نظم کا ایک ایک بند شعلہ بن کر لپک رہا تھا۔ زوردار مضامین پڑھے گئے۔ جن میں ظاہر کیا گیا کہ موجودہ ادبی عریانی قدیم عریاں نگاروں کو تحریر کے آگے صفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب باپ دادا اتنے ''گھبیر'' تھے تو کیا وجہ ہے کہ سپوت پیچھے رہ جائیں۔ اس ادبی ورثے کی قدر نہ کرنا حد سے زیادہ معقولیت کا ثبوت ہوتا۔ اگر کوڑھ بھی باپ دادا سے ورثہ میں ملے تو کلیجے سے لگا کر رکھنا چاہئے۔

ویسے تو کئی خواتین موجود تھیں مگر ان میں سے ایک قوم پرستی میں بلند مرتبہ رکھتی تھیں اور کئی قصائی ان کی ناک تراشنے کی فکر میں تھے، جس پر بجائے خوفزدہ ہونے کے انہیں اور فخر تھا۔ نواب زادے کی شمع محبت کا خاص شعلہ تھیں۔ کچھ سنائی نہ پڑا کہ انہوں نے کیا کہا۔ کیونکہ پورے ہال میں کھسر پھسر گونج رہی تھی۔ لوگ ان کے متعلق اڑی ہوئی افواہوں پر ناقدانہ مباحثے کرنے میں غرق تھے۔ ان کے بعد دوسری خاتون آئیں مگر یہ کچھ پھیکی سی رہیں۔ بے چاری اس شعلے کے سامنے صورت شکل کے لحاظ سے بھی مٹی کے تیل کی کپی معلوم ہو رہی تھیں۔ الجھے ہوئے پریشان بال اور بہکی بہکی نظریں، انتہائی چوٹ کھائی اور پٹی سی صورت، نہ جانے انہوں نے کیا کہا مگر مواد یقیناً انقلابی تھا۔ نہ وہ ہاں کی طرف دار تھیں اور نہ نہیں کی۔ ایک سرے سے انہوں نے ہر چیز کی مخالفت کی یہاں تک کہ خود اپنی مخالفت کی مخالفت کر دی۔ لوگ انہیں جھکی اور بدحواس کہتے تھے۔

جلسے کے بعد انجینئر صاحب اور کامریڈ صمد کی طرف سے پرتکلف ڈنر ملا۔ گھر واپس پہنچتے پہنچتے مس شمشاد کئی ہونٹوں پر شمن بن گئیں۔ کامریڈ صمد نے تو کئی مرتبہ اس طرح اس کے کان میں کچھ کہا کہ ان کے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے کان کی لو سے چھو گئے۔ انقلابی شاعر مع اپنے بدبودار کپڑوں اور عقاب جیسی بھوکی آنکھوں کے اس قریب تر آتا رہا۔

جلسے کی تھکن نے جلد ہی تھپک تھپک کر سلا دیا۔ مگر قریب ایک بجے اس کی آنکھ کسی نامعلوم کھٹکے سے خود بخود کھل گئی۔ چوروں سے اسے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اس وقت تو شاہوں کا بھی کلیجہ کانپ اٹھتا۔ ہمت کر کے اس نے زور سے پکارا کون؟ کوئی جواب نہ ملا۔ خاموش لیٹ کر بغور سننے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالنے

سے جسم بھی تن کر معلق سا ہو گیا۔ ایک ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا جیسے کوئی بھنگی ہولی روشن شیشے پر سرسرا رہی ہو۔

''شمن!'' ہوا سرگوشیاں کرتی ہوئی اس کے کان کے پاس رینگی۔ جیسے کسی کی جانی پہچانی سی آواز اسے پکار رہی ہو۔ مگر یہ آواز تو اسے بار بار دھوکے دے چکی تھی۔

''شمن!'' اس بار شبہ مٹ گیا، واقعی کوئی کھڑکی کے ادھر سے اسے پکار رہا تھا۔

''کون!''

''میں!۔۔۔ ڈرو نہیں میں ہوں افتخار۔ کھڑکی کھولو۔''

''ایں!'' شمن نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کھولی مگر اس کا وہم جسمانی صورت میں موجود تھا۔

''آپ؟''

''اندر آ سکتا ہوں۔''

''آیئے''۔ وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''مگر سوچ لو۔۔۔۔ میرے پیچھے خطرہ ہے۔''

''خطرہ!''

''جلدی بولو۔۔۔ کہ میں اور کہیں۔''

''آیئے اندر!'' اس نے جھلا کر کہا اور کھڑکی کے پٹ پھیلا دیئے۔

''پھر پچھتانا مت!'' اس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر رک کر کہا۔ مگر پھر اندر آ گیا۔

''کیا بات ہے؟'' شمن نے مضبوطی سے کھڑکی بند کر کے کہا۔

''ذرا سانس لینے دو۔'' وہ خاموش کوچ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ شمن ابا دہ اوڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''یہ کم بخت پھیپھڑے!'' اس نے کلیجہ بھینچ کر کہا۔ ''دو قدم نہیں چلنے دیتے بال بال بچا۔''

''کیا ہوا؟''

''وہی، وہی۔۔۔۔ اور کون اس بری طرح بھگانے کا شوقین ہے۔ زندگی ایک مسلسل دوڑ بن کر رہ گئی ہے۔''

''پولیس''

''ایں؟۔۔۔'' وہ چونکا مگر پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

''تمہیں میں نے آج تک نہیں بتایا۔۔۔ اور فائدہ بھی کیا۔۔۔ تم گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹرس ہو، تمہیں۔۔۔''

''میں ڈرتی نہیں ہوں کسی سے، نوکر ہوں غلام نہیں!''

''مگر۔۔۔''

''رہنے دیجئے، یہ بتایئے چھپا ئیں گے؟'' جواب میں افتخار نے اسے ایک بار دیکھا اور خاموشی سے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

جیب میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ شمن باورچی خانہ ٹٹولنے چلی گئی۔

"جانتی ہو یہ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے جلدی جلدی لقمے چباتے ہوئے کہا "روس کو کچلنے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں۔ یہ جیس کیوں کودا ہے؟ روس فن لینڈ سے دبک گیا تا۔۔۔ کم بخت یہ دانت نکلوانے پڑیں گے بے کار ہو گئے۔۔۔ یہ امپریلسٹ مل کر روس کو نگلنا چاہتے ہیں۔ اگر کہیں پانسہ پڑ گیا تو بس!" وہ تخیل میں بھیانک شکلیں دیکھ کر پھریریاں لینے لگا۔

"مگر جرمنی۔۔۔ جرمنی اتنا الو تو نہیں کہ ان کے گھسے میں آ جائے۔" اس نے جیسے خود کو سمجھایا۔

"مگر جیس؟ اس جیس کا کیا کریں گے؟" شمن خود اپنے بچوں جیسے سوال پر جھینپ گئی۔ "یہ سیاست ہے بھی تو عجیب کھیل، گھڑی میں بڑی بڑی اہم سرگرمیاں اور گھڑی میں بچوں جیسی شرارتیں۔"

"میں جا رہا ہوں۔۔۔ شمن۔۔۔ مجھے یاد رکھنے کی کوشش کرنا اگر بھول بھی جاؤ تو مجھے نہ بتانا۔ میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ نہ جانے کیوں میرا یقین ہے کہ تمھارے جانے سے جی رہا ہوں۔ نامرادیوں میں تمھارا ہی خیال سہارا دیتا رہا ہے۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے میں نے تمھاری ہی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔۔۔ اوہ یہ میں کیا بک رہا ہوں۔" اس نے نگاہیں زمین پر گڑو دیں۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"کئی سال کے لئے شاہی مہمانداری۔۔۔"

"مگر کس قصور میں۔"

"اخبار میں پڑھ لینا وہی پرانا کیس ہے۔۔۔ کانپور کی اسٹرائک کے بعد کا۔ چھوڑو ان ناگوار باتوں کو۔۔۔ میں ان لغویات سے تمہیں پریشان کرنے نہیں آیا بلکہ۔۔۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"جانے سے پہلے مضبوطی اور ہمت مانگنے آیا ہوں۔۔۔ دعا کرنا کہ کہیں بڑھیا راستے ہی میں نہ لیٹ جائے۔" شمن کا گلا گھٹنے لگا۔

"ذرا سی چھالیہ دو۔"

"اچھا تو میں جاؤں؟" مگر وہ کھڑا اپس و پیش میں ہاتھ ملتا رہا۔

"خدا حافظ!" وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف مڑا اور سست ہاتھوں سے پٹ دور کئے۔

"میں جا رہا ہوں۔۔۔ تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ۔۔۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے۔ اب میرا مرض خطرناک نہیں رہا۔۔۔ اب جراثیم۔۔۔" وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اور ایک دم کھڑکی میں سے غوطہ مار کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ شمن نے ایک جھلک اس کے تمتماتے ہوئے چہرے کی دیکھی۔ وہ آنسو روکنے کے لئے ہونٹ چبا رہا تھا اور اس کے نتھنے چوڑے ہو گئے تھے اور گردن کی رگیں شدت ضبط سے تنی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ خاموش کھڑی رہی، پھر پلنگ پر اوندھی گر کر گہری گہری سسکیاں لینے لگی۔

(38)

انقلابی جلسوں کی غیر انقلابی حرکتوں سے وہ جلد ہی عاجز آ گئی۔ دو چار جلسوں کی صدارت بھی کی اور نہایت جوش سے کام میں حصہ لیا۔ لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جاتا تو اس کا حصہ بس نام کا تھا۔ عام قاعدہ تھا کہ خواتین کے لئے منتظمین خود ہی تقریریں لکھتے، ریزولیوشن تجویز کرتے اور تمام کاغذات تیار کرتے اور یہ وہاں جا کر کٹھ پتلیوں کی طرح بتائی ہوئی لکیروں پر چلنے کی کوشش کرتیں۔ وہ بھی ایسے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے کہ عین وقت پر مددگار کو آ کر پنسل اور کھویا ہوا اشد ضروری پرچہ مہیا کرنا پڑتا۔ یہ عورت ذات بھی کس قدر غیر ذمہ دار جنس ہے۔ وہ لیکچر دینے کا وعدہ کر کے بالکل بھول جاتی۔ عین وقت پر لوگ اسے لینے بھاگتے اور یاد آتا کہ جو اسپیچ اسے تیار کرنے کو دی گئی تھی اس کا سرسری طور پر بھی مطالعہ نہیں کیا۔

"کیا بتاؤں بالکل بھول گئی۔" بڑی سے بڑی غلطی کرنے کے بعد مسکرا کر کہہ دیتی۔ یہ اس کا جنسی حق تھا جس کا استعمال نہ کرنا حماقت تھی۔ کتنا ہی ضروری مرحلہ ہو ان کا رویہ نہیں بدلے گا۔ بس یہ سمجھیں گی باوا جی کا گھر ہے، مزے سے بیٹھی ہیں، کھانا دیر میں پھیکا سیٹھا ہے باورچن کا قصور، گھر میلا ہو نوکروں کا قصور، کپڑے گندے ہوں دھوبی کا قصور، کسی بات میں بھی تو ان کا اپنا قصور نہیں۔ رنڈی بن جائیں سماج کا قصور، دھوکہ کھا جائیں نسوانیت اور بھولپن کا قصور، لٹ جائیں، چوری چلی جائیں، بھگائی جائیں، لونڈی بنا کر بیچ دی جائیں، سب ظالموں کا قصور۔ کئی اصحاب نے اس کے نام سے مضامین اور نظمیں لکھ چھپوائیں۔ کتابیں چھپوانے پر تیار ہو گئے مگر اس خشک تحفے کی طرف اس نے اتنی بھی توجہ نہ دی جتنی چاندی کے بندے پا کر ان کی چمک پر ہوتی۔ نئے زمانے کی نئی الجھنوں نے لوگوں کے پاس چھوڑا ہی کیا ہے سوائے حساس دلوں اور بے چین دماغوں کے، پہلے لوگ ساڑھیاں، بندے، جھومر، ٹیکہ تحفے میں دیا کرتے تھے۔ اب اشعار، مضامین اور افسانے حاضر ہیں دولت سے مطلب، سودا پٹانے کے لئے کچھ تو چاہئے۔ کبھی ان سب پر ترس آ جاتا۔ وہ بھی تو انسان تھے، جوان تھے، خواب دیکھنا جانتے تھے قصور یہ تھا کہ بٹوارے کے وقت ان کے حصہ میں احساس زیادہ اور نعمتیں کم پڑی تھیں۔ اگر امیر پیسے کے زور سے دس عورتیں رکھ سکتا ہے تو قلم والا قلم کو کیوں زنگ لگائے۔ قلم بھی تو ویسے شمشیر کا توام بھائی ہے۔ وہ کیوں نہ ملک گیری کرے؟

چھٹی کا دن تھا اور فرصت تھی۔ ویسے ہیڈ مسٹرس کو کام کرنے کی ضرورت نہیں، اس میں تو تھانے داری کا ہونا چاہئے۔ اگر وہ چار استانیوں سے گھما پھرا کر آٹھ کا کام لے سکے تو وہ صحیح معنوں میں محکمہ تعلیم کی بہی خواہ ہے۔ مختلف تیوریاں چڑھا کر الو بنا کر زیادہ سے زیادہ بے گار لینا، وقت مقررہ کے بعد بھی کام کرانا اور پھر بھی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

استانیوں میں انتہائی درجہ کا احساس کمتری پیدا کر دیتا کہ انہیں اپنے دماغ اور قوت متخیلہ پر بھی بھروسہ نہ رہے اور بالکل ہی چپ کر رہ جائیں مگر اف نہ کریں۔ سارے الزامات ان کے سر تھوپنا اور سرخروئی اپنے لئے رکھ لینا۔ بدانتظامی، جنگلی لڑکیوں اور نالائق استانیوں کے حصے میں قبرستان جیسی خاموشی اور سرکس کے جانوروں جیسی سدھائی ہوئی طالبات ہیڈ مسٹرس کی محنت اور جانفشانی کا نتیجہ!

چپڑاسی نے آکر اطلاع دی کہ کوئی عورت ملنا چاہتی ہے۔ کہلوا دیا نہیں مل سکتی۔ ان عورتوں کی آمد بھی کئی قسم کی آفتیں لاتی ہے۔ کہیں دشمن کی جاسوس تو نہیں کہ جا کر لگائی بجھائی کر دیں۔ کسی لڑکی کی ماں یا بہن ہوئی تو یا تو فیس معاف کروائے گی یا زبردستی درجہ چڑھانے کو کہے گی۔ نہ جانے یہ جاہل مائیں درجوں کو بانس کی سیڑھیاں کیوں سمجھتی ہیں جنہیں پار کرانا ہیڈ مسٹرس کا کام ہے۔ جہاں سالانہ امتحانات شروع ہوئے اور کمزور اور بدشوق لڑکیوں کی ماؤں کو ہیڈ مسٹرس کی محبت چرائی۔ مٹھائیاں چلی آرہی ہیں، تحفے نازل ہو رہے ہیں، ہاتھ پیر جوڑے جا رہے ہیں۔ اگر نہیں مانتیں تو دھمکیاں اور گالیاں بھی موجود ہیں۔

چپڑاسی نے آکر کہا کہ عجیب ٹیڑھے قسم کی عورت ہے، نہیں مانتی۔ ساتھ ساتھ وہ خود ہی آ گئی مجبوراً ملنا پڑا۔ برقعہ اتار کر گھر کی طرح ہو بیٹھی۔

''آپ مس گپتا ہیں؟'' چھوٹتے ہی سوال کیا۔

''نہیں!''

''نہیں تو شاید مسز نورانی!''

''جی نہیں!'' ذرا سختی سے کہا گیا۔

''کامنی دیوی؟''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں۔۔۔''

''تو آپ یقیناً زہرہ ہوں گی۔۔۔ کیوں؟''

''جی۔۔۔ نہیں! مطلب کیا ہے آپ کا؟'' جل کر کہا۔

''یا اللہ تو پھر آپ کون ہیں؟''

''آپ کی بلا سے آپ کو کچھ کہنا ہو تو۔۔۔''

''اری بہنو کہنا تو بہتیرا ہے پر یہ بھی تو معلوم ہو کہ کون سی ہو۔۔۔ چہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ آپ۔۔۔ اوں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہی۔۔۔ اے وہ کیا بھلا سا نام ہے اللہ مارا۔۔۔ چہ۔۔۔ ہاں تسنیم۔۔۔ تسنیم۔۔۔ خدائی مارا اس یاد پر۔''

''جی نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔۔۔''

''نہیں بی۔ ایک بھی یا غلط فہمی۔ اس حلقہ میں تو۔۔۔ یہی نام ہیں۔ اچھا جانے دو یہ بتاؤ کوئی کن تو نہیں رہا ہے۔''

''جی نہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے جلدی کہئے اور براہ کرم تشریف لے جائیے۔''

''ہاں ہاں گھبراؤ مت تشریف بھی لے ہی جاؤں گی مگر۔۔۔ خیر جو کچھ بھی ہو تمھارا نام خاک پڑے مجھے کیا، تم اسے تو جانتی ہوگی افتخار احمد کو۔''

''ایں؟'' شمن سمجھ گئی سی آئی ڈی سے پالا پڑا مگر وہ بچہ نہ تھی۔

''مکرنا مت۔ تمھیں قرآن پاک کی قسم۔۔۔ پاک پنجتن کا واسطہ۔۔۔ دیکھو بہن خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔۔۔ اپنے پیاروں کی قسم!''

''کیا مطلب ہے تمھارا۔۔۔ فوراً چلی جاؤ ورنہ۔۔۔''

''بیوی مجھے ان گیدڑ بھبکیوں سے تو دھمکاؤ مت، تم سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے اور بھگتا بھی ہے، جوان جلے نصیبوں میں لکھا تھا پھر کیا فائدہ۔ یہ بتاؤ اس نے تمھیں ماں بنایا تھا یا بہن یا معشوقہ!''

''تم دیوانی معلوم ہوتی ہو۔۔۔ جاتی ہو کہ پھر۔۔۔''

''اندازہ سے تو یہی معلوم پڑتا ہے کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ بہن خوبصورت نہیں غنیمت ہو۔''

''تم نہیں جاؤ گی؟''

''جاؤں گی کیوں نہیں پر اپنی کہہ کر اور تمھاری سن کر۔۔۔ تو میرے خیال میں معشوقہ ہی ہوگی۔۔۔ ڈھنگ بھی بتاتے ہیں۔ اللہ رکھے شرم آ گئی!'' وہ طنز سے مسکرائی۔

''تمھیں ان باتوں سے کیا واسطہ؟''

''کچھ بھی نہیں مجھ اجڑی کو کیا واسطہ ہوتا۔۔۔ بس یہی کہ میں اس بدذات کی بیوی ہوں۔''

''تم۔۔۔ تم!''

''ہاں میں یقین نہ آئے تو لو یہ سرٹیفکیٹ دیکھ لو۔۔۔ میں جانتی تھی کہ تم یہی کہو گی جھوٹ، تو لو یہ۔۔۔ حسین بی زوجہ افتخار احمد۔۔۔ قوم سید۔۔۔''

''تم کیا چاہتی ہو؟'' آنکھیں جھک گئیں۔

''یوں کہو۔۔۔ ہاں تو بن بیاہی ہو یا ماشاءاللہ۔۔۔''

''تم اپنی کہو۔۔۔ کیا کہنا ہے۔''

''تو ماشاءاللہ کنواری ہو۔ منہ سے تو یہی لگتا ہے۔ غیب کا حال اللہ جانے۔ آج کل کنواری بیاہی میں اللہ مارا فرق ہی کیا رہ گیا ہے۔۔۔''

''تو اس بندے نے اپنا مطلب بیان کرو۔''

''تو بہن مطلب یہ کہ تمھیں ان کے دل میں جب سے جب تک یا دھاتی یا جو تجھ کئیں۔ برا نہ ماننا اگر منہ سے کوئی بات نکل جائے تو۔۔۔ پوچھو تو میں اسے بھگت رہی ہوں۔ ایک گھڑی بھی سکھ چین کی نہ ہو تو برداشت کی مار۔۔۔ پیار نصیب نہ ہو۔ تین بچے ہیں۔ تیرے میرے گھر اتنی عمر

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

گزاری۔۔۔ باپ کے حقے بھرے، بھتیجوں کے گوموت کئے، بھاوجوں کی پھٹکاریں سہیں۔ اللہ نے جیسا کچھ بھی ڈالا بھگتا۔۔۔ پر اب بھنو میری۔۔۔" شمن کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کی ہچکیوں نے آئے حواس غائب کر دیے

"میں ہار گئی، پر تم ماشاءاللہ پڑھی لکھیاں اسے بھگت رہی ہو۔ تمھارا اس میں قصور نہیں وہ ہے ہی ایسا۔ خدا کی پھٹکار اس پر، صورت نہ شکل، اللہ جانے یہ عورتیں اس پر کیوں لٹو ہوئی جاتی ہیں۔ اے اور تو اور بوڑھی دھڈو کوئی بیٹا بنا کر کلیجے سے لگائے لیتی ہے، کسی کا بیرن بنا ہوا ہے۔ سنتی ہوں کہیں نکاح بھی کر رہا تھا۔"

"تم یہ کس افتخار کا ذکر کر رہی ہو؟"

"ایسا دیوانہ نہ سمجھو، میں خوب سمجھتی ہوں، کالج میں پڑھتا تھا تمھارے سنگ۔۔۔ شمشاد ہے نا تمھارا نام۔۔۔ خوب یاد آیا۔۔۔ فوٹو بھی ہے اس کے پاس اور۔۔۔ تم جھوٹ نہ سمجھو میں پکا ثبوت دے دوں گی۔ پہلے سن لو۔ یہ جو خواب۔۔۔ ہیں یا ان کی بیوی کا بھائی بنا ہوا ہے اور میں نخی نادان نہیں کہ ان بہنوں اور اماؤں کے چھل بے نہ پہچانوں۔ اللہ ماریاں اماں بہنیا کے رشتے کو شرماتی ہیں۔ ارے کام کرو تو کھلے بندوں کرو جب جانیں۔۔۔"

"خیر... آپ کیا چاہتی ہیں۔"

"یہ بتائیے آپ اسے روپیہ دیتی رہی ہیں؟"

"نہیں!"

"جھوٹ نہ بولو۔۔۔ میرے پاس آپ کے خط موجود ہیں جن میں حوالے دیے گئے ہیں۔ یہی نہیں بہن معاف کرنا، آپ نے اس کے لئے بیٹھ کر سوئٹر بنے ہیں، ہاتھ جلا جلا کر حلوے تیار کئے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔"

"میرے خط دکھا سکتی ہو۔۔۔"

"پہچان تو نہیں مگر آپ کے شہر کی مہر سے شاید۔۔۔" وہ مداری کی طرح تھیلے میں کچھ ڈھونڈنے لگی اور خطوں کے بنڈل نکال کر گود میں رکھ لئے۔۔۔

"میں۔۔۔ آپ چھیننے کی کوشش نہ کرنا۔۔۔" اس نے بے اعتباری سے ایک طرف مڑ کر کہا۔ اور شمن شرم سے پانی پانی ہوئی۔ کیونکہ ایک ثانیے کو اس کے دل میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کیوں نہ جھپٹا مار کر ظالم سے اپنی بے وقوفیاں چھین لے اور۔۔۔

"یہ۔۔۔ نیلے لفافوں میں۔۔۔ آپ خود دیکھ لیجئے۔" شمن نے کپکپاتی انگلیوں سے لفافہ لے لیا۔ کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی حقیقت ننگی ہو کر ناچ رہی تھی۔

"خاطر جمع رکھو۔۔۔ میں نے کوئی خط نہیں پڑھا۔ میرے بھیجے میں کہاں اتنا بوتا کہ چھیلے کے محبت نامے پڑھوں اور نبو شروع شروع میں چرائے بھی، پڑھے بھی، جلائے بھی، پر اب تو سب چیزوں پر خاک

ڈال دی۔۔۔ اے لکھن والیاں نہ تھکیں پر میں تو ہار گئی۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" شمن نے بھیگی بلی کی سی میاؤں کی۔

"اری بہنیا میں کیا چاہوں گی۔ تم خود سوچ لو۔" پلنگ پر پالتی مار کر کہا۔

"یہ دیکھو کہ نکھٹو کو تو آنکھ کا تارا بنا کر رکھا ہے اور مجھ دکھیاری کو لوگ گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ چلو چلو بہنی کی بھیک مانگ رہی ہو۔" "لو بھئی جیسے ہمیں شوق ہی تو ہے در در ٹھوکریں کھانے کا، لوگوں کے آگے ہاتھ پسارنے کا، کبھی ہمارا بھی زمانہ تھا۔ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا، سسر کی آنکھیں بند ہوئی تھیں، کوڑی کوڑی پھونک دی اور یہ کنگال بیٹا میکے میں بیٹھ، خود نکل کھڑا ہوا۔ ویسے بچے والا نے برس کے برس پہنچ جائے۔ ابھی کئے مہینے تمھارے پاس آیا تھا۔ رات گئے میں نے اسٹیشن پر پکڑا اور وہ ویٹنگ روم میں سے ہوا ہو گیا۔ پر میں بھلا چھوڑنے والی تھی۔ پھاٹک کے پاس چھپ گئی۔ جیسے ہی باہر نکلا میں ساتھ چلی کہ پتہ لگاؤں اس کے ٹھکانوں کا جب وہ تمھاری کھڑکی میں کودا تو میں سنگ تھی وہ تو میں اسی وقت جاتی پر فائدہ کیا تھا، دوسرے سنا ہے یار کے ساتھ مل کے عورتیں کام تمام کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ وہ تو خاک بچ جاتے، اس کا بس نہیں جو گلا گھونٹ دے خود۔ مگر بہن جب تک میں نے تمھیں دیکھا نہیں تھا۔ پر اب معلوم ہوا اگر اندازہ غلط نہیں تو شریف گھرانے کی بیٹی معلوم ہوتی ہو۔ آنکھوں میں شرم ہے۔" شمن کا جی چاہا کاش وہ اندھی ہوتی اور کان بھی پھوٹے ہوئے ہوتے!

"تم کیا جانو اس کے کتنے سلسلے چلتے ہیں۔ زمانے بھر کی عورتوں نے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ حکومت کو الگ تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ یہ جو بھوانی گیا تھا، یہ بھی کوئی چال تھی۔ میں تو خوش ہوئی تھی کہ اللہ مارا اب تو مرے گا۔ بلا سے رانڈ ہو جاؤں تو خیرات کی تو حقدار ہو جاؤں۔ بچوں کا پیٹ تو پلے۔"

"آپ فرمائیے بھی کچھ۔۔۔" شمن نے سہمی ہوئی آواز نکالی۔

"یا اللہ اتنا جو فرمایا کچھ بھی نہیں۔ ماشاءاللہ کتنے دن باپ کو بھرا تھوڑا بہت بچوں کا حق بھی سمجھ لو۔ اگر نہیں تو تمھاری مرضی۔ تم سے مل لی جی خوش ہو گیا۔ شریف ہو شرافت کو ہاتھ سے نہ دو گی۔ یہ نہیں کہ سپوڈنٹ صاحب کی بیوی کی طرح لگیں نخرے ڈبے دکھانے۔ میں نے کہا ہوش میں رہ کر بات کرو بیگم، کس بہلاوے میں ہو، پرائے مرد سے آنکھ لگاتے شرم نہیں آتی۔ اپنا چھ ہاتھ کا اچھا بھلا چھوڑ کر اس قبر بجو پر جی دے بیٹھیں۔ پھر اوپر سے انھو تو بندی بھی ایسی ویسی نہیں، صاف کہہ دیا کہ خطوں کا بنڈل جاتا ہے سپوڈنٹ کے پاس کہ میاں دوسروں کے ہتھکڑیاں جڑواتے پھرتے ہو، گھر میں کیا مزے سے خود اپنی عزت پر ڈاکہ ڈلوا رہے ہو۔ آستین میں سانپ پال رہے ہو۔ بس نکل گئی ساری ہیکڑی۔ جھٹ ہاتھ کے کڑے اتار کر دینے لگیں۔ میں نے کہا بیوی ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ ایسا بھی کیا کڑے لے جاؤں جو کل کو خصم سے کہہ کر جیل میں دھروا دو تو کیسی ہو۔۔۔ ذرا پانی منگوا دو۔۔۔ خدا کی پھٹکار حلق بھی تو سوکھ گیا۔" شمن نے پانی انڈیل کر برف ڈالی اور پیش کیا۔

"جگ جگ جیو بہن دکھیاری کی خاطر داری کا اجر ملے گا۔"

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"یہ میری بینک کی کتاب ہے، یہ بندے اور چوڑیاں۔۔۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی آپ کو نظر آ رہا ہے۔۔۔ آپ کو جو کچھ چاہئے لے جایئے۔" دیر تک حسین بی بیٹھی کتاب کے ورق الٹا کیں۔

"کچھ تم نے جمع ہی نہیں کیا۔"

"ہوں" وہ سوچنے لگی۔ "مگر میں تو کل جا رہی ہوں۔"

"آج تو چھٹی کی وجہ سے پوسٹ آفس بند ہے۔" شمن نے سوکھی آواز سے کہا۔

"یہ بندے تو اچھی وضع کے ہیں، پہن لوں کان بوجے لگتے ہیں۔ چوڑیاں دلی کی بنی معلوم ہوتی ہیں، کیوں؟"

"ہاں" شمن نے جبراً کہا۔

"اچھی ہیں، قدسیہ کے لئے ایسی ہی بنواؤں گی۔ بن باپ کی بچی ہے۔ پر دیکھ لینا جو کچھ بھی کمی رہ جائے۔ اسے تو وہ خدائی خوار بھی چاہے ہے۔ پار سال سو روپے دے گیا تھا۔ دے کیا جاتا میں نے اینٹھ لئے وہ زندگی اجیرن کی کہ اگلنا ہی پڑے۔ دو سویٹر بھی دیئے تھے کہ ادھیڑ کر بچوں کے بنا لے تو میں نے منے اور اسلم کے لئے بنا دیئے۔ اتنا سا اون بچ گیا خدا کی سنوار ان عورتوں پر کیا، دریا دلی سے اس بدنصیب کے لئے بنتی ہیں۔ اون بھی تو مہنگا ہے۔" شمن خاموش سنتی رہی۔

"اچھا بہن تو میں چلی۔۔۔ یہ لو اپنے خط پتر ان لو سنبھال کر۔"

"اور روپیہ"

"اب جانے بھی دو روپے، میرے آگے بھی کنواری بیٹی ہے، بیری کی طرح بڑھ رہی ہے۔ بیوی دنیا نہیں دیکھی تم نے، ایسا ہی ہے تو کچھ اوپر پڑا ہو تو دے دو۔" شمن نے بٹوہ جھاڑ کر ایک سو چالیس روپے گنا دیئے۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم بھی بیاہ کر ڈالو بنو۔ باپ دادا کا نام اچھالنے سے کیا فائدہ، یہ منہ پر مہاسے نکل رہے ہیں، سرسوں دودھ میں گھس کر لگا دو اللہ نے چاہا چنی کھلا نکل آئے گی۔۔۔ تو میں چلی۔۔۔"

دروازہ کھلا اور وہ تیز قدم مارتی نکل گئی۔۔۔ شمن مٹی کے ڈھیر کی طرح بے جان بیٹھی خطوں کے لاوارث بنڈل کو تکتی رہی۔ تو یہ تھی اس کے گلشن محبت کی عمر بھر کی کمائی۔

چپڑاسی نے آ کر بتایا کہ جلسے کی کار انتظار کر رہی ہے۔ اسے آج ایک ضروری لیکچر دینا تھا۔ "کہہ دو نہیں ہیں!"

اور واقعی اس وقت اس کی حقیقت "نہیں" سے بھی کم ہو رہی تھی۔

(39)

چونک کر اس نے دیکھا تو شام کی دھندلی سیاہی کمرے کو مختصر بناتی جا رہی تھی۔ دہشت زدہ ہو کر وہ پیچھے سمٹ گئی۔ یہ اتنی دیر وہ کہاں رہی؟ جب حسین بی اسے چھوڑ کر گئی تو خاصی دھوپ تھی۔ تو پھر یہ تین چار گھنٹے اس کے وجود نے کس طبقے میں ڈوب کر گزارے؟ احساسات کے ساتھ اس کا دماغ بھی سن ہو گیا تھا! نہ ہلی نہ جلی مگر دل دھڑکتا رہا، پھیپھڑے پھولتے پچکتے رہے، خون کا دوران قائم رہا۔ مگر خود نہ سوئی نہ جاگی، نہ ہی اتنی دیر کچھ سنا، دیکھا اور سوچا، نہ ہی کوئی خواب دیکھا، تو پھر کیا کرتی رہی؟

ضبط کے تناؤ سے جملہ حواس معدوم ہو کر کسی نامعلوم گہرائی میں غوطہ مار گئے اور اب وہاں سے آہستہ آہستہ ابھر رہے تھے، دفعتاً ان کی رفتار تیز ہوئی جیسے سطح کی کشش بڑھ گئی اور وہ اوپر کی طرف دوڑنے لگے۔ سڑک پر لالٹینیں جل اٹھیں، تانگے آگے پیچھے دوڑنے لگے، دور کہیں ریل کی سیٹی بھی گونجی، کنگر کوٹے کا انجن دن بھر کی جانفشانی کے بعد بھاری قدموں سے اڈے کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس کی پھولی ہوئی سانس دھونکنی کی طرح ہانپ رہی تھی۔ پاس کے قبضوں کی طرف جانے والی ٹھسا ٹھس لاریاں ہاتھیوں کی طرح جھومتی چلی جا رہی تھیں۔ نئے نئے سر اور نغمے کانوں میں لشتم پشتم گھسنے لگے اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ زمین کی سانسوں کو آج پہلی بار سن رہی ہے۔ اتنی دیر مردہ رہنے کے بعد کانوں کے پردے ان آوازوں سے ناآشنا ہو چکے تھے اور بالکل غیروں کی طرح پراگندہ ہو کر ہر نئی آواز پر چوٹ کھا کر چونک اٹھتے۔

تو دنیا موجود تھی! ویسی ہی جاندار کی گئی۔ صرف وہ گم ہو گئی تھی۔ اسے بڑا دکھ ہوا کہ اس کی غیر موجودگی سے کچھ بھی نظام درہم برہم نہ ہوا۔ مشین کے لکھوکھا پرزوں میں سے اگر ایک ننھا سا بے حقیقت پیچ تھوڑی دیر کو ڈھیلا ہو کر گر گیا تو سفر رک نہیں گیا۔ کچھ بھی تو نہ ہوا۔ جملہ عناصر کی موجودگی میں صرف اس کی خاطر یہ کاروان حیات سست پڑ جاتا۔ روزمرہ کا بھیانک انجن تو اسی طرح سیٹی بجاتا پٹریاں بدلتا دندناتا رہا۔

وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ امتحان کے لئے دو چار قدم اٹھائے، ہاتھ پیر ہلا کر دیکھے، ہر ٹکڑا سالم تھا، پرزے چل رہے تھے، کلیں درست تھیں۔ کھوتے وقت تو پتہ نہ چلا کھٹ سے بجلی کا بٹن دب گیا ہوگا۔ مگر پاتے وقت وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، کس طرح اس کی بھٹکی ہوئی ہستی جھجکتی شرماتی واپس لوٹ رہی تھی۔ کسی نے کمرے میں روشنی بھی نہیں کی تھی۔ ادب کی وجہ سے کوئی اس کے کمرے میں آ بھی نہ سکتا تھا۔ اور جو اسی طرح وہ بالکل ہی کھو جاتی۔ تو یہ مؤدب خادم اسے ڈھونڈنے بھی نہ آتے اور شاید ڈھونڈتے بھی تو اتنی دیر سے کہ پانے کا وقت گزر چکا ہوتا۔ یہیں اس بستر پر وہ کھو جاتی۔ کیڑے مکوڑے اپنا حصہ بٹورنے آ پہنچتے۔

مارے دہشت کے وہ کانپنے لگی۔ جی چاہا اس گھٹے ہوئے ننھے سے ڈبے میں سے بھاگ کر جم غفیر سے لپٹ جائے۔ انہیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ لے اور کہے۔ "مجھے خود میں جذب کر لو۔۔۔ چھپا لو چاروں طرف سے گھیر کر، اس ذرا سے اکیلے پن کو مار بھگاؤ۔۔۔ اور اب مجھے نہ کھونے دینا!" اور پھر شاید ان کی زندگی کے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

مس سے یہ مردنی چھوٹ جائے گی جو اس پر برسوں کی پڑی خاک کی طرح ذرہ ذرہ گر کر جمع ہو گئی تھی۔

یہ اس کے کمرے میں قبرستان جیسی پرانی اور ٹھنڈی بو کیسی؟ جیسے برسوں سے بند پڑا ہو۔ چپڑاسی نے آج لوبان بھی تو نہیں جلایا۔ مگر پھر اسے ایک دم لوبان کی خوشبو سے ڈر لگنے لگا۔ اس کی مردہ خوشبو سے تو یہ کمرہ بالکل پرانی قبر بن جائے گا۔ وہ کیا کرے؟۔۔۔ کیا کرے؟۔۔۔ کہاں جائے؟۔۔۔ کس کے پاس؟ دیر تک وہ یہی سوچتی رہی کہ اب اپنے اس ٹوٹے پھوٹے وجود کا کیا کرے کس طرح ان بکھرے ہوئے ذروں کو سمیٹ کر جوڑ ڈالے۔

''ماں۔۔۔ ماں۔'' وہ خاموشی سے پکارنے لگی اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر ماں کو پکارے۔ اس ماں کو نہیں جو اس کے باپ کے گھر میں بیٹھی اس کی خواہشات کو تسکین پہنچایا کرتی تھی اور جس نے اسے جنم دے کر دوسرا جی پیٹ میں ڈال لیا تھا، پھر اسے فراموش کر دیا تھا۔ بلکہ وہ ماں جس کی پیار بھری گرم آغوش میں گول مول ہو کر وہ روح کی اس ٹھٹھرن کو دور کر سکے، جس کے نرم و نازک ہاتھ اس کی تھکی ہوئی کمر کو سہلائیں اور دکھتی ہوئی آنکھوں کو بھینچ کر ان آنسوؤں کو نکال دیں جو مئی جون کے بادلوں کی طرح اس کی کنپٹیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ نرم گرم لو جیسے تھپیڑے کانوں کے پیچھے سے اٹھ کر انہیں جھلا رہے تھے۔ پر برسنے نہیں دیتے تھے۔

''ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو، ذرا دیر ٹھہرو۔'' اس نے خود کو نرمی سے چمکارا۔'' ذرا سی دیر ٹھہرو سب کچھ گزر جائے گا۔ یہ دھول بھری آندھی بیٹھ جائے گی۔ طوفان اتر جائے گا۔۔۔ ایک گلاس پانی پی لو۔۔۔ ٹھنڈا ٹھنڈا!''

فرمانبردار بچے کی طرح چل کر اس نے احتیاط سے تھرماس کھولا، برف کے ٹکڑے ہیروں کی طرح پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی کمزور روشنی انہیں آبگینوں کی طرح چمکا رہی تھی۔ خود اس کی سانس تھرماس کے خالی حصے سے ٹکرا کر ہیروں کو چومتی ہوئی واپس اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ چہرے کے عضلات خود بخود مسکراہٹ میں ڈوب کر ڈھیلے پڑ گئے۔ جان بوجھ کر اس نے تھرماس سے منہ لگا کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنا شروع کیں۔ ارے ٹھنڈی ہوا کی چادریں سی حلق میں اتر گئیں۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ایک چمکیلی شفاف ڈلی کو چھوا۔ ارے! ایک ٹھنڈا بوسہ سارے جسم میں بچھو کے زہر کی طرح چڑھ گیا۔ اور ہمت بڑھی انگلی لپکا کر اس نے ایک ڈلی کو پکڑ لیا جو پھسلتی مچھلی کی طرح زور مارنے لگی۔ مگر جھٹ سے اس نے ہتھیلی پر ڈال دیا۔ جلد میں سے ہوتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی گدگدی کہنی تک پھیل گئی۔ شفاف ڈلی آنسوؤں میں تیرنے لگی۔ ہتھیلی کی گرمی سے بے چین ہو کر وہ ادھر ادھر مچلنے لگی۔ نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے برسوں کے پیاسے ہونٹ اس پر چپکا دیئے۔ اتنی دیر بے کار پڑے رہنے سے زبان بے مزہ ہو گئی تھی۔ سارا منہ کڑوا ہو گیا تھا جیسے کسی نے کچا کچا خون لے کر حلق میں پوت دیا۔ ہاتھ ڈال کر اس نے بھاگتے ہوئے ٹکڑوں کو مٹھی میں بھینچ لیا اور منہ میں بھر کر چبا ڈالا۔ یہاں تک کہ اس کا حلق، زبان اور خوراک کی نالی یخ ہو گئی۔ مگر وہ برفیلے چنے چباتی رہی۔ ڈلیاں ختم کر کے اس نے گدلہ پانی گلاس میں انڈیلا۔ ندیدے شرابی کی طرح وہ ایک ایک جرعہ نچوڑ لینا چاہتی تھی۔ تھرماس چھوڑ کر اس نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ذرا دھچکا پڑا اور۔۔۔ کانچ ایک شیریں چھنا کے سے اچھل کر زمین پر گرا۔ ٹکڑے بالکل جاندار پرندوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگے۔ وہ سچ مچ بسور دی جیسے کسی نے ننھے سے بچے کا دودھ لڑھکا دیا۔ اور وہ اس وقت بہت حساس اور ننھی بن گئی

تھی۔ بچپن اور ماتا کے سارے جذبات گڈمڈ ہو کر نہ جانے کیا بن گئے تھے۔ غم و غصہ کا جوش سوڈے کے ابال کی طرح فوراً بجھ گیا۔ ایک بار بے اختیاری جی تڑپا کہ گلاس کے بلوریں ٹکڑوں کو بھی ٹھنڈے چنوں کی طرح چبا کر نگل جائے۔ مگر ''بری بات'' کسی نے اندر سے ٹوکا اور وہ چڑے ہوئے بچے کی طرح بگڑ کھڑی ہوئی۔ دانت پیس کر اس نے پوری طاقت سے ٹکڑوں میں ٹھوکر مار کر انہیں سارے کمرے میں بکھیر دیا۔ چمکیلے ذرے ہوا میں نیم مردہ چنگاریوں کی طرح چیخ کر تیر گئے۔

بڑا لطف آیا جیسے کنپٹیوں میں اڑے ہوئے بادل ڈھیلے ہو کر بہہ گئے۔ میز پر سے اس نے دوسرا گلاس اٹھایا، پہلے روشنی کی طرف کر کے اس کے آر پار جھانکا۔ بوندوں کی چاروں طرف قوس و قزح کی گوٹ، آگے پیچھے دوڑتے ہوئے رنگوں کے ذرے، دور رکھی ہوئی میز۔۔۔ کتنی ننھی سی بالشتیوں جیسی لگ رہی تھی۔ پلنگ اور کرسی بھی۔۔۔ ارے وہ خود بھی تو اتنی سی منی سی ہو گئی۔ جبھی تو ان چھوٹی چھوٹی کھلونوں جیسی چیزوں پر سوتی اور بیٹھتی ہے! اور یہ ساری دنیا اس گلاس میں آ کر بس گئی ہے۔۔۔ وہ خربوزے کے بیجوں برابر کتابیں، بٹن برابر اسٹول اور کپڑوں کی کھونٹی! کیا اچھا ہوتا جو وہ خود بھی ننھی سی گڑیا کی طرح کرسی پر دراز نظر آتی۔ یہ باریک دنیا اس کی رسائی سے کیوں دور تھی۔ وہ کس دروازے سے گھسے اندر؟ جل کر اس نے گلاس چھوڑ دیا۔ الماری کھول کر جلدی سے نیا سیٹ نکالا، ہلکے آسمانی رنگ کے گلاس اس نے ایک ایک کر کے روپہلی قہقہوں میں غرق کر دیئے۔

تو کیا ہوا؟ وہ کل اور نیا سیٹ لے آئے گی۔ نیلا، پیلا، گلابی ہر رنگ کا گلاس اور پھر ان کے ٹکڑوں کے ساتھ خود بھی قہقہے لگائے گی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈر کر وہ ٹکڑوں کو چھپانے لگی۔

''ستار ماسٹر آئے ہیں!'' چپڑاسی نے کہا۔

''بھگاؤ کم بخت کو!'' اس نے کہنا چاہا مگر خیال بدل دیا۔

''آتی ہوں'' اس نے اپنے کھوئے ہوئے رعب کو ڈھونڈ کر کہا۔

جلدی جلدی ساڑھی کی شکنوں کو ہاتھوں سے دور کیا۔ چپل پہن کر آئینے کے پاس گئی۔ روتے ہوئے ننھے بچے جیسے چہرے کو جلدی سے پاؤڈر تھوپ کر دھندلا کر دیا۔ زائد پاؤڈر تولیے سے پونچھ کر اس نے بال کنگھی سے اونچے کئے۔ بائیں آنکھ کے پپوٹے پر سے پاؤڈر رگڑ کر وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔

ستار پر سجے دنتی کی نئی گت کے توڑے لیتے وقت اس کی نظر پیر کے انگوٹھے پر پڑی۔ خون سے ڈر کر اس نے ہاتھ نہیں روکا۔

ٹھوکر لگاتے وقت مضبوط ٹو کا جوتا پہننا چاہیے۔ اس نے خون کو قالین پر رگڑ دیا۔

سونے سے پہلے اس نے دونوں دروازے احتیاط سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ کھڑکی کا سارا پردہ بھی کھینچ دیا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ بے پیر پلنگ کے پاس آئی۔ آہستہ سے بستر گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا۔ چھت کا پنکھا کھول کر چت لیٹ گئی۔ ریڑھ کی ہڈی خاص خموں میں جھکنے کی عادی سیدھے فرش پر لیٹنے لگی۔

''نہیں۔۔۔ ہر خم مٹا دیا جائے گا اس لہریئے کو سیدھا ہونا پڑے گا۔'' اس نے حکم دیا اور ایسی گہری نیند میں ڈوب گئی جو برسوں سے صرف آرزو بن کر رہ گئی تھی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(40)

سوکر اٹھی تو معلوم ہوا کہ دن بہت چڑھ آیا ہے۔ خبروں کا وقت نکل چکا تھا۔ ریڈیو پر کوئی دھیمے سروں میں کسی تازہ دم کا راگ کا الاپ کر رہا تھا۔ اطمینان سے چائے کی پیالی ختم کی اور صبح کا اخبار اٹھا لیا۔

''جرمنی نے روس پر حملہ بول دیا۔''

وہ جلدی سے تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اور دوبارہ ان موٹے موٹے حرفوں کو پڑھا جو تاریخ کے ماتھے پر خونیں لکیروں کی طرح کھنچ چکے تھے۔ اسے حسین بی کو دیکھ کر اتنا تعجب نہ ہوا تھا جتنا اس خبر کو پڑھ کر ہوا۔ مگر نہ جانے وہ کیوں مسکرا دی۔ خبریں اگر نئی صورتیں اختیار کر کے آئیں تو انسان مسکرا ہی پڑتا ہے۔ کل تک روس اور جرمنی گلے میں بانہیں ڈالے ایک دوسرے کو چمکار رہے تھے اور آج یہ تم پیزار شروع ہو گئی۔ شبہ تو تھی مگر اتنا قریب نہیں۔ ۲۲ جون بھی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ روس کے علاوہ کسی اور کی سلطنت کو بھی تاراج کر دیا گیا تھا۔ آنے والی پود اس تاریخ کو رٹتے وقت اس سلطنت کی شکست خوردہ رانی کے خواب سے بھی واقف نہ ہوگی۔ مگر پھر بھی یہ دن کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے دماغ میں بسا رہے گا۔ اور اس خیال سے اسے ایک گونہ تسلی ہوئی۔ جو کچھ بھی کیا ہٹلر نے ٹھیک کیا ورنہ یادداشت کے لئے اسے اپنی ڈائری خراب کرنی پڑتی۔ اس حسین خوابوں کی ڈائری میں یہ دھبہ کتنا بدنما معلوم ہوتا!

ارے اسے اٹھنا چاہئے۔ دو دکانیں کھل گئی ہوں گی۔ جنگ کا یہ نیا رخ ضرور قیمتوں پر اثر ڈالے گا۔ جاڑے کا سامان بھی اگر خرید لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ ضروری کام کا بہانہ کر کے وہ فوراً اسکول کی لاری میں بازار چل دی۔

آج ذرا اسے شوخ رنگ پسند آ رہے تھے۔ اس دن نہ جانے کس نے کہا تھا کہ سانولے رنگ پر ہلکا سبز رنگ بہت زیب دیتا ہے۔ کاسنی نفاست کا پتہ دیتا ہے اور سنہرا شاہی کہلاتا ہے۔ بناری فیتے آئے چل کے وہ مہنگے ہو جائیں گے، ساٹن بھی چڑھ رہی ہے۔ دولوٹ جلد ہی بے کار ہو جائیں گے۔ ہر چیز دوگنی خریدلی نے ... چاہئے۔ نصف سے زیادہ پونجی کپڑوں میں تبدیل ہوئی۔ باقی کچھ نئے سیٹ، سنگرنی اور چیٹ پٹ میں اڑ گئی۔ ... نے ایک قوس و ... چپلا روغن ناخنوں پر چڑھانے دیکھا تھا۔ کالے سیدھا تھ راون کی بہن جیسے ...

لگ رہے تھے۔ باقی کے چار پانچ رنگ اسے پسند آئے، نئی روی ہوتی ہے۔ بلیک میچنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر میکس فیکٹر کا پورا سیٹ کیا بہار دے گا۔ عمر میں پہلی مرتبہ ایک ماہ کے کل خرچ کے برابر روپیہ اس نے انہیں لوازمات میں جھونک دیا۔ سنگھار میں دیسی بدیسی سب چلتا ہے اور کپڑوں کو بھی کون پوچھتا ہے۔ کہہ سکتی ہے کہ پیسے کا خریدا ہوا پڑا ہے، ترقی پسند بننے سے پہلے کا ہے۔ جلاتا بےوقوفی ہے مجبوراً پہن کر ہی ڈالا جائے۔

بغیر آستین کے بلاؤز میں کتنے ہی فائدے ہیں۔ کپڑا کم، گرمی کم اور آرام زیادہ۔ جاڑوں میں بھی کوٹ کے نیچے پہن لو تو کندھے بہت نہیں پھولتے۔ بازوؤں کی عادت نہیں اور جلد بھی دورنگی ہے۔ کہنی تک گہری اور جہاں چھپی رہی وہاں ہلکی ٹھیک ہو جائے گی۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ نیا نیا سیکھا ہے تو بلا سے، کر کیا لیں گے؟

وہی کامریڈ صمد کی پانچ سیٹ جس میں ہمیشہ دم گھٹتا تھا، آج ضرورت سے زیادہ وسیع معلوم ہوئی۔ ایک طرف کامریڈ اور دوسری طرف شاعر انقلاب پھر بھی کافی جگہ تھی اور اسے ذرا بھی اعتراض نہ ہوا جب وہ دونوں بار بار ایک دوسرے کی سگریٹ جلانے یا کسی اور بہانے سے اسے دونوں طرف سے بھینچنے لگتے۔ ان کی گرم سانسیں گردن اور بازوؤں کو سینکتیں یا ان کی بے کل پنڈلیاں اس کی ساڑھی سے ٹکراتیں تو وہ بالکل انجان بن کر باہر دیکھنے لگتی۔ ایسے کہ اس کے دونوں رخ حسین زاویے پیش کر سکیں۔

ساٹھن کی صدری میں یہ بڑا عجیب ہے کہ آنچل بہت پھسلتا ہے اور انقلابی شاعر کی آنکھیں لٹو کی طرح ناچتی ہیں۔ صمد کی گردن میں بار بار کیا چیز رینگتی ہے کہ جسے ہٹانے کے لئے اسے اپنی کہنی شمن کے پہلو میں اڑانا پڑتی ہے۔ اور شاعر کی رانوں میں کھجلی ہوتی ہے تو وہ اپنے جسم سے زیادہ قریب بیٹھنے والے کے جسم کو کھجاتا ہے۔ آگے جھک کر وہ پروفیسر رحمان سے وقت پوچھنے لگی تو کامریڈ اور شاعر دونوں گھڑیاں باندھے تھے، مگر رحمان کے سر پر جا کر نے قدموں سے دوڑ رہی تھی۔

جلسے میں زور وشور کا مباحثہ رہا۔ مگر سب پنچ ہوچھا نے سے تھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسے برا کہیں اور کسے اچھا۔ جتنے منہ اتنی بول۔

''بیوقوف ہے روس کو چاہئے تھا جرمنی سے مل کر امپیریلزم کا خاتمہ کرتا۔''

''دکھاوے کی ہے لڑائی، ازادی ہے دشمنوں نے۔''

''نہیں جی خبر پکی ہے، پڑوس میں رات بھر گورے خوشی سے ناچتے رہے، اپنی بلا دشمن کے سر، سب سے پرانا دشمن ہے۔ اب دیکھو جرمنی کے ساتھ مل کر خوب پٹیں گے اسے۔''

''ارے آج تو یہ امن کے ٹھیکیدار دونی چڑھائیں گے۔ برسوں کی مراد بر آئی۔''

''نہیں جی روس کا ساتھ دیں گے، عملاً نہ سہی زبانی ہی سہی۔ اور خود چمگادڑ کی طرح دور رکھڑے جیتنے والی پارٹی کا انتظار کریں گے۔''

''آخر میں پے ہوئے روس اور جرمنی وسب مل کر بانٹ رکھائیں گے۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''فی الحال تو یہ روس کی طرف داری کریں گے اور کرنا بھی چاہئے۔ روس کی موت انسانیت کی موت ہوگی اور معلوم ہوتا ہے انسانیت کا بڑھاپا آ پہنچا۔''

''زیادہ سے زیادہ دو ماہ لگیں گے روس کو بٹنے میں۔''

ادھر سواستکا لٹو کی طرح گھومتا اپنا دائرہ بڑھاتا رہا ادھر شمشاد نے پینترا بازی شروع کر دی۔ آج کامرید صمدانی موٹر میں کل انجینئر صاحب کے ساتھ، ایک دن شاعر کے شعروں میں رچ کر کسی بوسیدہ ریستوران میں تو دوسرے دن پروفیسر رحمان کی نیم تاریک لائبریری میں! ایک ہفتہ سپرنٹنڈنٹ کے خیمے میں تیتروں کا شکار تو دوسرے ہفتے نہر کے کنارے ننھی سی پھولداری میں کافی کے گھونٹوں کے ساتھ اونچے قہقہے۔ وہ بڑی ذرپوک ہوگئی تھی۔ کم خوری سے جسم بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ انگلیاں دراز اور لوچدار ہوگئی تھیں اور پیروں کے جوڑ نازک، ذرا سی دور چلنے سے ٹخنوں میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں اور مسلنے سے اتنی گدگدی ہوتی کہ وہ اپنے روغنی ناخنوں سے مسیحا کے ہاتھ کی کھال اتار دیتی۔ کامرید صمدانی گہرے نشانوں کو تنہائی میں چومتے تھے، انقلابی شاعر نے ان ننھے ننھے زخموں کو نگینوں سے تشبیہ دی تھی۔ جہاں ان کا اداس دل شام کو تنہائیوں میں ڈوبا اچھلا کرتا تھا۔ انجینئر صاحب کا خیال تھا کہ یہ نشان، بہت دن بعد، جب زندگی انہیں ایک دوسرے سے بہت دور بھگا لے جائے گی تو صحرا میں گرے ہوئے ڈھانچوں کی طرح کسی شاندار کارواں کی یاد دلا دیں گے۔ پروفیسر ادیب تھے اور ان کے ہر جملے سے ادب ٹپکتا تھا۔ وہ انہیں ایک گمراہ روح کے قدموں کے نشانوں سے تعبیر کرتے تھے۔ کہاں کہاں پہنچ چکے تھے یہ اچھوتے پیچ پے! نگاہ تخیل بھی تو ان کا پیچھا کرتے کرتے بھٹک جاتی تھی۔ دوران خون بھی اپنی گردش سے انہیں نہیں چھڑا سکتا۔ یہی سارے کھرونچے ان کے دل و دماغ پر بھی تو کھنچے ہوئے تھے۔ مرنے کے بعد ان کی ہڈیاں بھی ان داغوں کی گواہی دیں گی۔ وہ ان سب سے بے تکلف تھی۔ وہ اس کے کمرے میں بغیر اجازت گھس آتے پھر اس کی پریشانی پر جھینپ جاتے۔ اس کے بستروں پر میمنوں کی طرح کلیلیں کرتے، مذاق میں اس کی ساڑھیاں اوڑھتے، اس کی چوڑیوں سے جوا کھیلتے۔ ایک ایک چوڑی دس دس روپے کا نوٹ بن کر ایک جیب سے دوسری جیب میں جاتی۔ اس کے کپڑے ناکوں سے بھینچ بھینچ کر اس کی مخصوص خوشبو دماغوں میں محفوظ کرتے جاتے تاکہ اس سے بچھڑ جانے کے بعد وہی خوشبو سونگھ کر اس کی یاد میں بے چین ہو سکیں اور گزرے زمانے کی یاد تازہ ہو جائے۔

اپنی حسن دار پیچیدہ کاکلیں اس نے کتنی بار تراش کر ان کے سینے کے تعویذوں کے لئے دیدیں، یہاں تک کہ اسے بالوں کے کمزور ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ جہاں کہیں اس کی چوڑی ٹوٹ جاتی تبرک کی طرح بانٹ دی جاتی۔ اشعار میں آمد کے لئے شاعر انہیں ہونٹوں پر لپ اسٹک کی طرح تھپتھپایا کرتے اور وہ ہونٹ بے رنگ رہتے، دل و دماغ قوس قزح کے رنگوں میں ڈوب جاتے۔ جوڑے کے پھولوں کی آوارہ پنکھڑیاں، میلے رومال اور ایسی ہی ایک غیر شاعرانہ دماغ کو واہیات نظر آنے والی چیزیں، کتابوں میں نشانی کے طور پر رکھی جاتیں۔ نہ جانے اس نے کتنے ہی لال، سفید اور پیلے پھول لوگوں کو اپنا گوارہ تحفہ بنا کر دے دیئے۔ کتنے ہی

سیب اور شربت کے گلاس ساتھ مل کر چار ہونٹوں نے چوسے ۔۔۔۔ مگر وہ پھر بھی پیاسی ہی رہی۔

افتخار نے اسے ایک نایاب نسخہ سکھا دیا تھا۔ اگر شیر کو سدھانا ہو تو بھوکا رکھو، حکومت کرنا ہے تو بھوکا رکھو، یہ گنتی کے سفید گروہ ان کالوں پر راج کر رہے ہیں یہ سب بھوک کی پالیسی کی بدولت۔ نتھنوں میں خوشبو آئے، رال ٹپک پڑے، زبان باہر نکل آئے مگر کھانا مت دو۔ پیٹ بھر جاتا ہے تو کھانے والا لقموں کا مزہ دوبارہ نہیں یاد رکھتا۔ حلق سے اترا سو گیا، بس ہونٹوں تک بات کرو، حلق سے دور!

وہ ان سے اوندھے سیدھے کام لینے سے نہ چوکتی۔ رات کو دس گیارہ بجے اسے یکا یک ناریل کے خوشبودار تیل کی ضرورت ہوتی۔ موجودہ تیل یا تو بدبو دینے لگتا یا جی سے اتر جاتا۔ وہ اسی وقت انہیں موٹر میں دوڑاتی، پیٹرول کی قلت کے باوجود اگر جوہی کی خوشبو کا ناپسند ہوتا تو واپس کر دا کے مولسری کی مہک کا لاتے اور گورنمنٹ سے ''ضروری کاموں'' کے نام سے پیٹرول لیتے یا پھر کالا بازار چوپٹ کھلا تھا۔ نئے نئے رنگوں کی جارجٹ کی تلاش میں انہیں دلی کلکتہ تک ہلکان کر دیتی۔ اس کے علاوہ ان سے تکیوں کے غلاف بدلواتی، گدے جھٹکواتی، پردے ٹنگواتی، ننھے سے ہیئر پن سے شلوار میں کمر بند ڈلواتی اور الجھا ہوا اون سلجھانے کو دے دیتی۔

سر میں تیل سوائے شاعر کے کسی سے نہ ڈلواتی کیونکہ انہیں چمپی کرنی بہت مزے کی آتی تھی۔ ساتھ ساتھ کندھے، بازو اور کمر بھی بڑی اچھی دباتے تھے۔ وہ انہیں اس معاملے میں چھوٹی موٹی مدد دے دیتی اور کنگھی کرتے میں جب وہ ہر بال کی شان میں فی البدیہہ آزاد نظم کہتے تو وہ حیرت زدہ ہو کر دائیں گال کے تل کے قریب چھنگلیا کا روغنی ناخن رکھ کر بیٹھ جاتی۔ اسے آئینہ میں بغیر دیکھے اس تل کے پاس ناخن پہنچانے کی مشق ہوگئی تھی۔ اس صفائی سے کہ چھپ نہ جائے اور یہ حرکت بالکل غیر ارادی معلوم ہو۔

اگر وہ کسی سے جل اٹھتی تو شاعر پر اپنے لاڈ کی بارش شروع کر دیتی۔ وہ بے چارا سب سے کم تر سمجھا جاتا تھا۔ لہذا اس کو یوں چڑھتا دیکھ کر لوگ ضبط کے دائرے سے پھسل پڑتے۔ لیکن اگر ہنر بہت زور سے پڑ جاتا تو وہ فوراً سوز کرنے والے کو منا لیتی۔

باوجود ان مظالم کے اس نے ہر ایک کو یہی یقین دلا رکھا تھا کہ وہ انتہائی درجہ کا بے رحم، سخت دل اور غصہ ور ہے۔ جب چاہے بے چاری کا دل توڑ کر رلا سکتی ہے۔ لہذا وہ سب یہی شیخی مارا کرتے تھے کہ جب چاہیں اسے تڑپا تڑپا کر رلا سکتے ہیں اور یہ تھا بھی ٹھیک، ذرا سا کنپٹیوں پر زور ڈالتی اور آنسو چھلک پڑتے۔ سب کا یہی قول تھا کہ اس کی آنسوؤں میں تیرتی ہوئی آنکھیں بالکل جل پریاں معلوم ہوتی ہیں اور جب روتے روتے اس کا برا حال ہو جاتا تو وہ خود بھی رو پڑتے۔ پھر دو محبت بھرے دلوں کے آنسو ایک ہی رومال میں جذب ہو جاتے۔

جو اصول اس نے بنا رکھے تھے اگر کسی بے صبرے نے توڑنے کی ہمت کی تو وہ ایک دم باسی ہار کی طرح اتار پھینک دیا گیا۔ اگر چاہتے ہو تو جتنا ملتا ہے کلیجے سے لگاؤ اور صبر کرو، نہیں چاہتے تو۔۔۔ ٹھنڈے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

گھر سدھارو۔

کون کہتا ہے کہ بے پیئے نشہ نہیں ہوتا۔ بعض ایسے بھی ہیں جو صرف سونگھ کر مست ہو جاتے ہیں۔ بعض اوروں کو پیتا دیکھ کر جھوم لیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ شراب و کباب کے اشعار پڑھ کر ہی مدہوش ہو لیتے ہیں۔ یہی حال جنسی زندگی کا ہے۔ بعض ایسے ہیں جنہیں قصہ کہانیوں ہی سے چین پڑ جاتا ہے۔ چند کند ذہنوں کو تصویروں اور فلموں سے مدد لینی پڑتی ہے اور اچھے بھلے تجربہ کار بھی ان چیزوں کو دیکھ کر نہ جانے کونسی بچی ہوئی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ تو بس یہ لوگ بھی اس طبقے کے تھے جو پانے کی امید میں کشکول لئے دروازے پر تو نے ہوئے تھے۔ یہ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ خواہ انہیں کتنا بھی الو بنائے آج یا پھر کبھی وہ خود اپنے ضمیر سے بھی اپنی بے وقوفیوں کا اعتراف نہ کریں گے۔

مگر ایسے لوگوں کو ٹھکرا دینا بڑی حماقت ہے۔ ناامید ہو کر تو وہ فوراً ہی جو کچھ نہ پا سکے تخیل میں پالیں گے اور وقت آنے پر اصل جیسی نقل کر کے ڈینگیں ماریں گے۔ ہزار باتیں دل سے جوڑ کر لگا دیں گے۔

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان کی مجال نہیں جو وہ جدا ہو کر اسے بھول سکیں۔ کم از کم اس کا خیال ان کے اکیلے پن کو تو دور کر ہی دیا کرے گا۔ اس کا ذکر کر کے وہ بیوی اور دوسری معشوقاؤں کو حسد کی آگ میں جلایا کریں گے۔ جب جی چاہا معشوق پولیس کے ڈنڈے کی طرح بیوی کی جان پر دے مارا۔ موقع بے موقع کسی کی یاد میں ایک کھولتی ہوئی پھنکار مار کر نیم غنودگی میں ڈوب گئے۔ دکھ بھری رنگین مسکراہٹ کے ساتھ سب کو چھوڑ کر دور رومان کی گود میں اڑ گئے۔

''آہ کیا ساڑھی پہنی تھی۔ اس رنگین شام کو رگ رگ مہک رہی تھی، بالوں میں نہ جانے کیا نشہ آور عطر چھڑک رکھا تھا کہ دل مچلا جاتا تھا۔ کئی بار میں نے چپکے سے جھک کر بالوں میں ناک گڑو دی۔۔۔!'' بس کافی ہے ایک بدبودار اور بدشکل بیوی کو جلا کر بھسم کر دینے کیلئے۔

وہ ان سب پر یہ بھی ظاہر کئے رہتی تھی کہ اوروں سے تو صرف مروت کی وجہ سے ملتی ہے اصل چوٹ تو اس نے لگائی ہے۔ اگر ایک سے بے تکلف ہوتی تو چاہتی دوسرا بھی دیکھ لے کہ ایک چولہے پر رکھا ہے تو اپنے کی آنچ بے کار نہ جائے! پھر نہ کچھ وہاں بھی بھنتا رہے۔ یہ بڑا کارگر حربہ تھا اور اس کی فتح کا سب سے بڑا راز!

وہ اب اکیلی کہیں نہ جاتی۔ ان ''پناہ گاہوں'' کے بغیر اس پر وحشت طاری ہو جاتی۔ بازار بھی جاتی تو انہی کی موٹروں میں۔ وہ فخریہ پیچھے پیچھے خرید و فروخت کی پوٹلیاں، جوتوں کے بنڈل بسکٹوں کے ڈبے، تازہ ترکاریوں کی گٹھیاں لاد کر چلتے، مہینے کی جنس موٹر میں پہنچا جاتے۔ دھنیا گم ہوتا تو دوسرے پھیرے میں بندوا لاتے۔ یہی نہیں وہ سینکڑوں ایسے کام کرتے جن کا اگر ان کی بیویاں ذکر بھی کر دیتیں تو مارے شرم کے ڈوب مر جانا بہتر سمجھتے۔

شاعر بے چارے کے پاس اپنے شعروں کے سوائے اور رکھا ہی کیا تھا جو اس کے قدموں پر نچھاور

کر دیتا۔ لہٰذا اس نے اپنی نئی تصنیف اس کے نام معنون کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس انوکھے تحفے میں اسے بڑی دلچسپی نظر آئی اور بڑے سوچ بچار کے بعد اس نے خود نہایت رسیلے اور چٹ پٹے جملے ڈھونڈ کر نکالے۔

''اس کے نام، جس کا نام میں نہیں لے سکتا۔''

''شرارت بھری آنکھوں کے نام۔''

''اس برق صفت کے نام، جس کی نگاہوں کے تازیانے میں برداشت نہ کر سکا۔'' یا''

اس برق صفت کے نام، جس کی نگاہوں کے تازیانوں نے میرے دل پر گہری لکیریں کھینچ دیں۔''

''اس شعلہ رخ کے نام، جس نے میری زندگی کے تاروں کو اپنے حسن کی مضراب سے لرزا دیا۔''

''اس سیماب وش کے نام، جس نے میری رگوں میں پارہ بھر دیا۔''

گو اسے قطعی یقین تھا کہ وہ نہ ہی برق صفت ہے اور نہ ہی سیماب وش، پھر بھی اسے بڑا لطف آیا۔ مگر آخری جملے سے نہ جانے کیوں وہ خود ہی چڑ بیٹھی۔ ایسا معلوم ہوا وہ کسی مشہور دواخانہ کا لمبا چوڑا اشتہار ہے۔ اسے شاعر سے خواہ مخواہ کا بیر ہونے لگا۔ وہ ان سب سے اکتا چکی تھی اور سمجھ نہ آتا تھا اب ان سے کس رخ ناک گھسوائے۔ وہ ان سب کو جلد از جلد سوکھے پتوں کی طرح جھاڑ دینا چاہتی تھی مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اسے بھول نہ جائیں۔ پھر یہ ہنر کوڑے سب فراموش ہو جائیں گے۔ یہ گہری لکیریں دھندلی پڑ جائیں گی اور رگوں میں بھرا ہوا پارہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر وہ لوگوں سے اس کا ذکر بالکل بیسوا کی طرح کریں گے۔ ناکامیاں انہیں گندہ ذہن اور دروغ گو بنا دیں گی۔

پروفیسر سے اس کی عموماً ٹھنی چھنتی رہتی تھی۔ وہ بے رحمی کی حد تک صاف گو اور منہ پھٹ انسان تھا۔ کبھی کبھی تو دشمن کو شبہ ہونے لگتا کہ وہ شکار ہے یا خود شکاری بھیس بدلے ہوئے ہے۔ نہ جانے کیوں جب وہ خاموشی سے اسے گھورتا تو اس کا جی چاہتا وہ لوہے کی چادر میں لپٹ جائے۔ بارہا اس نے بھولے سے اس پر تیر اندازی کی مگر معلوم ہوتا تھا تیروں کی نوکیں کسی چٹان سے ٹکرا کر لوٹ پڑتی تھیں۔ اس پر پروفیسر کی عقابی آنکھوں کی طنزیہ مسکراہٹ۔ وہ چراغ پا ہو کر پلٹ آتی اور پہلے سے زیادہ محتاط ہو جاتی۔

مگر اس نے ہار تو نہ مانی۔ غنیم کی کمزور رگ ٹٹولتی رہی۔ ایک بار پورا اثاثہ داؤ پر لگا دینے کی ٹھان لی۔ جی دھکڑ پکڑ کرتا تھا کہ اگر اس نے اس تھال میں ٹھوکر مار دی تو؟ دو چار چکنی چپڑی باتیں کر کے ایک دن پروفیسر کو ٹٹولا۔

''آپ اپنی نئی کتاب کس کے نام معنون کریں گے؟'' مگر پروفیسر نے بدک کر دیکھا۔ گویا کھانے سے پہلے سونگھتا ہے۔

''جو بھی امتحان میں پورا اترے۔''

''کیا فیس داخلہ ہے؟''

''کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''اونہہ بھئی آپ لوگوں سے کون جیتے گا۔ بھلا یہ جواب مجذوب کی بڑ ہم کوزمغزوں کے کیا سمجھ آئے۔''

''پھر وہی بنانے کی۔۔۔''

''توبہ ہے آپ تو بڑے بے اعتبار ہیں۔'' پروفیسر نے ایک گہری سی نگاہ اس پر ڈالی اور ثمن جلدی سے کھسک کر شاعر کے پہلو میں ہو رہی۔ نا بابا یہ سانپ کھیلنے کا نہیں مگر تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پروفیسر بھی کندھے پر آ کھڑے ہوئے۔

''کیا بگڑ گئیں۔'' انہوں نے اس کے پیر میں چٹکی بھر کر پوچھا۔

''نہیں تو۔''

''ہ پھر اس طنطنے کا مطلب، کتاب تو واقعی چھپ رہی ہے اور معنون۔۔۔۔''

''کس کے نام معنون کریں گے، اپنی مری ہوئی ماں کے نام؟'' جل کر پوچھا۔

''میری والدہ زندہ ہیں''! پروفیسر برا مان گئے۔

''اوہ معاف کیجئے گا، تو باپ کے نام؟''

''وہ مر چکے۔''

''چہ مصیبت ہے، جسے مردہ سمجھو وہ زندہ اور جسے زندہ سمجھو وہ مر جاتا ہے۔ تو پھر اپنی بیوی کے نام۔''

''بیوی نصیب ہی نہیں۔''

''ورنہ کرتے ضرور آپ یہ حماقت۔''

''سننے سے پہلے بولنے سے کیا حاصل، میں کہتا ہوں بیوی ہی سراسر حماقت ہے۔ اور اگر ہو تو پھر کتاب کیا انسان عقل و خرد سب ہی اس کے نام سے معنون کر دیتا ہے۔''

''اونہہ شوق سے کیجئے بیوی چھوڑ ساس کے نام کر دیجئے۔''

''بگڑتی کیوں ہو، محبوبہ کے نام کیوں نہ کر دوں۔''

''ہنہ۔'' اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

''مگر بھئی میں شاعر جیسے جملے سخت ناپسند کرتا ہوں۔''

''آپ نرے گودڑ ہیں۔''

''ہو سکتا ہوں، مگر بھئی نہ تو میری خشک اور اجڑی زندگی میں تار اور نہ ان پر کوئی مضراب ہیں مارے! معاف کرنا اگر برا لگے تو۔۔۔۔'' وہ مکاری سے مسکرایا۔

''مجھے کیوں برا لگتا۔'' حالانکہ اسے سخت برا لگ رہا تھا اور جی چاہتا تھا اس کا منہ کھسوٹ ڈالے۔ ''اچھا وہ دوسرا ''چھلانگ'' اس کا ڈیڈیکیشن وہ تو پسند ہے۔''

''اجی لاحول ولا قوۃ۔۔۔ خورشید تاباں فرسودہ اور تازیانے۔۔۔ انحطاط پسندی۔''

''جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔ کیا بگاڑا ہے اس نے آپ کا، ہر وقت بے چارے کا مذاق اڑاتے

ہیں۔ مانا کہ وہ آپ جیسے مکار نہیں۔''

''میں مکار ہوں'' پروفیسر نے چہک کر کہا۔

''اور کیا اتنا تو سیدھا ہے۔''

''تم نہیں جانتیں کتنا چلتا ہوا ہے۔ جانتی ہو نواب۔۔۔ کی بیگم صاحبہ کا کتنا چڑھا ہے۔ چار جگہ سے وظیفہ پیتا ہے۔'' ایک دھکے کے ساتھ چند گزرے ہوئے واقعات آگے بڑھے مگر ثمن نے دونوں ہاتھوں سے انہیں دور جھٹک دیا۔ شکر خدا کا کہ اس نے شاعر پر کبھی رحم نہ کھایا تھا۔

''وہ دن یاد ہے جب آپ نے میری ساری چوڑیاں توڑ دیں تھیں۔'' وہ تیزی سے بات ٹال کر بولی۔

''یاد ہے۔'' پروفیسر نے برا مان کر کہا گویا ایسے اہم واقعات کو بھول جانا جرم تھا۔

''آپ کو رنج ہوا تھا؟''

''تمہارے آنسو دیکھ کر خود کتنے بہائے تھے۔ وہ سب موتی میرے رومال میں جمع ہیں۔''

''اب تو دھل گیا ہوگا۔''

''نہیں، دوسرے پانی میں تو اتنی طاقت نہیں کہ ان موتیوں کو بہا سکے۔''

''خیر تو۔۔۔ سنئے آپ کسی نئے مجموعہ کو دیکھئے ایسے لکھئے تو کیسا معلوم ہو۔'' ان ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام..... نہیں صرف ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام۔'' وہ بھی تیار بیٹھی تھی کہ اگر پروفیسر کچھ کہے گا تو فوراً مذاق کی طرف بات پلٹ دے گی۔ مگر نہ جانے آج وہ کس موڈ میں تھا۔

''بڑی تیز ہو تم۔''

''اور خاک پوش پر ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بکھری ہوں۔۔۔ کیوں؟''

''اوہو، مصوری میں بھی دخل ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے بات بنتے دیکھ کر پورے زور سے بلہ بول دیا۔ ''لائیے آپ کی تصویر بنا دوں۔'' اس نے پروفیسر کی کلائی پکڑ کر اس میں اپنے لمبے ناخن گڑو دیئے اور قبل اس کے کہ ان کا بلبلاتا ہوا ہاتھ اسے پکڑتا وہ تڑپ کر باہر روش پر نکل آئی۔ جہاں عام نوکروں کے سامنے انہیں تہذیب کے ساتھ اونچی آواز میں موسم اور سیاست کے متعلق گفتگو کرنی پڑی۔ بے چارے دیر تک پیاسے بیل کی طرح ہانپتے رہے پھر چل دیئے۔

''ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام'' چھپ کر آ ہی گئی۔ مگر واقعات نے دوسری ہی کروٹ لے لی۔

شاعر فوراً کھٹک گیا۔ کچھ دن سے پروفیسر بڑے بے وقت ضروری باتیں کرنے آنے لگے تھے۔ وہ غریب اور کوئی تحفہ نہ دے سکتا تھا، تو گیتوں کی مالا ہی اپنی دیوی کے چرنوں پر چڑھا دی تھی۔ مگر سبھی ایرے غیرے نتھو خیرے رومانی بننے لگے۔ یہ تو زیادتی ہے۔ بھنا تا ہوا آیا۔ تھوڑی دیر تو خاموش ضبط کئے بیٹھی رہی پھر جل اٹھی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''مگر اس میں آپ کا کیا نقصان؟''

''کچھ نہیں گویا گویا۔ اونہہ جل گئے آپ کی باریکی خیال میں وہ آپ سے بہت آگے نکل گئے۔''

''نوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام۔۔۔ اوہ کتنا حسین تخیل!''

''شہ، بالکل نکما اور بے معنی، جی!''

''آپ کا یہ حسن ظن ہے میرے متعلق۔۔۔ چونی کے شعرا میں میرا نام ہے۔۔۔''

''اونہہ سب الو ہیں چونی کے شاعر۔۔۔''

''مس شمشاد!''

''مسٹر شاعر!''

''آپ کو میری ہتک کرنے کا کوئی حق نہیں۔۔۔''

''اور آپ کو میرا بھیجا چاٹنے کا کوئی حق نہیں۔ دماغ پک گیا آپ کے اوندھے سیدھے شعر سنتے سنتے۔۔۔''

''میں۔۔۔ میں۔۔۔ آپ۔۔۔''

''کیا میں۔۔۔ آپ۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ کوئی بات بھی ہو۔۔۔ اچھی عاشقی ٹھیری کہ گز گز بھر لمبی غزلیں سنو۔۔۔ سلام ایسی محبت کو۔۔۔ ہم لنڈورے ہی بھلے!''

''میں آپ کو ادب پرست اور۔۔۔''

''جی معاف کیجئے میں کچھ ادب پرست نہیں۔ یونہی آپ کو الو بنانے کے لئے سن لیتی تھی۔۔۔ تشریف لے جائیے اور آئندہ گرلز کالج کی چہار دیواری میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ شریفوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں کوئی چکلہ نہیں یہ۔۔۔''

''اور اب تک۔۔۔''

''اب تک میری مرضی!''

''میں نے۔۔۔ میں نے خود اپنا گلا گھونٹ لیا۔۔۔''

''بہت اچھا کیا آپ جائیے خود اپنے آپ کو دفن بھی کر دیجئے۔۔۔ جائیے۔۔۔''

''جا رہا ہوں۔۔۔ مگر آپ کو اتنا انحطاط پسند نہیں سمجھتا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔''

''جائیے بھی، اور اس اگر مگر کو میری طرف سے گھورے پر ڈال دیجئے گا۔ جائیے اور دنیا والوں سے کہہ دیجئے کہ میں بدمعاش اور آوارہ تھی..... اور آپ کی داشتہ رہی..... جائیے.....''

شاعر کے چلے جانے کے بعد ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ شکر ہے اس دن اور کوئی ملنے نہ آیا۔ ورنہ وہ تو شمشیر براں بنی بیٹھی تھی۔ ویسے فرصت بھی لوگوں کو نہ تھی۔ کامریڈ صمد کی ریاست میں سپاہیوں کی بھرتی شروع ہو گئی تھی لہٰذا وہ کامریڈی چھوڑ کر نئے سرے سے نوابزادہ بن کر خان بہادری کا پودا سینچنے لگے۔ ادبی اور ترقی پسند جلسے

بھی پھیکے پڑ کر درہم برہم ہو چلے۔ دو چار کو جیل میں بھرا اور پالیسی بدل گئی۔ زیادہ تر قومی جنگ کے متعلق ''کام'' کرنے لگے۔ روس کی جنگ دنیا بھر کی جنگ بن گئی، اور اس لئے انسان کی جنگ ہو گئی تھی۔ انجینئر صاحب بیروت چوگنی تنخواہ پر سدھار گئے۔ دنیا کچھ سونی ہوتی گئی۔ ہٹلر چھلانگیں مارتا دوڑنے لگا۔ ادھر جاپان کو بھی چھینکیں آنے لگیں۔ مشرقی جزائر میں خنکی بڑھ رہی تھی الاؤ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

بے بات جلی بیٹھی تھی۔ پروفیسر آن پہنچے۔ وہ کچھ حدود سے بڑھنے لگے تھے اور اب منڈی شاخ کی طرح یہی رہ گئے تھے۔ یہ شاید چھٹی بار اس کی زلف کے بال اور کوئی دوسری نشانی مانگنے آئے تھے۔ اصل میں راز و نیاز کے سب کل پرزے گھس گھسا چکے تھے۔ ایک ہی رومان دس دس بار دہرائے جانے کی وجہ سے سڑ چکا تھا۔ جملے چپچپا اٹھے تھے۔ سیاسی گرمی بھی کچھ مردہ ہو چکی تھی۔ بھوک کا سوال تیزی سے اٹھتا جا رہا تھا۔ فوجی بھرتی اندھے، لولے لنگڑے، کانے سب سمیٹ کر ہڑپ کئے جا رہی تھی۔ جو کل تک کوڑی کوڑی کو محتاج تھے، آج وردی پہنے رعب گانٹھتے پھرتے تھے۔ جسے دیکھو لیفٹیننٹ بنا اکڑ رہا ہے اور جب بھوک کم ہو گئی تو تناؤ بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ اور یہ زندگی کی دوڑ بھاگ ہے بھی ہے تو اس پیٹ کے بھاڑ ہی کی خاطر ہے۔ زیادہ سے زیادہ پیٹ بھر دو اور ان پیٹ بھرے ہوئے پیٹوں کو توپ کے آگے دھر دو، چیں بھی نہ کریں گے۔ اس کے باوجود ایک بے غرضی اور لاپروائی چھائی ہوئی جیسے لڑائی نہیں سٹے کا بازار لگا ہوا ہے۔ جتنا ہو سکے پیسہ گھسیٹ کر لے جاؤ۔ موقع ہے، لوگوں کو ضرورت ہے، خریدنے کو پیسہ ہے، کوڑا کرکٹ بھر دو ان کی جیبوں میں۔ ویسے وار فنڈ بھی جمع ہو رہے ہیں۔ ناچ تماشے کے ذریعے پیسہ بھی جمع کیا جا رہا ہے۔۔۔ سب کچھ حاضر ہے مگر دل حاضر نہیں۔ کیوں دل لگائیں؟ کس کی خاطر لگائیں؟ اتنی بار جو خون کی ندیاں بہائیں تو اس کا کیا اجر ملا؟ یہاں تو بھوک اور برہنگی ویسی کی ویسی ہی رہی، جہالت ایک قدم پیچھے نہ ہٹی، مرض ایک انچ دور نہ ہوئے۔ جرمنی مرے یا روس، جاپان مرے یا فرانس، ان ازلی سسکنے والوں کو کسی کے دکھ کا کیا احساس! دکھ سے گھبرانا کیسا؟ یہاں دکھ بھوگ لو تو وہاں جنت ملے گی۔ خیر ویسے جو آقا کا حکم، اپنے بس نہیں بھوک کے ڈنڈے کے بس ہی سہی۔

پروفیسر کے لاڈ ضرورت سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ہر چیز سے جی کبھی کا اکتا چکا تھا۔ سب ٹل گئے تھے مگر نہ جانے کس آس میں یہ تعینات تھے۔

''نئی کتاب کے لئے کوئی نام تجویز کرو۔'' ایک دن اٹھلا کر بولے۔

''نام؟۔۔۔ کیا ضرورت ہے نام کی؟ کیا بے نام کے کتاب نہیں چھپ سکتی!'' جلی تو بیٹھی ہی تھی۔

''نام سے میرا مطلب ہے نائیلہ!''

''جی اتنی اردو جانتی ہوں، کچھ بھی ہو ایک ہی بات ہوئی۔''

''تمہارا مطلب ہے بے نام۔۔۔''

''ہاں کیا حرج ہے ایسی گمنام رہنے والی کتاب کا نام رکھنا بے کار۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ لوگ چرائے ہوئے خیالات لفاظی میں ڈبو کر مصنف بننے کی کوشش کریں تو۔۔۔''

''یہ کس کے متعلق کہہ رہی ہو، میرے خیالات تجربات پر مبنی ہیں۔''

''ضرور۔۔۔ ذرا بتایئے تو کتنے گاؤں دیکھے ہیں، جا کر کسی پی ہے اور چنے کا ساگ کھا کر آگ کے ڈوڈے سونگھے ہیں؟ کتنی معصوم دیہاتنوں کی عزت لوٹی اور حرام کے بچے پیدا کروائے ہیں؟ سب بکواس بیٹھے بیٹھے بڑ ہانکنے لگے۔ بڑے قوم کو سدھارنے چلے ہیں، ہنہ۔''

''میں قوم سدھار کا قطعی قائل نہیں۔۔۔ میں لیڈر نہیں ہوں۔''

''تو پھر فائدہ کاغذ کالے کرنے سے، سوائے رنڈی کی حمایت کے اور منظور ہی کیا ہے آپ کو۔ یہ آپ رنڈیوں کے کیوں شدت سے طرف دار ہیں؟''

''میں۔۔۔''

''آپ وہاں جاتے ہیں تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے اور چاہتے ہیں گورنمنٹ بجائے جنگ سے سرمارنے کے رنڈیوں کے کمرے سجائے، وہاں ٹمٹماتی لالٹین کے بجائے بجلی کے ہنڈے لگائے۔ سستے تیل کی جگہ ایونگ ان پیرس کے کنٹرلنڈھائے۔''

''کیوں نہیں۔۔۔''

''مگر آپ کو اپنا گھر بھول کر رنڈیوں کی بہتری کی کیوں پڑ گئی۔ دنیا میں اور بھی بھوکے ہیں سب کو چھوڑ کر بس ان بے چاریوں کا رحم آتا ہے۔''

''کچھ بھی کہو وہ دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہیں اور کسی عضو کو سڑتے دیکھ کر میری حساس طبیعت۔۔۔''

''کچھ نہیں، بڑی بے چاریاں! ہنہ نہ جانے کتنی اس سے بدتر بے چاریاں گھروں میں پڑی سڑ رہی ہیں۔''

''بھلا ان کے بارے میں کیا لکھ یا جان سکتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم پردے کے پیچھے کتنے رنڈی خانے قائم ہیں۔ اور کیا ہو رہا ہے۔ دوسرے بھئی نہ ہی مجھے اس گھریلو عورت سے کوئی دلچسپی۔۔۔''

''کیوں ہوگی، بس آپ کی ساری دلچسپی رنڈی میں جذب ہوگئی۔''

''بے شک وہ میرے کام کی ہے۔۔۔ وہ میری ہے۔۔۔ یہ پردے میں چھپی ہوئی پری یا وہ عورت جسے ہم غلطی سے تعلیم یافتہ کہتے ہیں۔۔۔ ان سے مجھے کیا ملتا ہے۔''

''خیر یہ بھی مانا مگر آپ تو حقیقت نگار بنتے ہیں۔''

''پھر؟ کوئی اعتراض ہے؟''

''جی مجھے اعتراض کا حق تو نہیں مگر پوچھتی ہوں ان رنڈیوں کی تو آپ رگ رگ سے واقف ہیں۔ کیا مرد ایسے ہی نہیں ہوتے۔ ذرا انہیں بھی ڈھونڈ کر سامنے تھسیٹ لایئے۔ یا بس انہیں ہمیشہ ظالم، بے رحم،

دغاباز، حرام کے بچے پیدا کرنے والا ہی دکھاتے ہیں۔ بڑے روشن خیال بنتے ہیں مگر آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ عزت اور عصمت صرف عورت ہی کی ہوتی ہے۔ مردان فضولیات سے پاک ہے۔۔۔''

''ایں؟''

''جی! اور آپ اپنی دانست میں عورت کی حمایت کرتے ہیں، یعنی اسے یقین دلاتے رہنا کہ وہ چیز جو مرد کے لئے باعث فخر ہے اس کے لئے گناہ ہے، بس یہی ہے آپ کا انصاف اور ترقی پسندی۔۔۔''

''ہر بات کو الٹے دیتی ہو! سنتی کم ہو۔''

''کیوں کر سنوں، کوئی بات بھی ہو سننے کے لئے، کچھ نہیں سب زبان کے چٹخارے کے لئے ہے۔ کیوں صاحب آپ کی عریانی عورت کے سینے تک کیوں رہ جاتی ہے۔''

''ایں؟۔۔۔'' پروفیسر زور سے ہنسے۔

''نہیں مگر کبھی اپنی عریانی پر بھی تو نظر ڈالئے۔۔۔ بس بھوکے کتوں کی طرح۔۔۔''

''آج مزاج بڑا بگڑا ہوا ہے۔۔۔ پانی پی لو غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''میں بتاؤں کیوں لکھتے ہیں یہ عریاں چیزیں؟''

''میرے منع کرنے سے کیا مان جاؤ گی۔۔۔ بتاؤ۔''

''سینہ مرکز حسن ہے۔ بس اس سے کھیل کر جی ٹھنڈا کرتے ہیں۔''

''اچھا بابا، کیا بات ٹھنی اور کہاں پہنچ گئیں۔۔۔ معلوم ہوتا ہے۔۔۔''

''کیا۔۔۔؟''

''کوئی تازہ چوٹ کھائی ہے؟''

''چوٹ! ہنہ آپ نے کیسے جانا۔''

''تمھاری کھسیانی صورت اور روتی ہوئی باتوں سے، یہ تم جی کے جلے پھپھولے میرے سر کیوں پھوڑ رہی ہو۔ کیا میری جنس کا بدلہ مجھ ہی سے لے لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے تو بہت سنا چکیں، کچھ سننے کی بھی ہمت ہے، یا صنف نازک کی ڈھال آگے کر دو گی۔''

''میں بزدل نہیں دوسرے آپ سے تو۔۔۔''

''تو سنو مجھے تمھارے اوپر رحم آتا ہے۔''

''شکریہ! مگر وجہ اس دریا دلی کی؟''

''رحم بعض وقت بے وجہ بھی آتا ہے۔۔۔''

''تو مجھے آپ کی عقل پر۔۔۔''

''ہاں، شاید ہم دونوں قابل رحم ہیں۔ تم اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش میں کھو بیٹھی ہو اور میں نے تمھیں پہچاننے کی کشمکش میں اپنا بہت سا قیمتی وقت برباد کر دیا۔ ایک بار بازاری عورت کو چھوڑ کر بقول

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

تمہارے شریف عورت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی تو قدم قدم پر آنکھوں میں خاک جھونکی گئی۔۔۔۔اور اتنے دن جھک مارنے کے بعد پتہ چلا کہ عورت خواہ کوئی ہو کہیں ہو، اسے سمجھنے کی کوشش کرنا حماقت ہے، وہ سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ استعمال کے لئے ہے۔ ہاں اتنا اندازہ ہو گیا کہ تم معمولی قسم کی عورت نہیں مگر بڑے رنگین مغالطوں میں مبتلا ہو۔ اپنے آپ کو انتہائی ذہین سمجھتی ہو، حالانکہ قطعی نہیں۔ صرف ضرورت سے زیادہ چرب زبان ہو۔ بڑی لچھے دار باتیں کرتی ہو۔''

''ہنہ۔۔۔اور۔۔۔''

''اور زیادہ حساس بننے کی کوشش نہ کرو۔ میرے خیال میں جتنے دکھ سہہ کر تم ڈھٹائی سے ہنس سکتی ہو قابل داد ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بہادر اور مضبوط ہو۔ انتہائی بزدل ہو، سوئی کے زخم کو بھالا بنا لیتی ہو۔ تم سمجھتی ہو کہ یہ تمہارا رویہ جو ہم سب کے ساتھ رہا ہے یہ طاقت کا ثبوت ہے؟ قطعی نہیں، یہ خوف، یہ تمہارا اپنی نسائیت کو چھوئی موئی بنا کر رکھنا، یہ تمہاری سب سے بڑی بزدلی ہے۔''

''اپنی بے وقوفیوں کو میری بزدلی بنا رہے ہو۔''

''بے وقوفیاں؟ تم اسے بیوقوفی کہتی ہو۔ تم جیسی دہکتی ہوئی آنچ کے سامنے سے برف کے ٹکڑے کی طرح صحیح وسالم نکل آنا بزدلی اور بے وقوفی نہیں بلکہ بہادری کی انتہا ہے اور یہ جو ہم نے تمہارے کانچ کے گلاس کی قدر کی اپنے جی پر پتھر رکھ کر تو تم سمجھتی ہو تم ہمیں الو بناتی رہیں۔ حالانکہ ہم جان بوجھ کر الو بننے میں بڑا لطف اٹھاتے ہیں۔ ہم جو کچھ تم سے لینے آتے تھے مل جاتا تھا۔ بخدا میرے دل میں ایک بار بھی اس سے آگے قدم بڑھانے کی خواہش پیدا نہ ہوئی اور کیوں ہوتی کونسی نایاب شے تم ہمیں دے دیتیں۔ جو ہمیں باہر اس سے سستی نہ ملتی۔ ویسے تم خود جانتی ہو کہ تمہاری کشش اتنی شدید نہیں کہ مثلاً صمد کو خان بہادری کے خطاب سے زیادہ تم عزیز نہیں انجینئر تمہیں چھوڑ کر بیروت چلا گیا۔ کیا تم سمجھتی ہو تم اسے روک سکتی تھی۔ تم جیسی نہ جانے وہ ہر اسٹیشن پر کتنی چھوڑ گیا ہوگا۔ تمہیں وہ رتبہ نہیں حاصل ہو سکتا جو اس کی جاہل اور بے وقوف بیوی کو ہے۔ تم شعلہ ہو، مگر ماں کے سینے جیسی پرسکون گرمی تمہارے پاس نہیں۔ تم جلا سکتی ہو، مرہم نہیں لگا سکتیں۔ توڑ سکتی ہو بنا نا نہیں آتا۔۔۔ہاہاہا۔۔۔سچ بتاؤ دنیا میں تمہارے ماں باپ تمہیں بہت ہی چاہتے ہیں؟''

''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔۔۔''

''مجھے یقین ہے بالکل نہیں چاہتے۔'' پروفیسر نے سختی سے بات کاٹی۔ ''یقیناً تم ان کی پھوٹی آنکھ کا تارا نہیں۔ جبھی تو ملک میں اتنا خطرہ پھیل رہا ہے، لوگ اپنے پیاروں کو دور لے جا کر چھپا رہے ہیں، مگر کسی کو معلوم بھی نہیں۔۔۔کہ تم جاندار ہو۔ تمہیں بھی حفاظت کی ضرورت ہے۔''

''میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔'' ''ہاں ہاں، یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تم اتنی ہوشیار ہو کہ اپنے ساتھ اور چار چھ کو بچا لے جاؤ گی۔ ناقدری اور دوسروں کی بے مروتی کی تم اچھی طرح سے عادی ہو چکی ہو۔ دنیا نے تمہارے زخم دکھا دکھا کر بے حس بنا دیا ہے۔ اسی لئے تمہارا وار زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ضرور شاعر

سے تم نے اپنے کسی عاشق کا بدلہ لیا ہے جو تمہیں نامراد سسکتا چھوڑ گیا۔''

''بڑے عقل مند معلوم ہوتے ہیں!'' جیسے ثمن کی زبان سوکھ گئی تھی۔

''چھوڑو میری عقل کو، اور مجھے تمہاری تنہائی پر ترس آتا ہے۔ بالکل اس سڑک کی طرح جس کے سینے پر رات دن راہگیر چلتے ہیں پھر بھی وہ خود اکیلی، خاموش اور بے جان ہے۔۔۔۔معاف کرنا، میں نے بارہا تمہارے چہرے پر مجمع میں تنہائی کا کرب دیکھا ہے۔ جب تمہیں دکھ ہوتا ہے، قہقہے لگاتی ہو، جب خوشی ہوتی ہے تو آنسو بہاتی ہو۔ ہر چیز کو تم نے دھوکہ بنا رکھا ہے۔ خیر دنیا کو دھوکہ دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اپنے آپ کو دھوکہ دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔''

''جی، شاید اپنی نئی کہانی کا پلاٹ بنا رہے ہیں۔''

''میری کہانیوں میں انسان ہیں مردے نہیں۔ میں زندہ یا قدرتی موت مرے ہوؤں پر لکھ سکتا ہوں۔ مگر تمہارے جیسے خودکشی کئے ہوئے غیر انسانی واہمے کے متعلق میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں اتنا ضرور مانتا ہوں کہ تم جیسے ہنستے کھیلتے مردے بہت کم دیکھے۔۔۔۔برا نہ ماننا جو کچھ کہا ہے جذبۂ رحم سے مجبور ہو کر۔۔۔کل جا رہا ہوں بی بی سی سے دعوت نامہ آیا ہے۔۔۔کاش میں اس سے قبل تم سے سچ بول سکتا۔''

''تو آپ مانتے ہی کہ آپ جھوٹے ہیں۔''

''اور کیا۔۔۔جھوٹے کے سامنے سچا ہمیشہ ماند پڑ جاتا ہے۔ اس لئے جھوٹ ہی چمکایا۔ پر آج جب تم سچ بولنے لگیں تو میرا اعجاب بھی ٹوٹ گیا۔۔۔اچھا ہی ہوا ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ۔۔۔''

''کہئے کہئے۔ آپ لوگوں کی دروغ زبانی نے اکتا دیا ہے اور جی چاہتا ہے کسی کے ہونٹوں سے سچ سنوں۔ کہئے خواہ وہ سچ میرے منہ پر جوتا بن کر ہی لگے۔''

''تو سنو۔۔۔بات یہ ہے کہ۔۔۔میں نے۔۔۔معاف کرنا تمہاری توہین ہوتی ہو تو۔۔۔تم سے کبھی شادی کی درخواست تو نہیں کی، اور نہ ہی ایسے ہی بے اصول پھکوا انسان سے کوئی لمبا چوڑا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ کم از کم اپنے ہوش وحواس میں تو تم جیسی غیر مستقل مزاج عورت سے سوائے وقتی دلچسپی کے کوئی گہرا تعلق قائم کرنے کی کوشش کروں گا نہیں۔ شادی تو بڑی چیز ہے، میں تو تمہارے پڑوس میں بھی نہیں رہ سکتا۔۔۔دیکھتی ہو ہماری ایک منٹ نہیں بنتی، ہم ایک دوسرے کو خطرناک حد تک تاڑ چکے ہیں۔''

''اچھا تو یہی تھا آپ کی صاف گوئی جس سے مجھے نقصان پہنچنے کا ڈر تھا۔''

''ہاں، مگر نہ تو تمہیں نقصان پہنچا اور نہ ہی دکھ ہوا۔ میں جانتا ہوں تم احساس کی حدوں سے باہر ہو چکی ہو۔ تمہاری خودداری کو اتنی ٹھوکریں لگی ہیں کہ وہ ایک بے حیا کتیا بن گئی ہے۔ تم سے اتنا چھینا گیا ہے کہ اب تم ہی سب کچھ اٹھا کر پھینک دیتی ہو۔''

''کوڑا جمع کرنے سے فائدہ؟''

''ہیرے بھی تمہاری نظروں میں پتھر بن چکے ہیں۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''ان میں سے ایک درخشاں ہیرا تو شاید آپ ہیں۔'' شمن نے انتقام بھرا قہقہہ لگایا۔

''میرا ذکر چھوڑو ہم تم ایک دوسرے کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے مگر تم نے شاعر کو ٹھکرا دیا، برا کیا۔ معلوم ہے وہ چھ سو روپیہ پر دار پروپیگنڈے کے سلسلے میں نوکر ہو گیا ہے۔'' پروفیسر شرارت سے مسکرایا۔

''تو آپ کا خیال ہے چھ سو روپے نے ان کی ساری کثافتوں کو دھو ڈالا ہے۔''

''کثافتیں صرف غربت سے ہوتی ہیں ورنہ تم کیا جانو ان لونڈر میں بسے ہوئے سینوں میں کیا کیا گھناؤنی گندگیاں پوشیدہ ہیں۔ میں تو اتنا کہنا چاہتا تھا کہ جنگ ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے، ہر چیز مہنگی اور انمول ہوتی جا رہی ہے۔ اچھا ہے ایک کارندہ پھانس لو وقت بے وقت کام آئے گا۔۔۔ میں تو بے کار انسان ہوں ویسے میں تو شدت سے طوائفوں کا حامی ہوں۔''

''کبھی ان کے ہمدرد بن کر۔۔۔''

''ہاں ہمدرد بن کر ہی تو چاہتا ہوں کہ ان کی حالت پیرس کی طوائفوں جیسی ہو جائے۔ جیسے تم تعلیم نسواں کو ضروری سمجھتی ہو میں۔۔۔''

''تو آپ ان کے وجود پر مصر ہیں!'' شمن نے بات کاٹی۔

''میں بے چارا کون مصر ہونے والا۔ دنیا مصر ہے اور رہے گی۔ انہیں دنیا سے مٹانے کی کوشش کر کے تو دیکھ لیا۔ مرض مٹا نہیں دب کر پہلے سے زیادہ سڑاندا پھوڑا بن کر سوسائٹی کی جڑ میں چھپ رہا۔ جس کی لپیٹ میں صد ہا چکے ہیں، اور آتے رہیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس زخم کو کم سے کم کھول کر مرہم پٹی تو کریں شاید صاف ہوا سے تعفن کچھ کم ہو جائے۔''

''ایک طرف اشتراکی بنتے ہیں دوسری طرف طوائفوں کے پیغمبر!''

''اشتراکی دنیا میں ان باتوں کا جھگڑا ہی نہ ہوگا۔ ہر ایک کو حسب ضرورت راشن۔۔۔'' پروفیسر مسکرایا

''غلط، بالکل غلط۔ یہ آپ نے نہ جانے اشتراکیت کو کیا سمجھ رکھا ہے۔۔۔۔ خوب، آپ کا خیال ہے وہاں عورتیں مفت دال چاول کی طرح بٹا کریں گی۔ غلط آپ لوگ بڑے زبردست مغالطے میں ہیں۔ سمجھتے ہیں جیسے جنت میں حوریں ملیں گی ویسے ہی اشتراکیت عورتیں بخشنے لگیں گی۔ بس تھیوری پڑھ لی اور اشتراکی بن گئے۔ ایسے اشتراکی ہندوستانی اشتراکی بے شک ہو سکتے ہیں مگر اصل مقصد اشتراکیت کا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کی کس بات کا یقین کیا جائے اتنے بڑے اشتراکی بنتے ہیں اور اتنی زبردست تنخواہ سمیٹے جا رہے ہیں۔''

''یہ میری قابلیت کے دام ہیں۔''

''جب آپ سے زیادہ قابل اور محنتی آپ کی تنخواہ کا پچاسواں حصہ بھی نہیں پاتے، آپ نے اس بے ہودہ نظام میں شرکت ہی کیوں قبول کی۔''

''مصلحت وقت ہے۔۔۔ دیکھنا کیا ہوتا ہے!''

کچھ نہیں بڑے بڑے دعوے دار روپوں کی ڈھیریوں میں دب کر گم ہو گئے تو آپ کی کیا حقیقت ہے اپنے کام سے کب فرصت ملے گی جو کچھ سوچیں۔ یاد ہیں وہ دن جب آپ گورنمنٹ افسروں کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ انہیں غلام کہتے تھے اور اسی گورنمنٹ کی نوکری کی ٹیٹھی میرے سر پر پٹخے آئے ہیں۔ بات یہ تھی کہ جب تک آپ کو چالیس روپے کی نوکری ملی آپ غصہ رہے جونہی یہ قارون کی دولت ملی حکومت کے پیارے بن بیٹھے۔۔۔ بس یہ ہے ہمارے نوجوان کی ذہنیت کا خلاصہ، یہ ساری ہائے ہائے، یہ کسان پرستی یہ گاؤں سدھار اپنی نوکری تک رہے۔ اب تو ہر طرف آپ کو شانتی نظر آتی ہے کوئی خون آشام آندھیاں نہیں اٹھاتا، کوئی سرخ بارش نہیں برساتا، نئی سرخی اتنی زرد کیوں پڑ گئی۔ روس کو مار کھاتا دیکھ کر سب کے منہ اتر گئے، ابھی روس جیتنے لگے دانت نکال کر ہنسنا شروع کر دیں۔''

''روس نے حماقت کی۔۔۔ جو ہٹلر سے لڑ بیٹھا۔۔۔ جانے دو سیاست میں ٹانگ اڑانا عورتوں کو نہیں بھاتا۔ مرغی اذان دینے لگے تو ذبح کر دینا ٹھیک ہے۔۔۔ ہاں تو میرے خیال میں سارے کام چھوڑ کر تم جیسے معمے حل کرنا چاہئیں۔ تم جیسی عورتیں ہی اس پستی کی ذمہ دار ہیں۔ جب پیٹ سے ہی بچہ تمہارے جیسے توڑ پھوڑ اور خودغرضی کے منصوبے باندھ کر آئے گا تو دنیا میں اس کے علاوہ اور کیا کرے گا۔ مگر تم کیا کرو۔۔۔ تمہارا قصور نہیں۔ قصور! بس بگلے نظام کا ہے جہاں تم جیسے بچے پیدا ہونے پر مجبور ہیں بھلا سوچو اس ذہنیت کے ساتھ ہمیں کیا احساس ہو سکتا ہے کہ ہمارا ملک خطرے میں ہے۔ اس سے قبل کہ دوسرے اس کا قیمہ کریں ہم خود ہی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ہم کیوں اپنے ملک کو ہمیشہ غیروں کے ہاتھ بیچتے آئے؟ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ہمارا نہیں ہمارے مالکوں کا ہے اور ہم بس ادنیٰ خادم ہیں۔ پھر مالکوں کی چیز سے محبت کیسی اور اس کی تباہی پر دکھ کیسا؟ کیوں نہ اسے بہتر داموں اٹھا دیں۔ بھلا فرق ہی کیا ہے کالے نہیں پیلے، پیلے نہیں سفید۔ کیسے ہی ہوں ہمیں تو آقا سے مطلب ہے، ہمارے ملک کی حیثیت ہماری نظروں میں کبھی بھی ایک بیسوا سے زیادہ نہ رہی۔ خودغرضوں کے ہاتھ ہمیشہ بکتا رہا۔ ماں، گائے اور زمین کی جتنی بے قدری یہاں ہے کہیں نہ ہوگی۔ پھر بھی ہم ان کی پوجا کی ڈینگیں مارتے ہیں۔ خیر تو مجھے اعجاز مسیحائی کا یقین نہیں مگر سوچتا ہوں شاید جڑوں کا ایک آدھ تار زندہ رہ گیا ہو اور بارش سے جاگ اٹھے۔۔۔ اور وہ پودا جسے ایندھن سمجھ لیا گیا ہے۔۔۔''

''ایندھن؟''

''ہاں۔۔۔ تم جیسی ہستیاں دنیا کی بھٹی کو گرم رکھنے کے سوائے ایندھن کے اور کس کام آ سکتی ہیں۔ یہی نا کہ مرنے سے پہلے دو چار سولڑکیوں کو چوڑیوں کے جوڑ ملانا اور ساڑھی باندھنا سکھا جاؤ گی۔ یہی ہوگی تمہاری قومی خدمت۔۔۔۔ لیکن شاید۔۔۔ ایک بات پوچھوں۔''

''جلدی سے پوچھئے اور۔۔۔''

''تمہیں کبھی کسی نے پیار کیا۔۔۔ اور جواب دینے کی ضرورت نہیں تمہارے مقدس ہونٹ تمہاری پارسائی کی گواہی دے رہے ہیں۔۔۔ میں سوچتا ہوں۔۔۔ تمہارے اوپر تجربہ کیا جائے تو کیسا رہے گا۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

پروفیسر نے سگریٹ پھینک دیا اور عجیب نظروں سے شمن کو دیکھا۔ اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچ سکے انہوں نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر نرمی سے اس کے باغی ہونٹوں کو چوم لیا۔

"بنئے۔۔۔ بدتمیز۔۔۔ جنگلی۔۔۔" مگر وہ کسے دھکا دے رہی تھی۔ لمبے لمبے قدم رکھتے وہ باہر اپنی سائیکل لے کر سڑک کے موڑ پر غائب ہو گئے۔ "ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو۔" اس نے اپنے دماغ میں اندر کسی باغی گھوڑے کو ٹاپیں مارتے پا کر چمکارا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بڑی بات نہیں ،سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر اب کیا ہو؟۔۔۔ کیا ہو؟ بگڑے ہوئے رہوار نے لگامیں تڑاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ اس وقت جانے دو۔۔۔ سوچنے کی بالکل گنجائش نہیں۔ رگیں بہت زور سے تن رہی ہیں۔ ذرا دباؤ ڈالا تو چٹاخ سے ٹوٹ جائیں گی۔۔۔ چلو چپکے سے پلنگ پر لیٹ جاؤ۔۔۔ نیند پاس ہی کھڑی ہے، زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔"

پھر اچھی بچی کی طرح وہ پیر اٹھاتی پلنگ کے پاس پہنچی سر سنبھال کر تکیے پر رکھا اور آنکھیں پپوٹوں سے ڈھک لیں۔

"آج تو اس نے کہنا مان لیا اور جو آئندہ نہ مانا تو مشکل ہو جائے گا اس بگڑے ہوئے دماغ کو منانا!" اس نے سونے سے پہلے فکرمند ہو کر سوچا۔

ہاتھ پیر آرام سے غنودگی میں ڈوب گئے۔ مگر دماغ سوتے میں بھی سہمی ہوئی سسکیاں بھرتا رہا۔۔۔ دور اپنے پیچھے اس نے گھوم کر دیکھا وہ لمبی چوڑی سڑک جس پر معلوم ہوتا تھا کسی اژدہے کے لہریئے کھنچے ہوئے ہیں۔۔۔ اس کے پیچھے دوڑتی چلی آ رہی تھی، دہشت زدہ ہو کر اس نے چاہا لوٹ جائے اور اس بھیانک نشان کو مٹا کر صاف ستھری سیدھی لکیر کھینچ دے۔۔۔ مگر یہ خم تو فولاد کے تار کی طرح ضدی ہو چکے تھے۔ ایک ہی چوٹ میں چیخ جائیں گے! منہ پھیر کر اس نے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دوڑنا شروع کیا، اور ناک کی سیدھ میں آنکھیں بند کئے بھاگتی چلی گئی۔

(41)

"یہ الٹا، یہ سیدھا!" اس نے لڑکیوں کو کشیدہ کاری سکھاتے وقت کپڑا فرش پر پھیلا کر بغور دیکھا۔ مگر وہ فیصلہ نہ کر سکی! کاش اسے معلوم ہو جاتا کوئی ایسی طاقت جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی، کبھی دھوکہ نہیں دیتی، اس کے کان میں آ کر بتا دیتی کہ کپڑے کا رخ کون سا سیدھا ہے۔ اگر غلط رخ پر کشیدہ بن گیا تو پھر کیا ہوگا؟ جنگ کی امداد کے سلسلے میں جو مینا بازار لگایا جانے والا تھا اس میں یہ چیزیں بے کار ہو جائیں گی۔

ویسے ہی اس کا کام کتنا سست پڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا مشین میں ہولے ہولے زنگ لگتا جا رہا ہے۔ پیچ اڑ گئے ہیں اور ہینڈل نہیں گھومتے۔ لائبریری کی نئی کتابوں پر ابھی نمبر درج نہیں ہو سکے تھے۔ رجسٹر ادھورے پڑے تھے۔ حاضریوں کو جوڑ کر میزان نکالنا، اس کا دم گھٹا جاتا تھا۔ اس جمع تفریق سے رسید کی کتابیں بغیر دستخطوں کے جمع ہوتی جا رہی تھی اور فرنیچر کی سالانہ جانچ نہیں ہوئی تھی۔۔۔ کیا ہوگا؟ یہ مشین کیسے گھسیٹی جائے گی۔

اور اوپر سے یہ کپڑا! صبح سے کئی بار وہ کام رکوا کر اسی غور میں ڈوب گئی کہ کپڑا سیدھا ہے یا الٹا۔ کئی استانیوں نے ایک رخ کے بارے میں رائے دی اور کسی نے دوسرے رخ کو سیدھا بتایا۔۔۔ مگر وہ رائے عامہ کے اوپر اس وقت بھروسہ نہیں کر سکتی۔ عوام کچھ نہیں جانتے آنکھ بند کر کے ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔

کئی بار اس نے سب سے چھپ کر بذریعہ قرعہ بھی صحیح رخ معلوم کرنے کی کوشش کی، چپکے سے دو پرچیاں لکھ کر پنوں کے ڈبہ میں ڈالیں۔ ہیڈ نیل کیا، او نک، اطمینان نہیں ہوا۔ اتنی بار دھوکہ کھانے کے بعد اسے کسی پر یقین نہ آتا تھا۔ کیا پتہ جو یہ قرعہ بھی جھوٹ بول رہا ہو۔ اسے پھنسانے کے لئے کوئی چال چل رہا ہو۔ اور اتنی باریک کشیدہ کاری غلط رخ پر کڑھ گئی تو کیسے ادھیڑی جائے گی۔ تمام کپڑے کا قیمہ ہو کر سوراخ ہو جائیں گے اور پھر ان گڑھوں کو کیسے پر کیا جائے گا؟ یہ ننھے ننھے مہاسے آنکھوں میں کھٹکیں گے اور اس کی نیندیں تلخ کر دیں گے۔

یہ اتنا کھچر پچر کام ہندوستان میں کیوں پسند کیا جاتا ہے؟ یورپ والے کیسے بڑے بڑے پھول کاڑھتے ہیں! دلکش بھی آسان بھی اور صوفیانہ بھی! لیکن یہاں تو ہر چیز ایک دوسرے سے چپکی ہوئی، ایسی کہ سانس بھی نہ لی جائے، ایک جانا اور اس کے ساتھ یہ مینا کاری! ہر چیز الجھی جا رہی ہے۔ الجھے ہوئے دماغ سے نکلی ہوئی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ساری چیزیں آپس میں گتھم گتھا ہوئی جاتی ہیں۔ کوئی انھیں کیسے بکھیرے؟

جوں جوں فروخت کا دن قریب آتا گیا اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ غارت ہو یہ وار فنڈ اور مینا بازار! کیا ہوگا اس پیسے سے لڑائی میں جائے گا اور مرہم پٹی کے کام آئے گا ایک طرف زخمی کرنے کے لئے نئے نئے آلے ایجاد ہوں گے۔ دوسری طرف ان کا مقابلہ کرنے کے لئے نرسیں دوڑیں گی۔ یہ خوب صورت کشیدہ کاری لاکھوں ٹینکوں اور بموں کی صورت میں انسان کی طرف سے انسان پر برسائی جائے گی۔ جسم پسیں گے، خون کے دھارے بہیں گے ظالم اور مظلوم سب ایک ہی دنی سے متھ دیئے جائیں گے!

اور یہ بھولے بھالے سپاہی، جنگ شروع ہوئی اور ان کے دام بڑھے۔ پھر تو سب ہی کچھ ان کا ہے ملک ان کا۔۔۔ عالیشان عمارتیں ان کی، قوم خطرے میں۔۔۔ ان کے باپ دادا کی ہڈیاں خطرے میں۔۔۔ شاندار عمارتیں، یہ مندر اور مسجدیں سب لن کی، جب تک سکھ چین رہا انہیں موسم کا پھل سمجھ کر کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور آج جنگ کے بھوکے دیو کا منہ بھاڑ کی طرح کھلا ہوا ہے۔ جھونکے جاؤ گھان پر گھان! اس کے بعد! جب کھیل ختم تو پیسہ ہضم، توپیں پگھلا کر ریل کی پٹریاں بنائی جائیں گی۔ بندوقوں کے فرانے بھرتے موٹر بنیں گے۔۔۔ تھوڑی سی دھات ان کے حصہ میں بھی تمغوں کی صورت میں آجائے گی جن سے آنے والے بچوں کے جھنجھنے بنائے جائیں گے۔ جب کٹتے مرتے انسان تھک جائیں گے، ملاپ ہو جائے گا، سپاہی اپنا کٹا ہاتھ یا پیر لے کر گھر جا بیٹھے گا اور جب تک منچلے پھر نہ لڑیں وہ کبھی کبھی استعمال ہونے والے ہتھیار کی پڑا زنگ کھایا کرے گا۔

جب لڑائی ختم ہو جائے گی اسکولوں میں چھٹیاں ہوں گی۔ ڈنر پارٹیاں ہوں گی اور سپاہی؟ اس سپاہی کا کیا ہوگا؟ اسے پگھلا کر چورا چکے اور ننگے بھوکے فقیر ڈھالے جائیں گے!

کوئی ان سے پوچھے کیوں لڑتے ہو کم بختو؟ مانا کہ آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور تمھیں کچھ سوجھتا نہیں، ذرا یہ بھی تو سوچو کہ جن ماؤں نے جنم دیا ہے ان کے جی پر کیا گزرتی ہوگی۔ خوش قسمت ہیں وہ مائیں جو بانجھ رہیں۔ یہ سب ان مردوں کا کیا دھرا ہے، انہیں یہ سپاہی جننا پڑتے تو پتہ چلتا کہ کیا بیتتی ہے جی پر!

مینا بازار کی کامیابی کا سہرا باندھنے سے پہلے ہی سر چکرا اٹھا، طاقت ضبط ہار گئی، توازن دماغ ڈگمگانے لگا ،لہٰذا چھٹی لے کر گھر آرام کرنے کے ارادے سے چلی گئی۔ یہ جنگ کے زمانے میں اپنوں کی ضرورت کتنی بے رحمی سے محسوس ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کسی میں جذب ہو کر چھپ جاؤ اور پھر عمر میں ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھنا چاہئے کہ اپنوں کی محبت کا کیسا مزہ ہے۔ شاید یہاں ہی اسے وہ سب کچھ مل جائے جس کی تلاش میں وہ اتنا بھٹکی کہ کوئی کوچہ نا آشنا نہ رہا۔

یہ بھائی بہن! اس نے انہیں بھولنے کی کیوں کوشش کی تھی۔ ایک ہی شکم میں سب نے تکمیل پائی۔ ایک ہی گھر میں بڑھے پلے جیسے ایک ہی پیڑ کی بہت سی پتیاں۔ مگر جب ڈال سے ٹوٹ کر ایک پتی گری تو زمانے کی

ہوا اسے کتنی دور اڑا کر لے گئی۔ لڑھکتے لڑھکتے جب تھک گئے تو اس نے پھر اچک کر شاخ پکڑ لی۔ عادت نہیں رہی تھی نا! اس لئے بڑا زور لگانا پڑا، کندھے کھنچ گئے۔ مگر واپس ماں کی گود میں کتنا سکون ملا۔ نیند سی آ گئی۔

ہیں؟۔۔۔ ساری دنیا تو اس کے گھر میں موجود تھی! اسی ایک خاندان میں کچھ ولائتیوں جیسے گورے بھبوکا، کچھ حبشی نژاد، کسی میں منگولی خون کی کڑواہٹ تو کسی میں ایرانیوں جیسا تیکھا پن۔ اور یہ سب چار پانچ عورتوں کی محنت کی کمائی تھی۔ اگر جرمنی کی طرح ہندوستان کو بھی مصفیٰ خون کی ضرورت محسوس ہو تو خالص دیسی مال کتنا رہ جائے گا یہی جتنی تل پر سفیدی، یا شاید اتنا بھی نہیں۔ آریوں کا حصہ اور افغانی، منگولی اور عربی خون اور پھر یہ جو تازہ تازہ ولایتی خون سامان جنگ کے ساتھ ساتھ لال کنڑوں میں بھر بھر کر آ رہا ہے، یہ؟۔۔۔ ہندوستانی مٹی ہر بیج کو نگل لیتی ہے۔

ان اودے پیلے رشتہ داروں سے اس نے مذہبی عقیدت کے ساتھ جٹ کر محبت کرنی شروع کر دی۔ اس نے کبھی بچوں کو چوما نہ تھا۔ اس لئے پہلے پہلے سخت ابکائیاں آئیں اور جی گھبرایا۔ کیا ناک تھوک میں لتھڑے ہوئے نامکمل انسان سے تو کتے بدرجہا بہتر ہے۔

اگر خزاں کی ماری پتی دوبارہ پیڑ میں لٹکنے کی ضد کرے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بار پھر سے بہار لوٹ آئے؟ گرا ہوا پھل طشتری سے بھاگ کر ڈال میں لٹکنا چاہے تو کیا وہ کامیاب ہوسکتا ہے؟ یہ مرغیاں ہی اگر اپنی ماں کے پوٹے کے نیچے گھسنے کی کوشش کریں تو کیا سما سکتی ہیں؟ لٹکے لٹکے اس کے شانے ٹوٹنے لگے جتنی جتنی گرفت مضبوط کی اس ہاتھ کے پھسلتے گئے اور جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ پیسہ خرچ کے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے، جنسی بھوک مٹائی جاسکتی ہے، پیٹ ناک تک بھرا جاسکتا ہے، مگر ممتا کسی داموں نہیں ملے گی۔ کسی کے بچے کو اپنانے کی کوشش ایسی ہی احمقانہ حرکت ہے جیسے کوا دم میں مور کے پر لگا کر مور بننے کی کوشش کرے۔ کوے ٹھونگیں مارتے ہیں سو الگ۔ الٹی مور موقع پا کر شامت بلا دیتے ہیں۔ ناجائز بچے کی ماں، پھر ماں تو ہے ورنہ اگر گولر پھول لگا لے تو کیا ہو؟ سب سے پہلے اس نے بڑے چاؤ سے بڑی بہن کی بچی پر دستِ شفقت پھیرنا شروع کیا۔ ماں بننے کے بعد شاید دکھ جھیلنے کی تمیز بھی خود بخود آ جاتی ہے مگر ٹمن کو تو الٹے لٹکنے کا مزہ آ گیا۔ نیں نیں بچی دن اور رات روتی۔ جی چاہتا اس جاندار ریڈیو کی ایک بار ہی اس کل مروڑے کہ سدا کے لئے چپ ہو جائے۔ گھٹنے پر لٹا کر بچے کو تھپکنا بھی ایک فن ہے۔ ایسی مشین جیسی رفتار ہو کہ سر جھٹکا نہ کھائے صرف جھومتا رہے اور پھر ساتھ ساتھ منہ اور تالو کی مدد سے انتہا سے زیادہ عجیب و غریب بے معنی آوازیں نکالی جائیں تا کہ بچے کو بیک وقت انسان، مرغی اور چرخے کی گود میں سونے کا مزہ آ جائے۔ تھوڑی سی سانس منہ میں جمع کر کے لفظ ''رے'' پر چھوڑ دی جائے ایسے کہ ایک پھوار کی صورت میں ''رے'' ڈھلتے ہوئے سکوں کی قطار کی طرح دوڑتے چلے جائیں۔ پھر تالو سے زبان لگا کر انگریزی کے لفظ (کیو) کو بار بار ایک خاص تناؤ سے نکالا جائے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بچے کی کنپٹیوں پر تھپکیاں بھی لگائی جائیں۔ اگر یہ تمام حربے بے کار ثابت ہوں تو دو چار آدمیوں کی مدد سے قریب رکھی ہوئی اشیاء کو بلا کر جھنجھوڑ کر جتنی بھی آوازیں مہیا ہوسکیں مع اوپر دی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہوئی ترکیب کے ایک شور قیامت کی صورت میں بچے کے دماغ پر نازل کی جائیں۔ اگر تھپکیاں باقاعدہ ہیں، گھٹنے کی رفتار سائنس کے مقرر کردہ اصول کی پیروی کر رہی ہے تو انشاءاللہ بچہ سو جائے گا۔ اور اس طرح سے سویا ہوا بچہ عموماً جاگتے میں بھی دماغی طور پر سوتا رہے گا۔

بچی کو صحیح و سالم واپس کر کے اسے یک گونہ اطمینان ہوا بھلے کو بچی عارضی تھی۔ اگر خدانخواستہ کہیں خود اس کے وجود سے مستقل طور پر پھوڑے پھنسی یا گانگن کی طرح پھوٹ نکلی ہوتی تو کیا حال ہوتا؟ کچھ تعجب نہیں کہ ہندوستان میں اس کثرت سے بچے مرتے ہیں خود اس کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اگر چپکے سے وہ بچی کی رضائی اتار کر کھڑکی کھول دے صبح تک نمونیا اور پھر شام تک جھگڑا ختم۔ چین سے پیر پھیلا کر سوئے۔ خود ان بچوں کی مائیں آنے والے جی کو خبر سنتے ہی پاس پڑوس کی دائیوں سے راز و نیاز شروع کر دیتیں۔ مرض تو نہ جاتا الٹی نئی نئی لتیں لگ جاتیں اور جب وہ نیا جی جنم لیتا تو بھی ہر ممکن کوشش اسے ختم کرنے کی کرتیں مگر آخر کو ماں ہوئیں نا۔ مارنا بھی چاہتیں تو نہ مارا جاتا۔ جونہی نزع کی حالت شروع ہوتی مامتا بے قابو کر دیتی۔ جاتی ہوئی روح واپس گھسیٹ لائی جاتی۔ ساری عمر گھسنے کے لئے۔

جب پہلی بچی کی ہیبت ذرا ختم ہوئی تو اس نے پھر ایک بچے کی سرپرستی شروع کی۔ یہ بدقسمتی سے ذرا کم رو تھا، صحت خراب تھی اور گندگی سے خاص انس رکھتا تھا۔ بہت دوا دارو کی مگر جملہ امراض اس کے جسم میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ کوئی ہی ایسا مرض ہوگا جو دائمی طور پر اس پر قابض نہ ہو چکا ہو۔ ویسے مرنے ورنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔

مجبوراً منجھو بی کی چینی کی گڑیا جیسی بچی کے نام قرعہ پڑا۔ بڑی تیاریوں سے کپڑے بنے اور اب کے ثمن نے سنجیدگی سے گود لینے کے مسئلے کو سوچا۔ جاتے وقت منجھو بی ایسا روئی جیسے وہ بچی کو زندہ دفن کر چلی، ہزاروں نصیحتیں! ''مارنا مت تمہارا غصہ بہت تیز ہے!'' وہ کہہ گئی، اللہ کی شان یہ وہی منجھو بی تھی جس نے ذرا سی عمر سے اسے انا سے لے کر پالا تھا۔ یقیناً وہ منجھو بی کی بدذات بچی سے تو ہزار گنا بہتر ہوگی جبھی تو پل بھی گئی پر اسے تو دو دن پالنا دوبھر ہو گیا۔

اب لی خبر کوؤں اور موروں نے۔ وہ چونچیں دھار رکھ کر جمائیں کہ مزہ آ گیا۔ بچی بھی سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی نہ اگلے بنے نہ نگلے۔

''چہ چہ۔۔۔ اے ہے اتنی سی جان کو ماں سے چھڑا لیا۔۔۔ توبہ۔''

''اے ہے پرائے بچوں پر کیا چونچلا، ایسا بھی ظلم نہیں چاہیے۔'' جتنی زبانیں اتنی بکواس، جلتی اور اس امید میں سر جھکا لیتی کہ شاید لوگ تھک کر چپ ہو جائیں گے۔

وہ طعنے بھی برداشت کر لیتی کیونکہ بچی غضب کی پیاری تھی مگر رات کو ظالم نے وہ ستم ڈھایا کہ جاڑوں کی رات میں اولا برف پانی سے نہلانا پڑا۔ دوسرے دن نمونیا اور دو چار دن میں بچی ختم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچی اسے شرمندہ کرنے کو شرط لگا کر مر گئی۔ رنج کو شرم اور غصہ نے دبا لیا۔ جی چاہا کاش وہ دن واپس لوٹ آتے

جب منجھو بی اسے پال رہی تھی۔ کیا کیا ظلم جو تا کرتی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو منجھو بی کے منہ پر طمانچہ مارنے ہی کو مر جاتی۔ دو دن بعد منجھو روتی پیٹی کا لک ملنے آ پہنچی۔

ایسی ایسی باتیں سننا پڑیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ منجھو نے سارا الزام اس پر تھوپ دیا۔ بس نہ تھا جو وہ اسے قتل عمد کے جرم میں گرفتار کرا دیتی۔ ثمن کے بس میں ہوتا تو وہ ایسی ایسی دس بچیاں جن کر منجھو کے منہ پر کھینچ مارتی۔ تو بہ اتنا چھچھورا نہ سمجھتی تھی منجھو کو، اس کا دل رکھنے کو رونے کی بھی کوشش کی بچی کے سارے نئے نئے کپڑے خیرات کر دیئے اور دھوم دھام سے پھول چالیسواں کیا، گویا بچی نہیں گناہوں کی پوٹ مری تھی جس کی بخشش دشوار تھی۔

اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں نے سمجھاتے وقت صاف کہہ دیا کہ یہی بچی منجھو کو انگلی پکڑ کر۔۔۔ جنت میں لے جائے گی۔ یہ معصوم بچے جنتی ہی نہیں بلکہ زبردست سفارشی بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ جو کچھ ثمن نے پھول چالیسویں پہ روپیہ بہایا سب منجھو کے توشہ خانہ میں جمع ہو گیا۔ پھر بھی منجھو کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر روتی رہی۔

ایک سرپھرا ضدی بیج چٹان کے سپاٹ سینے سے چپک کر پھلنے پھولنے کی آس لگا بیٹھا لاکھوں موجیں آئیں کہ بہا کر لے جائیں مگر چٹان سے سر پھوڑ کر لوٹ گئیں۔ پھر ایک دن وہ بیج بھی پتھر بن گیا۔ پروفیسر کا خط آیا۔ ''یہاں لڑکیاں اتنی فیاض ہیں کہ شادی فضول معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم بطور مہمان (یاد رہے لفظ مہمان) آنا چاہو تو مکان کافی وسیع ہے۔''

پتھر بن جانے والا بیج اس تھوہر کے بے حیا جھاڑ سے بدرجہا غنیمت ہے، جو گھن بن کر سوسائٹی کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ وہ انسانی بھیڑیا جو کرسیاں توڑنے کا کرایہ ہزار روپے وصول کر رہا ہے، دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کر رہا ہے؟ ثمن نے جواب دیا۔ ''مہمان نوازی کا شکریہ اگر ایسا وقت آن پڑا تو دیکھا جائے گا۔''

''وقت چھپڑ پھاڑ کر نہیں آ پڑے گا۔ تمہیں خود لانا پڑے گا ورنہ یہ وقت آنے میں تو دیر کرتا ہے جانے میں ایسی تیزی دکھاتا ہے کہ سوائے ہاتھ ملنے کے کچھ نہیں رہ جاتا۔ ذرو اس وقت سے جب تمہیں کہنا پڑے۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

اس عرصے میں اس نے ایک اور بچہ کو اپنانا چاہا مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ انسان یکسانیت سے کیوں گھبرا جاتا ہے۔ جتنی اس نے پرورش کی یہی اندازہ ہوا کہ اس کی حیثیت بالکل اس زمین جیسی تھی جس کی چھاتی پر چڑھ کر ہر ایک اپنا پیٹ بھر لیتا ہے مگر پھر اسے بنجر کہہ کر چھوڑ جاتا۔ یوں تو یہ بچہ بالکل سیدھا سادہ تھا مگر باوجود کوششوں کے اس نے اپنی ماں کے آنچل سے جھولنا نہ چھوڑا۔ ثمن سے اپنی خاطر کروا کر وہ سیدھا ماں کے کلیجے سے لگ بیٹھتا۔

''پرایا۔۔۔ پرایا، اس کے کانوں میں بار بار یہ [illegible] تھے گا۔ ایک بار ہی اس نے جھنجھلا کر ساری بندشوں کو توڑ ڈالا!۔۔۔ کوئی نہیں اس کا، اور اسے نہ [illegible] بھی [illegible] ہے'' وہ خود اپنا کافی ہے؟

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

دوسرے دن شام کی گاڑی سے اس گھر سے ہوئے "خود" کو سمیٹ کر روانہ ہو گئی کہاں؟۔۔۔وہ کہاں جا رہی ہے؟ یہ اس نے بالکل نہ سوچا اتنی لمبی چوڑی دنیا میں وہ جہاں چاہے جا سکتی ہے۔اور کیوں نہ جائے، مانا کہ کوئی منزل نہیں یہ اور بھی اچھا ہے۔کیوں ہے کوئی منزل؟ ان بادلوں کی بھی تو کوئی منزل نہیں جہاں اور جدھر جی چاہا بغیر پروگرام بنائے چل نکلتے ہیں۔جہاں جی چاہا، برس گئے۔جی چاہا تو بھیگے کو بھگو دیا اور جی نہ چاہا تو پیاسوں کو ترساتے نکل گئے۔ان آندھیوں کا بھی تو کوئی گھر نہیں۔ادھر کا کوڑا ادھر گھسیٹ لے جانا، سنسان غاروں میں چیخیں مار مار کر دوڑنا، چٹانوں پر سر پھوڑنا، دریا کی چنچل موجوں سے الجھنا اور یونہی اُٹھتے گرتے رہنا۔لطف بھی تو ہے اس خانہ بدوشی میں۔شاید کبھی کہیں ساحل مل جائے! اور یہ بھی بھٹکتی ہوئی ناؤ پار لگ جائے جو نہ لگی تو بھی کیا ہے؟ کچھ حرج ہے اسی طرح بہتے چلے جانے میں نہ پتوار نہ بادبان اور نہ ناخدا کا احسان!

آگرہ!

وہ اتر پڑی نہ جانے کیوں جی چاہا تاج محل کو دیکھے، شاید عشق و محبت کی اس عظیم الشان نشانی کو دیکھ کر دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔کیا لوگ تھے! بیوی کی محبت میں کیا کچھ بنا کر چھوڑ گئے تھے۔کتنا مقدس رشتہ ہے یہ بھی۔مگر ایسی ہی یادگار کوئی دنیا والوں کی محبت میں نہیں بنا دیتا۔جبکہ لاکھوں ہزاروں سڑک کے پتھروں پر سر رکھ کر زندگی گزارتے ہیں۔شہنشاہ اور ملکہ کی روحیں کیونکر چین سے پیر پھیلا کر سنگ مرمر کے سائبان تلے سو سکتی ہیں؟ باقی عمارت میں چمگادڑیں اور الو بستے ہیں مزے ہیں ان کے۔ان الوؤں سے تو کوئی ٹیکس بھی نہیں وصول کرتا! بس یہاں تو مردوں اور چمگادڑوں کے ہی ٹھاٹ ہیں۔اگر سکھ اٹھانا منظور ہو تو ایسے کرو کہ دوسرے جنم میں چمگادڑ یا الو کے روپ میں آنا ہے۔یہی مکتی کا بلند ترین درجہ ہے۔

ہمیشہ سنا کرتی تھی کہ چاندنی رات میں تاج بیچ اندر کی پیشانی پر جگمگاتا ہوا کلمہ دکھائی پڑتا ہے۔لیکن دن ہی میں اس کے اس عظیم الشان لاش کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔شام ہوتے ہی شوقین مزاج کونے کھدروں میں داد عشق دینے کو آ موجود ہوئے۔سستے مال سے آراستہ "حوریں" جن کے چہرے سفید پاؤڈر کی افراط سے جھولی میں دبائی ہوئی شکرقندی کی طرح نیالے ہو رہے تھے اور وہ اس جشن عیش میں بھتنیوں کا کردار ادا کرنے کے لائق بھی نہ تھیں۔

یہ مردے کے سینے پر بیٹھ کر جینے میں ان لوگوں کو خاص لطف کیوں آتا ہے۔کیا کشش ہے ان قبرستانوں میں جو زندگی کی ہر حسین انگڑائی ان ہی کے سر پر توڑنے کو جی چاہتا ہے۔شاید جذبہ انتقام کچھ تسکین پا جاتا ہے۔"تم نے اپنی نامہ دری کے لئے صدیوں کا خون ان عمارتوں کی بنیادوں میں نچوڑ دیا۔۔۔ اور ہم۔۔۔ یہ فعل کرنے سے نہیں جھجکتے۔کاش انتقام سیدھے راستے پر چل سکتا اور یوں نہ بھٹکتا۔"

لاہور!

اس کا اور بھی جی گھبرایا۔اگر اسے اختیار رہتا ہوتا شاید اس سے زیادہ دلچسپ بنا پا سکتا تھا۔وہ

جہاں کے مقبرے کی عرصے سے دھوم سنی تھی مگر اسے یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی کہ وہاں بھی گدھوں کو ہی سکون نصیب تھا۔نور جہاں! دل کی گہرائیوں میں ایک عورت کی فتح دوسری عورت کے دل میں کچھ کھٹک سی پیدا کر دیتی ہے۔آخر ایسی کون سی بات تھی جو نور جہاں سیم کی ہستی پر یوں چھا گئی اور کون جانے اسے شیر افگن سے زیادہ عشق تھا یا جہانگیر سے!۔۔۔یا پہلے شیر افگن سے اور پھر جہانگیر سے! اور ہو سکتا ہے ایک ہی وقت میں دونوں سے رہا ہو، عورت کے دل میں محبت کی جدا جدا کوٹھڑیاں ہیں کسی میں ماتا کی، کسی میں شوہر کی محبت۔۔۔اور کسی میں عاشق کی! اور پھر اس نے خود اپنے دل میں جھانک کر دیکھنا چاہا۔یہ ان کوٹھڑیوں میں کیا ٹھنسا ہوا تھا۔دھند اور بادل کے سوا کچھ نہ سوجھا۔کاش وہ ان الجھے ہوئے ڈوروں کو سلجھا کر الگ الگ پنڈیاں بنا کر رکھ سکتی۔عاشق محبوب اور دشمن سب ہی کے چہرے دھندلے ہو چکے تھے۔پنسل لے کر صرف ضروری نقوش گہرے کر دیتی اور باقی وقت کے گھسوں سے آپ ہی مٹ جاتے۔اسے ہر چیز بیمار اور بدنما نظر آئی۔نو نے مکان بنا جانے والوں کو کھڑے کوس رہے ہیں۔سڑتی ہوئی موریاں جو کسی کی ملکیت نہیں، بوجھ کے کتے سڑک کے بدنصیب بچے، نہ جانے کس کی فرماں برداری میں کس کی رکھوالی کر رہے ہیں۔لمبے چوڑے دیواروں پر پھیلے ہوئے گھناؤنے امراض کے علاج جو پکار پکار کر بسنے والوں کی مردانگی کی داد دے رہے ہیں۔اس کی سوتیلی بہن نئی دہلی؟ صاف ستھری، اجاڑ، سنسان! معلوم ہوتا ہے چمگادڑیں یا روحیں بستی ہیں۔بالکل جدید تاج محل کا نمونہ کبھی۔۔۔بت اور نئے آقا آئیں گے تو اسے ان کے ابدی مالکوں کو سونپ کر نئے استھان بنائیں گے۔

مگر یہ قطب مینار اتنا بلند مگر کتنا بے کار! یہ اکیلا پاگل سا دروازہ اس کے کیا معنی، یہ کیوں بھوت کی طرح ہاتھ پھیلائے کس کے لئے آغوش وا کئے ہوئے ہے؟

کہاں؟ کہاں؟ وہ کہاں جائے؟ اس بھول بھلیاں میں راستہ کیوں نہیں ملتا۔جی چاہا پردہ پھاڑ کر باہر نکل جائے۔پرسکون خلا میں کچھ نہیں ہوگا اور کتنا سکون ہوگا۔روپیہ ختم ہو چلا تھا۔واپس جا کر کہیں نوکری تلاش کر لینا مشکل کام نہ تھا مگر کیوں؟ یہ وہ کس سے پوچھے، ایلما سے ایک دم یاد آ گئی یقیناً اس نے اپنی "کیوں" کا جواب پا لیا ہوگا۔وہ اسے ضرور تسکین پہنچائے گی۔وہ سیدھی بانکی پور روانہ ہو گئی۔

ایلما کو دیکھ کر اسے رشک ہوا۔وہ کتنی سنبھل چکی تھی۔وہ مسلسل تھکان کے آثار مٹ چکے تھے اور بڑی مستعد اور چست نظر آ رہی تھی۔تھا ہی کیا ایک دوسرے کو بتانے کے لئے سوائے تنہا اور نہ گزرنے والی فضول گھڑیوں کے۔پھر بھی ایلما خوش تھی اپنے حسابوں دو رالف کی بیوہ کی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔سسرال، میکا، شوہر سب اس ایک جان کے وجود سے ملا اور کھو گیا۔

پروفیسر ناتھن اب بھی اس پر مہربان تھے۔شام ہوتے ہی آ جاتے اور رات گئے تک گپ شپ رہتی۔کتابوں کے اس کیڑے کو اتنا زندہ دل دیکھ کر وہ متحیر رہ جاتی۔اس کے ساتھ اور بھی چند پروفیسر آ جاتے۔

"ان سے ملو شمن، روفی میر۔" ایلما نے اسے ایک طرف بلا کر کہا اور شمن نے دیکھا وہ ایک چھوٹے سے سر اور شربتی بالوں والے گورے سے ہاتھ ملا رہی ہے۔اس نے مجبوراً رسمی تعارف کا جواب دیا۔اسے ایلما کا یہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

طریقہ قطعی پسند نہ آیا۔ ٹیلر کو وہ اس قدر عزت اور عقیدت سے دیکھ رہی تھی گویا کوئی معمولی کورا نہیں بھگوان میں پدھارے ہیں۔ اسے ان ہندوستانیوں سے ازلی نفرت تھی جو ان سفید چمڑی والوں کے ذرا سے التفات سے پھولے نہیں سماتے۔ اتنا نہیں جانتے کہ یہ لوگ جو ہم سے ملتے ہیں تو صرف اس لئے کہ واپس اپنے ملک جا کر لوگوں کو حیرت زدہ کریں کہ وہ ہم درندوں کے اتنے قریب پہنچ کر مطالعہ کرتے رہے۔ پھر بھی نہ ہم نے انہیں کاٹا اور نہ ہماری سیاہی نے ان کی سفیدی کو گندا کیا۔ ہماری تصویریں دکھا دیں گے کہ یہ ہیں وہ جنگلی بندر جنہیں ان کی تہذیب کی ہوا نے کپڑے پہننا سکھا دئیے ہیں۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں شمن چپ چاپ ہو رہی تھی اس نے کئی بار گفتگو میں دلچسپی لینے کی کوشش کی مگر پھر دلی الجھن میں کھو گئی۔ آخر کار وہ کتابوں کی الماری ٹٹولنے لگی کہ کہیں لوگ اسے بالکل احمق نہ سمجھیں۔

''ضرور پڑھو۔۔۔لاجواب ہے۔'' اس نے مڑ کر دیکھا ٹیلر اس کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا جو شمن کے ہاتھ میں تھی۔

''شکریہ!'' اس نے بے توجہی سے کتاب رکھ دی اور دوسری اٹھالی۔

''ایک بات۔۔۔'' ٹیلر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی: ''میں انگریز نہیں آئرش ہوں۔ سفید رنگ کا ہر آدمی انگریز ہی ہوسکتا ہے۔ اس رنگ کی کچھ ایسی ہیبت بیٹھی ہوئی ہے کہ دوبارہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں آج تک کتوں، گھوڑوں اور ان غید انسانوں کی بھی پہچان نہ ملی تھی۔ سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں، وہ بہت سے لوگ دانتوں، کھروں اور چال سے نسل پہچان لیتے ہیں پر نہ جانے کیسے؟

''اسکی کیا ضرورت تھی۔''

''اوہ میں خوب جانتا ہوں۔'' اس نے شرارت سے اپنی بے پلکوں والی آنکھ ماری کہ بڑی آسانی سے شمن اس اقدام جرم میں پکڑوا سکتی تھی۔ ''تم لوگ سفید چمڑا دیکھ کر ہی بدظن ہو جاتے ہو اور اس میں تمہارا قصور نہیں۔''

''بدقسمتی ہماری!'' جل کر شمن پھر کتابوں کی طرف جھک گئی۔

''میرے پاس کچھ تازہ ترین کتابیں ہیں اگر شوق ہے تو۔۔۔'' شمن کو بے اعتباری سے دیکھتا پا کر وہ کچھ کھسیانہ سا ہو گیا۔ ''معاف کرنا اگر کوئی گستاخی ہوگئی ہو کہتے ہیں عورت کو سلام بھی کرو تو گالی سمجھتی ہے۔۔۔ مگر میں سمجھا تھا تم ایلما کی دوست ہو۔۔۔شاید تم بھی اسی کی طرح۔۔۔'' اتنے میں ایلما نے چائے کے لئے پکار لیا۔

''ارے تم ٹیلر سے نہیں ملیں شمن۔۔۔''

''ہم مل چکے!'' ٹیلر نے مسخری صورت بنا کر کہا۔

''ارے نہیں۔۔۔شمن یہ جرنلزم کے بہت شوقین ہیں۔ لڑائی میں شریک ہونے سے پہلے۔۔۔ یہ لکھا کرتے تھے ٹیلر؟''

''نمائندے تھے اخباروں کے۔'' پروفیسر ناتھن بولے۔

''بڑے لائق آدمی ہیں اور۔۔۔ ہاں بھئی اٹھو سینما نہیں ملے گا پھر۔'' ایلما نے بے وقوفوں کی طرح سب کو گڑبڑانا شروع کیا۔

فلم ردی ہی نہیں انتہا سے زیادہ بیکچر تھا۔ چند گورے جنگلیوں کے بیچ میں داد طلب بہادری، سخاوت اور انسانیت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ٹیلر چند سیٹیں چھوڑ کر بیٹھا تھا مگر کئی دفعہ جب شمن نے اس کی طرف دیکھا تو اسے بھی اپنی طرف دیکھتا پایا اور کئی بار بے ساختہ دونوں کو ہنسی آ گئی۔

''اب یہ بھی میرے اعمال نامے میں لکھ لیا۔'' کھیل کے ختم ہونے پر ٹیلر نے ملزمانہ صورت بنا کر کہا اور شمن زور سے ہنس دی۔

رات کو ایلما نے ٹیلر کی بے انتہا تعریف کی۔

''تم بھول رہی ہو کہ یہ سفید چمڑی والے کیا ہوتے ہیں۔ یہی دیکھو یہ دنیا کے مارے دھتکارے یہودی، پولش اور نہ جانے کون کون صرف اپنی چمڑی کے بل بوتے پر یہاں آ کر اینٹھنے لگے۔ آج کل تو جسے دیکھو شیر کی کھال اوڑھے شیر بنا پھرتا ہے۔ یہاں تو جو مہمان بن کر آتا ہے۔ آقا بن بیٹھتا ہے۔''

''کچھ اس میں ہمارا بھی قصور ہے، ذرا بازار میں جا کر دیکھو ہزاروں فقیر، بھک منگے اور دکاندار ''صاحب'' ''سرکار'' کہہ کر دوڑ پڑتے ہیں''۔

''وہ بے چارے کیا جانیں کون ہیں یہ، چاہے وہ انہیں کی طرح کنجڑے جلاہے ہوں۔ مگر معلوم تو صاحب ہوتے ہیں اور رہتے بھی ٹھ ٹھ سے ہیں۔ ہم سے تو ہمارے مہمان ہی اچھے ہم خود بھوکوں مر رہے ہیں مگر یہ دیکھو میزبانی میں فرق نہیں آتا۔ جب انہیں تمیز سے رہنا نہیں آتا تو پھر دھکا مار نکال دینے کو کیوں جی نہ چاہے۔''

''ارے یہ بھی مظلوم ہی ہیں ہٹلر کے مارے۔''

''ہٹلر کے مظلوم بھی ہمارے ظالم ہیں، ذرا سوچو ہمیں ان سے کیا ہمدردی ہوسکتی ہے۔ ہم ہٹلر سے بچ کر کہاں جائیں؟ ہمیں تو کوئی اپنی زمین پر قدم بھی نہ دھرنے دے گا'' مگر ایلما اونگھ چلی تھی۔ نہ جانے اس کو کیا ہوتا جا رہا تھا کالج کی وہ جوشیلی ایلما مر چکی تھی اور اب یہ ہاری ہوئی ایلما ہر مجبوری کے آگے سر جھکانے لگی تھی۔

صبح اٹھ کر ایلما نے کہا کہ نوکر کو لے کر شہر سے جنس لے آئے کیونکہ اسے کچھ حرارت معلوم ہوتی تھی۔ اناج کی قلت نے بری طرح پریشان کر رکھا تھا۔ اور جگہ تو راشننگ ہوگئی تھی مگر اس حصہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔ روز بروز اناج اپنی مرضی سے مہنگا ہوتا جا رہا تھا۔ گھر میں جتنا پہلے گھی کا خرچ تھا اس سے چوگنا تو صرف گیہوں پر صرف ہو جاتا تھا اور گھی کا تو کیا پوچھنا، گھاس کا گھی بھی انمول ہوا جا رہا تھا۔

''ہیلو!'' کسی نے پکارا۔ شمن نے مڑ کر دیکھا تو ٹیلر اپنی چندھی آنکھوں میں جاذبیت پیدا کرنے کی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کوشش کر رہا تھا۔

''تھک گیا ہوں اس رینگتے ہوئے ست ہندوستان سے، سوچا لاؤ کوئی مصیبت ہی مول لوں۔'' وہ شرارت سے مسکرایا اور شمن کو بھی ہنسی آ گئی۔

''ارے مجھے سخت ناامیدی ہو رہی ہے؟''

''کیوں؟''

''میں سمجھتا تھا گرج کر برس پڑو گی۔۔۔ خیر فال اچھی رہی اس لئے دوسری ترکیب چلنا پڑے گی۔''

''وہ کیا؟''

''کہ چلو میرے ساتھ چائے پیو۔''

''مگر میں سامان خریدنے آئی ہوں۔''

''چلو پہلے سامان خرید لیں پھر نوکر کو چلتا کریں گے۔''

ہر دکان پر ٹیلر کو دیکھ کر دکاندار نے چوگنے دام کر دیئے۔ چاروں طرف سے وہ لے دے مچی کہ شمن کو اسے رخصت کرنا پڑا۔

''تم سامنے ہوٹل میں ٹھہرو میں سامان خرید کر آتی ہوں۔''

''کیوں؟۔۔۔'' وہ بگڑا۔

''تمہاری موجودگی سے بھاؤ بگڑے جا رہے ہیں۔''

''ارے وہ کیسے؟ اچھا اب میں کچھ بولوں گا بھی نہیں۔''

''وہ تم کچھ بھی کرو، تم بھی تو شاہی خاندان سے ہو اس لئے۔''

''میں کیوں ہوتا شاہی خاندان سے ہشت!''

''یہاں والے ہر سفید چمڑی والے کو بادشاہ سلامت کا بھائی بھتیجا ہی سمجھتے ہیں۔۔۔ انکساری ہماری گھٹی میں پڑ چکی ہے۔۔۔ اور تم جانتے ہو یہ گھٹی قریب سو سال سے ہمیں کون پلا رہا ہے۔''

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ٹیلر جا کر ہوٹل کے دروازے پر کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا، شمن خوب بھاؤ تاؤ کر کے سامان خرید چکی تو گاڑی کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔ ٹیلر بالکل اس کے ذہن سے اتر گیا لیکن جونہی وہ گھر پہنچی اسے فوراً یاد آیا اور جلدی سے سامان اتروا کر اس نے اسی گاڑی میں واپس بھاگنا مناسب سمجھا۔ جونہی گاڑی مڑی پھاٹک میں داخل ہوتی ہوئی دوسری گاڑی سے قریب قریب ہم آغوش ہو گئی۔ گاڑی بان ایک دوسرے کو خوبصورت رشتوں سے نوازنے لگے۔ دیکھنے کے لئے سر باہر نکالا تو ٹیلر کو اترا دیکھ کر سن رہ گئی۔

''میں بالکل بھول گئی'' اس نے لجاجت سے کہا۔ ''سامان کی گڑبڑ میں۔''

''یہ میری عزت افزائی ہے!'' ٹیلر نے طنزیہ ادب سے جھک کر کہا ''مجھے پتہ نہ تھا کہ ایک زندہ انسان سے تمہیں ہلدی دھنیا اور چاول زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے تمہارا وقت ضائع کرنے کی کوشش

کی مگر میں داد دیتا ہوں کہ تم ناگوار چیزوں کو بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیتی ہو۔'' وہ مڑ کر چلا۔

''مگر۔۔۔ شمن کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور وہ پھر لوٹا۔

''کس گاڑی میں چلو گی۔۔۔ اپنی میں یا یہ جو میں لایا ہوں۔'' اس نے بالکل ایسے پوچھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

جب گاڑی کافی دور نکل گئی تو ٹیلر ایک دم ہنسنے لگا۔

''اوفو۔۔۔ یہ لڑکیاں!''

''تم دل ہی دل میں ہم ہندوستانی لڑکیوں کو جنگلی، غیر مہذب اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہو۔۔۔ مگر۔۔۔''

''مگر ہندوستان پر کیا موقوف، دنیا بھر کی لڑکیاں ایسی ہی وحشی ہوتی ہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔ ''تم سمجھتی ہو ہماری لڑکیاں ادھر بلایا اور دوڑیں۔''

''کم از کم ہندوستانیوں کا تو یہی تجربہ ہے، دیکھ لو یہاں تک بندھی چلی آتی ہیں۔''

''غلط بالکل غلط۔ جو ہندوستانی یہ کہتے ہیں وہ ایسی دیسی لڑکیوں سے ملتے ہوں گے، وہاں کی اچھی تعلیم یافتہ لڑکیاں بڑی خشک ہوتی ہیں۔ اور یہ ننگی بھوکی فقیرنیاں کہاں نہیں گرتیں۔''

''تو وہاں بھی لوگ ننگے بھوکے ہیں؟'' شمن نے بن کر طعنہ دیا۔

''کیوں نہیں تم سمجھتی ہو وہاں سب لارڈ اور بیرن ہی رہتے ہیں۔ تم جو مٹھی بھر انگریز دیکھتی ہو یہ تو ہندوستان کی قسمت سے ایسے نظر آتے ہیں ورنہ جب تک دنیا میں شیطان موجود ہیں لوگ ننگے بھی رہیں گے اور بھوکے بھی۔''

''اس حد تک؟'' گزرتی ہوئی گاڑی میں سے شمن نے مرجھائے ہوئے سڑاندے فقیروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''نہیں اس حد تک تو نہیں۔'' ٹیلر نے پھریری لی۔ ''ہندوستان آنے سے پہلے نہ جانے کیا کیا سوچتا کرتا تھا۔۔۔''

''یہی کہ بس نواب راجہ، سونے ہیرے سے مرصع ہاتھی۔۔۔''

''بالکل یہ تو نہیں پر ہاں خیال تھا اتنے دن کی حکومت میں ان لوگوں نے کچھ تو کیا ہوگا۔ مگر یہاں آنے سے کچھ دن پہلے ہی میں نے ایک آدھ کتاب ہندوستان کے متعلق پڑھی تھی پھر بھی یہ دیکھنے کی امید نہ تھی۔''

''اور یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد سارا الزام ہمارے ہی سر رہا نا!''

''سارا تو نہیں۔۔۔ کچھ ضرور۔۔۔''

''لیکن یہ بھی سوچا کہ وہ کچھ بھی ہمارے سر منڈھنے کا۔۔۔''

''یہ تم لوگوں کی میں نے عجیب خصلت دیکھی ہے کہ تم اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ بے گناہ اور غیر

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ذمہ دار ظاہر کرنے میں فخر سمجھتے ہو۔ آخر انسان ہو، حیوان تو نہیں۔''

''حیوانوں کے ہاتھوں مجبور تو ہیں۔''

''اور جیسے ہندوستانیوں میں ایسے حیوان نہیں۔''

''ہیں انہیں کے پٹھو۔''

''تو یہ کہو یہاں کے اور وہاں کے حیوانوں کے جتھے نے ایک دوسرے کی مدد سے ملک کا یہ حال بنا رکھا ہے مگر سچ بتانا، اپنی ذات سے تم نے اب تک اس جتھے کو توڑنے کی کیا کوشش کی ہے۔ کونسی قربانی کی ہے؟''

''قربانی کرنے والوں کی گت دیکھی تم نے۔ کیا حال کیا گیا ان کا۔''

اور واقعہ بالکل تازہ تھا۔ ملک کی سب سے بڑی جماعت نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ بغاوتیں ریل کے ڈبوں میں پورے زور وشور سے رونما ہوئیں۔ سفید قوم کو کھلا ''حکم'' مل گیا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے نہیں مانگتے تم کو ورنہ بسیں جلا ڈالیں گے، ریل کی پٹریاں اکھیڑ دیں گے، یہ تمھارے ہیٹ اور ٹائیاں جلا دیں گے۔ مگر سفید بادشاہت اس بغاوت کے زکام کو بجائے گولہ بارود کے لاٹھیوں سے ہی راہ راست پر لے آئی۔ چوہے دان کا پٹ کھلا اور بالائی غائب! دو چار دن ہی میں بے سری فوج کو حکومت کے ہاتھی نے روند کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ انہسا بھی اتنی بے ضرر نہ تھی جتنی یہ بغاوت ثابت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا چند ناسمجھ بچے مچل گئے تھے کہ ہم تو چاند لیں گے۔ ایسے بچوں کو تو بس دو طرح سے درست کیا جا سکتا ہے یا تو پنی کا چاند دے دو۔ مگر یہ بچے بڑے ہوشیار ہیں، صاف پنی کو پہچان گئے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ ایک تھپڑ اور کہہ دو ''جب ابا بازار سے آئیں گے تب چاند ملے گا۔''

مگر کون جانے جب ابا بازار سے آئیں تو تھکے ہوئے ہوں یا ایک سرے سے چاند کی ضرورت ہی نہ سمجھیں۔

''اتنا سلیقہ نہیں انہیں کہ چاند سچ مچ کا دے دیا جائے۔ پھاڑ پھوڑ کر الگ کریں گے، آپس میں بھائی بھائی جھگڑیں گے، نوچ کھسوٹ کر پھینک دیں گے۔ ہمارے پاس سیف۔۔۔ میں رکھا ہے چاند حفاظت سے، جب بڑے ہو جاؤ گے تب ملے گا۔''

مگر کب بڑے ہونگے یہ تو ابا ہی جانیں۔ کتنے ہی بڑے ہو جاؤ اطمینان دلاؤ مگر ماں باپ کے دل میں تو وہ کل کے بچے ہی رہیں گے۔ اور پھر جانیں ابا بازار سے لوٹیں گے بھی یا وہیں دھرے رہ جائیں گے۔ ہٹلر تو کبڈی اڑا رہا ہے۔ پالے پر پالا مارتا جا رہا ہے، کون جانے چاند بھی وہی مار لے جائے۔

''ہاں۔۔۔ اور تاریخ ہمیشہ ان کی اس حرکت پر لعنت بھیجے گی۔'' ٹیلر نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر مؤرخ بھی تو یہ خود ہی ہیں۔، ہم تو وہی پڑھیں گے جو آج تک پڑھتے آئے ہیں یعنی ان کی عقل مندیاں اور اپنی بے وقوفیاں۔۔۔ ہر زمانے میں آنکھ کھول کر انہی کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کیے۔''

''مگر اس مرتبہ امریکہ جو موجود ہے۔''

''امریکہ کب موجود نہ تھا مگر وہیں تک جہاں تک ایک ڈالر کے دس بننے کی امید ہے، روئی کا بیوپار نہیں جنگ کا سہی۔ اب ان کے گن اور گانے پڑیں گے۔ گرتوں کو سنبھالنا بارے ہوؤں کو جتانا، کمزوریوں کو طاقت بخشنا انہی کا کام ہے۔ اب ہماری پتی ہوئی سرکار کے سر پر انہیں نے ہاتھ رکھا۔''

''نہیں ایسا نہ ہوگا۔۔۔ ہم میں سے بہت نا معلوم کن مغالطوں میں مبتلا رہے۔ اب ہماری بھی آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں۔۔۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ واقعی کچھ ہو ہی جائے گا، ہم میں سے گنتی کے چند ہیں جو ایسی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں، ان میں سے نہ جانے کتنے تو واپس جا کر بھول بھال جائیں گے شاید چند ایسے بھی ہوں جو کچھ یاد رکھیں۔''

''کہیں کپلنگ کی طرح یاد نہ فرمانے لگیں۔ یہ زمانہ کپلنگ نہیں پیدا کر سکتا۔۔۔ تم دیکھنا اس جنگ میں انسانیت نئی روشنی لے کر پیدا ہوگی۔ ارے ہم کہاں نکل آئے۔۔۔ گاڑی والے۔''

باتوں باتوں میں پتہ بھی نہ چلا اور گاڑی کافی دور نکل گئی۔ گاڑی والا بھی کچھ متحیر ان دو مختلف عناصر کو ٹکرا تا دیکھ کر کھو سا گیا تھا۔ دونوں نے اتر کر ایک ہوٹل میں چائے پی۔

''لیلما کے بعد میں دوسری ہندوستانی لڑکی سے ملا ہوں۔۔۔ مجھے ناامیدی نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں ہم لوگوں سے اتنا پرہیز کیا جاتا ہے۔''

''اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ تم لوگوں کی لڑکیاں تو ہمارے لڑکوں کو قیمتی سمجھتی ہیں کیونکہ شوہر کی حیثیت سے وہ بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں وہ اپنے ہی رنگ میں سمو کر بہ آسانی زندگی گزار سکتی ہیں۔''

''تو کیا ہندوستانی لڑکیاں ایسا نہیں کر سکتیں۔ وہ چاہیں تو یورو پین لڑکوں کو ہندوستانی بنا سکتی ہیں۔ ارے اس عورت ذات میں بڑے بڑے معجزے دکھانے کی طاقت پوشیدہ ہے۔ وہ چاہے تو دنیا سے یہ قوم اور نسل کا فتنہ مٹا سکتی ہے۔''

''یہ میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ اونچی نسل کو بیٹی دے دیتے ہیں مگر لیتے نہیں تاکہ دھبہ نہ آ جائے۔''

''ہشت۔۔۔ بالکل پرانی باتیں، تم سوچتی ہوگی ایسا۔ میں تو بڑی خوشی سے ہندوستانی لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں۔''

''قول سے فعل مشکل ہے۔''

''مگر میں یقین دلاتا ہوں۔'' رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی لہٰذا لوٹ آئے دونوں۔ ٹمن جب گھر پہنچی تو لیلما دیکھ کر مسکرا اٹھی۔

''بڑی گاڑھی چھن رہی ہے۔۔۔''

''صاحب لوگ جو ہوئے نا۔ سمجھتے ہیں اس طرح ہماری عزت افزائی ہوتی ہے۔۔۔ کہاں ہم خاک

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کے ذرے اور کہاں وہ آفتاب عالم تاب!''

''ٹیلر ایسا نہیں۔''

''اجی سب ایک ہی مل کے نکلے ہوئے ہیں۔''

''تو پھر کیوں گئی تھیں اس کے ساتھ۔''

''یہ دکھانے کہ ہم اتنے جاہل نہیں جتنا تمھارے بیوپاریوں نے سمجھ رکھا ہے۔۔۔۔ایلما جی اکتا گیا۔ بھئی میرے لئے بھی کام ڈھونڈ دو۔''

''فوج کے دفتر میں۔۔۔''

''بھئی یہ فوج ووج سے تو مجھے معاف رکھو مجھے اس دوسروں کی جنگ لڑنے سے کیا دلچسپی۔''

''کیا مطلب ہے۔کیا چینے کو آ جانے دوگی۔''

''میری بلا سے چینے آئیں یا چندھے۔''

''وہ لوٹ ماریں گے کہ توبہ بھلی۔''

''اور یہ کیا کم لوٹ رہے ہیں دوسرے لوٹیں گے انہیں جن کے پاس کچھ ہے اور جو آپ ہی مر رہے ہوں انہیں وہ کیا ماریں گے؟ ان ننگے بھوکے کسانوں کا نہ کسی نے اب تک کچھ بگاڑا اور نہ کوئی بگاڑ سکتا ہے۔ اچھا ہے یہ دولت مند لٹیں تو۔''

''ارے بھائی اپنے دولت مندوں کو خود لوٹو تو ایک بات بھی ہے۔دوسروں سے لٹوانے میں کیا عقل مندی ہے۔''

''خود نہیں طاقت تو دوسروں کی مدد سے سہی۔''

''ارے کہیں بندر نے بلیوں میں بٹوارہ کیا ہے۔دیکھ تو رہی ہو یہ باہر کی مدد کا نتیجہ۔تاریخ گواہ ہے کہ جس کی مدد مانگی وہی ظالم بن بیٹھا۔اب تو جب ہی کچھ ہوگا جب ہم خود کریں گے۔''

''تم دلی کے چاول بہت کم لائیں۔''ایلما نے ایک دم سیاست کے میدان سے گھر کی چار دیواری میں چھلانگ لگائی۔

''ملے ہی نہیں۔''

''لالو نے تمھیں دکان نہیں بتائی۔ایک بنیا ہے پروفیسر کی جان پہچان والا، وہ دے دیتا ہے جتنے بھی مانگو۔یہ موٹے چاول سے تو گھن آتی ہے۔''

مگر یہ گھن آنے والے چاول بھی بازار سے اڑ کر نہ جانے کہاں روپوش ہونے لگے۔ کچھ ایسا مرض پھیلا کہ اندر ہی اندر چاول چٹ گیا۔ گیہوں کو بھی گھن لگ گیا۔ گھن بھی ایسا ویسا نہیں بھینسا گھن!''

''ارے اٹھو نا۔''ایلما نے جھنجھوڑ کر جگایا۔روز تو وہ اسے دن چڑھے تک سونے دیتی تھی۔

''کیوں؟''شمن نے کروٹ بدل لی۔

''ارے وہ تمھارا صاحب بہادر کھڑا ہے۔''

''کون صاحب بہادر؟''

''ارے بنومت، وہی ٹیلر اٹھونا۔''

''لعنت، تمھارا ہوگا صاحب؟''

''دیکھنا ہے۔''ایلما چھیڑنے کو ہنسی۔

''کیا؟''شمن اٹھ بیٹھی۔

''کچھ نہیں۔تو پھر اٹھتی کیوں نہیں۔''

''چڑیل!''شمن نے تکیہ کھینچ کر مارا۔

پروفیسر کو بھی لے لیا اور چاروں مل کر ٹیلر کی لائی ہوئی ٹیکسی میں روانہ ہوگئے۔ پکنک کا ارادہ تھا۔

''ہم لوگ تو عموماً مقبروں میں پکنک مناتے ہیں!''شمن نے کہا۔

''یا خدا، یہ کیوں؟''ٹیلر حیرت سے بولا۔

''تاکہ برکت ملتی رہے۔''

''بھئی ہمیں لائبریری میں ضروری کام ہے۔تم اور ٹیلر چلے جاؤ۔۔۔''پروفیسر اور ایلما شاید گھر ہی سے کوئی سازش کر کے آئے تھے۔

''تو میں بھی ساتھ چلوں۔''پروفیسر کو خاموش اور ایلما کو بے توجہی سے دوسری طرف دیکھتے پا کر اس نے جلدی سے بات پلٹی۔''میں گھر چلی جاؤں گی۔ مجھے ذرا کام بھی ہے۔کپڑے وغیرہ ٹھیک کرنا ہیں۔''

''واقعی؟''جب پروفیسر اور ایلما چلے گئے تو ٹیلر نے پوچھا۔

''کیا؟''

''کہ تمھیں گھر جانا ہے اور بہت ضروری کام ہے؟''

''ہاں! کیا کچھ اعتراض ہے؟''شمن نے بھی مذاقیہ جواب دیا۔

''بہت سخت، کیونکہ۔۔۔''

''کیا؟''

''میرے ساتھ کھانا کھاؤ گی۔''

''ابھی کھانے کا وقت دور ہے۔''

''کیا بھدا جواب ہے؟''وہ برا مان گیا۔شمن کو ہنسی آ گئی۔

''ہمارے یہاں ان باتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے تمھارے ساتھ گھومتے دیکھ کر لوگ نہ جانے کیا کہیں گے!''

''چھوڑو ان لوگوں کو۔۔۔اگر تم جیسی لڑکیاں ہی لوگوں سے ڈرتی رہیں گی تو پھر مل چکی آزادی تم

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لوگوں کو۔''

''گویا اسی طرح گھوم پھر کر تو ہمیں آزادی جیتنا ہے۔''

''یقیناً........جتنے ملک ان ''لوگوں'' کی ہیبت سے پاک ہیں سب آزاد ہیں۔''

''بے شک تم چاہو تو سب ہی کچھ کہہ سکتے ہو۔ آزاد ہو نا۔''

''چھوڑو اس آزادی کے جھگڑے کو اور تھوڑی دیر کے لئے میری رنگت، قومیت کو بھول کر میری کوئی بات سننے اور اس کا جواب دینے کی کوشش کرو۔ ذرا دیر کے لئے اس نفرت کو بھول جاؤ تو ہمارے تمھارے درمیان برسوں سے پل رہی ہے۔ مورچے پر لڑنے والے سپاہی تک ایک بار سب کچھ بھول کر آپس میں انسانوں کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ اتنا سوچو ایک پردیسی انسان اپنوں سے دور تمھاری مہمان نوازی کا طلب گار ہے۔''

''کی تو تھی ایک دفعہ تمھارے بھائی بندوں کی مہمان نوازی۔۔۔۔ بنے بن کر آئے اور۔۔۔''

''چہ چہ۔۔۔ بڑی خراب زبان ہے تمھاری!'' وہ خوش مزاجی سے ہنسا۔

''دوسرے حربے بے کار ہو جانے سے ساری تیزی اسی پر دھار رکھنے میں صرف ہوگی۔ وہ مثل سنی ہے کسی کے ہاتھ چلیں اور کسی کی جیب!''

ہوٹل کے سامنے ٹیکسی ٹھہری کرایہ چھ روپیہ ہوا تھا مگر ٹیلر نے دس روپے دے دیئے۔ اس نے جب ریزگاری کے لئے لاچاری سے جیبیں ٹٹولیں تو ٹیلر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور چلنے لگا۔ ڈرائیور نے جھک کر ایک سلام کیا اور شمن کی غصہ سے بھری نظروں کو دیکھ کر صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔۔۔۔ گویا کہتا ہے آگئیں بھانجی مارنے کو، ہونا کلوٹی، روزانہ اتنی میموں کو لاتا ہوں۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچتیں!

یہی تو ہے وہ چال جس کی بدولت تم لوگ یہاں حکومت کر رہے ہو۔'' اس نے ٹیلر سے کہا۔

''یا خدا، کیا ہوا؟''

''یہ تم نے چار روپیہ بخشیش دے کر اس کی روح تک خرید لی۔''

''ارے مگر میں نے قطعی اس خیال سے روپیہ نہیں دیا۔ بلکہ مجھے معلوم تھا وہ زیادہ سے زیادہ دو روپیہ نوٹ میں سے واپس کرتا، باقی کے لئے کہہ دیتا نہیں ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں کہاں نوٹ بھنانے دوڑتا پھروں گا۔ میں نے کہا جہاں دو وہاں چار۔۔۔ مصرف ہی کیا ہے ہمارے روپیہ کا؟ کس کے لئے کمائیں؟''

''عیش اڑانے کے لئے، جس کے لئے تم لوگ بنے ہو۔''

''یہی ہوتے ہیں ہمارے عیش، کچھ تانگوں پر، کچھ موٹر پر اسی طرح روپیہ اڑ جاتا ہے۔'' اس کے طعنے کی پروا نہ کرتے ہوئے ٹیلر نے خود سے کہا۔

کھانا کچھ سونا سا رہا۔ ٹیلر بڑا حساس اور خاموش سا ہو گیا۔ شمن کو بڑی خوشی ہوئی۔ کم بخت فلرٹ کرنے کی کوشش میں اسے یہاں لایا ہے۔ ہوٹل سے وہ سیدھا اسے گھر پہنچا گیا۔ ایلما رات گئے جب وہ سو گئی تب آئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح وہ ڈرائنگ روم میں گئی تو دیکھا ٹیلر بیٹھا ایلما کو اپنا البم دکھا رہا ہے۔ معمولی صاحب سلامت ہوئی، جب ایلما دیکھ چکی تو اس نے البم شمن کو پکڑا دیا اور خود چائے لانے چل دی۔

معلوم ہوتا تھا البم نہیں کوزے میں شہر کے شہر بھر دیئے ہیں۔

''بم! بم!'' اس کے دماغ میں گونجا، کتنا لطف آئے، یہ کھلونے ذرہ ذرہ ہو کر اڑ جائیں۔ پر ہندوستان کا تو یہ بم بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کچی مٹی کا سینہ چیر کا کیا لطف لیا جا سکتا ہے، وہ تو انہیں گرم گرم نوالوں کی طرح نگل جائے گی۔ پر یہ عظیم الشان سربفلک عمارتیں کیوں نہ لرزیں بموں کے خوف سے؟

''تم ان عمارتوں کے لئے خود لڑ رہے ہو، پر ہمیں بھی بارود کی جگہ جھونک رہے ہو۔'' اس نے انتہائی زہریلے انداز سے کہا کہ ٹیلر جو پرشوق نگاہوں سے تصویروں کو دیکھ رہا تھا کھسیانہ ہو گیا اور اس کا منہ اتر گیا۔

''ایں؟'' شمن کو اپنی کم ظرفی پر شرم آگئی۔ ''کتنی عجیب انسان ہو! میں تو تمھیں اپنے کیمرے کی چالاکیاں دکھا رہا ہوں اور تم سیاست کر کے بیٹھیں۔۔۔'' وہ روٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

''سچ کہا تھا میرے ایک ہندوستانی دوست نے کہ اگر مغرب مشرق سے دوستانہ معانقہ کرنا چاہے تو وہ اسے زنا سمجھ کر پرے جھٹک دے گا۔'' وہ آہستہ سے مڑ کر بولا۔

''کل سے میں برابر تمھاری جلی کٹی باتوں کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر توبہ ہے۔۔۔ کیا تم سب ہندوستانی اسی ذہنیت کے مالک ہو؟ اگر ایسا ہے تو تمھارا مرض لاعلاج ہے۔ ہر بار تم ہاتھ مار کر دوا گرا دیتے ہو اور پھر واویلا مچاتے ہو؟''

''یہ کرپس کی دوا پینے سے تو بہتر ہے ہم بیمار ہی رہیں!''

''مگر یہاں کرپس کہاں ہے تم سے سیاست کون بے وقوف پوچھ رہا ہے، تم سمجھتی ہو کہ تمھیں سیاست سے لگاؤ ہے! اس لئے ایسی باتیں کر رہی ہو، قطعی نہیں۔ سیاست کو تم بالکل نہیں سمجھتیں، بس دوسروں پر الزام دے کر خود بچ نکلنا، یہ کہاں کا انصاف ہے، مانا کہ انگریز تمھیں بھڑکاتے ہیں، آپس میں لڑاتے ہیں، مگر تم کیوں اتنے احمق ہو جو لڑ پڑتے ہو، معلوم ہوتا ہے ابھی سو دو سو سال تمھیں اور غلامی کی زنجیریں گھسیٹنا پڑیں گی۔ بے وقوف ہے وہ حکومت جو تمھیں آزادی دے، دشمن ہے وہ تمھاری، کیونکہ تم آزاد رہنے کے قابل نہیں، اپنی حفاظت کرنا تمھیں نہ آیا نہ کبھی آئے گا۔ تاریخ کے صفحے الٹو اور مجھے دکھاؤ کہ کہاں سے کس موقع پر تم نے اکیلے دشمن کا مقابلہ کیا ہے۔ آج اگر یہ چلے جائیں تو دوسرے آ جائیں گے۔ نئے سرے سے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہونا پڑے گا۔''

''ایسا مذا بھی بہت ہے جو چھین لینے کی دھمکی دیتے ہو۔''

''ارے بھئی میرے بس میں ہوتا تو کیا کچھ نہ دے دیتا۔'' ٹیلر نے بات کا رخ بدل کر شرارت سے کہا۔

''بس دیکھ لیا تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو، وہ آزادی بھی دیکھی جو امریکہ نے نیگرو کو دے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

رکھی ہے۔''

''میں بتاؤں ایک ترکیب، تم سیاست میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ یہ کھیل نہیں کہ سنی سنائی رائے پر یقین کر کے میدان میں کود پڑے۔ سخت مطالعہ کی ضرورت ہے اور میں شرط بدتا ہوں دنیا کی کوئی عورت سنجیدگی سے مطالعہ کر ہی نہیں سکتی۔''

''اور میری رائے میں عورت سے بڑا سیاست داں کوئی نہیں۔ وہ جو گھر میں حکومت کر سکتی ہے، ملک میں بھی راج کر سکتی ہے۔ تمھارے خیال میں یہ سارے نسوانی حربے جن کی بدولت عورتیں مردوں کی کمائی، شخصیت یہاں تک کہ تخیل تک کو غصب کر لیتی ہیں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے؟''

''غلط بالکل غلط، کوئی عورت ہماری کمائی زبردستی نہیں چھین سکتی۔ ہم جیسے جی چاہتا ہے خود خرچ کرتے ہیں، رہی شخصیت تو وہ عورت کی عقل سے بالاتر شے ہے۔ ہاں تخیل کی ملکہ وہ ضرور ہے مگر صرف ہماری دماغی عیاشی کے لئے۔''

''بڑے لطیف مغالطے ہیں۔ اچھا ہے آپ لوگ انہیں مغالطوں میں مبتلا رہیں، جب ہی تو کمال ہے کہ بے وقوف انسان اور اپنے آپ کو عقل مند سمجھتا رہے۔'' سیاست سے ہٹ کر گفتگو نے زندگی کے رومانی دائرے میں قدم رکھ دیا۔

''کہا تو میں نے جہاں تک دل کی حکومت کا پھیلاؤ ہے، تمھارا ہی ڈنکا بجتا ہے۔'' نیلر نے اسے واضح طور پر شمن کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ہنس پڑی۔

''اور دل کی سلطنت کا پھیلاؤ چادر کی وسعت کو دیکھ کر محدود کیا جاتا ہے یا مشرق مغرب۔۔۔''

''دل کی حکومت سمتوں کی پابند نہیں، اس کے لئے مشرق بھی اتنا ہی حسین اور روشن ہے جتنا مغرب!'' نیلر کی آنکھوں کی شرارت بڑھی اور شمن نے غور کیا کہ اس کی آنکھیں اتنی بُنڈی نہیں اور بھوؤں کی جگہ بھی خاصے بال ہیں۔

اتنے میں ایلما چائے لے کر آ گئی۔ آج وہ کچھ بے چین ہی نظر آ رہی تھی۔ اسے بار بار کسی کے انتظار میں خاموش ہو کر پیروں کی چاپ سنتے دیکھ کر نیلر نے چھیڑا۔

''بڑا احمق ہے!'' نیلر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون؟'' ایلما چونک پڑی۔

''پروفیسر!''

ایلما جھینپ گئی۔ شمن نے دیکھا کہ یہ رنگین نسوانی جذبہ اس کے چہرے کو نرمی اور شیرینی سے منور بنا گیا۔ وہ کرخت اور خشک ایلما گویا موسم بہار کی آمد سے شگفتہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی باغیانہ آنکھیں ایک اطمینان بھری امید میں ڈوبی ہوئی پہلے سے زیادہ بڑی اور جاندار معلوم ہوتی تھیں، جیسے کسی نے پھونک مار کر ان پر سے برسوں کی پڑی ہوئی گرد جھاڑ دی ہو، اتنے میں پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتے آن پہنچے۔ خلق کی زرد پیشانی

ڈھلے ہوئے شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

''ہم لوگ دہلی جا رہے ہیں۔'' انہوں نے بچوں کی طرح کہا۔

''مبارک ہو۔'' نیلر نے جوش سے پروفیسر کا ہاتھ جھٹکا۔

''ایں؟'' شمن بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

پھر ایلما نے اسے بتایا کہ آخر کو پروفیسر نے اسے اس تاریک بل سے کھینچ ہی نکالا جس میں وہ خوفزدہ ہو کر جا چھپی تھی۔ ان کی دوستانہ ہمدردی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی پریشانیوں کا تھوڑا سا بوجھ ان کے کاندھوں تک پھیلا دے۔ پروفیسر ابتدائی تعلیم پر ریسرچ کر رہے تھے۔ انہیں ویسے بھی اپنی اسکیم کو عمل میں لانے کے لئے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ ویسے اگر کوئی کہتا کہ ان کی اپنی نجی زندگی میں ایلما کا وجود کار آمد ثابت ہو سکتا تھا تو یہ بات مشکل سے یقین آتی۔ پروفیسر کچھ عجیب گھریلو انسان تھا۔ خود وہ اپنے وجود میں کہیں نمایاں نظر نہ آتا تھا۔ شاید وہ ان کتابوں کی دیکھ بھال کے لئے ایلما کو مفید سمجھتا ہو، جو اسے اپنے جسم سے زیادہ عزیز تھیں۔ یہ ایلما کا کہنا تھا۔

''میں عرصہ دراز سے تمھاری ضرورت محسوس کرتا ہوں۔'' پروفیسر نے صرف اتنی بات کو بار بار دہرایا۔ اور یہ ضرورت اسی طرح محسوس ہوتی رہے گی کہ جب تک اسے پورا نہ کیا جائے۔

''میں اس کے اطمینان اور سکون سے تھوڑا سا حصہ اپنے لئے چرا لوں گی۔ اور وہ مجھے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہوگا۔'' ایلما نے کہا۔

شمن کے جانے کے سوال کو ایلما نے ایک سرے سے سنا ہی نہیں۔

''تم چاہتی ہو میں نہ جاؤں۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''نہیں بھئی۔ یہ کیسے کہہ سکتی ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔''

''تو اتنے دن گھر کی دیکھ بھال تمھارے سپرد!'' ایلما نے بات کاٹ کر کہا۔ ''ذرا باورچی کو دن دن بھر تاش مت کھیلنے دینا اور آس پاس کے غنڈوں کو جمع نہ کرنے پائے۔ پچھلی دفعہ میں ایک دن کو گئی۔ رات کو لوٹی تو جوا خانہ بنا ہوا تھا گھر۔۔۔۔'' ایلما نے بات کو طے سمجھا۔

''مگر ایلما آخر مجھے جانا تو ہے ہی۔'' وہ ڈری کہ ایلما منزل کا نشان نہ پوچھ بیٹھے۔

''تو پندرہ دن میں گھس نہیں جاؤ گی۔''

''مجھے نوکری کے لئے بھی تو کوشش کرنا ہے۔''

''ہاں ہاں کر لینا۔ ذرا پہلے چل کر سامان تو درست کروالو۔''

''پروفیسر کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔'' کپڑے رکھتے رکھتے ایلما ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''کیا۔ کہو نا بن کیوں رہی ہو۔''

''اوہو شرم آ رہی ہے۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''بشت، میری بات تھوڑی ہے۔ وہ ٹیلر کو کہہ رہا تھا۔'' شمن کے کان کھڑے ہوئے۔

''کیا؟''

''کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ اچھا آدمی ہے ٹیلر ہے نا؟ مجھے تو وہ انگریز لگتا ہی نہیں۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ وہ آئرش ہے۔۔۔ مگر یہ کیسے کہ وہ لگتا نہیں؟''

''اس کی باتوں سے، شمن اگر ہم ایسے انگریزوں سے بھی ملیں تو ان سے نفرت نہ کر سکیں۔''

''ایسے سے تمھارا مطلب؟''

''ایسے سے میرا مطلب جیسا ٹیلر ہے۔''

''بڑی گدھی ہو۔۔۔''

''اونہہ بنومت تم خود سمجھتی ہو کہ وہ اور سفید چمڑی والوں سے مختلف ہے۔''

''مختلف ہو سکتا ہے مگر یہ خصوصیت ان کی جبلت پر اثر نہیں ڈالتی۔ بہت سے سانپ کاٹتے نہیں مگر نگل جاتے ہیں، رہے تو پھر بھی سانپ۔''

''ارے تو نگل ہی گیا آخر۔'' ایلما بڑے زور سے ہنسی۔

''پاگل ہو گئی نا۔ ارے چل وہ مجھے کیا نگلے گا۔''

''مگر تو اسے ضرور نگل گئی۔۔۔ پروفیسر کہہ رہا تھا کہ۔۔۔''

''لعنت تیرے پروفیسر پر کہ۔ کہ۔۔۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہتا۔۔۔''

''تمھیں جیسے کچھ نہیں معلوم؟ بنہ مجھ سے بنتی ہو۔۔۔ ڈرائنگ روم میں وہ کوئی چپکے چپکے تو بول نہیں رہا تھا۔''

''ارے وہ تو مذاق کر رہا تھا۔''

''میں اسے تین سال سے جانتی ہوں۔ وہ ایسے مذاق کرنے کا عادی نہیں عجیب انسان ہے۔ خیر جی اس میں بات ہی کیا ہے۔ وہ تمھیں پسند کرتا ہے تو اس میں گناہ کونسا ہے۔''

''گناہ کیوں ہوتا۔ سچ بتانا ایلما کیا تمھیں پسند ہے وہ۔''

''ٹیلر؟۔۔۔ حد سے زیادہ۔''

''ٹیلر کی خصوصیت سے بات نہیں کر رہی ہوں۔ دراصل مجھے تو اس سفید چمڑی سے ہی گھن آتی ہے۔''

''سفید چمڑی میں اگر سرخ دل ہو تو؟''

''ہوا کرے۔۔۔ وہ ہم کالوں کے مذاق سے بہت مختلف ہے۔''

''وہ اتنا بندر جیسا تو سفید ہے بھی نہیں۔۔۔ ہمارے یہاں اس سے کہیں گورے آدمی ہوتے ہیں مگر ان سے ہمیں گھن نہیں آتی۔ پھر آخر اس میں کیا بات ہے؟''

''خیالات، ہمارے دل نے ان سب یورپ والوں کو بھوت بنا کر نفرت شروع کر دی ہے۔۔۔ ذرا بند

کرو الوصندوق کپڑے بہت ٹھنس گئے۔''

دونوں مل کر صندوق بند کرنے لگیں۔ ایلما بڑے جوش و خروش سے سامان باندھ رہی تھی۔ آزاد چڑیا کی طرح دھیمی آواز میں کوئی ہلکا پھلکا راگ گنگنانے لگتی اور پھر کسی سوچ میں ڈوب جاتی۔ شاید ماضی بار بار اسے کچوکے دینے کے لئے ابھر آتا تھا۔ جسے وہ اپنی قوت ارادی سے دور جھٹک پھینکتی۔

صبح ہی صبح ٹیلر ملٹری کا ٹرک لے کر آن پہنچا، مزدوروں کی طرح سامان بھرتا رہا، جب چائے پینے بیٹھا تو اس نے بتایا کہ دو روز بعد وہ بھی روانہ ہونے والا ہے۔ وہ کچھ غمگین تھا۔ مگر اس سے زیادہ وہ دیکھ رہا تھا کہ شمن نے بھی یہ بات سنی کہ نہیں۔

''سنا شمن ٹیلر بھی جا رہے ہیں۔'' ایلما نے شمن کو نا لتے دیکھ کر نہایت بھدے پن سے کہا۔

''اوہو۔۔۔ چہ بڑا افسوس ہے۔'' شمن نے بڑے تپاک سے کہا۔

''مہربانی سے اس قدر صدمہ لوگوں کو نہ پہنچاؤ ایلما۔'' ٹیلر نے طعن سے کہا اور شمن بھی تکلف سے مسکرا دی۔

''بھئی دیر نہ ہو جائے۔'' پروفیسر بڑے بڑے چائے کے گھونٹ پینے لگے۔

''اچھا خدا حافظ شاید پھر ہم نہ مل سکیں۔'' ٹیلر نے بڑے تکلف سے کہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

''بنومت ٹیلر۔'' ایلما نے جل کر کہا۔

''مگر تم تو پرسوں جا رہے تھے۔'' اس نے مصافحہ کے لئے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور بڑی معصومیت سے نمکدانی پیش کر دی۔

''شکریہ۔۔۔'' اس نے بگڑ کر ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔

''ارے میں سمجھی تم نے نمک مانگا!''

''زخموں پر نمک۔۔۔ خوب خوب۔۔۔ بھئی واہ۔'' پروفیسر نے قہقہہ لگایا۔

''واقعی تم میں کسی نمک کی ضرورت ہے۔۔۔ بدمذاق ہو ٹیلر۔'' ایلما نے اٹھتے ہوئے اس کا کندھا ہلا کر کہا۔

ایلما کی گاڑی روانہ ہو گئی تو ٹیلر نہایت خاموش موٹر چلاتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا وہ بڑی تندہی سے اسے گھر پہنچانا چاہتا ہے۔ مگر موٹر کی رفتار ضرورت سے زیادہ دھیمی تھی۔

''کہاں جا رہے ہو۔''

''پونا۔'' منہ موڑے موڑے جواب دیا۔

''اچھی جگہ ہے؟''

''بہت، جنت ارضی۔'' ٹیلر نے جل کر کہا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''بہت خوش نصیب ہو۔''

''شکریہ!''

''کیا پیٹرول ختم ہوگیا۔'' دشمن نے موٹر کی سستی کو ٹوکا اور ایک دم سے ٹیلر نے اسپیڈ بڑھادی کہ معلوم ہوا موٹر الٹ گئی۔

''آخر مطلب کیا ہے۔'' دشمن نے زبردستی غصہ ہونے کی کوشش کی۔

''یہ کہ ہم انسان نہیں۔۔۔ پتھر کے ٹکڑے ہیں۔ چند بھیڑیوں کی خودغرضی اور مکاری نے پوری قوم کے منہ پر کالک مل دی اور اس حد تک کہ اب کوئی کوشش اسے نہیں مٹا سکتی۔''

''کچھ تو ان بھیڑیوں نے ایسا داغی دکھ پہنچایا ہے جس نے اسے حد کو پہنچادیا۔''

''مانتا ہوں۔۔۔ مگر عقل بھی تو کوئی چیز ہے۔''

''دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔'' دشمن نے بہ مشکل اسے سمجھایا۔

''تو کیا واقعی تمھارے دل سے میرے لئے نفرت نہیں مٹ سکتی۔'' ٹیلر نے بڑی نرمی سے کہا۔

''نفرت تو نہیں ہے مجھے۔'' دشمن نے جیسے خود کو بتایا۔

''تو پھر تم صرف مجھے جلانا چاہتی ہو۔'' وہ مسکرادیا۔ ''جی چاہتا ہے اسی بات پر موٹر لڑادوں کسی پیڑ سے۔'' اس نے موٹر کی رفتار دھیمی کردی۔

''ہمارے دل دکھے ہوئے ہیں۔''

''خصوصاً اس اگست کے واقعہ کے بعد سے۔'' ٹیلر نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

''تم بھی یہ سوچتے ہو کہ یہ سب فساد کانگریس نے کروائے۔۔۔۔''

''ہاں اور کانگریس قابل مبارکباد ہے۔'' دشمن پھر بے اعتباری سے بھڑکی۔ ''اتنے مجبور اور نہتے گروہ سے اتنا پرجوش اظہار ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لاٹھیاں بھی تو پوری نہیں۔۔۔''

''تو تمھارے خیال میں یہ بے وقوفی نہ تھی۔''

''آزادی سے محبت رکھنا اگر بے وقوفی ہے تو اس کے پانے کے لئے جدوجہد کرنا مہا بے وقوفی ہے۔''

''مگر حماقت تو تھی۔ اس طرح اودھم مچادینے اور بے موت مرنے سے آزادی نہیں ملا کرتی۔'' وہ اس سے جواب مانگنا چاہتی تھی۔

''آزادی کی دیوی بھینٹ چاہتی ہے اور اگر اسے رام کرنا ہے تو ایسی لاکھوں قربانیاں دینی ہوں گی۔ جو کچھ ان سرپھرے جوشیلے بچوں نے کیا۔ وہ واقعی بہت معمولی نظر آتا ہے کیونکہ جو کچھ ہوا بے ترتیبی سے اور بد انتظامی سے ہوا۔ اگر یہ قربانی باقاعدہ دی جاتی تو آزادی کے میدان کا تھوڑا بہت حصہ ہاتھ ضرور آجاتا۔

''مگر یہ گاندھی جیسے لیڈر بھلا ہماری جنگ آزادی میں کیا رہنمائی کریں گے۔ اہنسا ہنہ، کہیں اہنسا سے بھی ملک جیتے گئے ہیں۔'' وہ خود اپنی مخالفت کرنے لگی۔

''گاندھی نہیں اگر اس وقت چنگیز خان بھی ہوتا، ایسے کہ ہاتھ میں تنکا نہیں تو وہ کیا کرلیتا۔۔۔ دیکھا نہیں تم نے کچھ نہ کرنے پر تو یہ سزا ملی اور کہیں ہاتھ بھی ہلا دیتے تو صاف انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔''

''ہنہ ہیں بھی کس کام کے یہ لیڈر۔۔۔ کچھ کیا ہے انہوں نے آج تک، بلا سے مرجائیں تو سچے لیڈر پیدا ہوں۔''

''لیڈر انڈا اچھوڑ کر نہیں نکل آتے۔ اگرچہ تمھارے یہ لیڈر کچھ نہیں کررہے مگر پھر بھی ان کی خاموش ضد عوام کے جی میں ڈھارس بندھائے ہوئے ہے۔ آزادی کی خواہش نہیں مری۔ گو جیل میں جانے سے بہت کچھ عوام پر سے ان کا بھروسہ اٹھ گیا۔۔۔ بہت سے ناامید ہوکر منکر ہوگئے، چڑ کر بگڑ بیٹھے، مگر پھر بھی ایک زمانہ آئے گا، جب وہ محسوس کریں گے کہ ہمارے لیڈر فضول نہیں بلکہ مجبور تھے۔''

''تو پھر یہ جیل میں گئے ہی کیوں؟ کیا قوم کی خدمت کی؟'' دشمن نے بچوں کی طرح پوچھا۔

''بہت بڑی خدمت کی جو کچھ وہ زبان سے نہ کہہ سکتے تھے ڈرامے کے ذریعے دکھادیا۔''

''ایں؟'' دشمن نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

''کہ ظالم جب ضد پر آجاتے ہیں تو وہ کیا نہیں کرتے، وہ نفرت جوان کے اس فعل سے اس وقت عوام کے دل میں پیدا ہوگئی ہے اسے کوئی مہربانی، کوئی رعایت دور نہیں کرسکتی۔ اگر اس وقت حکومت تمھارے اوپر یہ مظالم نہ کرتی تو تم اس کے ضرور گن گاتے رہتے اور آزادی کی وہ لگن جو آنے والی پود کے دل کو لگے گی وہ ایک ایسی چیز ہوگی کہ۔۔۔ ارے ہم کدھر نکل آئے؟ ٹھہرو کار موڑنے دو۔۔۔۔''

ٹیلر نے اسے گھر پر اتار دیا اور شام کو آنے کا وعدہ دے کر چلا گیا۔ ابھی دھوپ کافی تھی جو بیرے نے آکر کہا کہ وہ آگیا۔

''ارے اتنی جلدی؟'' وہ ہلکے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ بخار ہے۔

''بخار ہے کیا؟''

''شاید یہاں ہر وقت بخار کا ہی گھف آتا رہتا ہے۔ چلو جلدی چلو پکچر دیکھیں گے۔۔۔ اور وہ۔۔۔۔ وہ لگالینا سرخ ہونڈ!'' اس نے ابروؤں کے بیچ میں انگلی رکھ کر کہا۔

''اچھا بندی؟''

''ہاں ہاں!'' اس نے زور زور سے سر کو جھٹکا۔

''کیوں؟''

''اچھی لگتی ہے۔'' اس کی سرخ تھکی ہوئی آنکھیں ہنستے میں بالکل غائب ہوگئیں اور دانت چمک اٹھے۔

بجائے پکچر جانے کے وہ ہوٹل میں بیٹھے کافی پیتے رہے۔ ٹیلر نے بتایا کہ اس کی منگیتر جسے چھوڑتے وقت اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اسے یک لخت بھول گئی۔

''اس نے میرے خطوں کا جواب بھی دینا بند کردیا۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''ہم یہاں میدان

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

جنگ میں وطن سے دور۔ ایک ان کی یاد میں زندگی کی گھڑی گزارتے ہیں اور وہ جھوٹ موٹ کو بھی ہمارا دل رکھنے کی کوشش نہیں کرتیں۔'' ''کوئی گھڑی کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب وہ ہمارے خیالوں سے دور رہتی ہوں۔ مگر۔۔۔ یہ بے وفا عیش کی متوالیاں ہمیں انسان ہی نہیں سمجھتیں۔'' شمن خاموش سنتی رہی۔

تمھیں اب بھی اس لڑکی سے محبت ہے۔'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔ یوں تو مجھے لفظ لڑکی سے ہی شدید محبت ہے۔'' وہ پھر شرارت سے مسکرایا۔ ''گزشتہ چند سالوں نے اور بھی کمزور بنا دیا ہے۔۔۔''

گھنٹوں بکواس کر کے جی ذرا ہلکا ہو گیا۔ پھر وہ اپنے بچپن اور اپنی ماں کی باتیں بتاتا رہا۔ اسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور بہن کو پیار بھری ملامتیں بھیجنے میں لطف آتا تھا۔ وہ بہت شریر مگر پیاری تھی۔ ہزاروں لڑکے لگا رکھے تھے اور ٹیلر کو بدھو سمجھتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ سے جھینپو تھا۔

دوسرے دن ٹیلر اتنی صبح آیا کہ شمن کو اسے گھنٹہ بھر بٹھائے رکھنا پڑا۔ نہا دھو کر جب وہ باہر نکلی تو وہ لان میں چائے کی کشتی کے قریب لیٹا ہوا تھا۔

''میں خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔ کل صبح جا رہا ہوں۔''

''خدا حافظ'' شمن نے جواب دیا۔

''اور۔۔۔ بس تمھیں اتنا ہی کہنا ہے۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''یہ بھی پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ کہاں جا رہا ہوں۔۔۔ ویسے نہیں تو رسماً ہی سہی۔''

''مجھے رسم و راہ بڑھانے کی ضرورت؟''

''ہوں، ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ گھاس پر ماتھا ٹیک کر اداسی سے بولا۔

''رات کو سائیکل پر چلیں۔''

''رات کو؟۔۔۔ بھئی مجھے رات سے ڈر لگتا ہے۔'' اسے برا مانتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ''اگر تمھیں شام کو فرصت ہو تو چلو گھوم آئیں۔۔۔''

''سنو! باورچی سے کوئی مزیدار کھانا منگواؤ۔ گرمی نے زبان بھی تو سن کر دی ہے۔''

''مرچیں کھاؤ گے۔''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا اور زور سے آنکھیں ہتھیلیوں سے بھینچنے لگا۔

''کیا سوئے نہیں رات بھر؟''

''نہیں'' وہ روٹھ کر بولا ''نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ میں مانتا ہوں کہ تم مجھے پسند ہو لیکن۔۔۔ میں اسے محبت نہیں بلکہ کوئی سخت، بے رحم اور تکلیف دہ مرض کہوں گا۔''

''معلوم ہوتا ہے لو لگ گئی۔'' شمن بات ٹالنے کو زور سے ہنسی۔

''کیا ایسی کوئی بیماری ہے ہندوستان میں جس میں شدید ترین محبت وبال جان بن جائے؟''

''ہاں، لو کی طرح یہاں عشق کی لو بھی چلتی ہے مگر آج کل نہیں، وہ برسات کے دنوں میں جب کالی گھٹائیں گھر کر آتی ہیں، کوئلیں کوکتی ہیں اور پپیہے شور مچاتے ہیں۔''

''تو پھر مجھے خزاں کا کوئی مرض لگ گیا ہوگا؟''

''ہو سکتا ہے کافی خطرناک مرض ہے۔ تم بھوتوں میں یقین کرتے ہو۔''

''میں۔۔۔؟ ہشت! تم بھی نہیں کرتیں مگر یہاں بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں صرف بھوت رہتے ہیں۔ تم نے وہ مرگھٹ دیکھا ہے وہاں کھوئے ہوئے انسانوں کی روحیں صدیوں سے بھٹک رہی ہیں۔ ہڈیوں کے ڈھیر رات کو جاگ اٹھتے ہیں اور ہر آنے جانے والے کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔''

''کسی کا روپ بھر کر، مثلاً تمھارے روپ میں!''

''ہاں۔'' دونوں ہنس پڑے۔

''اگر میں تم سے شادی کے لئے کہوں تو؟''

''تو؟۔۔۔ تو۔۔۔ ارے تم نے جو ابھی مرچوں دار کھانا منگوانے کو کہا تھا۔۔۔ منگواؤں؟'' اس نے چاہا مذاق اڑائے۔

''میں سوچتا ہوں ہم اور تم ملکر انسانیت کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔'' اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

''مگر اس کے لئے شادی ضروری ہے؟'' اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔

''ایں؟۔۔۔ مجھے نہیں معلوم، مگر نہ جانے کیوں میرا خیال ہے کہ۔۔۔ ویسے ہم دونوں ساتھ نہیں رہ سکتے۔ تمھیں مجھ سے محبت بھی نہیں، کیوں؟''

''جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ میں تو ہندوستانی ہوں اور یہاں کے موسم کی عادی ہوں۔ مجھے لو نہیں لگتی۔''

''بکو مت، تم محبت نہیں کر سکتیں کیونکہ میں سفید ہوں۔''

''ہمارے ملک میں تم سے بھی زیادہ سفید انسان ہیں۔ ہم ان سے محبت بھی کرتے ہیں اور شادی بھی۔''

''تو اگر مجھ سے شادی کرو تو بعد میں محبت کر سکو گی۔ میرا مطلب ہے اگر کوشش کرو تو۔''

''مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنا نہیں آتی۔''

''تم میں اتنی ہمت ہے کہ مجھ سے شادی کر لو۔''

''کہہ نہیں سکتی۔''

اتنے میں باورچی پھلکیاں اور چٹنی لے کر آ گیا۔ نیلر نے ڈھیر ڈھیری چٹنی لگا کر تیزی سے کھانا شروع کیں۔ مارے مرچوں کے ناک آنکھ سے پانی بہہ نکلا اور منہ کچے گوشت کی طرح لال بھبھوکا ہو گیا۔

''تمھارے سوال کا جواب مل گیا؟''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''ایں؟'' وہ بچوں کی طرح ناک پونچھ کر بولا۔

''یہ مرچیں کیا کہتی ہیں؟''

''کہتی ہیں۔۔۔۔کہ تم۔۔۔تم بے وقوف ہو شمشم۔'' اس نے پہلی دفعہ اس کا نام لیا اور وہ بھی بگاڑ کر۔

''اتنا بڑا جوا کھیلتے ڈرتی ہو؟'' اس نے طعن سے پوچھا۔

''جوا!'' شمن کا دل نامعلوم مسرت سے چونکا۔ زندگی کا لطف اونچے اونچے داؤ لگانے میں ہے۔'' اس نے جیسے خواب میں دہرایا۔

''ہمت ہے اتنی۔'' وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''ہمت تو کچھ ایسی مہنگی چیز نہیں۔ مگر تم یہ سٹا کیوں لگا رہے ہو؟''

''میرے لئے یہ سٹا نہیں مجھے ہندوستان سے لگاؤ ہے اسے زخمی دیکھ کر میرا دل دکھ رہا ہے۔ مجھے وہ دنیا کا ایک عضو نظر آ رہا ہے۔ اسی دنیا کا ایک ٹکڑا جو میری ہے۔۔۔''

''زندگی کی طرف سے تمہارا رویہ بھی صرف شاعرانہ ہے۔ تم جانتے ہو یہ سٹا ہے مگر اس کے نتیجہ کا خوف ابھی سے تمہارے خون کی حرکت تیز کئے دے رہا ہے۔ اس خوف میں بڑی لذت ہے مگر تمہیں اس لذت کا چسکا کہاں سے پڑا۔'' شمن نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ دورالہ آباد کے کیمپ میں جو اس نے خونی وعدہ کیا تھا اس کی لذت اب تک اس کے دماغ میں محفوظ تھی۔

''تم میری فکر نہ کرو۔''

''میں نہ کروں گی تو خود ہی کر لو گے۔ تم پچھتاؤ گے۔''

''میں؟''

''ہاں۔۔۔اور ابھی یہاں سے جا کر تم اپنی ہر بات کو یاد کر کے شرمندہ ہو گے یہ نشہ زیادہ دیر قائم نہیں رہے گا۔''

''کیا نشہ؟''

''خود فریبی کا نشہ، کہ یہ تم عجیب و غریب بات کرنے جا رہے ہو، میں ہندوستانی تم۔۔۔''

''چپ رہو۔۔۔میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی دنیا کو نہیں لانا چاہتا۔ ایک خیال ہے اور وہ یہ کہ میں اور تم قریب تر ہو جائیں۔۔۔میری ماں بڑی اچھی ہیں وہ بہت خوش ہونگی۔'' وہ ایک دم چہک کر بولا۔'' ہم ساتھ ساتھ سارے یورپ کا سفر کریں گے۔۔۔اوہ۔۔۔کتنا لطف آئے گا۔ یہ کم بخت لڑائی ختم ہو جائے گی، میں پھر سے اپنی پڑھائی شروع کروں گا۔ تم بھی وہاں کوئی ڈگری لے لینا۔۔۔پھر ہم دونوں ہندوستان آ کر۔۔۔''

''ارے بڑے تیز ہوا باز ہو، دم بھر کی سیر کر کے لوٹ بھی آئے؟'' شمن زور سے ہنسی اور ٹیلر بھی کھلکھلا اٹھا۔

'' چلو ذرا باہر چلیں نا۔۔۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا۔ دو ننھے بچوں کی طرح وہ قہقہے لگاتے، دیوانوں جیسی باتیں کرتے دور تک نکل گئے۔

''تم ہاں کہہ دو اور ہم اپنی جنت میں۔۔۔۔'' زور سے ایک لاری گزری اور دھول کے پھنکے اس کے ہنستے ہوئے حلق کو گھونٹ گئے۔ بات ادھوری چھوڑ کر وہ شمن کے کندھے کا سہارا لے کر کھانسنے لگا۔ مسافر اس عجیب و غریب سین کو آنکھوں میں جذب کرنے کے لئے لاری میں سے لٹک لٹک کر جھانکنے لگے۔

''دیکھا تم نے؟'' شمن نے تلخی سے کہا۔

''میں ان کتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔'' وہ بھی جھلا کر بولا۔ کمرے میں پہنچی تو وہ سارے قہقہے جو تھوڑی دیر قبل شگوفوں کی طرح دل میں پھوٹ رہے تھے یک لخت مرجھا گئے جیسے کسی نے بٹن دبا کر بجلی غائب کر دی۔ وہ خاموش پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بار بار اس کے شانے میں کوئی چیز چبھتی جیسے کوئی رگ چڑھ گئی ہو۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''انتہا!'' اس نے سہم کر جواب دیا۔

''کوئی راستہ؟''

''ناممکن۔ خضر بھی بھٹک رہے ہیں۔''

''علاج؟''

''کوئی نہیں!''

''دعا؟''

''بے کار!''

جلدی سے اس نے اٹیچی میں دو ساڑھیاں ڈالیں۔ کوئی تو گاڑی جا رہی ہوگی کہیں دنیا کے کسی کونے میں، بس یہاں سے دور سامان پھر آتا رہے گا۔ ویسے ہے ہی کیا سامان خانہ بدوش کا؟

کیا حماقت ہے؟ ایسا بھی خوف؟ ہشت، کیا نگل جائے گا وہ تمہیں، کہہ دو صاف صاف دن اور رات کبھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔

اس نے اٹیچی دور پھینکی۔ دیر تک ایلما کی کتابیں درست کرتی رہی پھر لیٹ کر سو گئی۔ جب آنکھ کھلی تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ بیرے نے آ کر کہا ٹیلر آیا ہے جلدی سے ساڑھی لپیٹ کر باہر آ گئی۔

''کیا ہے رونی؟''

''ادھر۔۔۔ادھر آ جاؤ۔۔۔'' وہ سہما ہوا اور پریشان تھا۔ چہرہ بہت لمبا اور زرد ہو رہا تھا بار بار سگریٹ جھاڑنے کے بہانے وہ ہاتھوں کی لرزش کو چھپا رہا تھا۔ برساتی سے نکل کر دونوں گھاس پر پہنچ گئے۔

''میں۔۔۔میں سوچتا ہوں۔ میں نے ابھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''کیا بات ہے؟''

''یہی۔۔۔یہی۔۔۔''وہ بری طرح گھبرا گیا۔

''روبی گھبرانے کی کیا بات ہے۔میں بچہ نہیں اور نہ ہی تم ننھے ہو۔ہم یہ شادی کیوں کر رہے تھے؟ صرف اس لئے کہ ہم دونوں مل کر بہت کچھ دنیا میں کر سکتے ہیں۔اس میں محبت کو دخل نہیں۔''

''تمھیں مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی۔''

''میں۔۔۔میں آج تک محبت کو نہیں سمجھ سکی۔اور اب تو میں نے اس فضول مسئلہ پر غور کرنا بھی چھوڑ دیا''۔اس نے آہستہ سے کہا۔ٹیلر غور سے اسکا منہ تکتا رہا۔

''میں تمھیں محبت کرنا سکھادوں گا۔''اس نے ثمن کا ہاتھ ہمدردی سے دبایا۔

''سکھادو گے؟''وہ زور سے ہنسی اس کی آواز میں تلخی اور خوف کے ملے جلے ساز بج اٹھے۔''محبت سکھائی نہیں جاتی۔یہ ایک احساس ہے جو پیدا ہوتا ہے،پروان چڑھتا ہے اور۔۔۔اوہ چھوڑو اس قصے کو۔۔۔ تو دیکھو کوئی ایسی حماقت کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔''

''حماقت کیوں کہتی ہو۔''

''یاد ہے وہ لاری۔۔۔جو ہمارے پاس سے گزری تو لوگ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے ہم بندر ہوں مگر انسان بننے کی جرأت کر رہے ہوں۔''

''مگر میں تو ان کی پرواہ نہیں کرتا۔''وہ دانت پیس کر چیخا۔

''تو تم غلطی کرتے ہو،قدرت سے جنگ کرتے ہو۔''

''مگر یہ ایسی ان ہونی بات تو نہیں۔ہزاروں سفید لڑکیاں ہندوستان میں مسرت کی زندگی گزار چکی ہیں اور گزار رہی ہیں،کیا وجہ کہ میں اور تم خوش نہ رہیں۔''

''لڑکیوں اور لڑکوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ایک بار ایک عورت اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک مرد کے ساتھ ہو جاتی ہے تو خواہ اسے کتنا بھی نیچے اترنا پڑے۔۔۔وہ وہیں اپنا گھر بنا بیٹھتی ہے۔مگر مرد؟ مرد بڑا نازک مزاج ہوتا ہے ذرا سی بات پر چڑ کر چل جاتا ہے۔''

''مگر۔۔۔''

''ہم تم ملے۔۔۔زندگی کے تجربات میں عظیم الشان۔۔۔اضافہ ہو گیا۔سنو تم کل ہی واپس لوٹ جاؤ۔۔۔ارے ہاں،میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہاں جا رہے ہو۔''

''واپس پونا۔۔۔''

''صبح گاڑی جاتی ہے۔میں تمھیں خدا حافظ کہنے پر پہنچ جاؤں گی۔دیکھو۔دیکھو ہماری دوستی ختم نہ ہو گی۔''اس نے ٹیلر کو سر سے پکڑ کر گہری سانس بھرتے دیکھ کر سہارا دیا۔

''ہماری دوستی بڑی کارآمد ثابت ہو گی۔مجھے ہی نہیں پورے ہندوستان کو تم جیسے دوست مل جائیں تو

بھاگ کھل جائیں۔''

''تو تم صبح آؤ گی؟اسٹیشن پر۔''شب بخیر کہنے سے پہلے اس نے التجا کی۔

''ضرور۔''

سمجھا بجھا کر واپس لوٹی تو معلوم ہوا سر پر لدا ہوا بھاری بوجھ پھینک آئی۔سورداس جی ایک بار رسی کے دھوکے میں سانپ کو پکڑ کر بیسوا کے مکان پر پہنچ گئے تھے۔کیا دنیا میں ایسے بھی جذبے موجود ہیں جو ہمیں اس حد تک اندھا بنا سکتے ہیں۔

ہلکی پھلکی غبارے کی طرح مگن وہ پلنگ پر جا پڑی جیسے کسی نے بال و پر کے جھگڑے سے آزاد کر دیا۔مگر نیند نہ آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ غبارے کی ڈوری جڑ سے ٹوٹ کر رہ گئی اور وہ دور خلا میں اڑتا چلا۔کدھر؟ کہاں؟ ہوا بھی تو نہیں چل رہی کہ کوئی رخ کا اندازہ لگا سکے۔

ایک دم نہ جانے کدھر سے بادل اٹھے۔نہ گرجے نہ چمکے بس برس ہی نکلے۔نہ جانے کب کے گھٹے ہوئے پرنالے بہہ نکلے۔تکیے میں منہ گھونٹ کر وہ ہچکیوں میں ملی ہوئی آہوں کو جذب کرتی رہی۔اسے نہیں یاد تھا وہ کب روئی تھی اور آج جیسے پہلی بار ضبط کا چینل بند ایک ننھی سی چوٹ سے پھٹ پڑا۔ کارواں رواں بلک بلک کر سسکیاں بھرنے لگا۔تنہا ہمدم غنودگی نے سر پر ہاتھ پھیرا اور آہیں گہری سانسوں میں ڈوب گئیں۔

صبح اس کی آنکھ بجائے سات کے آٹھ بجے کھلی۔ایک اطمینان بخش دھکے سے اسے یاد آیا کہ ٹیلر جا رہا ہو گا۔ریل کا جن اسے ہر لمحہ اس سے دور تر گھسیٹتا لے جا رہا ہے۔بعد دم بدم بڑھ رہا ہے اور کچھ ہی دن میں یہ اتنا فاصلہ ہو جائے گا کہ ناپے نہ نپے گا۔

رات کو مچل جانے والی بچی کو ملامت کرتی وہ اٹھی۔نیم گرم پانی سے غسل کیا۔تھکے ہوئے کندھے بھینچ کر اس نے رہی سہی سستی کو بھی جھٹک دیا۔بڑی تیز بھوک لگ رہی تھی۔رات وہ کھانا بھی تو بھول گئی۔ باورچی نے نہ جانے کیا کہا تھا اور پتہ نہیں،اس نے کیا جواب دیا۔توبہ کہیں بیرے نے اس کی سبکیاں نہ سن لی ہوں،ناشتہ کے بعد وہ دیر تک بیٹھی ٹوکری میں سے چلغوزے اور بسکٹ کے ٹکڑے چن چن کر کھاتی رہی۔اسی ٹوکری میں سے کل اس نے اور ٹیلر نے لان پر بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا۔کتنا لاپرواہ تھا ٹیلر!کالر تنگ تھا تو اوپر کا بٹن نکال کر اس نے چنوں کی پڑیا میں گرا دیا تھا۔نیچے کا حصہ کدھر گیا۔دو انگلیوں کے سرے سے بٹن کو پکڑے وہ پھراتی رہی اور پھر اسے اپنے بٹوے کی ننھی سی جیب میں ڈال دیا۔

آج وہ کیا کرے جو یہ لمبا چوڑا دن کٹے۔معلوم ہوتا تھا ہندوستان کی زمین ہی ختم ہو گئی۔اور ہے بھی کیا اس کھنڈر میں؟ تو پھر کیا کیا جائے؟ خیر اس وقت تو بازار کا ایک چکر برا نہ رہے گا۔

کمرے میں تالا لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کنجی چھوٹ پڑی!ٹیلر کا بھوت مع اپنی تمام مردنی کے دیوار سے سہارا لئے کھڑا تھا۔

''تم جھوٹ بول گئیں۔اسٹیشن پر نہیں آئیں۔''اس نے روٹھے ہوئے انداز میں غرا کر کہا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''ہیں؟ تو اس لئے تم نہیں گئے۔''

اس نے نیم مردہ مسکراہٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''مگر۔۔۔''

''لعنت ہے اس اگر اور مگر پر!'' وہ زور سے بھونکا۔

کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر ٹیلر نے بتایا کہ وہ صبح چھ بجے سے اسٹیشن پر پہنچ گیا تھا۔ ثمن کا جی دکھ گیا۔

''چہ بائے۔۔۔ مع تمام اسباب کے؟''

''نہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرایا اور ثمن کے بگڑنے پر زور سے چلایا۔ ''مجھے معلوم ہے تھا تم ہندوستانی بڑے دھوکے باز ہوتے ہو اور تم ضرور دھوکہ دو گی۔ اس لئے سامان لاد کر لے جانا۔۔۔'' وہ زور سے ہنسا۔

''دیکھو رونی۔''

''چپ رہو کچھ نہیں دیکھتا میں۔۔۔ تم عورت نہیں پتھر ہو تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں پھر بھی۔۔۔ پھر بھی تم مجھے لیکچر دیئے جا رہی ہو۔ بس ہو چکی تمہاری نصیحت۔۔۔ اور ہاں تمہیں یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اب میں پونا واپس قطعی نہیں جاؤں گا۔

''تو میں جا رہی ہوں شام کو۔''

''چلو۔۔۔ کے بجے کی گاڑی سے'' وہ مسرت سے بولا۔

''چلو سے کیا مطلب گویا آپ بھی۔۔۔ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے۔''

''دماغ سلامت ہوتا تو کہنا ہی کیا تھا۔ کچھ کھانے کو منگاؤ۔''

''کھانے کے کمرے میں چلو۔''

''نہیں ہم تو یہیں کھائیں گے۔'' اس نے بستر پر لیٹ کر کہا۔

''نیکسی یا پھر وہ کل والا پروگرام۔ سائیکل؟'' اس نے ناشتہ ختم کر کے کہا۔

''تمہارا سر!''

''میرا سر بہت دکھ رہا ہے۔'' ٹیلر نے آہستہ سے اپنا تھکا ہوا سر اس کے گھٹنے پر ٹکا دیا۔

''نیند کم آئی۔''

''آئی ہی نہیں بالکل۔'' اس نے سر بالکل گود میں سرکا دیا۔

''اسپرو لاؤں۔'' اس نے آہستہ سے اس کے بھورے رنگ کے بالوں کو چھوا۔

''تین اور تین چھ اور تین نو گولیاں کھائیں۔'' ٹیلر نے معصومیت سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

دن آنکھیں میچے چپ چاپ گزرتے چلے گئے۔ ایلما نے بہت ملامت کی کہ اس کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رجسٹری کا دفتر کوئی نامعلوم جگہ تو نہ تھی۔

گیارہ بجے جب وہ سول میرج کے دفتر سے نکلے تو سڑکیں کافی بھری ہوئی تھیں۔ ٹیلر بار بار مسکرا رہا تھا مگر وہ وحشیانہ مسرت جو دفتر کی میز پر سے سر اٹھاتے وقت بجلی کی طرح اس کی آنکھوں میں کوندی تھی اب معدوم ہو چکی تھی۔ اس کا انداز گفتگو نہایت نرم اور پیارا تھا اور چہرہ پر شاندار فتح کے احساس کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ثمن کچھ ششدر کچھ پراگندہ تیز تیز باتیں کر کے ان اجنبی آوازوں کو نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو اس کے کانوں میں ہتھوڑے کی چوٹ بن کر پڑ رہی تھیں۔

''غلط۔۔۔ سب غلط۔۔۔ آگ اور پانی کبھی بغل گیر نہیں ہو سکتے۔'' کوئی بار بار سرگوشیاں کر کے یاد دلا رہا تھا۔

شملہ میں چیڑ کے درختوں کے درمیان چھپے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں جب ثمن نے نیا سبز کامدار شب کا لباس پہنا تو ایسا معلوم ہوا کسی نے اسے برف کے تودے میں دفن کر دیا۔ باہر کے کمرے میں ٹیلر بیٹھا دیر تک ضروری خطوط لکھتا رہا اور وہ صندوق میں سے کپڑے نکال کر جمانے لگی۔

زور زور سے کھانسنے اور منہ دھونے کی آوازوں نے اسے بتایا کہ ٹیلر غسل خانے میں ہے۔ باہر خشک ہوائیں سوکھی چادروں کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ نامعلوم خوف دہرا اس فضا میں تیر رہا تھا۔ خاموشی موت کی طرح اداس تھی معلوم ہوتا تھا کائنات کسی بھیانک سانحہ سے لرز کر ایک دم چپ چاپ رہ گئی ہے۔ دو بلیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی کھڑکی سے باہر کود گئیں۔ خزاں رسیدہ پتیاں مردہ چڑیوں کی طرح پیڑوں سے ٹپک رہی تھیں۔

''کھڑکی بند کر دو۔'' اس نے لجاجت سے ٹیلر سے کہا۔ بڑبڑا کر نہ جانے وہ کیا بولا اور چٹخنی لگا دی۔

جب وہ مڑا تو ثمن نے دیکھا وہ بہت پٹے ہوئے تھا مگر اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا جیسے کاغذ کا ٹکڑا جو بارش میں پڑے پڑے دھل کر بے رنگ ہو گیا ہو۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(42)

وہ جاگ پڑی مگر آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑی رہی۔ دور کہیں بہت سے گھنگروؤں کی جھنکار ہوا کو جاندار بنائے ہوئے تھی۔ یہ گھنگرو چڑیاں بجا رہی تھیں۔ بے تال سرچیں چیں بھی ملا کر بھیرویں کا الاپ معلوم ہو رہی تھی۔ سب ہی سر کومل تھے۔ نیم خوابیدہ احساسات کو جمع کرنے کے لئے اس نے جاگنے کی کوشش کی۔ جسم کو آہستہ سے سمیٹا اور پھر پھیلا دیا۔ پپوٹے کھولنے چاہے مگر نہ کھلے جیسے سورج اس کی آنکھوں میں گھور رہا ہے۔ ایک دم اسے کچھ یاد آیا دماغ میں سوئی سی چبھی اور بھالا بن گئی، آنکھیں بزدل چڑیوں کی طرح بچتی بچتی کھل گئیں۔ کمرہ خالی تھا!

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہاں تھا ہی کیا؟ رات جہاں ٹیلر کے کوٹ ٹانگے تھے، وہاں صرف ایک ملگجی سی سرخ ٹائی لٹکی ہوئی پھانسی لگے ملزم کی طرح جھول رہی تھی، جوتوں کی قطاریں جو اس نے اپنے ہاتھ سے سیدھی کی تھیں، غائب، صرف ایک میلا موزہ کونے میں پڑا منہ چڑا رہا تھا۔ خاموش اور مفلوج وہ اس میلے موزے کو گھورتی رہی جو بڑھتے ایک نیالے پہاڑ کی طرح پھول گیا۔ ہوا کے خاموش جھونکے سے ٹائی گوشت کے لوتھڑے کی طرح پھسل کر زمین پر آ رہی۔ جلدی جلدی اس نے سر میں گھستے ہوئے مرچوں دار دھوئیں کو دونوں ہاتھوں سے پرے ہٹایا اور بیچ کمرے میں کھڑی ہو گئی۔

''گیا!۔۔۔ وہ گیا!!'' در و دیوار قہقہے مار کر چیخ اٹھے۔

''تو پھر؟۔۔۔ اب؟۔۔۔ اب کیا ہو؟'' اس نے لجاجت سے جواب مانگا۔

''وہ گیا! تم بھی جاؤ۔۔۔ کوڑی بھی تو نہیں تمھارے پاس۔ ابھی مالک مکان سنے گا کہ تم رہ گئیں اور وہ گیا۔ تو وہ تمھیں کوئی بیسوا سمجھے گا جنہیں یہ سفید چمڑی والے آئے دن چند سکوں کے عوض لاتے ہیں دھکے مار کر نکال دے گا۔''

''تو پھر؟۔۔۔ اب کیا کرنا چاہئے۔''

''بھاگو! جتنی طاقت تمھارے پیروں میں ہے وہ سب ایک بار لگا دو اور بھاگو۔ وہاں باغ کے کونے میں جو باؤلی ہے وہی جس میں کل آتے وقت تم دونوں نے جھانکا تھا کہ دیکھیں یہ دن رات کا ملاپ کیسا نظر آتا ہے پانی کے آئینے میں؟ تو تم چمگادڑوں اور مکڑیوں کی غارت گری دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئیں تھیں۔ بدبو تو ہے اس میں اور ان جانے کیڑے مکوڑے بھی مگر راستہ بڑا سیدھا ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی کمر کے لئے اس سے سیدھا راستہ نہیں۔''

سر پکڑ کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ وہ ایک دن کی بیاہی دلہن مگر نہ ابٹنے کی مہک، نہ مہندی کا رنگ، ایک چوڑی بھی تو نہیں کلائی میں۔ اس کا سہا ہوا دماغ اور جھجکا۔ یہ بیاہ ہے یا رانڈاپا؟ لڑکھڑاتی ہوئی وہ باہر بھاگی برآمدے میں بہت سے ہاتھوں نے اسے لپک لیا۔ بہت سے نہیں صرف دو ہی تو تھے، مگر کتنے سکون بخش اور

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

محافظ۔ اور ٹیلر کا بھوت کتنا سرخ اور تازہ دم ہو رہا تھا۔

''تم اٹھ آئیں۔۔۔'' اسے سیڑھیوں کے پاس کھڑا کر کے وہ برآمدے کے نیچے کود گیا۔ ''میں نے کہا تمھیں کیوں جگاؤں۔'' اس نے نیچے سے اس کی کمر دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔ تمھیں ایک چیز۔۔۔ ہیں؟''

''روتی'' اس نے طوفان کے نیچے سے نکل کر لمبی سانس کھینچی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے نرمی سے نیچے اتار کر اسے ایسے دیکھا گویا وہ کوئی چینی کا کھلونا ہے۔ جس کے ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو۔

''کچھ نہیں۔۔۔'' وہ آنسو پی کر ہنسنے لگی۔ ڈری ہوئی دھڑکن سے بھری ہوئی مصنوعی ہنسی۔

''روتی۔۔۔ تمھارے جوتے اور کپڑے کہاں گئے۔'' چائے پیتے وقت اس نے رک رک کر پوچھا۔

''جوتے؟ کپڑے؟۔۔۔ کیا کرو گی۔ ابھی میں تمھیں اس جھگڑے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔۔۔ لو'' اس نے بہت سا مکھن لگا کر توس دیا۔

''یونہی پوچھا تھا۔''

''کیا بات ہے شم۔'' اس نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

''آ۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ میں اٹھی۔۔۔ تو تمھاری سب چیزیں غائب تو۔۔۔۔

''تو۔۔۔؟ ٹیلر اور سنجیدہ ہو گیا۔۔۔ ''تم سمجھیں۔۔۔''

''تو میں سمجھی۔۔۔ میں کہ چور لے گئے۔'' اس نے بچوں کی طرح بہانہ بتایا۔

''جھوٹ۔۔۔ مجھ سے جھوٹ مت بولو۔'' ٹیلر کا منہ اتر گیا۔ ''میں سمجھتا ہوں۔''

''خاک سمجھتے ہو۔''

''اگر یہ حال رہا تمھاری بے اعتباری کا۔۔۔ تو۔۔۔''

''ہشت۔۔۔ بہت عقل مند بنتے ہو۔۔۔''

''ہاں تم سمجھیں میں چلا گیا، تمھیں چھوڑ کر۔''

''بہت سمجھے۔ اتنی سمجھ ہوتی تو شادی ہی کیوں کرتے۔۔۔ سچ بتاؤ کہاں گئے کپڑے؟ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔'' اس نے ایسے بات پلٹی کہ ٹیلر سیدھا ہو گیا۔

''بیرا برش کرنے کو لے گیا ہے۔ دیکھو بھئی میں نے شادی اپنے لئے کی ہے نہ کہ ان کم بخت جوتوں کے لئے۔ صبح صبح میری تو بات بھی نہ پوچھی اور جوتوں پر نثار ہوئی جا رہی ہیں۔''

''اچھا کہیں چلو گے گھومنے؟''

''نہیں۔۔۔ بس یہیں تمھارے پاس۔۔۔'' وہ اس سے لگ کر گھاس پر لیٹ گیا۔

پورا مہینہ چٹکیوں میں سوتے، جاگتے، ہنستے، بولتے گزر گیا۔ دن بھر اجڑے ہوئے باغ کے سنسان

کونوں میں سر سے سر جوڑ کر کیٹس اور بائرن کے اشعار اور عمر خیام کی رباعیاں پڑھی جاتیں۔ ٹیلر کی آواز بہت نرم اور بھاری تھی۔ دھیمی آواز میں محبت بھرے نغمے اور پھڑکتی ہوئی نظمیں سنایا کرتا۔

وہ کیا سوچا کرتی تھی اور کیا نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ انگریز عام طور پر گندہ ذہن رہتے ہیں، دانتوں کی صفائی کے لئے ہزاروں دوائیں ایجاد کرنے کے بعد بھی اس کی نظر سے کوئی چمکیلے سفید دانتوں والا انگریز نہ گزرا۔ ان کے سیاہی زرد دانت دیکھ کر ہمیشہ رونگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ ٹیلر کے دانت سفید نہ تھے مگر بالکل ہموار اور بیماری سے پاک تھے۔

''سب سے پہلی چیز جس نے مجھے تمہاری طرح متوجہ ہونے پر مجبور کیا تمہارے نیلگوں سفید دانت تھے۔'' وہ ثمن سے کہتا۔ دانتوں کا رنگ بدلنا ممکن نہ تھا۔ مگر وہ ضرورت سے زیادہ ان کی صفائی میں منہمک رہتا۔ اخروٹ کا چھال چبا کر وہ ثمن سے مقابلہ کرنے لگتا اور شکست کھا کر بچوں کی طرح بگڑ اٹھتا اور اداس ہو کر کہتا۔

''میں یہ دانت اکھڑوا کر دوسرے لگواؤں گا۔''

''تم ہندوستانی نہ جانے کس مٹی سے بنائے گئے ہو کہ ہم لوگ دواؤں سے بھی اس کی نقل نہیں اتار سکتے۔'' وہ اس کے سانولے رنگ کو دیکھ کر کہتا۔ ''اس رنگ میں کتنی کشش ہے آنکھیں جھپکنے لگتی ہیں۔'' وہ نیم باز آنکھیں بنا لیتا۔ اسے پاؤڈر اور رنگ سے بہت نفرت تھی۔

''اس سے جلد کی حساس اور ملائمیت چھپ جاتی ہے۔''

''میں تو خوشبو کے لئے لگاتی ہوں۔''

''اوہ۔۔۔۔ خوشبو! اس جلد کی خوشبو سے بھی نشہ آور کوئی خوشبو ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اسے تیز کرنے کے لئے شراب چھڑک لو۔''

جی چاہتا ہے زندگی کی لمبان لامتناہی ہو جائے۔ یہی چیڑ کے لمبے درخت ہوں، اخروٹ کی چھاؤں ہو، وہ اور ٹیلر شیلے کی نظموں میں الجھ کر کھوئے رہیں۔ زندگی اتنی نرم و نازک بھی ہو سکتی ہے یہ اسے معلوم نہ تھا۔ بے معنی قہقہے، گہری نیندیں بڑھی ہوئی بھوک، اور کیا چاہیئے تھا۔

ٹیلر روز بروز بدلتا جا رہا تھا۔ ثمن سمجھتی تھی کہ اس اجڈ گنوار کو ہندوستانی رنگ میں رنگنا قطعی ناممکن نہ سہی مگر دشوار ضرور ہے مگر وہ تو خود بڑی تیزی سے ہندوستان کی آب و ہوا، خوراک اور طرز رہائش کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ یہ مرد بھی کتنے سہل ہوتے ہیں۔ جو زندگی انہیں دینا چاہو دے دو۔ اس معاملے میں نہ ان کا ملکی اختلاف آڑے آتا ہے نہ قومی۔ جس آغوش میں گئے آنکھیں بند کر کے سر ڈال دیا۔ اب جو چاہو کرو۔ دن رات ایک ہی لباس پہننے سستی کا اشتہار بنا پڑا رہتا۔ شیو کرنا بھول جاتا۔ وہ تو ڈاڑھی چھوڑ دیتا مگر ثمن نے شدت سے مخالفت کی لہٰذا مجبوراً شیو کرتا۔ پانی سے گھبراہٹ ہوتی۔ خوب مرچوں دار سالن کھا کر تین چار گھنٹے دوپہر کو سوتا۔ بڑی مشکل سے شام کو اٹھتا۔ باہر جانے کے لئے ہزاروں بہانے بنانے لگتا۔ اور ثمن زبردستی گھسیٹ لے

جاتی تو وہ بالکل سنسان اور غیر دلچسپ راہوں میں گم ہو کر وہاں قدرت کی رعنائیوں کی تعریف کرنے بیٹھ جاتا۔ اس نے چپکے سے دو ہفتہ کی چھٹی اور منگالی۔ ثمن نے پوچھا تو بہانے کرنے لگا کہ اس کی چھٹی واجب ہے۔

دہشت زدہ ہو کر ثمن نے دیکھا کہ وہ ایک پیچیدہ معمہ بنتا جا رہا ہے۔ زیادہ تر اونگھتا رہتا ہے مگر جونہی جاگتا ہے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور پھر جلد ہی اس مدہوش کن تاریکی میں ڈوبنے کی کوشش کرتا ہے۔ رات گئے تک خاموش بیٹھا پیتا رہتا۔ اگر ثمن کچھ بات بھی کرتی تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتا۔ لمبی لمبی جمائیاں لے کر آنکھیں بند کر لیتا۔

''میں یوگ کا عمل سیکھ رہا ہوں۔'' وہ مذاق کرتا۔

''یوگ کا عمل؟''

''ہاں، نروان حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔''

''دماغ خراب ہوا ہے؟'' وہ بگڑ جاتی۔

''یہ دنیا فانی ہے۔'' مذاق حد سے گزر جاتا اور وہ روٹھ جاتی تو بچوں جیسی حرکتیں کر کے مناتا، بے وقوف ناموں سے چکارتا۔ جس پر وہ اور برا مانتی اور اٹھ کر باہر چلی جاتی۔ جب تنہا گھوم پھر کر آتی تو اسے کرسی پر اسی طرح سویا پاتی۔

اس کی توجہ اور محبت بھی عجیب تر ہوتی گئی شدت میں تصنع کی ملاوٹ معلوم ہوتی۔ وہ جتنا خاموش رہتا اتنا ہی پر جوش اظہار محبت ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا کسی چیز کو دور جھٹک کر وہ جما کھڑا رہنا چاہتا ہے۔ ایک نامعلوم سا خوف اور اکتاہٹ اسے نڈھال کر دیتی اور وہ جھلاہٹ بھری محبت ثمن کو خار بن کر کھٹکنے لگتی۔

ایک دن بڑی زبردستی سے وہ اسے آبادی کی طرف گھسیٹ لے گئی۔ تھوڑی دیر کو اس کی نیند دور ہو گئی۔ بالکل پرانے ٹیلر کی طرح کافی پی کر قہقہے لگاتا رہا مگر جونہی ہنسی ختم ہوئی ایک عجیب قسم کی جھجک اس کی حرکات میں معلوم ہوئی جیسے وہ رسیاں تڑوا کر بھاگ جانا چاہتا ہو۔ روشنی سے آنکھیں چندھیا جاتی ہوں، تھوڑی دیر میں وجہ معلوم ہو گئی لوگ چپ چاپ بیٹھے اس انوکھے جوڑے کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے، بیرا اپنا فرض بھول کر ان کے قریب کسی بہانے سے کھڑا رہ جاتا۔ کاؤنٹر پر ریزگاری لیتے ہوئے گاہک کا حساب کتاب گڑبڑ نظر آتا۔ اور دو چار پر نچی سوکھی ماری سیمیں تو کھلم کھلا ناراض بیٹھی تھیں۔

''نہ جانے یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟'' اس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''یہی کہ۔۔۔۔ نہ جانے میں کون ہوں۔۔۔ اور تم۔۔۔ اوہ۔۔۔ سوچنے دو۔۔۔ آؤ'' وہ ثمن کے چہرے پر رنگ آتا دیکھ کر نالے لگا۔

''واپس چلو!'' ثمن نے درشتی سے کہا۔

''کیوں؟ ارے واہ!''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''میں کہتی ہوں واپس چلو۔''

''مگر۔۔۔'' وہ کچھ جھینپا ہوا سا اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ راستے بھر خاموشی رہی۔

''ہم ان سے ڈرتے ہیں۔۔۔ کیا ان کا دیا کھاتے ہیں۔'' وہ مارے غصے کے لرزنے لگا۔ ''جاہل کمینے!'' وہ بری بری گالیاں بکنے لگا۔ آخر لوگ اتنے کوتاہ نظر کیوں ہیں؟ آخر انسان ہے تو ایک ہی بیج کا پھل، کیا چھوٹا کیا بڑا، کیا کالا کیا سفید، مگر کون سمجھاتا۔ کاش وہ اس شادی کے پیچھے چھپا ہوا شاندار مقصد موٹے موٹے حرفوں میں لکھ کر اپنی پشت پر ٹانک لیتے تاکہ یہ کوڑ مغز یوں متحیر آنکھوں سے تو نہ گھورتے۔ یہ بے رحم آنکھیں جو معلوم ہوتا ہے پیٹھ میں سوراخ کر کے دل میں گھس جاتی ہیں۔

''ان کا کوئی قصور نہیں، عجائبات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔'' ثمن کا دل بیٹھنے لگا۔

''مگر انہیں کیا مطلب؟ یہ کیوں مرے جاتے ہیں۔ میں سب جانتا ہوں ان لوگوں کی سفیدی کو، دل کی سیاہی تو کوئی دیکھے۔''

''وہ مجھے کیوں بازاری عورت سمجھتے ہیں۔''

''میں۔۔۔ میں گولی مار دوں گا ان حرام زادوں کے۔۔۔ جیسے ان کی سفید پتلیاں تو بس دیویاں ہیں۔'' ثمن نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔ اس لئے اس کا غصہ انتہا سے زیادہ بڑھ گیا۔ پھر وہ ثمن سے لڑ پڑا گویا وہی ان سب کو بھڑکا آئی تھی۔

''تم جھجکتی کیوں ہو؟'' وہ چیخا۔

''میں کہاں جھجکتی ہوں۔''

''اور کیا تم گھبرا کر انہیں اور شیر بنا دیتی ہو۔'' اپنا الزام وہ ثمن پر تھوپنا چاہتا تھا۔ ''مگر میں ان کمینی حرکتوں کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتا۔ اگر یہ لوگ ذلیل سمجھیں گے تو میں خود ان کے منہ پر تھوک دوں گا۔'' اس نے اس زور سے چنگھاڑ کر کہا کہ ہر لفظ اسکی ذہنی کوفت کا آئینہ دار بن گیا۔ گو وہ منہ سے بکتا رہا مگر اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دل میں مانتا ہے کہ ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ ثمن کو سہما ہوا دیکھ کر جی دکھ گیا اور وہ اسے سمجھانے لگا۔

اس ذہنی کوفت کو اس نے شراب اور زبردستی کی محبت میں ڈبونا شروع کیا مگر اس طرح وہ اکیلا فرار پا جاتا ثمن اس کے رویہ سے عاجز آ جاتی۔ اکتا دینے والا عشق مصنوعی اور فضول معلوم ہوتا۔ اپنے ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے وہ اس مدہوش کے پاس کیونکر پہنچ سکتی۔

''پونا کب چلو گے؟'' اس نے ایک دم نرمی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے اپنے پوشیدہ خوف کو اور چھپانا چاہا۔ ''تمہیں چھوڑ کر میں کیسے کام کر سکوں گا۔''

''مجھے چھوڑنے کو کون کہتا ہے۔'' ثمن نے جبریہ ذلت برداشت کر کے کہا۔

''ایں؟۔۔۔ ہاں۔۔۔ مگر وہاں ڈیوٹی پر مجھ سے نہ جایا جائے گا۔''

''پھر کیا ارادہ ہے؟ اسی طرح مٹ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے کیا؟''

''اگر تمہاری آغوش میں مٹ بھی جاؤں تو۔۔۔''

''بکواس مت کرو رونی۔۔۔ تم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔''

''دھوکا۔۔۔ کون کم بخت دھوکا دے رہا ہے؟ بتہ!'' وہ مجرمانہ انداز میں نظریں بچا کر کہنے لگا۔ تم، مجھے ہی نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکہ دے رہے ہو۔ تم۔۔۔ پچھتا رہے ہو۔''

''غلط۔۔۔ غلط۔۔۔ یہ سراسر بہتان ہے!'' اس کی تیزی اور جھلاہٹ نے بات کو اور پختہ اور یقینی بنا دیا۔

''میں تمہاری ہر بات سہہ سکتی ہوں۔ مگر رونی یہ جھوٹ مجھ میں برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔ اگر تم صاف کہہ دیتے کہ تم مجھے ساتھ لے جانے میں ذلت محسوس کرتے ہو تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔''

''میں۔ میں تمہارے بغیر کبھی نہیں جاؤں گا یہ بات طے ہے اور یہ کیسے کہتی ہو کہ مجھے تمہیں ساتھ لے جاتے ذلت محسوس ہوگی۔''

''اس میں تمہارے قصور نہیں اس چتکبرے جوڑے کو دیکھ کر جب لوگ مسکرا اٹھتے ہیں۔ آنکھ بچا کر اشارے کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ تم۔۔۔''

''تو پھر تو تم بھی جھوٹ بولتی رہو گی۔ گو ظاہر تو یہ کرتی ہو کہ نہ تو تم نے کچھ دیکھا اور نہ سمجھا۔''

''یہ۔۔۔ یہ میں اس لئے کرتی ہوں کہ۔۔۔ میں۔۔۔'' وہ کچھ نہ بتا سکی۔

''تم مجھے دھوکہ دینا چاہتی ہو۔ تم خوب دیکھتی ہو کہ میرے ہم وطن مجھے تنفر سے بھری ہمدردی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ گویا تم ایک بیماری ہو جو میری حماقت سے میرے سر منڈھ دی گئی اور تمہارے بھائی بند سمجھتے ہیں کہ تمہارے پہلو میں ایک انسان نہیں ان کی ساری قوم کی شخصیت پر ایک موٹی سی گالی ہے۔''

''لوگ مجھے کمینہ سمجھتے ہیں۔۔۔''

''شم۔۔۔ مگر تم مجھ سے کیوں لڑ رہی ہو۔ گویا اس میں میرا کوئی قصور ہے۔۔۔ تم جانتی ہو میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

''ہوں، یہ جو تم پستی کی طرف گرتے جا رہے ہو یہ بھی صرف میری خاطر۔۔۔ تم نیچے اتر کر میرے برابر ہونا چاہتے ہو۔ تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو کہ میرے برابر آنے کے لئے تمہیں اٹھنے کی نہیں بلکہ گرنے کی ضرورت ہے؟''

''یہ تمہارا وہم ہے۔''

''نہیں یہ میرا وہم نہیں، میں دیکھ رہی ہوں تم اس دوری اور فرق کو مٹانے کے لئے خود مٹے جا رہے ہو۔''

''تمہاری محبت کی خاطر۔ سوچو تو اگر تمہیں چاہتا نہیں تو پھر۔۔۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"مگر یہ محبت کیسی جو تمہیں مار رہی ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ کیا ہے، تمہیں محبت ہو یا نہ ہو مگر اتنا یقین ہے کہ مجھے اٹھا کر اپنے برابر کرنے کی کوشش بے کار ہے۔ تم سفید انسانوں کی دنیا اتنی بلند ہے کہ میرے سیاہ وجود کو اس مقدس درجے تک لے جا کر اپنی اور اپنی قوم کی توہین نہیں کر سکتے لہٰذا خود اپنی حماقت کے حضور میں اپنی ہی قربانی دے رہے ہو۔"

"تمہارے وہم سیدھی بات کو بھی بھوت بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ ذہنیت۔۔۔"

"ہندوستانی ہے کہہ دو۔" لہجے میں انتہائی تلخی پیدا کر کے کہا۔

"چہ چہ اتنا احساس کمتری! تم ہندوستانیت کو توہین سمجھتی ہو۔ یقین مانو شم میں نے جو کچھ کیا انجان ہوتے ہوئے کیا۔"

لیکن یہی کیا کم تھا کہ "کیا" آخر قدرت کو اس کے ہر شعبۂ زندگی سے خواہ مخواہ کا بیر کیوں ہو گیا تھا۔ تلخیاں بڑھتیں اور پھر دب جاتیں مگر ہر جھڑپ کا ایک داغ چھوڑ جاتا۔ محبت اور انسانیت ہر وقت میدان میں ڈٹے نہیں رہ سکتے۔ ویسے دونوں کا جی بھی اکتا گیا تھا۔ محبت لچر معلوم ہونے لگی تھی۔ ایک دوسرے کے وجود سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ہنی مون ہی میں ایک دوسرے کی جدائی کے سپنے ترسانے لگے۔ اور یہ چھوٹے موٹے جھگڑے اس نفرت کو بڑھاتے گئے جو دونوں کے لاشعور میں حلول ہو چکی تھی۔ مگر وقتی طور پر دبی ہوئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں اپنی بھول پر حیرت زدہ ہیں۔ پچھتانے میں خودداری کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے لہٰذا سکون قلب کا یہ نسخہ بھی ٹھکرایا ہے۔ یقیناً نیلر پر تو کسی قسم کا کوئی سوداوی مرض قابو کئے ہوئے تھا ورنہ وہ اس قدر آسانی سے یہ ڈرامہ نہ کھیل جاتا۔ اوپر سے مرچوں اور شراب نے دھار رکھ دی۔ جھنجھلا کر وہ احساس شکست سے بچنا چاہتا۔

بہت ضبط کرتے مگر ذرا سی ٹھیس سے پکا پھوڑا پھوٹ نکلتا اور دونوں کو اپنی خوبیاں اور دوسرے کے عیب نظر آنے لگتے۔ وہی طعنے جو انہیں لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتے تھے الفاظ کی مدد سے ایک دوسرے پر پھٹنے لگے۔ شکل و صورت کی وہی خوبیاں جو دیوانہ بناتی تھیں آنکھ میں شہتیر بن کر کھٹکنے لگیں۔ نیلر کے بال بے جان اور بدرنگ نظر آتے۔ آنکھیں خائب معلوم ہوتیں اور جلد کچے گوشت جیسی لگتی۔ ادھر نیلر کو اس کے سیاہ بال اور آنکھیں ڈراؤنی معلوم ہونے لگیں۔

خدا خدا کر کے ہنی مون کا مصیبت بھرا زمانہ ختم ہوا اور مجبوراً پونا روانہ ہونا پڑا۔ نیلر کا خوف تازہ ہو گیا۔ وہ نہایت پر خطر اور اجنبی محاذ پر جا رہا ہے۔ شمن اسے محسوس کرتی اور سارا غصہ اور نفرت اولے کی طرح سینے میں جمع کرتی جو بگولے بیابانی کی طرح دل و دماغ میں ہلچل مچائے رہتا۔

اسٹیشن پر ایک دوسرے سے رشتہ داری ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور کمپارٹمنٹ میں بھی اگر کوئی غور سے دیکھتا تو دونوں کو انسانیت سے زیادہ قریب رشتے میں منسلک تصور نہ کرتا۔ وہ ایک دوسرے سے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

بے توجہ اپنی تنہائی ظاہر کرنے میں کوشاں تھے۔ کوئی نہ دیکھتا ہوتا جب بھی حساس بنے غصے ہونے کو تیار رہتے۔ آوازوں پر کان لگائے رہتے کہ کہیں ان کے ہی متعلق تو کانا پھوسی نہیں ہو رہی ہے۔ غیروں کی طرح ڈائننگ کار میں کھانا کھایا اور بل ادا کرتے وقت نیلر کے کان سرخ ہو گئے اور شمن نے بیرے کی ناقدانہ نظروں کا بڑی مشکل سے مقابلہ کیا۔ دو بے جوڑ انسان اپنے جوڑ کے بے تکے پن کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

کبھی بھولے سے وہ بے تکلفی سے کوئی دلچسپ بات ایک دوسرے سے کہتے تو فوراً ڈر کر ارد گرد دیکھنے لگتے کہ لوگوں کی حیرت کا کیا حال ہے۔ اس بہادری اور جوش سے قائم کئے ہوئے جائز رشتے کو گناہ کی طرح چھپانا پڑ رہا تھا۔ جب نیلر کا سر سوتے میں تکئے سے ڈھلک کر مڑ گیا تو شمن کی ہمت نہ پڑی کہ اس بے چین سر کو سیدھا کر دے۔ گو اسے خوف تھا کہ کہیں بے چارے کی گردن نہ رہ جائے۔ وہ معمولی سا خیال جو برسوں کے پرانے میاں بیوی میں بھی تھوڑا بہت رہ جاتا ہے یعنی ایک دوسرے کی تکلیف سے بے چین ہو جانا اس کے اظہار کا حق بھی چھن چکا تھا اور وہ ابھی دلہن دولہا تھے۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر کا جوڑا بیٹھا کھلے بندوں ننھے بچوں جیسا اخلاص کر رہا تھا۔ اگر ابھی اس کی جگہ کوئی سفید قوم کی لڑکی ہوتی تو سر بازار اپنے سیاہ بھٹ میاں کو چٹا چٹ چومنے کا حق رکھتی تھی۔ بلکہ فخریہ کہتی تھی کہ "لو" دیکھو میرے روپہلی حسن کی طاقتیں کہاں کہاں کا جانور پھانس کر لاتی ہیں۔" اور وہ سیاہ آدمی بھی اس روپہلی بارش سے کھل کر فخریہ کہتا کہ "دیکھو تم ہم کو کالا سمجھتے ہو مگر یاد نہیں کرشن جی بھی تو کالے تھے اور گوپیاں ان کی متوالی تھیں۔۔۔۔" مگر وہ، حقیر تھی۔

اور اس کا جی چاہا سب کے منہ پر تھوک دے اور اسی وقت سب کے سامنے جھک کر نیلر کے دکھتے ہوئے سر کو آرام سے رکھ دے، اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے شربتی بالوں کی ریشمی نرمی کو انگلیوں میں جذب ہوتا محسوس کرے۔ اس کی پلک کا ایک بال جو ٹوٹ کر پپوٹے پر چپک گیا ہے جیسے سونے کا باریک سا تار، وہ اسے انگلی سے ہٹا دیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ کہیں آنکھ کھلے تو اندر نہ جا پڑے۔ ویسے ہی کیا کم کوئلے پڑ چکے ہیں جو اس نے غسل خانے میں آنکھیں مسل مسل کر نکالے۔ کتنا اس کا جی چاہا کہ ساڑھی کا پلو تہہ کر کے منہ کی بھاپ سے گرمی پہنچائے۔ مگر اسے یہ تجویز نیلر کے سامنے پیش کرنے کی ہمت نہ پڑی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس ذلت کو برداشت کرنے سے پہلے مر جانا بہتر سمجھے گا۔

اور یہ وہی نیلر تھا کہ جو ضدی بچے کی طرح روز آن کھڑا ہوتا تھا۔ دھن کے پکے بھکاری کی طرح اس نے دروازے پر دھرنا دے کر اسے حاصل کیا تھا اور پھر اپنے کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا۔ یہ وہی انسان تھا جو اس کے گھٹنے پر سر ٹکا کر پھانس نکلوانے کے لئے مصر ہوتا تھا، پیڑوں کی جڑوں سے کشتی لڑ کر جب پھانسیں لگا لیتا تو شمن کی خشک شاخوں کو بجلی کے سامنے وہ سوئی سے انہیں نکالا کرتی اور اس وقت وہ ضرورت سے زیادہ شریر بن جاتا۔ ہر پھانس کا کرایہ وصول کر کے نکلواتا اور دوسرے دن جان بوجھ کر نئی پھانسیں لگا لیتا۔ لیکن اگر اس وقت سب کے سامنے وہ اس کا سر چھو بھی دیتی تو وہ مارے ذلت کے مر ہی جاتا اور وہ خود؟ اسے اپنے آپ پر بھی رحم نہ آتا۔

وہ پہلے سوچا کرتی تھی کہ بھلا کیا جانیں یہ انگریز کہ عشق و محبت کیا چیز ہے، ہوا و ہوس کے بندے، نہ شرم نہ حیا بھلا رومان کیا سلامت رہتا ہوگا ان میں؟ کتنی سخت، کھردری اور مطلبی محبت ہوگی لیکن رونی بالکل مختلف تھا۔ وہ ہر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مذاق کو سمجھ جاتا اور اس میں وہ ساری حماقتیں موجود تھیں جنہیں وہ بچپن سے عشق و محبت سے وابستہ سمجھتی تھی۔ وہ بدمذاق نہ تھا گھنٹوں ایک دوسرے کے بچپن کے قصے سن کر ہنستے۔ دنیا کے وہ مختلف ٹکڑوں پر بسنے والے ایک ہی جیسا بچپن اور جوانی گزار چکے تھے۔ وہی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور سزائیں، معصوم دلچسپیاں اور ایک ہی جیسے کھیل۔

اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ پھر دور دور ہو جاتے اور ایک دوسرے کے سائے سے بھاگتے۔ تھوڑی دیر میں کمپارٹمنٹ خالی ہو گیا تو بجائے قریب آنے کے وہ ایک دوسرے کو بزدل اور بے اصول ثابت کرنے لگ گئے اور وہ نرم گرم جذبات جو تھوڑی دیر قبل ثمن کے دل میں جنم لے رہے تھے کملا کر ختم ہو گئے۔

پونا پہنچ کر زندگی سلجھنے کے بجائے اور الجھ کر بوجھل ہو گئی۔ سب سے پہلے تو نوکروں کی حیرت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پاس پڑوس کی متعجب آنکھوں کے تیر سہنے کے لئے گینڈے کی کھال کی زرہ بکتر پہننا پڑی۔ جو آتا نوٹ لینے آتا۔ اور کچھ نہیں تو بے کار کے سودا بیچنے والے ہی جان بوجھ کر ناک لگاتے، سونگھتے چلے آتے۔ ٹیلر کے دور دراز کے ملنے والے ان کے دوست اور دوستوں کے دوست آنکھیں پھاڑے مبارک باد دینے دوڑے آتے۔ ان کی آمد اور تمنائیں بڑھاتی۔ وہ لوگ بڑے مہذب طریقوں سے اس عجیب و غریب سانحہ کا ذکر اول سے آخر تک سننا چاہتے۔ ان کے چہرے تجسس سے پریشان ہو جاتے اور عقلیں پراگندہ! یہ ہوا تو کیسے ہوا؟

جتنے منہ اتنی باتیں، پرانے گھاگ انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی آوارہ عورت تھی۔ نو وارد اسے کسی ریاست کی مہارانی سمجھتے، چند ایسے بھی تھے جو کچھ فیصلہ نہ کر سکتے مگر دونوں کو خالی الذہن ضرور سمجھتے۔ انتہا ہو گئی کہ ٹیلر کے افسر نے اسکو بلا کر اس واقعہ کی سیاسی نقطہ نگاہ سے معیوب حماقت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آقاؤں کی قدیم روایتوں کو ٹھیس لگانے کی کوشش کی تھی۔ جوابدہی کرتے کرتے ٹیلر تھک ہی نہیں گیا بلکہ خود اپنے اوپر جو اعتماد تھا کھو بیٹھا۔ یہ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ ڈاک کے پروں پر اڑتی ہوئی امریکہ میں ٹیلر کی بیوہ ماں تک پہنچ گئی۔ وہ کم عقل اور کمزور نہ تھی مگر پھر بھی مفصل خط مانگا تھا۔ ٹیلر اس پر بھی چراغ پا ہو گیا۔

''مگر اس میں ایسی کیا برا ماننے کی بات ہے۔'' اس نے بڑھیا کی حمایت کی۔

''کچھ نہیں تم اس کی حمایت صرف میری ضد میں کر رہی ہو۔ میں اسے منہ بھی نہ دکھاؤں گا۔ اگر وہ مجھے اب تک بچے سمجھے ہوئے ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔'' ٹیلر کا غصہ ناک پر دھرا رہنے لگا تھا۔ وہ اب بالکل جاگ اٹھا تھا اور شراب بھی نشہ نہ لا سکتی تھی۔ وہ عموماً ہر جلسے اور پارٹی سے جان چراتا یا تو اسے کوئی مرض آن باتا یا مجبوراً ثمن کو ایک آدھ بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ دنیا کو چھوڑ کر وہ ایک دوسرے سے اور بھی اکتاتے گئے۔ زیادہ وقت ایک دوسرے کو طعنے دینے اور اپنے حال پر رحم کھانے میں صرف ہوتا۔ دونوں اس مصیبت کا الزام اپنے اوپر سے اٹھا کر دوسرے کے سر منڈھنا چاہتے تھے۔ بہت جلد زندگی خوفناک حد تک بار بن کر رہ گئی۔ اگر وہ

ہمت کر کے کسی کے یہاں چلے بھی جاتے تو گھما پھرا کر ان کے بے تکے عشق کا ذکر نکل آتا۔

''ایک بار ہمارے ایک رشتے کے چچا نے ایک ریڈ انڈین سے شادی کر لی تھی۔ بڑی باوفا اور نیک تھی۔ ہمیں اپنی زبان کے گیت اور خوفناک جنگلوں کے قصے سنایا کرتی تھی۔'' وہ بڑے جوش سے کہتے۔

''ہندوستان سے دوستی بڑھانے کا یہی طریقہ ہے کہ کالے اور گورے کا امتیاز اٹھا دیا جائے۔'' وہ بڑے فراخدل بن کر کہتے۔ مگر ان کی یہ سخاوت دونوں کو اور بھی دکھ پہنچاتی۔ وہ خوب سمجھتے تھے۔ کہ اس کے اصل معنی یہ ہوئے کہ مشرق اور مغرب کو ملانے کی کوشش اتنی ہی مشکل اور بے سود ہے جتنی کہ سیاہ کو سفید بنانے کی آرزو۔

ہر ملاقات کے بعد نئی ملاقات کا خیال بھیانک بن کر خون خشک کرنے لگا۔ کئی دن تک دلوں پر مردنی چھائی رہی جو آپس کی تلخیوں کی شکل میں پھوٹ نکلتی۔ الگ لگ دوستوں کا حلقہ بنایا تا کہ ایک دوسرے کی موجودگی جو سوال دلوں میں پیدا کرتی ہے اس کی گنجائش ہی نہ رہے۔ مگر لوگوں سے نجات کہاں تھی۔ لاکھ یقین دلاتے کہ یہ سب حماقت محبت کے زبردست ہاتھوں مجبور ہو کر کی گئی۔ اب بھی بہت خوش ہیں اور قطعی نہیں پچھتاتے۔ ہر مخالفت کو تیار ہیں مگر اس طرح مستعدی سے تیار ہونا ہی صاف ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کشمکش میں خود کو ڈال دیا ہے۔ اور ادھر جاپانی پٹاخوں نے بری طرح فضا کو مکدر کر رکھا تھا، بم تو خیر جہاں گر رہے تھے تباہی مچا رہے تھے۔ مگر جو انسان ان سے بچنے کے لئے بھاگ رہے تھے ان کی حالت قابل رحم تھی۔ جیسے کھٹکا سن کر بدحواس بھیڑیں چاروں طرف بھاگنا شروع کر دیتی ہیں اور بجائے محفوظ ہونے کے خود خطرہ بن جاتی ہیں۔ یہ گھبرائے ہوئے کم عقل جانور ایک شہر سے بھاگ کر دوسرے شہر میں پناہ لینے دوڑ پڑے۔ اونے پونے سامان بیچ کر ریلوں پر حملہ کر دیا۔ بمبئی کے لوگ کلکتہ اور کلکتہ کے لوگ بمبئی۔ اس کوٹھی کے وہاں اس کوٹھی میں بدل کر یہ سمجھ لیا کہ اب گھن نہیں لگ سکتا۔ حادثوں سے جتنی جانیں گئیں اتنی شاید سال بھر کی لگاتار بمباری سے بھی نہ جاتیں۔ گھپ اندھیرا سڑکوں ہی پر نہیں عقلوں پر بھی چھا گیا۔

مگر یہ کیا ہوا؟ ڈھال پر سے اترتے اترتے روڑے پر سے پیر پھسل گیا۔ برف کے بے جان سفید بھوت نے چاروں طرف سے ہاتھ پھیلا کر ہٹلر کی بڑھتی ہوئی جرأت کو آغوش میں بھینچ لیا۔ ہڈیاں تک جما کر رکھ دیں۔ موجیں اٹھا اٹھا کر چڑھتی ہیں اور سفید چٹانوں سے سر پھوڑ کر لوٹ آتی ہیں۔ اوپر سے برف کے بیٹوں کی دیدہ دلیریاں الاماں۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک دم لوٹ پڑے جیسے چالاک کبڈی باز، اپنے پالے میں دور تک دوڑا لائے پھر جو پٹایا ہے تو چین بلا کر ہی چھوڑا۔ تمام دنیا کی ٹوٹتی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں، ہارتے اور پیچھے بھاگتے ہوئے بھی سنبھل کر ڈٹ گئے۔ سرخ ستارہ خوں میں لت پت مگر سانس لئے ہوئے نکل آیا۔ وہ دو مہینوں میں ختم ہونے والا مریض سنبھالا لے کر چاق و چوبند ہو گیا۔

''ہم جانتے تھے آخر میں فتح ہماری ہی ہوگی۔'' ٹیلر نے اخبار رکھ کر غرور سے کہا۔

''تمہاری؟ یعنی یہ فتح تمہاری رہی اور وہ شکستیں جن کا مزہ شاید اب تک وہاں پر ہوگا، وہ کس کے حصے میں لگا دیں۔'' ثمن نے چڑ کر کہا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''ایں؟۔۔۔ ہار اور جیت تو ہوا ہی کرتی ہے۔۔۔۔''

''اچھا تو کبھی ہار بھی ہوئی ہے، منہ سے تو یہی کہتے رہے کہ جیت رہے ہیں، وہ بہادری سے پیچھے ہٹنا کچھ تم ہی لوگوں کی صفت ہے۔ تم میں کیا دم تھا کہ ہٹلر جیسے جن سے لڑتے، یہ ہندوستانی بھیڑیں اس دیوتا کے کلیجے کی آگ کیا بجھا سکتیں۔''

''تم پالیٹکس نہیں سمجھ سکتیں۔ اتحادی۔۔۔''

''جب تک ہارنے کا خوف ہے اتحادی بنے ہوئے ہو، ادھر جیتے اور ادھر سارا اتحاد چولہے میں ڈال کر حصے لینے دوڑ پڑو گے۔ اور پھر نہ دیکھو گے بھائی نہ بھتیجا بس سرکار عالیہ رہ جائیں گے اور ان کے چیلے چانٹے۔''

''اب کے ایسا نہ ہوگا۔''

''اجی خصلتیں بھی کہیں بدلی ہیں۔ جرمنی ختم ہو لے پھر روس کی باری ہے۔ آج روس کے گن گائے جا رہے ہیں کل تک اسے انسانیت کا دشمن کہتے تھے۔ آج چائنا کی محبت میں فدا، گلے میں پیار سے ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں۔ کل تک یہی چینی چور، ظالم، وحشی اور بدمعاش تھے۔ سوائے ڈاکوؤں کے مکار چیلے کے کبھی کوئی دوسرا عہدہ نہ ملا۔ آج وہی چینی اتحادیوں کی فہرست میں گنے جا رہے ہیں، جاپان کے مظالم کا تو غل مچا رکھا ہے اور اپنے فعل انسانیت کی حفاظت بنا کر پیش کئے جا رہے۔ مگر یاد رکھو ظلم کی ایک انتہا ہوتی ہے جہاں پہنچ کر ظالم خود اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹ لیتا ہے۔''

''ٹھیک ہے ظلم تو ہوتے ہی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں انہی میں فائدہ ہے۔ غور سے دیکھو تو باوجود مظالم کے ہندوستان بہت ترقی یافتہ ہو گیا ہے اور ہوتا جا رہا ہے۔''

''یہ جو چند کروڑ انسان انگریزی بولنے لگے ہیں اسی کو تم ترقی کہتے ہو گے۔ کاش اسی طرح تمہیں ہٹلر جرمن سکھا کر مہذب بنا سکتا۔''

''اسے ذاتی لڑائی کیوں بنا رہی ہو۔'' ٹیلر چڑ گیا۔

''کیونکہ یہ ہماری ذات سے وابستہ ہے۔''

''سکون چاہتے ہیں تو ہمیں بہت کچھ برداشت کرنا ہوگا۔''

''میں سب کچھ برداشت کروں گی مگر اپنے ملک کو ان سفید چمڑی والوں کی ایڑی تلے مسلتا دیکھ کر ضرور میرے دل سے خون ٹپکے گا۔ میرا دل روئے گا، آنکھیں روئیں گی اور روح ہمیشہ روتی رہے گا۔ یہ نہ سمجھو یہ بھوبل ٹھنڈی پڑ گئی ہے تو چنگاریاں بھی بجھ گئیں۔ کبھی تو زمانے کی ہوا رخ بدل کر چلے گی پھر انتقام۔۔۔''

''مگر تم لے تو رہی ہو اپنی ساری قوم کا دبا ہوا جذبۂ انتقام۔ تم میرے ہی سر پر ختم کر دو گی۔'' گھریلو جھگڑا تلخ تر ہوتا گیا۔

''اور تم؟۔۔۔ میری قوم کو دماغی، مالی اور جسمانی طور پر پینے کے بعد اب اس کی روح پر حملہ کر رہے

ہو، خیر اب تک تو اقتصادی اور سیاسی دنیا کے مالک تھے اب مجھ جیسی بدنصیب عورتوں نے اپنی آخری دولت بھی تمہاری جوتیوں میں ڈال دی۔''

''مگر میں کونسا خوش ہوں، مجھے بھی تو خوب انعام ملا، میری قوم میرے منہ پر تھوکتی ہی ہے۔ تمہارے وجود کی سزا مجھے ان کی پھٹکار کی صورت میں بھگتنی پڑ رہی ہے۔ سڑے ہوئے انگلی کے پورے کی طرح انہوں نے مجھے کاٹ کر جسم سے دور پھینک دیا ہے۔''

''اور۔۔۔ اور مجھے؟ رنڈی بھی اتنی کمینی نہیں سمجھی جاتی جتنی میں اپنی قوم کی نظروں میں ہو گئی ہوں۔ میں نے ان کے پرغرور سر کو تمہاری ٹھوکروں میں ڈال دیا۔ وہ میری پرچھائیں بھی اپنی شریف عورتوں کے اوپر پڑنا گوارا نہ کریں گے۔''

''مگر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم بچہ تو نہیں تھیں۔ تمہارے کم بخت ملک کی غلیظ آب وہوا اور خود تمہاری سیاہ کشش نے میرے دماغ کو مفلوج کر دیا۔ میں نے بہت برداشت کیا۔ لیکن اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی علاج بھی تو نظر نہیں آتا۔ میں اس راہ پر گم ہو گیا ہوں جو مجھے لوٹنے بھی نہیں دیتی۔''

''یہ الفاظ تمہارے منہ سے نکل رہے ہیں۔ تم جو میری جوتی پر ناک رگڑتے تھے میں نے تمہاری چاپلوسیوں کو سچ سمجھ لیا۔ تم پر بھروسہ کیا۔ ایک بار تمہارے برف کے تودے جیسے وجود میں انسانیت کو پالنے کی کوشش کی اور اسی حماقت کی سزا بھگت رہی ہوں۔ مگر معلوم ہو گیا کہ تم لوگ انسان ہو ہی نہیں سکتے، لاکھ خول چڑھا لو تو حقیقت تم بھیڑیوں کا راز فاش کر کے رہے گی۔ خونخوار درندے جھوٹے اور فریبی کہیں کے۔''

''خاموش، بدتمیز!''

''ہنہ بدتمیز! چور کو چور اور حیوان کو حیوان کہنا بدتمیزی نہیں راست گوئی ہے۔ تم جیسے لٹیرے۔۔۔''

''میں کہتا ہوں خیریت اسی میں ہے کہ چپ رہو۔'' رونی کی زبان ہار گئی اور غصے سے آنکھیں دہک اٹھیں۔ اس کی شکل گھناؤنی ہو گئی۔

''اوہو۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے بھونکنے سے میں ڈر جاؤں گی۔ چاہے کچھ ہو میں تمہارے فریب کا حال ضرور کھولوں گی۔ اس طرح دھوکہ دے کر۔۔۔'' شعلے کی طرح بھڑکا ہوا چہرہ اور بھی سیاہ پڑ گیا۔ پوری طاقت سے چوڑا چکلا ہاتھ کنپٹی اور رخسار کو کچلتا ہوا ٹمن کو زمین پر گرا گیا۔

ٹیلر ہانپتا لرزتا باہر چلا گیا۔ ٹمن نے ایک آہ بھی نہ بھری وہ بڑی احتیاط سے سنبھل کر کرسی کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

''وہ کیا کرے؟ اب کیا کرے؟''

''ٹھہرو اتنا مت سوچو، ذرا ٹھہرو تم نے گناہ کیا ہے تو خمیازہ بھگتنے سے اتنی مت ڈرو، تھوہر کا پیڑ سینچ کر انگور توڑنے کی امید نہ کرو ٹھہرو۔'' سر پکڑے وہ کئی گھنٹے روتی رہی۔ ٹیلر رات گئے آیا۔ نشہ میں دھت تھا اس کے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی چاپ سن کر ہی وہ کانپ اٹھی اور جلدی سے کنڈی لگا کر پلنگ پر گر گئی۔ نیلر تو پلنگ پر گرتے ہی سو گیا۔ مگر وہ آنکھیں پھاڑے صبح تک کھڑکی سے کالی بھیانک رات کو گھورتی رہی۔ سوچتے سوچتے کنپٹیاں سن ہو گئیں، دماغ دکھ گیا، پر وہ کیا سوچ رہی تھی، سوائے شدید غم کے کوئی دوسرا احساس زندہ بھی تو نہیں رہا تھا۔ جسم تھک کر پکا پھوڑا ہو گیا۔ کاش کسی غیبی جراح کا مشاق ہاتھ اس ٹپکن کو ٹھنڈا کر سکتا۔

صبح اس نے چائے کی پیالی بستر پر پڑے حلق سے نیچے اتار لی۔ نیلر کے جانے کے بعد وہ اٹھی۔ آج وہ بہت خوش وضع کپڑے پہن کر گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے سیٹی بھی بجائی تھی جس کی ہر تان سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ دوپہر کو اس نے فون سے لنچ کو منع کر دیا اور سیدھا ریس کورس چلا گیا۔ وہاں سے خوب ہار کر اور پی کر رات گئے لوٹا۔ بیرے کو مارتے مارتے چھوڑا۔ یہ ایک نئی ادا تھی اس کا رویہ نوکروں سے عام سفید لوگوں سے بہت مختلف رہا تھا، وہ ان سے بہت نرمی سے بولتا اور عموماً مذاق کیا کرتا تھا۔ آج وہ ٹیڑھی میڑھی عین مین انگریزی اردو میں احکامات صادر کر رہا تھا۔

دو دن اسی طرح آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ اگر بھولے سے سامنا ہو جاتا تو نفرت سے منہ موڑ کر دور ہٹ جاتے۔ نیلر بظاہر بڑا بہادر بن رہا تھا مگر ثمن کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ بھول بھول کر سر تھام کر پریشانی میں ڈوب جاتا، بار بار چیزیں پٹخ دیتا اور نوکروں پر جھلاتا۔ وہ دکھی تھی تو نیلر بھی کچھ تو بھگت رہا تھا۔

ثمن کھوئی ہوئی سی بیٹھی تھی جیسے وہ کسی مضبوط پل پر دوڑتے دوڑتے ایک دم ٹھٹک گئی۔ آگے تختے اکھڑے ہوئے تھے اور نیچے لامتناہی گہرائیاں اور بے رحم چٹانیں۔ شب بیداری سے اس کی آنکھوں کے گرد بھورے حلقے پڑ گئے تھے، کپڑے میلے ہو گئے تھے۔ مگر وہ بے خبر نہ جانے کیا سوچنے کی کوشش کئے جا رہی تھی۔ جو کچھ اس نے کیا تھا اس کی سزا وہ تنہا بھگتنا چاہتی تھی۔ ویسے اس نے اپنی کسی سہیلی کو اس بے وقوفی کی خبر بھی نہ دی تھی۔ ہمدردی وصول کرتے کرتے اکتا گئی تھی اور خطوں میں بھی اس کی موجودگی نہیں چاہتی تھی۔ اس کے گھر والوں کو بے شک خبر مل گئی تھی مگر وہ بھی سنانے میں خاموش ہو گئے تھے۔

''جب تم ہی اتنی مضبوط ہو تو ہم کون؟'' ان کے رویہ سے صاف ظاہر ہوتا تھا ایک طرح وہ لوگ اس کی طرف سے عرصہ ہوا تھا ناامید ہو چکے اور کوئی بھی خبر انہیں متحیر نہ کر سکتی تھی۔ اگر انہیں اس انجام کی خبر ملتی بھی تو شاید کچھ زیادہ متاثر نہ ہو سکتے۔ گویا وہ پہلے ہی سے اس انجام کی پرچھائیاں دیکھ چکے ہوں۔

روپے کی اس نے کبھی پروا نہ کی لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ اگر پاس روپیہ ہی ہوتا تو زندگی اتنی گھٹی ہوئی نہ نظر آتی۔ گو اسے نوکری آسانی سے مل سکتی تھی۔ کوئی معمولی سی پڑھانے کی نوکری۔ دنیا سے دور، بوسیدہ کتابیں، بدشوق لڑکیاں اور لامتناہی اکیلا پن۔ وہ اس آخری ہیولے سے بہت ہی خائف ہو چکی تھی مگر اس دم گھونٹنے والی خلا میں گرتے ہوئے لرزہ چڑھتا تھا۔ لیکن اب کیا ہو گا؟ سوچتے سوچتے سر کی رگیں سوجھ گئیں مگر کوئی دھندلی سی شعاع بھی روشنی کی نہ ملی۔

ثم۔۔۔ثم۔۔۔'' رونی کی آواز گھبراہٹ اور خوشی سے لرز رہی تھی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''کہاں ہو ثم ڈیئر۔۔۔'' وہ گیلری میں بے تحاشہ دوڑ رہا تھا۔ ''ثم!'' اس نے دروازے ہی سے اسے چیخ کر پکارا۔ ''یہ۔۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ممی۔۔۔ پیاری مم کا خط۔'' جلدی سے وہ آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا ثمن نے جھڑ کر پیپر سمیٹ لئے۔

''یہ دیکھو۔۔۔ ذرا دیکھو کیا لکھا ہے۔ میں اپنی پیاری بٹی کے لئے اپنے بیاہ کا بروچ اور لاکٹ بھیج رہی ہوں۔۔۔'' ''اصلی ہیروں کا ہے، میرے باپ کو ہیروں سے عشق تھا۔۔۔ اچھا سنو۔۔۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے اگر پہناتی تو۔۔۔'' ''اور مم۔۔۔'' وہ ثمن کی گود میں سر رکھ کر قہقہوں میں ملے ہوئے آنسو بہانے لگا۔

''ممی ہیرا ہے ہیرا۔۔۔ثم۔''

اور پھر نہ جانے کیسے ملاپ ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے پل کے تختے جڑ گئے اور ایک بار پھر زندگی کی گاڑی دندنانے لگی۔ نیلر نے اپنے آپ کو خوب گالیاں دیں اور کوسا۔ سارا الزام اپنے سر لے لیا بالکل ننھا سا رونی بن گیا۔ اور سوائے ممی اور ثم کے اس کے منہ سے دوسری بات نہ نکلتی۔ رات کو دونوں نے لارل اور ہارڈی کا ایک بدمذاقی سے بھرا ہوا فلم دیکھ کر بچوں کی طرح تالیاں بجائیں۔ باوجود سختی سے منع کرنے کے وہ بے دھڑک اسے سب کے سامنے چومے جا رہا تھا۔ لوگوں کی تحیر سے پھٹی ہوئی نگاہوں کا جواب وہ گستاخ قہقہوں سے دے رہا تھا۔ آج دنیا میں بس تین انسان تھے۔ دو یہ بگڑے دل اور ایک محبت کرنے والی ماں جو ہزاروں کوس دور امریکہ میں بیٹھی انہیں اپنی آغوش میں لئے چوم رہی تھی۔ شاید اسے معلوم بھی نہ ہو گا کہ اس نے غریب الوطن بیٹے اور غیر قوم کی بٹی کو اپنے کتنے قریب کھینچ لیا تھا۔ دونوں کے دل سفید بالوں والی معصوم صورت بڑھیا کے خیال سے ناچ رہے تھے۔ وہ اب دنیا میں اکیلے نہیں تھے۔ ایک تیسری جان ان کی زندگی میں آ گئی تھی۔ آج ان کا بھی ایک رازدار پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے نصیحت کو بھول کر رنگ اور قومیت پر لیکچر دیئے بغیر انہیں پیار بھری مبارکباد دی تھی۔ اس کی بہو ایک عورت تھی جسے اس کے چہیتے بیٹے نے چنا تھا۔ اسکے علاوہ اس نے کچھ بھی تو نہ سوچا اور ضرورت بھی کب تھی کچھ سوچ بچار کرنے کی۔ آج تک اس بیٹے نے کونسی غلطی کی ہمیشہ اس کی رائے پر عمل کیا اور کامیاب جوان بن کر اب انسانیت کے لئے ہتھیلی پر جان رکھ کر وطن سے دور پڑا ہوا تھا۔ وہ عورت جس نے اس انجان غریب الوطن سے پیار کیا ہو گا۔ وہ ضرور قابل محبت ہو گی۔ خواہ کتنی ہی کالی ہو، من کی ضرور گوری ہو گی۔ بس وہ اسی لئے اپنے خاندانی زیور اس کے سپرد کر رہی تھی۔

نہ جانے رونی نے اسے کیا لکھا ہو گا۔ آخر ماں ہے بیٹے کی ضد سے مجبور ہو گئی اور یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بدگمانی نے سر اٹھایا تو یہ ماں بھی بیٹے کی طرح مکار تھی! اف یہ سفید چمڑی۔

مگر جب رونی خرانٹے لینے لگا تو سرہانے کا دھیما لیمپ جلا کر اس نے خط دوبارہ پڑھا۔ ایک بار، دو بار اور آنسو نہ روک سکی۔ دور بچھڑی ہوئی ماں کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا خط، دنیا کے کسی جھگڑے کا اس میں ذکر نہ تھا، نہ خون آشام جنگ کا، نہ قومی خدمت کا، نہ آفتوں سے ڈرایا تھا، نہ کہیں ہمت دلائی تھی۔ جیسے دنیا میں اور تیسری چیز کا وجود ہی نہیں۔ ایک ماں ہے اور اس کا اکلوتا بیٹا، ہاں ایک چیز اور۔۔۔ وہ ان کی کبھی نہ ملنے والی

محبت، ایک دوسرے پر پکا اعتماد اور اس کی نئی بہو جسے ہر سطر میں لاکھوں پیار اور دعائیں بھیجی تھیں۔ بغیر دیکھے بھالے وہ محبت کا بیش قیمت خزانہ اس پر لٹا بیٹھی تھی۔

کتنا فراخ تھا اس ماں کا دل جسے شمن اپنے پروفیسروں سے ملتی جلتی تک چڑھی سمجھے بیٹھی تھی۔ بالکل اپنی معلوم ہو رہی تھی بلکہ اپنوں سے بھی زیادہ۔

وہ پارسل بھی دوسرے دن آ گیا۔ اگر شمن نہ روکتی تو وہ پولیس کے دفتر میں ہی چیر پھاڑ کے کھول ڈالتا۔ اس میں ماں کی ایک تصویر بھی تھی، ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ایک کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ نظریں اوپر کئے اپنے دونوں بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی ایک ایک شکن میں مامتا کا خزانہ پوشیدہ تھا۔ وہ چھلکتی ہوئی آنکھیں ہجر کی داستان بنی ہوئی تھیں۔ وہ کسی اونچے خاندان کی عورت نہ تھی۔ بیوگی کے بعد اس نے اپنی ساری توجہ اپنے بچے کی پرورش کی طرف مبذول کر دی تھی۔ اس کے کرخت جسم اور ابھری ہوئی چہرے کی ہڈیوں سے سخت محنتی ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ اس کی عمر فکر کی اور ناپ کرتے بیتی تھی۔ اور اب آخری عمر میں علاوہ اور چھوٹی موٹی جنگ کی بخشی ہوئی فکروں کے یہ بیٹے کی جدائی بھی جان کو آزار بن کر لگ گئی تھی۔ آخر کیوں بھیج دیا اس نے اپنے اکلوتے کو جنگ کی بھٹی میں پھنک جانے کے لئے؟ کیا بڑھیا کو اس بیٹے سے بھی کوئی چیز زیادہ پیاری تھی جس کی خاطر وہ ساری عمر کی کمائی کا داؤ لگا بیٹھی تھی۔

ایک بڑا سا آنسو خط پر ٹپکا اور کاغذ کانپ اٹھا۔ دور دراز پڑی ہوئی دو اجنبی عورتیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئیں۔ رونی سوتے میں نیند سے تھکی ہوئی کروٹیں لے رہا تھا۔ اس کے ہونٹ لرزاں تھے اور آنکھوں کے کونے بھیگے ہوئے تھے۔

تو ان برف کے تودوں میں بھی محبت چھپی ہوئی ہے، ان کے سینوں میں بھی دل ہیں اور ان میں ٹیسیں بھی اٹھتی ہیں! وہ سمجھتی تھی کہ یہ ایثار اور قربانی صرف مشرقی عورت کا ورثہ ہے۔ یہ مغربی موم کی پتلیاں کیا جانیں محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ خصوصاً اولاد کی محبت۔ سنا ہے بڑی بدمعاش ہوتی ہیں بوڑھی ہو جاتی ہیں پر ہوس نہیں جاتی۔ جانور ہوتی ہیں کسی ملک، کسی قوم کا ہو گلے میں لعنت کا طوق بن کر چمٹ گئیں۔ اول تو بچے پیدا ہی نہیں ہونے دیتیں اور اگر بدقسمت روحیں آن ہی ٹپکیں تو کتوں سے بدتر گت بناتی ہیں۔

مگر شمن نے یہ سب کچھ کہاں سے دیکھ لیا۔ نہ ہی کبھی وہ ان کے ملک میں گئی اور نہ ہی ہندوستان میں آئے ہوئے باشندے ملک و قوم کے صحیح نمائندے کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔ تو پھر کس نے بتائیں یہ ساری باتیں۔ یہ باتیں فولادی دیواریں بنی انسانوں کے بیچ میں اڑی ہوئی ہیں۔ کیا کوئی آنچ انہیں پگھلا سکتی ہے! کیا یہ لاکھوں کروڑوں سفید اور کالے انسانوں کا خون انہیں گھلا سکتا ہے۔

سائس! سائس کے نام پر اسے ہنسی آ گئی۔ بچپن سے اس نے مرکھنی ساسوں کے قصے سن رکھے تھے، ہر سڑی گلی چیز کو اس کی ساس کا سریا کلیجہ بتایا جاتا تھا۔ مگر اسے خواب میں بھی کبھی شبہ نہ ہوا تھا کہ ایسی بھولی گڑیا جیسی ساس ملے گی۔ کاش اس کا سسر بھی زندہ ہوتا۔ ڈکنس کے ناولوں جیسا، وہ گردن ہلتی، منہ میں پائپ

دبائے، باغبانی میں دھت بذھا!

کون کہتا ہے وہ کھو گئی! سامنے لمبی سیدھی اور روشن سڑک کہکشاں کی طرح جگمگا رہی ہے۔ اس پر دو نہیں، تین کھلونوں جیسے ننھے منے انسان آگے قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں۔ رونی، وہ خود اور ماں!

صبح خط دوبارہ پڑھا گیا۔ ساتھ ساتھ ہزاروں لمبے چوڑے قصے یاد آ گئے۔ ٹیلر نے چھٹی منانے کی رائے دی مگر شمن کے اصرار پر بادل نخواستہ جبراً دفتر گیا۔ جاتے وقت ٹیلر نے تاکید کر دی کہ قلم اور بہت سا کاغذ خط لکھنے کے لئے تیار رہے۔ آتے ہی لکھائی شروع ہو جائے گی دوپہر کے کھانے پر شامی کباب اور دہی کی خاص فرمائش کی۔ یہ مرد روٹھ جاتے ہیں تو کھانے سے پہلے روٹھتے ہیں۔

شام کو خط لکھا گیا۔ دو لفظ لکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پیاری ماں۔۔۔ نہیں کاغذ پھینک دیا۔ بہت پیاری ماں سب سے پیاری! اب؟ آگے کیا لکھے جسے آگے کچھ کہنا ہی نہ ہو۔ ان تین لفظوں میں دنیا سما گئی۔ کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد خط لکھا گیا۔ ٹیلر نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ نصف سے زیادہ خط شمن کے بارے میں تھا۔

جیسے بادل چھٹ گئے۔ اب باہر جانے آنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ ماں چھتری پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ بوند نہیں پڑ سکتی۔ زندگی مزے سے ہچکولے کھاتی گزرنے لگی جیسے ربڑ ٹائر گاڑی کنکریلی سڑک پر ٹھمکتی چل چلی جا رہی ہو۔ شکر رنجیاں آتیں اور گزر جاتیں۔ ہر جھٹکے پر دور ہو جاتے مگر پھر سر ٹکرا جاتے، دل مل جاتے۔ قہقہوں میں آنسو سوکھ جائیں تو کبھی آنسوؤں میں ہنسی ڈوب جائے۔ دنیا بھی عجائبات کی عادی ہو جاتی ہے خصوصاً جب کہ ڈھٹائی پر اتر آئیں۔ اب سڑک پر گردن موڑ کر بھی کوئی نہیں دیکھتا اور اگر دیکھتا ہے تو انہیں نہیں دکھائی دیتا۔ جلسوں پارٹیوں میں بھی جاتے اور کوئی متحیر نہ ہوتا۔ لوگوں کو ایک بار مشرق اور مغرب کے مل جانے کا گمان ہونے لگا ان کی شادی ضرب المثل بن گئی۔ حوالے دیئے جانے لگے۔

گھر سے بار بار تقاضا ہو رہا تھا کہ آ جاؤ چاہے دو چار دن ہی کو آؤ اور اس کا بھی جی چاہ رہا تھا۔ اتنی دوری پر بھی خون کی کشش مجبور کئے دیتی تھی۔ ارادہ بھی کیا مگر پھر ایسی وحشت ہوئی کہ نیند اڑ گئی۔ یہاں کے لوگ تو عادی ہو چکے تھے پر اب یہ نئے پہاڑ کیسے کھودے جائیں گے اور پھر ان چٹانوں کو ہموار کرنے کے لئے جس ماتھا پھوڑی کی ضرورت تھی وہ کس سے جھیلی جائے گی۔ بڑی بوڑھیوں کے طعنے کیسے سنے جائیں گے۔ سب کی سب ٹیلر کی ماں نہیں بن سکتیں۔ بہن بھائی چھوٹے بچے بچیاں کیا کہیں گے! انہیں کون سمجھائے گا۔ چڑیا گھر ہی چلے جاتے ہیں تو جانور بوکھلا اٹھتے ہیں۔ بھلا یہ خوگیر کی بھرتی کیا نہ دند مچائے گی۔ تو وہ نہیں جا سکتی۔

وقت بدل جانے سے زیادہ فرصت بھی کم معلوم ہونے لگی۔ ادھر جنگ کی آگ لپکی ادھر وقت کی رفتار میں بھی کوک بھر دی گئی۔ ہر وقت یہی معلوم ہوتا گھنٹے، منٹ، سیکنڈ ہاتھوں سے پھسلے جا رہے ہیں۔ سلائی کی نگرانی کے ساتھ ساتھ آئے ہوئے مال کی بھی دیکھ بھال کرنا پڑتی۔ اس کے علاوہ جب ایک نوکری میں دو

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

برتن رکھے ہوں تو آبائی حق کے بل بوتے پر ٹکراتے ہیں۔ سینما ہی ایک چیز رہ گئی تھی جہاں بغیر ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے وقت کاٹا جاسکتا تھا۔ شمن بے کاری سے اور بھی اکتا گئی۔ آنکھ کھول کر پڑھنا اور پڑھانا کچھ نہ کچھ زندگی کا مصرف رہا اور اب یہ حال کہ دن گزر جاتا تو رات دوبھر ہو جاتی۔ نیلر تو تھکا ماندہ آ کر مزے سے سو جاتا اور وہ پڑی جاگا کرتی۔ دن کو لازمی طور پر نیند آ جاتی اور یہ لمبی لمبی راتیں اور تھکا دینے والی تنہائی اس کا دماغ ہلا ڈالتیں۔ نیلر کا وجود تو نہ ہونے کے برابر ہوتا۔ دن کو وہ کام میں رہتا اور رات کو نیند میں اور شمن اس کی دنیا سے نکلی ہوئی باوجود ساتھ رہنے کے تنہا ہی رہتی جیسے وہ اس کی بیوی نہیں پڑوسن ہے جس سے بوقت ضرورت بات کرلی ورنہ نہیں۔

مگر سینما میں بھی چخ چخ ہو جاتی ''گریٹ ڈکٹیٹر'' پر کچھ ذاتی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ بزدلی اور چھچھوراپن ہے۔۔۔۔ مذاق تو ہر ایک کا بنایا جاسکتا ہے''۔ نیلر جو بغیر سوچے سمجھے ہنس رہا تھا اس فلسفہ پر چڑ گیا۔

''ارے مائی کیف پڑھو تو تمھیں معلوم ہو کہ یہ نازی کیا ہیں۔ شیطان ہیں پورے۔'' اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

''کچھ زیادہ فرق تو نہیں نازیوں میں اور ان کے بھائی بندوں میں، شیطان نئے نئے روپ بھر کر جنم لیتا ہے۔''

''مگر اتنا تو کوئی نہیں''

''ہنہ۔۔۔ بھلا تم کیوں کہو گے۔ ان کے چیلے جو ٹھہرے، شاہی پاسبان جو ہوئے۔''

''ہم۔۔۔ میں۔۔۔ ہم لوگ برطانوی راج کی حفاظت کے لئے ہرگز نہیں لڑ رہے ہیں۔''

''کہہ دو انسانیت کی حفاظت میں لڑ رہے ہو۔ ہنہ چوٹی بلی جلیبیوں کی رکھوالی کرنے چلی ہے۔ نو سو چوہے تو پورے ہو گئے۔ اب حج باقی رہ گیا۔ کیا کہنے ہیں۔''

''لیکن اس مرتبہ انصاف ہوگا۔''

''کیوں نہیں لٹیرے ہی انصاف نہ کریں گے تو پھر اور کون کرے گا۔''

''مگر بھئی میں تو لٹیرا نہیں، میرے ملک نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟''

''تم لٹیروں کا ساتھ دو گے تو ضرور لٹیرے کہلاؤ گے، بڑے انسانیت کے پہرے دار بنے ہو ذرا ہندوستانیوں کو بھی انسان سمجھ کر دیکھو۔''

''کون کہتا ہے ہم ہندوستانیوں کو انسان نہیں سمجھتے؟''

''تو پھر ان چالیس کروڑ انسانوں کو نازیوں کی چکی میں پستا دیکھ کر تمھارے کان پر جوں کیوں نہیں رینگتی۔ فرانس کو تم بچانے دوڑے، پولینڈ کی موت پر چھاتی کوٹ کوٹ کر رو دئے، برطانیہ کے ہاتھ سے دو تین سونے کی چڑیاں جاپانیوں نے چھین لیں تو کلیجے مسل گئے، مگر یہ کیسی انسانیت ہے جو بس تمھیں سفید چمڑی ہی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

میں نظر آتی ہے۔''

''کیوں ہم چین کے لئے بھی لڑ رہے ہیں۔''

''جیسا لڑ رہے ہو وہ خوب معلوم ہے روس کی بھی تو مدد کر رہے ہو۔ دوسرا محاذ کیسے قائم ہو رہا ہے۔ پر نہ جانے یہ بات ہے کہ کنجی ہی نہیں ملتی۔ ہم جانتے ہیں یہ دوسرا محاذ کب کھلے گا۔۔۔۔ جب جرمنی پسنے لگے گا اور روس تھک جائے گا۔''

''تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے اب سینما بھی تمہارے ساتھ دیکھنا حماقت ہے۔'' طے ہوا کہ فلم بینی بند۔ پر یہ عہد زیادہ دن قائم نہ رہا اور فرمائش نیلر ہی کی طرف سے شروع ہوئی۔ یہ طے پایا کہ اگر ایک انگریزی فلم دیکھی جائے تو دوسرا ہندوستانی بالکل کھرا سودا۔ یہ نہیں کہ وہاں سے تو دنیا بھر کا کوڑا اسمیٹ کر ہندوستانیوں کے سر پٹخا جائے اور یہاں کی ایک تصویر بھی نہ دیکھی جائے۔ خیر حکومت کے آگے بس نہیں تو گھر میں تو چلے گا اپنا قانون۔ نیلر راضی ہوگیا۔ وہ ہندوستانی بخوبی سمجھ لیتا تھا۔

مگر دو ایک اسٹنٹ پکچر تو جھیل گیا پھر تو یہ حال ہوگیا کہ دو ریلیں دیکھیں اور خفقان اٹھا۔

''یہی فلم تو پچھلے ہفتے دیکھی تھی۔'' وہ ضد کرتا۔

''کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی ہفتے تو بن کر آیا ہے۔'' شمن لڑتی۔

''نہیں جی یہی تھا۔ وہ چغد سا عاشق، کیا میں اسے پہچانتا نہیں۔ جنگلوں میں گاتا پھر رہا تھا۔ پھر وہ چپٹی سی ہیروئن گر پڑی تھی تو۔۔۔۔ چلو چلو یہ تو وہی ہے کوئی دوسرا انگریزی فلم دیکھیں۔''

اب شمن کا پارہ چڑھ جاتا یوں تو ہر فلم میں یہی ہوتا ہے۔ ہیرو جنگل ہی میں گانا گاتا ہے۔ ہیروئن گرتی ہے تو اسے اٹھانا ہی پڑتا ہے مگر نیلر تو اسے جان بوجھ کر جلانا چاہتا ہے۔ جو فلم اچھا بھی ہوتا تو وہ پورے وقت سوتا رہتا۔ اور شمن جلی بھنی نہ جانے بیٹھی ضد سے دیکھا کرتی۔ اور جان بوجھ کر انگریزی کے اچھے فلم میں عاجز بن جاتی۔ غرض کوئی بھی ہو دونوں کا مزہ کرکرا رہتا۔

''یہ تمہارے ہاں ہر کیریکٹر گاتا ہے یا روتا ہے۔''

''اور تمھارے یہاں سوائے نخش کے اور کیا ہوتا ہے۔'' وہ بحث کرتی۔

''یہ کہنا چاہئے کہ امریکن فلموں کی نقل اتاریں۔''

''ہنہ، بڑے امریکن فلم، گندے، غلیظ، سوائے ننگے پن کے اور ہے بھی کیا۔'' گو اسے معلوم تھا کہ عام طور پر جو ہندوستانی فلم ذرا بہتر ہوتے ہیں ان میں یہی چالاکی استعمال کی جاتی ہے مگر وہ بجتی رہی۔

''لاجواب ہوتے ہیں۔ تمہارے فلموں میں تو کچھ ہوتا ہی نہیں۔''

''یہ تمھاری سمجھ کا قصور ہے نہ کہ فلموں کا۔ تم ہم لوگوں کی زندگی کا فلسفہ ہی نہیں سمجھتے۔ تم لوگ تو بس جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کو فلم دیکھتے ہو۔''

''اول تو ہمارے جذبات بم کے گولے نہیں کہ ٹھیس لگی اور بھک سے اڑ گئے دوسرے اس میں مضائقہ

ہی کیا ہے۔''

تلخیاں اور بڑھتیں، بحثیں عام موضوع سے ہٹ کر گھر کی چار دیواری میں آن جمتیں۔ نجی باتیں پھوٹ نکلتیں اور ایک سرے سے سینما سے بائیکاٹ کرنا پڑتا مگر ریڈیو ہی جان کو روگ کی طرح لگ گیا۔ ان دونوں کو تو بس کسی بہانے کی تلاش رہتی۔ ٹیلر ہندوستانی گانا سنتے ہی پاگل ہونے لگتا۔ اس کی ضد میں شمن نے پکے راگ سیکھنے کے لئے ماسٹر رکھ لیا۔ وقت بھی کٹ جاتا اور جنگ کا مواد بھی مہیا ہو جاتا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر استادوں کے راگ سنتی۔ ہر تان پر جھوم اٹھتی، ہر کنکری پر لرز جاتی اور الکاروں میں کھو جاتی۔ مگر جونہی ٹیلر آتا وہ کھٹ سے لندن جا پہنچتا۔

''یہ ہے اصل نغمہ!'' وہ جھوم کر کہتا۔

''ہنہ جیسے پٹاہوا کتا رو رہا ہے۔'' وہ جل کر کہتی۔

''جبھی تو کہتا ہوں سمجھنا سیکھو۔ کان پیدا کرو۔''

''تم ہندوستانی گانا سمجھنے لگو تو یہ کائیں کائیں سنو بھی نہیں۔''

''ہندوستانی گانا کسی عقل والے دماغ میں تو سما نہیں سکتا۔''

اس پر بات بڑھ جاتی۔

''تم میرے ملک کی ہر چیز کو حقیر سمجھ کر مجھ سے دور کرنا چاہتے ہو۔''

''میرے ساتھ تو تمھیں میرے ہی رنگ میں رنگنا پڑے گا۔''

''کوئی ضروری نہیں کہ میں تمھیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش نہیں کرتی تو تم میرے اوپر جبر کرو۔''

''تم جانتی ہو کہ تمھارا رنگ پھیکا ہے، تمھارے مرد زیادہ عقلمند ہیں۔ وہ یورپین لڑکی سے شادی کر کے کس قدر مہذب ہو جاتے ہیں۔ کھانا، پینا، رہنا، سہنا، بول چال سب میں سلیقہ آ جاتا ہے۔''

''ہنہ خوب۔ یہ ایک اور امپیریل ازم کو پھیلانے کی چال ہے کہ اپنی لڑکیاں الوؤں کو پھانسنے کے لئے لگا دی ہیں اسی طرح انگریزیت کا پرچار ہو جاتا ہے۔ ان کا لباس پہن کر، ان کی زبان منہ میں لے کر، ان کی عورتوں کی آغوش میں بھلا ان کے خلاف چوں کرنے کی سکت رہ جاتی ہے۔ پھر نہ وہ ہندوستانی ہی رہتے ہیں اور نہ ان کی سیاہ چمڑی انگریز بننے دیتی ہے۔ بیچ میں معلق ہو جاتے ہیں۔ ان کی اولادیں یا تو اپنے دوغلے حسن کے بل بوتے پر پیشہ چلا لیتی ہیں یا آنے جانے والے نامیوں کی جوتیاں چاٹتی پھرتی ہیں۔ ایک طریقہ تھوڑی بے مینے کا۔ یوں جذب کر کے بھی تو فنا کیا جا سکتا ہے۔''

''تو بھئی تم ہی مجھے اپنے نظام میں جذب کر لو۔ اس کیچڑ میں رہنے کی عادت ذرا مشکل سے پڑے گی۔''

''مگر۔۔۔''

''مگر اصل بات یہ ہے کہ۔۔۔۔ خیر جانے دو۔''

''کہو۔ میں کوئی بچہ نہیں جو تم چڑاؤ اور رو دوں۔''

''یہ کہ یورپین طرز رہائش بہت بلند ہے اور تمھیں یقین ہے کہ وہ جذب ہونے کے لائق ہے۔ اس لئے تم جان بوجھ کر بجائے اوپر اٹھنے کے نیچے کیسے گھسیٹ سکتی ہو۔ تم لوگ دل سے یورپین معاشرت کے مداح ہو۔''

''بڑے حسین مغالطے ہیں۔''

جھک جھک ہوتی مگر شمن دل میں ضرور نادم ہوتی۔ یہ کیا بات تھی کہ وہ یورپ کی اتنی بڑی مخالف ہوتے ہوئے بھی انجان طور پر اسی رنگ میں رنگتی جا رہی تھی۔ وہ میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتی، بیڈ پر سوتی اور چھوٹے چھوٹے قواعد پر عمل بھی کرتی۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ اس ندامت نے ضد کو اور بھی بڑھا دیا۔ وہ جان بوجھ کر اصول توڑتی، معمولی بیماری کے بہانے سے کھانا بستر کے پاس منگوا لیتی۔ بجائے نائٹ سوٹ کے اس نے غرارہ اور کرتا پہننا شروع کیا۔ مگر ٹیلر نے محسوس بھی نہ کیا اور اسے غرارہ بے انتہا پسند آیا۔ بالکل اسکرٹ معلوم ہوتا تھا۔

تو گویا جس چیز میں اسے اپنی معاشرت کی جھلک نظر آتی تھی وہ اچھی اور قابل پسند تھی! اتنا روشن خیال ہوتے ہوئے بھی وہ انجان طور پر کس قدر کوتاہ بیں تھا۔ جہاں تک ہوش و حواس کا ذکر تھا وہ وسیع نظر تھا۔ مگر یہ لاشعور کی پاسبانی اس کی طاقت سے باہر تھی۔ یہ صدیوں کی جمی ہوئی کائی آسانی سے نہیں کھرچی جا سکتی تھی۔ یہ حال ہے ان روشن خیالوں کا تو کوتاہ نظر والوں کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ کتنا بھی چاہیں احساس برتری دماغ سے نہیں نکل سکتا، انسانیت ہمہ گیر برابری مانتی ہے۔ یہ دماغ میں جو چور بیٹھا ہے وہ کبھی کبھی جھانک کر دیکھتا ہے۔ پانچ انگلیاں یکساں نہیں۔ انہیں کھینچ تان کر یا کاٹ چھانٹ سے برابر نہ کرو۔۔۔ ہاتھ بدوضع اور بھونڈا ہو جائے گا۔ دنیا کی شوبھا اسی اونچ نیچ سے قائم ہے۔ اس معاملہ میں روشن خیال خام خیالی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

اور گھر میں ایک عجیب کشمکش شروع ہو گئی۔ جیسے گاما اور زبسکو جٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی طرف کھینچتا ہے یہ اپنی طرف۔ کبھی یہ داؤ لگا کر جیت کرنے لگتا ہے تو وہ پلٹا مار جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ ذہنی رسہ کشی بھی بڑھتی گئی۔ کیسے پار لگے گی یہ دو انجنوں کی کشتی جس میں دونوں انجن مخالف سمت کو دوڑ رہے ہیں۔ کبھی دو انچ مشرق کی طرف بہتی ہے تو کبھی دو انچ مغرب کی سمت۔ نتیجہ وہی انجماد، گھٹن اور کوفت اوپر سے طوفان تلا کھڑا ہے موجیں منہ پھاڑ پھاڑ کر دوڑ رہی ہیں اور ناخدا نے جنم ہی نہیں لیا۔

زندگی سے تھکی ہاری نبٹتی ہوئی دور نکل گئی۔ آج ہی ٹیلر سے چخ چخ ہوئی تھی زخم تازہ تازہ تھے۔ پارک میں بینچ پر ذرا دیر کو سستانا چاہا۔ مگر جیسے سانپ نے چنک لیا یہ بینچ کیوں، چبوترہ کیوں نہیں۔ یہ سارے نوٹس، سارے اعلانات یہ انگریزی میں کیوں؟ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ذرہ ذرہ مالکوں کی دست درازیوں سے کچلا ہوا، میلے کچیلے تھیلوں کی وضع کے پتلون، بھدیلی فراکیں۔۔۔ ٹوٹے ہوئے پائے والی کرسیاں اور

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کھرچی ہوئی میزیں ان درندوں کے خونی پنجوں کے نشان پر پنجہ پنجہ پر کھدے ہوئے ہیں۔ کیسے بھریں گے یہ گھاؤ؟

اس کا جی چاہا بینچ کو ایک ٹھوکر لگائے اور زمین پر لوٹ لگا دے یہ امپیریل ازم کے ٹھپے۔ کاش کوئی غیبی ہاتھ ان گندگیوں کو چن کر ملک سے دور سمندر میں جھونک دیتا اور اس کے ساتھ ساتھ ان سفید برص کے داغوں کو بھی دھو ڈالتا جو سیاہی اور گرمی سے تپ کر کوڑھ کے زخم بن گئے ہیں۔ جن کی عفونت نے انسانیت کا دم گھونٹ رکھا ہے۔

''اوہو السلام علیکم۔۔۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔'' کسی جانی پہچانی سی آواز نے پہلو سے پکارا اور وہ چونک پڑی۔

''ارے۔۔۔ تم۔۔۔ آپ۔'' وہ حیرت زدہ ہو کر پروفیسر کے بگڑے ہوئے حلیہ کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے تو واہمہ کی سازش معلوم ہوئی۔ کہاں وہ نک سک سے درست چھیل چھبیلے پروفیسر اور کہاں یہ ڈھیلے ڈھالے کھدر میں غرق بدوضع شاعر نما لیکن انتہائی غیر شاعرانہ انسان۔

''مگر آپ تو چلے گئے تھے۔''

''ہاں۔ اور آ بھی گیا تو اس میں اس قدر حیرت کی کیا بات ہے تم تو ایسے چونکیں جیسے میں کوئی مردہ ہوں جو کفن پھاڑ کر آن کھڑا ہوا۔''

''کچھ نہیں اصل میں یوں ایکا ایکی ملنے کی امید تو نہ تھی۔ مگر یہ۔۔۔''

''کہو کہو۔۔۔'' وہ خوش مزاجی سے مسکرایا۔

''کچھ نہیں جانے بھی دیجئے اتنے دن بعد ملیں اور پھر وہی جنگ شروع کر دی۔ کہئے خیریت تو رہی۔''

''پوچھو مت۔ خود دیکھنے کی کوشش کرو۔''

''بس اب دیکھئے مجھے الزام نہ دیجئے گا آپ ہی چھیڑ رہے ہیں۔ کوئی بات منہ سے نکل گئی تو تنا اٹھیں گے۔

''آزماؤ تو ایک بار، اب وہ نازک مزاجیاں نہ رہیں۔'' پروفیسر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''معلوم ہوتا ہے کسی سے عشق ہو گیا۔''

''اجی ایسا ویسا عشق۔ شدید قسم کا۔''

''مبارک ہو۔ مگر یہ ہوا کیسے؟''

''عشق ہونے میں بھی کیا کوئی بل بیل لگتے ہیں۔''

''مگر معاف کیجئے گا یہ ڈھونگ تو کچھ قوم پرستوں کا سا رچایا ہے۔'' اس نے سر سے پیر تک نگاہ دوڑا کر دیکھا۔

''معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' پروفیسر چپکے سے بولا۔

''مگر یہ بات کیا ہوئی۔ کم از کم آپ سے تو یہ امید نہ تھی۔''

''کیا امید۔۔۔ یہ ڈھونگ رچانے کی۔۔۔''

''جی۔۔۔ یہ لباس، یہ کاکلیں۔۔۔ اور یہ لٹکا۔۔۔ کمال کر دیا آپ نے تو۔ تب تو آپ کمیونسٹ بھی ہو گئے ہوں گے۔''

''لازمی طور پر۔'' پروفیسر اب بھی مسکرا رہا تھا۔

''وہ تیرہ سو کی نوکری۔''

''وہ چھن گئی۔''

''وجہ؟ آپ تو۔۔۔''

''سخت نالائق نکلا۔ جبھی تو یہ روپ دھار لیا۔'' پروفیسر کی آواز میں طنز کی تلخی نہ چھپ سکی۔ شمن نے بے اعتباری سے پروفیسر کو گھورا۔ یہ وہ کیا پینترے چل رہا تھا۔ اسے اس شخص پر بھروسہ نہ تھا۔ دم بھی میں الو بنا دیتا اور پتہ بھی نہ چلتا۔ پر آج تو وہ خود بگلا بھگت بنا بیٹھا تھا۔

''کچھ آپ بیتی بھی تو سناؤ۔۔۔ ہاں بھئی شادی کی مبارک باد تو دینا بھول ہی گیا۔''

''جی ہاں۔ آخر کو ایک کارندہ پھانس ہی لیا۔ جنگ کا زمانہ ہے ہر چیز مہنگی ہو رہی ہے۔''

''میرا ہی جوتا میرے ہی سر۔ لیکن مجھے تم سے یہی امید تھی برا نہ مان جانا۔ دراصل شادی بیاہ کے معاملے میں میری رائے حقیقت نہیں رکھتی۔ مگر کہیں تم نے شادی صرف اس لئے تو نہیں کر ڈالی کہ تمھیں ذرا عجیب و غریب بننے کا شوق ہے۔۔۔ سنو، سنو بیچ میں نہ بولو۔ اگر اس وجہ سے کی ہوتی تو تم خوش اور اس قدر مطمئن نہ نظر آتیں۔''

''میں خوش نظر آتی ہوں۔'' وہ کھوکھلی آواز میں ہنسی۔

''کم از کم صورت اور صحت تو یہی کہتی ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔ یہ بتاؤ کچھ کرتی بھی ہو یا کام چھوڑ دیا؟''

''بہت دن ہوئے چھوڑ دیا۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اوہ بھولی۔۔۔ آپ تو ''کام'' کر رہے ہوں گے۔'' پروفیسر مسکرایا اور کوئی جواب نہ دیا

''اب تو آپ سرکاری کمیونسٹ ہیں۔ اب تو راج ہوں گے۔''

''کیوں نہیں۔''

''قومی جنگ کا بھی کام جاری ہوگا۔''

''بڑی تیزی سے۔''

''بھئی مزے ہیں آپ لوگوں کے ایک بے چارے وہ کمیونسٹ تھے جو چوہوں کی طرح بلوں میں چھپتے پھرتے تھے، پاگل کتوں کی طرح دوڑائے جاتے تھے، ایک آپ ہیں کہ۔۔۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''مزے سے وائسرائے کے ساتھ؛ نرازار ہے ہیں۔۔۔موٹریں۔۔۔گھوڑا۔۔۔گاڑی، کمی کیا ہے ہم لوگوں کو۔'' شمن نے پھر طنز کی کڑواہٹ پر منہ بنایا۔ مگر پروفیسر کی مکار دھنسی ہوئی آنکھوں اور بے معنی مسکراہٹ نے گڑبڑا کر رکھ گیا۔

''اچھا تو وہ آپ کی محبوبہ کون ہیں۔''

''ہے ایک بنگال کی حسینہ۔''

''بنگال کی؟''

''ہاں۔۔۔تمھیں نہیں معلوم۔ ارے بنگال ہی میں تو میرا تقرر ہوا تھا۔ بس وہیں ایک کافرہ کے تیر نظر کا گھائل۔۔۔'' شمن گھبرا کر دور ہٹ گئی۔ پروفیسر کی آنکھیں بھیانک طور پر سکڑ گئیں۔ ان میں عجیب نامعلوم سا خوف چھا گیا۔ جیسے وہ کسی ڈراؤنے خواب کو نیم بیداری میں دہرا رہا ہو۔ اس کا جسم پہلے سے نصف بھی نہیں رہا تھا۔ چہرے پر عمر کے آثار اچانک برس پڑے تھے، اس لئے مسخ ہو گیا تھا۔ بال کتنے سفید ہو گئے تھے جیسے وہ پن چکی جھاڑ کر چلا آ رہا ہو۔ وہ چکرا گئی۔

''سردی بڑھ گئی ہے۔ گھر چلیں گے یا دیر ہونے کا ڈر ہے۔'' اس نے بینچ پر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''چلوں؟'' پروفیسر نے جاگ کر جواب دیا۔

''ہاں کیوں نہیں۔۔۔ٹیلر تو شاید دیر سے آئے۔''

''تلی نہ پھاڑ دے کالا آدمی دیکھ کر!''

''مگر تم تو سرکاری کالے ہو۔''

''پھنکار ہو۔۔۔کیوں؟'' وہ خوش مذاقی سے ہنسا۔

گھر پہنچے تو وہ دیر تک گھوم پھر کر مکان دیکھتا رہا۔ کھانے پر اس نے ہوکے زدہ ہو کر ایک دم نوالے نگلنا شروع کئے۔ مگر پھر ٹھٹک گیا۔ جیسے ایک دم ابکائی نے گلا دبوچ لیا ہو اور پھر نگلنا شروع کر دیا۔

''ذرا ہاضمہ بگڑ گیا ہے مرغن کھاتے کھاتے۔'' وہ پھر بے معنی طور پر مسکرایا۔ کھانا کھاتے ہی وہ روانہ ہو گیا جیسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو۔

''پھر آؤں گا اب تو گھر دیکھ لیا ہے فیرنی خوب تھی۔'' وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا۔ اسکے جانے کے بعد شمن چپ چاپ اداس بیٹھی رہی۔ روس بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ قطعی متاثر نہ ہوئی۔ سب ڈھونگ بگلا بھگت کہیں کے۔ انسانیت کے سگے بن کر چلے ہیں حمایتی۔ کہیں رہی سہی انسانیت کو بھی نہ ہڑپ کر جائیں۔

رعب جمانے آیا ہو گا میرے اوپر۔ وہ کوئی اور ہوں گی جو ان ہتھکنڈوں پر ریجھ جاتی ہوں گی۔ غبن وبن کیا ہو گا کم بخت نے جو نکالا گیا تو اپنی سیاہی کا پردہ ڈالنے کو لال جھنڈے کی آڑ میں آن دبکا۔ کچھ ایسی حوریں تو ہوتی بھی نہیں یہ بنگالنیں۔ سوائے آنکھوں کے اور ہوتا ہی کیا ہے۔ مگر یہ دو ٹکے کے شاعر انہی پر مرتے ہیں۔ لیکن بنگال میں تو قحط پڑ رہا ہے!

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اور یہ کون سی نئی بات ہے، قحط پڑے یا ہریالی ہو، بیوہ کی مانگ تو ویسے ہی اجڑ رہتی ہے۔ رونی تھکا ہارا چڑچڑاتا ہوا آیا اور سو گیا۔ اور کوئی دن ہوتا تو وہ کوئی بات نکال کر اس بنگال کے قحط کا تھوڑا سا بدلہ تو اس کا خون جلا کر لیتی مگر پروفیسر نے جیسے اس کی روح تک کو کچل دیا ہو۔

جلی بھنی بیٹھی تھی کہ بیرے نے پروفیسر کے آنے کی اطلاع دی۔ جی چاہا کہہ دے دھکے مار کر نکال دو۔ مگر پھر سوچا دو چار چٹکیاں تو کمبخت کی ڈھیٹ بونیوں میں لی ہی جائیں چنانچہ بلا لیا۔

پروفیسر کو دیکھ کر وہ پھر چونکی، یا خدا یہ دنیا ہے یا مداری کا تھیلا، مرغی کا پر ڈالو کبوتر کا بچہ نکال لو۔

''میرے بالوں کو دیکھ رہی ہو۔۔۔بہت کاٹ دیئے کم بخت نائی نے۔ میں نے کہا بھیا ذرا اچھے کاٹ دینا اس نے گدی کھرچ ڈالی۔'' اس نے گردن سہلا کر کہا اور شمن کے منہ پر طمانچہ سے لگا گویا کہتا ہے تم سمجھتی تھیں مجھے ڈھول تاشوں کی ضرورت ہے ویسے مجھ پر کچھ دم خم نہیں، یہ لو میں نے یہ ہتھیار بھی پھینک دیئے۔ اب آ جاؤ میدان میں۔

''میں تمھارے پاس ایک غرض سے آیا ہوں۔ تنہائی سے اکتا جاتی ہو گی۔'' شمن کے کان تمتما گئے اور وہ بھی سمجھ گیا۔ اس لئے جلدی سے بولا۔

''اتنی حساس نہ بنو۔ ذرا غور سے سنو۔ مذاق کو چھوڑو۔ ہاں پہلے میری اس دن کی بکواس کو معاف کر دو میں مذاق کر رہا تھا۔ مگر معلوم ہوا تم بڑی بد مذاق ہو گئی ہو۔ وہ تمھاری قیافہ شناسی کیا ہوئی یا صرف بنا کرتی تھیں۔ دو لفظوں میں میری داستان سن لو یقین نہ آئے تو کوئی پرواہ نہیں، ہمارے تعلقات نجی باتوں پر نہیں بگڑنا چاہئیں۔ میں کلکتہ بھیجا گیا تھا۔ وہاں کیا کچھ دیکھا اور کیسے دیکھا یہ نہ پوچھو اور نہ ہی کوئی بیان کر سکتا ہے۔ بھوتوں میں یقین تو نہیں کرتا مگر کوئی ہے آسیب جو چمٹ گیا اور مجھے استعفیٰ دے کر بھاگنا پڑا۔ آمدم بر سر مطلب ہمارے یہاں کچھ کلرکوں کی کمی آ گئی ہے۔ بہت معمولی کام ہے۔ ہفتے میں دو تین روز کام دیکھنا۔ دفتر کا کام نہیں وہ تو ہم نے انتظام کر لیا ہے۔ بلکہ۔۔۔اگر تم تیار ہو تو خیر ورنہ۔۔۔''

''کیا کام ہے؟''

''جی تو چاہتا ہے کہہ دوں۔۔۔'' وہ شرارت سے مسکرا دیا۔

''کہیے کہیے نا۔''

''رہنے دو، کہنے سننے کے لئے تو بہت وقت پڑا ہے۔۔۔۔سنو کام یہ ہے کہ ہم نے چند سینٹر مقرر کئے ہیں۔ جہاں ہمارے آدمی جا کر اناج بٹتے وقت انتظام کرتے ہیں۔''

''کیسا اناج؟'' لیکن وہ جھینپ گئی اسے وہ لمبی لمبی قطاریں بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے کی ٹکریں مارتی ہوئی اناج کی دکان کے سامنے کھڑی یاد آ گئیں۔

''ایسا مشکل کام نہیں بس عورتوں کو ایک قطار میں سیدھا رکھنا اور یہ دیکھنا کہ منتظمین خواہ مخواہ تنگ تو نہیں کرتے۔ اناج کے سینٹر کم ہیں۔ اس لئے بھیڑ ناقابل بیان ہوتی ہے۔ سنبھال سکو گی؟''

''سنبھالنے کو کیا ہوا مگر۔۔۔''

''کیا تم اپنی اس مگر کو دو چار مہینے کے لئے سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں۔ میں کوئی بھاگ نہیں جاؤں گا۔ جانتا ہوں تمھارے دل میں ہزاروں لاکھوں سوال کھلبلی مچا رہے ہیں۔ مگر یہ وقت ان سوالوں کو حل کرنے کا نہیں۔

''بے سمجھے بوجھے کوئی کام۔۔۔''

''نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمھارا غلط خیال ہے۔ اول تو ذرا سا مطالعہ کرو، ذرا خبروں میں دلچسپی لو تو خود بخود سارے جواب مل جائیں گے۔ اور ویسے اگر میں تم سے بحث کرنے بیٹھا تو خوب جانتا ہوں کہ ہار جاؤں گا۔''

''تو آپ کھوکھلی بنیادوں کے بوتے پر بحث کریں گے۔ بنیادیں کھوکھلی تو نظام بھی کھوکھلا۔

''وہ دیکھو میں ہار گیا۔ کہتا ہوں تم سے کمیونسٹوں کا کام نہیں خدا ترسی سمجھ کر کر دو۔ اگر جی چاہے تو۔ ورنہ زبردستی نہیں۔''

پروفیسر نے ہتھیار ڈال کر جو ستیہ گرہ کی پالیسی پکڑ لی اس پر شمن جھنجھلائی تو بہت مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے قائل کرے۔ غنیم بحث پر ہی تیار نہیں ورنہ دو لفظوں میں پرخچے اڑ جائیں۔''

''کیا ہے ذرا مشغلہ ہی ہاتھ آ جائے گا۔ جواب دو تا کہ پھر کوئی دوسرا راستہ نکالوں''

''میں آؤں گی۔''

''تو میں کل ہی تمھارے پاس ہفتہ بھر کا پروگرام بھیج دوں گا۔''

اور دوسرے دن وہ آٹھ بجے روانہ ہو گئی۔ ابھی اناج بانٹنے میں دو گھنٹے باقی تھے مگر ہجوم کا یہ حال تھا، جیسے کسی بڑے دیوتا کے درشن کا جماؤ لگا ہوا ہے۔ نوچ کھسوٹ، دھکم دھکا بس نہیں جو ایک دوسرے کو نگل جائیں۔ جونہی مندر کے پٹ کھلے خلقت طوفان کے ریلے کی طرح ٹوٹ پڑی ''ہٹو ہٹو۔۔۔ پیچھے ہٹو۔'' پولیس نے کوڑا اٹھا کر جاتریوں کو پیچھے دھکیلنا چاہا۔ مگر تو یہ کیجئے ان دیوتا کی کشش یوں کوڑوں سے کمزور کی جا سکتی تو پھر مشکل ہی کیا تھی، یہ پھر کتے ہوئے بھوکے خود اپنے ہاتھوں سے جسم کی کھال ادھیڑ لیتے۔ بدن دیکھو تو ایسے سوکھے جیسے گھسے ہوئے کپڑوں میں پھپھیوں کا ڈھیر لپیٹ دیا ہو۔ مگر ہوس دہن پہلوانوں جیسی۔ چاول کا دانہ دیکھتے ہی جس میں بھوت جاگ اٹھتے ہیں۔ وہی پھپھیاں جو پٹ کھلنے سے پہلے ٹھیرے سے بھی زیادہ بے جان ہو رہی تھیں۔ بجلی کی سرعت سے جی اٹھتی ہیں اور پھر زبانیں تو خدا کی پناہ۔ تیل نہیں ملتا تب تو اس تیزی سے چلتی ہیں۔ اگر دو چار چپٹے نوالے چھو جاتے تو نہ جانے کہاں پہنچیں اور پھر یہ زبانیں عورتوں کی قطار میں چل رہی تھیں۔

بڑی مشکلوں سے ان بے کل کیڑوں کی قطار میں کھڑا کرنے کی کوشش جاری تھی۔ اگلے حصہ کا انتظام شمن کے ہاتھ آیا۔ گو یہاں قدرے سکون تھا۔ کیونکہ اناج قریب تھا۔ مگر پچھلے حصے میں باوجود تین چار لڑکیوں کی جدوجہد کے اودھم برپا تھا۔ ڈیڑھ دو فرلانگ لمبی لکیر بالکل زہریلے سانپ کی طرح دم پٹخ پٹخ کر تلملا رہی تھی۔

یہ عورتیں تھیں یا بھوکی کتیاں! صنف نازک اس طرح بدحواسی سے اچھل کود مچائے تو جی برا ہی ہو جائے

گا۔ شمن نے کئی بار انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر شاید وہ زبان بھی نہ سمجھتی تھیں۔ اور نہ جانے کیا کیا کچھ جنگلی زبان میں چیخ پڑیں۔ دھوپ تیز تھی معلوم ہوتا تھا سورج سے گیلی گیلی بھوبل برس رہی ہے۔ کوئی پگھلی ہوئی راکھ جسم پر پوت رہا ہے۔ اور پھر ان گنوارنوں کی کھٹی کھٹی سڑاند۔۔۔ سر بھنا گیا۔

سب سے اگلی عورت سخت لڑاکا مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ نہ جانے دکاندار سے کیا چخ چخ لگا رکھی تھی اور کھسکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ کبھی پیر پکڑتی تھی کبھی ہاتھ سے سر کوٹنے لگتی تھی جمعدار جی کا ہنٹر گھوما اور وہ روتی بسورتی گھسیٹ کر دور پھینکی گئی۔ کچھ اناج کی برائی کر رہی تھی۔ بازار میں دوسیر کا تھا تو یہاں ساڑھے تین سیر، پھر بھی ہائے ہائے بند نہ ہوتی تھی۔ لیکن سب سے پہلی عورت کا مرض متعدی معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ جو آگے بڑھی اڑ کے رہ گئی اور دو چار کو ہنٹروں سے ہٹانے کے بعد قطار میں بذریعہ لاسلکی خبر دوڑ گئی کہ مال گہنا ہوا ہے۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ پروفیسر بھیڑ میں کہنیاں چلاتا تیرتا چلا آ رہا ہے۔ ایک بار اس نے شمن کو دیکھا مگر آگے بڑھ گیا آگے پہنچ کر اس نے ہاتھ چلا چلا کر دکاندار سے بالکل ایسے لڑنا شروع کیا جیسے وہ عالم فاضل پروفیسر نہیں بلکہ قطار والیوں کا کوئی بھائی بند ہے۔ زبان بھی تو وہ کوئی نئی بول رہا تھا۔ جس میں گجراتی، مراہٹی اردو اور انگریزی الجھی ہوئی تھی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اناج ملنا بند ہو گیا۔ سانپ نے پیچ و تاب کھانے شروع کئے اور کنڈلی مار کر ایک بار ہی دکان میں گھسنے کی کوشش کی۔ ڈھیل شمن کے محاذ پر ہوئی وہ پروفیسر کی طرف متوجہ ہوئی اور بلوہ ہو گیا۔ باڑ بکھر گئی، آہیں اور سسکیاں چاروں طرف پھیل گئیں۔ بھوکے ہاتھ پھر ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچنے لگے۔ زبانیں پھڑ پھڑانے لگیں۔

'پچھلے حصہ کا انتظام کرنے والے آگے دوڑے۔ پروفیسر بھی دکاندار سے نپٹ کر موقع پر آ گیا۔

''ابھی ملے گا اناج۔۔۔۔ یہ بوریاں غلطی سے آ گئی تھیں۔ تھوڑا صبر کرو بہنو۔''

اس نے چیخ چیخ کر آگے پیچھے لپکنا شروع کیا۔ مگر معلوم ہوتا تھا صبر بھی جنگ کے ساتھ کچل پچلا کر خاک ہو گیا تھا۔ آہیں چیخیں بن گئیں۔ نہ جانے کیا ہوتا مگر معلوم ہوا کہ اناج آ گیا ہے اور پھر لنگر جاری ہو گیا۔

ٹیکسی میں بیٹھاتے وقت پروفیسر نے شرمندہ ہو کر اس کی نفیس جارجٹ کی ساڑھی کو دیکھا جو قریب کی موری میں ڈوب کر مرے ہوئے چوہے کی طرح لٹک رہی تھی۔

''آج تو تم تماشہ دیکھنے آئی تھیں مگر مجھے یقین ہے۔ بدھ کے دن جب آؤ گی تو اصل لطف آئے گا۔ آؤ گی نا۔ دو دن آرام کر لو۔''

''کوشش کروں گی۔'' اس نے اپنے دکھتے ہوئے کندھے تکیے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ساڑھی کا تھرا ہوا کونا پنڈلی پر رینگا اور اسے پھریری آ گئی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(43)

کام غیر دلچسپ تھا اور تکلیف دہ بھی، لیکن اتنا تو ہو گیا کہ مقررہ شام کی تھکی ہوئی خاموشی ٹوٹ گئی۔ ٹیلر بڑی دلچسپی سے ان معرکوں کا حال سنتا۔ آئے دن نیا ڈرامہ دیکھنے میں آتا۔ انسانوں کی ایسی ایسی فاش کمزوریاں دیکھ کر تو جی جل اٹھتا۔ آخر ہندوستانیوں کو ترتیب سے کیوں اس قدر نفرت ہے ہر کام میں بس گودڑ بھر جاتا ہے۔

''انہیں سدھانا مشکل ہے۔'' ٹیلر نے سب کچھ سن کر کہا۔

''جاہل ہیں نا بے چارے۔'' شمن رسانیت سے بولی۔

''ہاں اور دوسرے کچھ ہے ہی ان کی خصلت میں۔''

''بھوک کے آگے کیا یاد رہے۔'' شمن نے ذرا ضبط کر کے کہا۔

''مگر اناج تو برابر مل رہا ہے۔ دراصل یہ لوگ ہوتے ہی بے اصول ہیں۔''

''خاک مل رہا ہے اناج، سارا پھپھوند لگا ہوا چاول اور گھنا ہوا گیہوں۔''

''مگر ہم نے پنجاب سے تازہ گیہوں منگوایا ہے۔''

''منگوایا ہو گا مگر ملتا نہیں، وہ تازہ گیہوں تو کیا کھیتوں میں جب سڑ جائے گا تب نکالا جائے گا۔''

''یہ تو بڑی مصیبت ہے۔''

''اور کیا پھر سرکار سنتی بھی تو نہیں۔''

''سرکار کیا کر سکتی ہے۔ جب ڈاکو تاک میں لگے ہوئے ہوں۔''

''یہ ڈاکو بھی سرکار کے ہی پٹھو ہیں۔ ہر سال انسان کشی کے سلسلے میں خطابات ملتے ہیں ان کو۔''

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو گویا میں ہی سرکار ہوں۔''

''سرکار کے حمایتی تو ہو۔''

''یوں تو تم بھی سرکار کی حمایتی بن گئیں۔ راشن اسکیم میں کام کرتی ہو جو سرکاری ہے۔'' شمن ذرا اس جرح سے لاجواب رہ گئی۔

''تو اس میں عیب ہی کیا ہے۔'' ٹیلر صلح کے انداز میں بولا۔ ''تم تو بالکل بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔''

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''میں سرکاری ہتھکنڈے سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں۔'' اس نے اداس ہو کر کہا۔ ٹیلر آج اسے منانے پر تلا ہوا تھا۔

''صبر کرو، وہ وقت بھی آ جائے گا۔''

''کونسا وقت؟''

''جب تم ان ہتھکنڈوں سے آزاد ہو سکو گی۔ نہ جانے تم لوگ اس قدر کم ہمت کیوں ہو، ذرا سی بات پر نا امید ہو جاتے ہو۔ ہمارے ملک کی تاریخ پڑھ کر بھی تم نے کوئی سبق نہ حاصل کیا۔۔۔ یہ احساس شکست کب دور ہو گا تمھارے دلوں سے۔''

''شکست کھا کر بھی محسوس نہ کریں، یہ اچھا ظلم ہے۔''

''شکست کھا کر اگر دو گنے جوش سے آگے بڑھو تو احساس خود بخود زائل ہو جائے گا۔ اگر صرف رونے سے کام چل جایا کرتا تو شاید کبھی کا قصہ ختم ہو جاتا، ہندوستان میں کتنی آنکھیں ہیں جو دن رات خشک آنسو نہیں بہاتیں۔'' آج ٹیلر میں کھویا ہوا انسان واپس لوٹ رہا تھا۔ گھر کے جھگڑوں نے انہیں کس قدر حیوان بنا دیا تھا۔ دونوں طرف مورچہ بندی شروع ہوئی تھی اور اس آپس کی جنگ نے دنیا بھر میں بھڑکتی ہوئی آنچ کو ماند بنا رکھا تھا۔ اپنے گھر دنچوں نے آگے انسانیت کے کلیجے میں رستا ہوا گھاؤ نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ پانی پینے کے بہانے سے اٹھی۔ لوٹ کر اس نے جیسے بالکل انجان بن کر ٹیلر کے سنہرے بالوں میں انگلیاں ڈبو دیں۔ کتنا نرم گرم احساس تھا، گلے میں اٹکی ہوئی گرہ دکھنے لگی۔

''رونی!'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی اور نہ ہی ٹیلر نے کہنے دیا۔

''ممی کا خط۔'' ٹیلر نے اسے جاگتا پا کر ڈاک اٹھا کر دے دی۔ ''ذرا دیکھنا۔۔۔ بڑی بی نے کیا کیا لکھ مارا ہے۔ سمجھتی ہیں میں اب تک وہی دو فٹ اونچا رونی ہوں۔ جسے پورے وقت نگرانی کی ضرورت ہے۔''

رونی چلا گیا تو وہ لیٹی خط پڑھتی رہی۔ ماں نے لکھا تھا کہ کیا کیا کھانے ٹیلر کو پسند ہیں اور کن چیزوں سے نفرت ہے، وہ رومال بہت کھوتا ہے، اور یہ عیب ایک بیوی کے لئے وبال جان ہے۔ اس کے موزے بھی بہت پھٹتے ہیں۔ اگر روز رات کو سونے سے قبل گرم پانی سے پیر دھلا کر ٹیلکم پاؤڈر چھڑک دیا جائے تو۔۔۔''

ہارا ہوا دماغ نیند میں لپٹا دھانوں کے ہرے بھرے خواب دیکھتا رہا۔ سانولی سانولی مٹی کے گداز سینے پر دھانوں کے ننھے ننھے سنہرے دانے گھنگھروؤں کی طرح نیکے، کنجوس مٹی کب تک ضد کئے منہ موڑے رہتی۔ آن کی آن میں سورج کی نوکیلی کرنوں نے انہیں گدگدا کر زندگی کی رمق پیدا کر دی۔ رو پہلا پانی چھل چھل ناچتا ان میں جذب ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے ہرے بھرے دھان شرابیوں کی طرح جھومنے لگے۔

اب کشمکش ڈھیلی پڑ جائے گی نیا دھان آ گیا! بھنی بھنی آنکھیں شکر سیری کی نیند میں نشیلی ہو جائیں گی۔ نیا دھان آ گیا۔ اب سسکتے ہوئے بنگال کے حلق میں بھی امرت ٹپکے گا۔ نیا دھان آ گیا۔۔۔ اب قحط ختم! خالی مٹھیوں میں یہ نیا دھان سونے کے ٹکڑے بن جائیں گے۔ خالی ڈھنڈار خزانہ بھی دولت سے مالا مال ہو جائے

گا۔۔۔ کروٹ لیتے میں اس کی گردن ڈھلک کر ٹیلر کے سینے پر ٹک گئی۔

آنکھ کھلی تو ٹیلر کی ناچتی ہوئی سیٹی کان میں گونجی۔ وہ آئینے پر جھکا ہوا سیفٹی ریزر سے گال کھرچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سچے نیلم کے ٹکڑوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ اور شمن کو وہ کانچ کی نیلی گولیاں یاد آ گئیں، جنہیں بچپن میں اس نے کدن کے ساتھ مل کر کیاریوں میں بو دیا تھا۔ وہ ایک دم مسکرا پڑی۔

شمن کو زور سے ہنسی آ گئی۔ یہ مائیں اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں۔ سب کی سب ایک ہی جیسی لیکن ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ کتنے دن ہو گئے شمن نے ٹیلر کے کپڑوں کی مرمت نہیں کی، بٹن ٹوٹ گئے ہیں، کالر مسک گئے ہیں، موزوں کی پچاس جوڑیاں ہوں گی، مگر سب کی ایڑیاں اور پنجے غائب۔ دیر تک وہ بیٹھی کپڑوں سے کھیلتی رہی۔

چاہتی تھی کہ کسی کام سے گلو خلاصی ہو جائے۔ پروفیسر سے ہی جھڑپ ہو جائے، کہ اسی بہانے مصیبت سے جان چھوٹے، اب اسے بڑی تھکن ہو جاتی تھی، اور موسم بھی ناگوار ہوتا جا رہا تھا۔ ہفتے میں دو کے بجائے تین دفعہ جانا پڑا۔ کیونکہ ملیریا کی وجہ سے مددگاروں میں اور کمی آ گئی تھی۔ اور کام بھی کیا گویا بندر سدھانے پڑ رہے ہیں۔ اسکول میں وہ ہمیشہ اعلیٰ جماعتوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ بدتمیز پھوہڑ بچے اسے کبھی نہ بھگتنے پڑے۔ لیکن ان عورتوں کو قطار میں کھڑا رہنا سکھانے سے تو بکریوں کو پڑھانا آسان تھا۔ کھوپڑیاں ہی نہ تھیں۔ بس ساری قوتیں سمٹ کر دھان کے دانے سمیٹنے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ خیر دو چار دن کی بات ہوتی تو کچھ نہ تھا۔ مگر یہاں تو مہینوں کا سلسلہ تھا۔

بے وقت کے مہمان سب ہی کو کھلتے ہیں۔ مگر پروفیسر کو آتا دیکھ کر تو جی ہی لوٹ گیا۔ کم بخت بھوکا تو آیا ہی ہوگا۔ چائے پر دو وقت کے کھانے کا انتظام کرے گا۔ بہ جبر خوش آمدید کہنا پڑا۔ ''نہیں چائے پینے کی فرصت نہیں، شیلا رہ گئی تھی اسے بھی آج ایک سو چار بخار چڑھ آیا۔ عورتوں کا معاملہ ہے ورنہ ویسے تو کام چل رہا ہے۔''

وہ کچھ مجبور اور شرمندہ سا ہاتھ ملتے ہوئے بولا ''ایک تم مسلمان ہو۔ جو اس کام میں دلچسپی لے رہی ہو۔ سنا ہے پردہ چھوڑ دیا ہے مسلمان نے بھی، مگر شاید صرف جلسوں پارٹیوں کے لئے چھوڑا ہے۔''

''مگر جب لڑکیاں موجود ہیں تو پھر ہندو مسلم کا سوال کیوں اٹھاتے ہیں۔''

''یونہی۔۔۔ کوتاہ نظر ہوں۔ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہوئے کبھی کبھی خیال آ جاتا ہے کہ۔۔۔ خیر تم تو آؤ گی۔''

''کیا خیال آ جاتا ہے؟ کیا اب راشٹنگ میں بھی پاکستان قائم کرنے کا ارادہ ہے۔'' اس نے سوئی چبھو ہی دی۔

''پھر بحث!''

''بات نہ ٹالئے یہ آپ کے کون سے لینن یا اسٹالن نے بتایا ہے کہ حصے بخرے کر دیئے گئے تو ساری

بلائیں دور ہو جائیں گی۔''

''مگر۔۔۔''

''ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تو تم لوگوں نے یہ چال چلی۔''

''تم سمجھتی ہو کہ پاکستان دے دیا تو ہندو مسلم فساد ہوں گے۔۔۔ میری بات بھی تو سنو۔ کون دے رہا ہے پاکستان؟ ہے کس کے پاس کچھ دینے کو۔''

''آپ ہی لوگ برا رہے ہیں۔''

''جی ہاں۔ ہماری جیب میں رکھا ہوا ہے پاکستان، کہ مانگے کوئی اور ہم دے دیں۔''

''مگر آپ ان کے مطالبے تو مانتے ہیں۔''

''ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کا ایک گروہ کسی خاص قسم کی حکومت پسند کرتا ہے تو ہمیں کیا حق کہ انکار کریں۔ ہمیں ان کے بہت سے مطالبات سے اختلاف ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ سرے سے پاکستان کا مطالبہ ہی ماننے سے انکار کر دیں۔ ہم فیصلہ کرنے والے کون؟''

''مگر مذہبی ڈھونگ رچا کر۔۔۔''

''کہہ تو دیا اختلاف ضرور ہے۔ ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ابھی تو صرف پاکستان کا مسئلہ درپیش ہے۔''

''اور اگر سکھستان، عیسائیستان اور بدھستان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔''

''تو اس پر بھی غور کیا جائے گا۔ کسی مسئلہ پر خواہ وہ کیسا ہی فضول ہو غور نہ کرنا۔۔۔''

''مگر مقصد کیا ہے۔ اس طرح کی تضیع اوقات سے۔''

''مقصد صرف ایک ہے، اتحاد۔''

''ہنہ کس قدر گھسا ہوا لفظ ہے۔ کانوں کو بھی تو متاثر نہیں کرتا۔''

''ہاں گھسا تو بہت گیا ہے مگر تراشا نہیں گیا۔ ابھی شیشے کا دھندلا سا ٹکڑا ہے مگر میں نے کہا تو کہ پھر کر لینا بحث۔''

''یہ خوب ہے آپ تو دلائل سے گھبراتے ہیں۔ انسان کی قوت متخیلہ کو مفلوج کئے دیتے ہیں۔''

''اب میں کیسے ہر منکر کو دلائل سے قائل کرتا پھروں۔ تم ہی سوچو۔ اگر دو چار بھی تم جیسے ضدی پلے پڑ جائیں تو اپنی زندگی تو انہی کو قائل کرتے کرتے گزر جائے۔ خیر یہ بھی کر لیتے مگر ذرا دیکھو تو کیسی افراتفری پڑ رہی ہے جو بنگال میں ہو گیا کیا چاہتی ہو یہاں بھی ہو جانے دیں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہ ہوتی تو بھلا اپنا قیمتی وقت یوں برباد کرتا۔ خیر اگر تمہیں فرصت نہیں تو۔۔۔''

''چائے تو پیجئے۔ زیادہ دیر نہ لگے گی۔'' اس نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

''اب دیکھو اگر مجھے اتحاد منظور نہ ہوتا تو تمہیں شاید اتنی خوشامدیں کروانے کی ہمت نہ ہوتی۔'' چائے کے گھونٹ لے کر پروفیسر مسکرایا۔ ''کسی قیمت پر بھی ہم ملاپ کرا کر رہیں گے۔ گو ایسا کرنا آسان نہیں دونوں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہی طرف سے جوتے پڑ رہے ہیں مگر تم دیکھنا ہماری ڈھٹائی کو۔'' وہ زور سے ہنسا۔

''اچھا اب چلئے۔۔۔تو ذرا جلدی آنا صبح۔۔۔۔'' بغیر کچھ کھائے پئے وہ تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

شمن نے دیکھا کہ اس کے بال پھر گدی پر شاعروں کی طرح بڑھ آئے تھے اور کپڑے میلے تھے۔

شمن کو ڈانس پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور نیلر بھی یہی کہتا تھا۔ پتہ نہیں دل سے یا مجبوراً وہ عموماً کترا جاتا۔ مگر یہ پارٹی افسروں کی طرف سے تھی اور اسے کامیاب بنانے کی ذمہ داری بھی انہیں کے سر تھی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے شمن کو بخار بھی آ گیا اور اس کا جھگڑا تو یوں حل ہو گیا۔ پیچھے کچھ دنوں سے صحت ویسے ہی خواہ مخواہ گرتی جا رہی تھی اوپر سے یہ بخار اور پھر ٹیلر کی لاپرواہ مصروفیت، پروفیسر بھی غرض سے آتا تھا۔ جب سے بخار آیا وہ رسم پوری کرنے کو ایک دو منٹ کے لئے آتا اور بھاگ جاتا۔ شاید دوسری لڑکیاں بھی رو بہ صحت ہو رہی تھیں اور شمن کی اشد ضرورت نہ رہی تھی۔

چڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ آگے ہی دو طشتریاں اور ایک پیالی پھینک چکی تھی کہ نیلر چاق و چوبند ٹائی اتارتا، زور زور سے پیر پٹختا آن پہنچا۔

''اوہو بڑے تر مال اڑا رہی ہو۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور شمن کا جی چاہا کشتی اس کی تھوتھنی پر کھینچ مارے۔ صبح سے ایک نوالہ حلق سے نہیں اترا اور یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ دن بھر چراہی کرتی ہے۔

''ممی کا خط پڑھا؟ پاگل ہو گئی ہیں۔'' وہ شرماتے ہوئے انداز سے مسکرایا'' بے کار کی چیں چیں نہ جانے ان عورتوں کو کیا اچھی لگتی ہے۔ ہشت فضول۔'' مگر شمن نے خط نہیں اٹھایا خاموش چائے میں چمچہ چلاتی رہی۔ نہ جانے کیا بک رہا ہے۔

''بے کار کا جنجال۔۔۔جی گھبراتا ہے میرا بچوں سے۔''

''ہنہ ایک حماقت ہو گئی اب دوسری۔۔۔''

''ایں؟'' وہ کچھ کھسیا کر چونکا۔

''اور کیا جو ہم نے بویا ہے ہم ہی بھگتیں اور بے گناہوں کے ماتھے پر سیاہ دھبہ کیوں تھوپ جائیں۔''

''ممی۔۔۔ان کی خواہش ہے۔۔۔۔'' کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شدت احساس سے کان سرخ ہو گئے۔

''ممی بچہ تو نہیں جو سمجھ نہ جائیں، وہ خود خلاف ہوں گی۔''

''کون ممی۔۔۔ارے توبہ کرو، دیوانی ہیں وہ بچوں کی۔۔۔تمام ادھر اُدھر کے بچوں کو چمٹائے رکھتی ہیں۔''

''تو اب بھی ادھر اُدھر کے بچے موجود ہیں، شوق سے چمٹائیں۔''

''ہوں'' وہ چپ ہو گیا۔

''آدھا تیتر آدھا بٹیر، ہنہ۔'' اس نے انتہائی مکاری سے کہا اور خون پھر نیلر کے کانوں کی طرف دوڑا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''ہم نے سخت غلطی کی۔'' نیلر بجھی ہوئی آواز میں بولا۔

''حد سے زیادہ بڑی حماقت۔''

''کیسے بھگتی جائے گی یہ دوزخ۔''

''کیا ضرورت ہے کہ بھگتی ہی جائے۔ اگر زہر کھا لیا جائے تو قے کیوں نہ کر دی جائے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب یہ کہ دو زندگیوں کو قبر میں جھونکنے سے بہتر ہے تم اپنا منہ اُدھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں۔''

''کسی ہندوستانی سے کہتیں تو وہ مزہ چکھا دیتا۔'' اس وقت ٹیلر نے دانت پیس کر کہا۔

''شاید۔''

''اور پھر تمہیں اعتراض بھی نہ ہوتا۔''

''شاید۔''

''کس قدر نیچ ہو تم۔'' اس کے منہ میں جھاگ آ گیا۔ ''ذبح کر ڈالنا چاہئے اس قسم کی حیوان عورتوں کو۔ اف۔۔۔مجھے تم سے کتنی نفرت ہے۔''

''ہنہ۔ اور جیسے میں تمہارے عشق میں دیوانی ہو رہی ہوں۔''

''تم۔۔۔تم بیسوا سے بھی بدتر کسی خبیث طبقے سے ہو۔۔۔کاش ایک بار کوئی تمہارا گلہ گھونٹ کر مجھے آزاد کر دے۔''

''اور تمہیں کیوں نہ مسل ڈالے جونک بن کر سارے ملک کا خون چوس رہے ہو۔ ذرا اپنی ماں بہنوں کو تو دیکھو۔۔۔ہنہ۔۔۔بدمعاش زمانے بھر کی۔''

''چپ کم بخت۔۔۔گلاب کے پھولوں کو چھوڑ کر میں نے تھوہر سے ناطہ جوڑا۔۔۔''

''اور تم۔۔۔بڑے حسن کے پتلے ہو۔ کوڑھ جیسی رنگت، سڑے ہوئے دانت، بندر کہیں کے۔''

''تو پھر کس بھیل چمار سے جا لپٹو۔ ایسی ہی باحیا ہو تو نکل جاؤ یہاں سے۔''

''بھیل کمار تم سے لاکھ درجے بہتر ہے ٹامی کہیں کے۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی۔

مذاق مذاق میں شمن بتا چکی تھی کہ ٹامی ہم ہندوستانی اس سفید ناجائز اولاد کو کہتے ہیں جو فوج میں بھرتی کر کے توپوں کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ نیلر اس کے منہ سے اتنی نیچ گالی سن کر کانپ اٹھا۔ تھوڑی دیر وہ ساکت و بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کی رنگت سفید پڑ گئی۔ جیسے کسی نے پچکاری سے خون کھینچ لیا ہو۔ شمن نے جلدی سے کمرے میں جا کر دروازے بند کر لئے، وہ چیخ چیخ کر گالیاں بکتا رہا۔ شمن نے کبھی اسے اتنا غصہ میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل پاگل معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ضبط کی لگام تڑا کر غصہ دماغ پر پھٹ پڑا ہو۔ شمن پیر لٹکائے پلنگ پر بیٹھی تھر تھر کانپی۔ اتنی بات بڑھ گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔

رات بھر ٹیلر کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔ وہ زخمی چیتے کی طرح تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔

بار بار الماری کھول کر کچھ انڈیلنے کی آواز آتی مگر وہ بھی جلدی خاموش ہو گئی۔ کیونکہ ایک بوتل آنے جانے والوں کے لئے رکھی تھی۔ عادتاً ٹیلر نہیں پیتا تھا۔ اور پھر سسکیوں کی آواز آئی جیسے کوئی دم گھونٹ کر رونا ضبط کر رہا ہو۔ شمن کا جی جل گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ ٹیلر ہٹا کٹا قد آور جوان مرد ایک عورت کے مارے، ہوئے ڈنکوں پر سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا جا کر۔۔۔۔ مگر وہ لرز اٹھی۔ وہ نیلی نیلی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھیں، وہ تمتمایا ہوا چہرہ!

دوسرے دن صبح ہی اٹھ کر نوکر نے بتایا کہ وہ اچانک سامان تیار کروا کر دہلی روانہ ہو گیا۔ کوئی ٹرنک کال بھی کی تھی۔ شمن کا بخار بھی نہ اترا اور کمزوری حد سے زیادہ بڑھ گئی۔

پورا ہفتہ گزر گیا اور ٹیلر کا نہ ہی کوئی خط آیا نہ خیر خبر۔ اس نے اِدھر اُدھر ٹیلی فون کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چل سکا۔ وہ کسی اہم کام کے سلسلے میں گیا ہوگا۔ جس میں شاید راز داری کا جھگڑا شامل ہوگا۔

دو ہفتے! اور ٹیلر کا نام ونشان نہیں۔ صرف سرکاری طور پر اس کی تنخواہ تو شمن کو مل گئی۔

ذرا سی چنگاری کو پنکھا جھل جھل کر اس نے کتنا بڑا شعلہ بنا دیا کہ دم بھر میں سب کچھ بھک سے اڑ گیا۔ بس ٹیلر ایک بار واپس آ جائے۔ پھر؟ پھر یہ تاریخ کبھی نہ دہرائی جائے گی۔ وہ آ جائے گا پھر تو۔۔۔۔ بن جائے گا۔ سب کچھ بن جائے گا۔ کھنڈر اتنے بوسیدہ نہیں ہو گئے کہ مرمت نہ ہو سکیں۔

''زیادہ نہیں بس ایک بار۔۔۔۔ آخری بار۔۔۔ آخری موقع!'' وہ نہ جانے کس سے اور کیا مانگتی رہی۔

دن گزرتے گئے وہ کام پر بھی چلی جاتی مگر جی کھویا سا رہتا۔ اس نے ٹیلر کے سارے کپڑے نکلوا کر دھوپ دی۔ کمزوری باقی تھی اس لئے دور بیٹھی ہدایات دیتی رہی۔ برش خود کیا اور گولیاں ڈال کر بند کر دیئے۔ دن میں کئی بار احساس تنہائی خوف بن کر چھایا اور وہ خاموش آنسو بہایا کی۔

اور دن گزرے! اس کا کوئی دنیا میں نہیں۔ وہ سب کو کھو چکی ایک ایک کر کے سارے ڈورے زہریلے دانتوں سے کتر ڈالے، مگر امید کا آخری تار سلامت تھا۔ گو بار بار لرزتا کہ اب ٹوٹا اور اب ٹوٹا۔ اس کی نیند بالکل اچاٹ ہو گئی تھی۔ سارا انتظام ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ رات بھر یہی معلوم ہوتا۔۔۔ وہ مل گیا راستہ! ٹیلر کی موٹر آ کر رکی۔۔۔ وہ اترا۔۔۔ اب زینے پر چڑھ رہا ہے۔ سیڑھیاں طے کر چکا۔۔۔۔ اب دروازے پر آ رہا ہے۔ مگر نہیں۔ سارا حساب گڑبڑ معلوم ہونے لگتا۔ نہیں بھلا اتنی جلدی موٹر سے کیسے اترا ہوگا منہ سے کہنا اور بات ہے فعل کے سرزد ہونے میں تو وقت لگتا ہے۔ وہ کھٹ سے اس نے موٹر کا دروازہ بند کیا۔۔۔۔ اب۔۔۔۔ چلا۔۔۔ سیڑھیوں پر چڑھا، صاف جوتوں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔۔۔۔ مگر یہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ختم ہو نہ چکتی۔ دس بارہ سیڑھیاں ہزار چاپوں میں بھی طے نہ ہو پاتیں۔ اور پھر اسے معلوم ہوتا جسے وہ پیر کی چاپ سمجھی تھی وہ نل کی بوندیں ٹب میں گر رہی تھیں۔ ٹپ ٹپ متواتر یہ بوندیں انسانی قدموں کی طرح چلتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ جھنجھلا کر وہ اٹھتی اور نل کو خوب مروڑ کر بند کر دیتی تاکہ گلا گھٹ جائے کمبخت کا۔

دماغی خلجان بڑھتا گیا۔ کھانے کی اکیلی میز پر ایک نوالہ بھی اس کے حلق سے نہ اترتا۔ زبان پر کائی لگ گئی تھی۔ ہر چیز کڑوی، بدمزہ، بساندی اور پھپھلاندی معلوم ہوتی۔ تھک گئی تھی وہ ان کھانوں سے، میز کرسی سے، نرم نرم صوفوں سے، جی چاہتا ایک ہی بار سب کچھ جھٹک کر دور کھڑی ہو جائے۔ آخر تھا کیا ان الجھنوں میں؟ اس پھیکی کسیلی زندگی سے تو یقیناً موت زیادہ چٹ پٹی ہوگی۔ شامی کباب کا چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں سڑاندی غلاظت کا پہاڑ بن کر پھیل گیا۔ بیرے کی نظروں سے ابکائی بچاتی ہوئی وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ یہ کباب ٹیلر کو کس قدر پسند تھے۔ روکھے روکھے نگل جاتا تھا۔ لیکن اب یہ نہ پکیں گے جب تک ٹیلر نہ آ جائے۔ ورنہ یونہی گلے میں ابکائی بن کر اٹکتے رہیں گے۔

یہ ذرا سی بات اتنی لمبی کیوں ہو گئی۔ کتنی بار تو اسے ادھورا چھوڑ دیا گیا مگر پھر بھی قسمت میں اس کی تکمیل یوں لکھی تھی۔ مانا کہ وہ ایک دوسرے سے اکتا جاتے تھے مگر یہ کون سی نئی بات ہے اور لوگ بھی تو لڑتے بھڑتے ہیں مگر زندگی کی روانی ٹھوکر کھا کر منہ کے بل نہیں گر پڑتی۔ اب کے ٹیلر آ جائے تو؟ تو۔۔۔۔ کتنا ارمان بھرا خواب تھا! مگر وہ اس سے معافی مانگ لے گی۔ گو معافی تو کجا اگر وہ صرف ایک معمولی اشارے سے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی تو ٹیلر ریشہ خطمی ہو جاتا۔ اتنا غصیل تھا پر جہاں آنسوؤں کی چمک دیکھی اور عقل کی آنکھیں چندھائیں، الٹی معافیاں حصے میں آتیں۔ اور کیا حرج ہے جو ماں کی بات بھی مان لی جائے۔ یہ وہی تو ماں تھی جس نے دور بیٹھے بیٹھے جیسے جنتر منتر دبا کر دو مختلف طاقتوں کو کھینچ کر ملا دیا تھا۔ تف ہے اس کی اوقات پر کہ وہ اس کی ننھی منی آرزو نہ پوری کر سکی۔ خیر وقت اتنی دور نہیں بھاگا ہے اب بھی تلافی کی جا سکتی ہے۔

لیکن۔۔۔ ایک بھیانک ''لیکن'' نے اس کے جمع ہوتے ہوئے خیالات کو بکھیرنا شروع کیا۔ سرکاری طور پر اسے معلوم ہوا کہ ٹیلر ابھی پندرہ بیس دن نہ آ سکے گا۔ جی کڑا کر کے چاہا اسے خط لکھے مگر یہ کم بخت قلم بڑا مجبور آلہ ہے۔ اس کے پاس وہ طاقتیں کہاں جو ایک روٹھے کو منانے کے لئے استعمال کرنا پڑتی ہیں۔

پروفیسر کا فون آیا، کہ فوراً آؤ۔ جی تو نہ اٹھتا تھا مگر کرنے کو کچھ نہ تھا بے کار دن اونگھتے گزارنا قیامت سے کم نہ تھا۔ راشننگ کے دفتر پر چھوٹی چھوٹی مہابھارت چھڑی نظر آتی تھی۔ چند بے پر کی خبروں نے اڑ کر بھوکوں کے پیٹوں کی آگ اور بھڑکا دی تھی۔ بنگال کی بھوک ہیبت بن کر سہار رہی تھی۔ لوگ اناج پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ رہا سہا صبر بھی مفقود ہو چکا تھا۔ انسانیت کو اتنا نیچا دیکھ کر جی جھنجھلا اٹھتا۔ آخر اتنی کانٹوں بھری زندگی اتنی پیاری کیوں تھی۔ آخر دوسرے ملکوں میں بھی تو بھوک ہے پر اتنی اندھی اور بے حیا نہیں۔ اگر ذرا صبر سے مر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

دھوپ تیز ہونے لگی مرجھائے ہوئے زرد چہرے تیل جیسے چپچپے پسینے سے دمک اٹھے جیسے لاشوں پر برقی روشنی پھیل گئی۔ آنکھیں زیادہ خشک اور بے رونق ہو گئیں۔ تھکی ہوئی ٹانگیں ٹھوس تپش کے بوجھ سے لرزنے لگیں۔ مجمع ہنڈیا کی طرح کھدبدا اٹھا۔ تعفن کے بھبکے شمن کے بھیجے کو گھونٹنے لگے۔ دوڑا میں چیختی کراہتی شور پر تاشے باجے کا سماں باندھتی گزر گئیں۔ پوں پوں ہزاروں موٹریں شمن کے کانوں میں گھسنے لگیں۔ لڑکھڑا کر اس

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

نے پان والے کی دکان کا سہارا لیا۔

چونا۔ سادہ ودیسی؟ ۔۔۔۔ بائی ۔۔۔ بھیلی سپاری؟ پان والے نے جلدی جلدی کتھے چونے کی کلھیوں کو بجایا۔ بھیڑ کے گچھے تاش کی گڈیوں کی طرح بکھرے سمٹے ہوا میں لہرائے، پیر کی نیچے سے پتھریلی پان کی پیکوں سے لتھڑی ہوئی زمین کتاب کے ورق کی طرح پھڑ پھڑا کر منہ پر آن چپکی ۔۔۔ اور کہیں آگ بجھانے کا انجن ٹن ٹن کرتا خاموشی میں ڈوب گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک نئے کمرے میں پایا۔ گھومتا ہوا دماغ ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ وہ اسپتال میں ہے۔ پروفیسر جھکا ہوا برف توڑ رہا تھا۔ وہ تین اور ناواقف چہرے موجود تھے۔ ''ایسی حالت میں باہر نہیں نکلنا چاہئے۔'' ڈاکٹر نے ربر کی نلکیوں والا آلہ تہ کرتے ہوئے کہا۔

''حالت؟ کیسی حالت؟ مگر شاید یہ ڈاکٹر اپنی کہنے میں جو مزہ پاتے ہیں وہ مریض کی سننے میں نہیں پاتے۔ ڈاکٹر نے لمبی چوڑی فہرست احتیاطوں اور دواؤں کی سنا دی ۔۔۔ دوائیں طاقت کی دوائیں! اور۔ مارے حیرت کے وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ بچہ تو نہیں تھی مگر پریشانیوں میں وہ کتنا کچھ بھولی ہوئی تھی۔ اس عظیم الشان انکشاف نے جیسے بھاگتے بھاگتے اسے ایک دم پکڑ لیا۔ پروفیسر کچھ خجل کچھ مجرم سا کھڑا تھا۔ وہ اٹھی تو ایسے سہارا دینے کو دوڑا گویا وہ نازک سا کانچ کا گلاس ہے اور پھونک مارے سے ٹوٹ جائے گی۔ وہ کھسیا کر تیز تیز چلتی باہر ٹیکسی میں آن بیٹھی۔

موٹر کی تیز ہوا نے اسے جگا دیا۔ چونک کر اس نے پھریری لی اور ایک دم اس کا دماغ بھی موٹر کے ساتھ بھاگنے لگا۔ جی چاہا زور زور سے ہنسے یا پھر زور زور سے روئے۔ مگر وہ ڈرائیور سے جھینپ گئی۔ ''جلدی ۔۔۔ جلدی'' اس نے ڈرائیور کو ٹوکا۔ بس نہ تھا جو وہ اپنے دل کی تیز دھڑکن موٹر کی طاقت میں شامل کر دیتی۔ آج اس کا جسم ایک دم ہلکا ہو کر اڑ جانے پر تلا ہوا تھا۔ بار بار آنکھوں میں بے معنی آنسو چھلکے آرہے تھے۔ سامنے آئینے میں اس کی شکل کتنی مردہ اور اجڑی ہوئی نظر آئی مگر کچھ پرواہ نہیں، حسن اور بدصورتی یک جان ہو کر اس نئی چمک کے سامنے ماند پڑ چکے تھے۔ بدصورت تھی تب بھی ۔۔۔ تب بھی اس کا دل ایک دم کتنا حسین ہو رہا تھا، وہاں صرف ایک متحیر سا خیال تھا۔ رونی ۔۔۔ رونی ٹیلر ۔۔۔ کہاں ہو تم مجھ سے معافی مانگو ۔۔۔ بے رحم کہیں کے ۔۔۔ اس کا گلا گھٹ گیا۔

وہ ڈانٹ بتائے گی رونی کو۔ آنے دو تو ذرا۔ اپنی ''بدنصیبی'' کا سارا الزام اس پر تھوپ دے گی۔ اور پھر رونی! اسے اتنا ہوش کب رہے گا کہ برا مان سکے۔ جنگلی کہیں کا! خود غرض وحشی! چلا گیا اتنے دن کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ آج کل پیٹنٹ دوائیں کہاں ملتی ہیں۔ کیلشیم انجکشن لانا جوئے شیر لانے سے کم ہوگا۔ اور اس وقت یہ لاپروائی ۔۔۔ مگر پھر اسی رونی پر پیار آ گیا۔ اتنی دور ہو کر وہ کہیں بالکل ہی قریب تو تھا۔ اور ماں! چہ بے وقوف پیاری سی ماں نے لکھا تھا۔ ''تم لوگ گھبرانا نہیں اونی سامان میں سب خود تیار کر لوں گی۔'' چہ۔ دیوانی۔ بڑی بی مارے ارمانوں کے مری جا رہی ہیں۔ سمجھتی ہیں جیسے ان میں بہت سلیقہ ہے پالنے کا لاڈ میں بگاڑ کر ناس مار

دیں گی۔ رونی سے بھی بدتر ضدی اور منہ چڑھا بنا دیں گی اور پھر بڑی بی میں دم کہاں ہوگا جو رات برات ہوا لگ جائے ۔۔۔ کہتی ہیں آئیں گی۔ مگر یہ بدنصیب جنگ بھی دم لے جبھی تو جینے کی فرصت ملے جب ہی تو۔ نا جانے کم بختوں کو کیا مل رہا ہے ایک دوسرے کا خون بہانے میں۔ وہ سوچتی رہی اس خون میں لتھڑی ہوئی دنیا کا خیال کر کے جی دہل گیا۔ کاش یہ جنگ جب تک ختم ہو جاتی خدا کسی کو اس قیامت کے دنوں میں جنم نہ دے۔ کون بچا ہوا ہے؟ اور کب تک؟ نہ جانے کس وقت آگ برسنے لگے۔ پریشان ہو کر وہ اپنے لمبے چوڑے کنبے کو بچانے کی فکر میں پڑ گئی۔

ارے ۔۔۔ اور کوئی احتیاط نہیں کرتا۔ روشنیاں دھڑا دھڑ جلنے لگی ہیں۔ شیشوں پر سے کالے کاغذ اتر گئے، تہہ خانہ قبر بنا پڑا ہے۔ مانا کہ خطرہ قریب نہیں، مگر چیل جھپٹا مارنے سے پہلے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔

اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دم میں بمباری ہونے والی ہے۔ اسٹور میں بھی تو کچھ نہیں۔ رونی کے پائپ کو تمبا کو نہ ملا تو وہ سر کھا جائے گا، پاگل آدمی ٹھہرا!

اور جو وہ رونی کو کچھ نہ بتائے تو؟ مزہ آجائے۔ ایک دم حیرت کے پاگل ہی تو ہو جائے گا اور جو ابھی سے معلوم ہو گیا تو جینا دوبھر کر دے گا۔ جان کھا لے گا۔ ''یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔'' اسے ایک دم ہنسی آگئی۔ کیسی اترائی ہوئی باتیں سوچنے لگی تھی وہ بھلا آج کل بم کہاں؟

مگر احاطے میں داخل ہو کر واقعی اس پر بم پھٹ پڑا۔ ملٹری کی بھوری گاڑی برساتی میں کھڑی تھی بے قابو ہو کر وہ بھاگی۔

''رونی ۔۔۔ رونی ۔۔۔'' ہانپتی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ ساڑھی پیر میں لپٹی اور وہ سہم کر رک گئی۔

''رونی!'' اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ دور دھکیل کر کھولا۔ ''رونی!''

''گڈ ایوننگ میڈم!'' ایک کلف لگے ہوئے فوجی نے سلام کیا۔

''رونی'' اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔

''مسٹر ٹیلر بذریعہ ہوائی جہاز محاذ پر روانہ ہو گئے۔ یہ خط۔'' اس نے ادب سے خط بڑھایا اور جلدی سے سلام جھاڑتا ہوا لوٹ گیا۔

ہاتھ میں خط لئے وہ ٹھہری ہوئی سوچنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہوا میں ہوائی جہازوں کے ہزاروں لاکھوں پر ببر شیروں کی طرح غرائے۔ چیختے، چنگھاڑتے بم لاکھوں کی تعداد میں برس پڑے۔ جنگی گرج کانوں کو سن کر گئی۔

''رونی ۔۔۔ رونی'' اس کی بھٹکی ہوئی روح کراہتی ہوئی موہوم سے واہمے کے تعاقب میں ڈوب گئی۔

رونی سارے اختیارات سونپ کر جنگی محاذ پر روانہ ہو گیا تھا۔ یہ آزاد تھی! جسم سے نکلی ہوئی روح کی طرح آزاد! لاوارث اور کھوئی ہوئی۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

''تم نہیں گئے رونی۔۔۔رونی یہ نہیں ہوسکتا۔ظالم اب تم کہیں نہیں بھاگ سکتے۔''اس نے بڑے وثوق سے پکارا گویا وہ اسے قید کر چکی ہو۔''سنو رونی۔۔۔''مگر وہ کسی کو نہ سنا سکی،اور گھنگھور گھٹائیں زور شور سے گھر کر منڈلائیں۔

''ٹھہرو ٹھہرو۔۔۔۔''اس نے منہ زور طوفان کو لجاجت سے چمکارا۔''سب ٹھیک ہو جائے گا ٹھہرو۔اتنا زور نہ لگاؤ۔۔۔ورنہ یہ تنی ہوئی ڈوریاں ٹوٹ جائیں گی۔تم گئے رونی۔''اس نے گھٹے ہوئے کلیجے کا زور لگا کر پکارا،مگر آہ بھی نہ نکلی اور پھر ایک دم نئی جان نے اس کی پکار سن لی۔۔۔زندگی کی پہلی پھریری لہروں کی طرح تھراتی ہوئی اس کے جسم میں تیر گئی۔ڈوبتی ہوئی طاقتیں تاریکیوں سے ابھرنے لگیں۔تنی ہوئی رگیں آپ ہی آپ لچک کر ڈھیلی پڑ گئیں۔آنکھوں کی دہشت آنسوؤں سے ڈھل کر بہہ نکلی،سسکیاں ہنسی کے فوارے بن گئیں،اور بمباری کا بھیانک احساس دور جھٹک کر وہ بوسیدہ ملبہ کے ڈھیر کے نیچے سے رینگ آئی۔۔۔ اکیلی؟

امریکہ میں بیٹھی اونی کپڑے بننے کی شوقین ماں ہوائی اڈوں کے پروں پر موت کے دہانے کی طرف اڑتا رونی۔۔۔وہ خود۔۔۔۔اور۔۔۔اس کے اپنے وجود سے اس قدر قریب ایک نئی جان!اتنی لمبی چوڑی برادری میں وہ اکیلی کہاں ہے۔مانا کہ بہت دور ہیں وہ،ایک دوسرے سے ہزاروں میل کا سفر حائل ہے۔مگر اس وقت اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی ساری دنیا سمٹ کر خود اس کی ہستی میں سما گئی۔آج اس بے کسی کی تنہائی میں بھی کتنی چہل پہل تھی۔اس بے سروسامانی میں بھی کتنی سلجھی ہوئی سجاوٹ تھی!آج وہ کتنی متحیر مگر خوش تھی۔اس سے قبل اس نے اپنے آپ کو اتنا کمزور۔۔۔اتنا بہادر،اتنا پریشان۔۔۔مگر اتنا مطمئن کبھی نہ محسوس کیا تھا۔اور دنیا کتنی حسین ہوگئی!زندگی کتنی عزیز۔

اور رونی؟

اس کا جی مسل گیا۔خالی ہاتھ،اکیلا رونی!اس کی مفلسی پر اسے ترس آ گیا۔جیسے کسی رئیس اعظم کو اپنے محل کی کھڑکی سے کسی قلاش فقیر کو ناداری کی سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ کر رحم آنے لگے۔

''ٹھگ کہیں کی۔''اس نے نئی دولت سے مالا مال ہستی کو طعنہ دیا۔ایک ہرجائی لٹیرے کو بھی لوٹ لیا!

نشیلے قدم اٹھاتی،جیسے اس کی ٹخنوں پر نقرئی گھنگھروؤں کے گچھے آن بندھے ہوں،وہ پلنگ کی طرف مڑی!نہایت احتیاط سے اپنا تھکا ہوا سر تکیے پر ٹکا دیا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com